علمی و ادبی رسالہ
نگار
مرتبہ
نیاز فتحپوری

قواعد رسالۂ نگار

۱ رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔
۲ رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں بیس تاریخ سے پہلے دفتر کو اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائیگا۔
۳ خط کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے جن پر نمبر خریداری نہیں ہوتا ایسے خطوط ضائع کر دئے جاتے ہیں۔
۴ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے
۵ مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہئیں
۶ سالانہ قیمت پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ

(نگار)

تصانیف مولینا نیاز فتحپوری

تصویر زیب النسا بیگم

یہ تصویر صنعت و نقاشی کا ایک نادر نمونہ ہے نگین آرٹ پیپر پر تیار کرائی گئی ہے یہ وہی تصویر ہے جس کو حکومت نے نہایت گراں قیمت پر خرید کر کے برٹش میوزیم کو دیا ہے۔ نہایت نفیس چیز ہے۔
قیمت علاوہ محصول ۸؍

صحابیات

یعنی عہد سعادت کی اقتداء (؟) خواتین کے نہایت صحیح اور مستند حالات خواتین کے مطالعہ کے لئے ضروری ہیں قیمت ؏

تصویر رقاصہ

بنگال کے مشہور مصور مز...[illegible] قلم کی بہترین صناعی۔ یہ تصویر بھی رنگ[illegible] آرٹ پیپر پر طبع کرائی گئی ہے اور[illegible] تصویر رسالۂ نگار ماہ مارچ میں شائع[illegible] ہے آپ دیکھیں گے تو بہت خوش ہ[illegible]
قیمت فی کاپی صرف ۸؍

تاریخ الدولتین

علامہ جرجی زیدان کی تاریخ تمدن اسلامی کا پانچویں حصہ کا ترجمہ جس میں دولت بنی عباس و بنی امیہ پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے ۱؍

نگارستان

حضرت نیاز کے تمام بہترین ادبی مضامین کا مجموعہ ادب لطیف کا اگر صحیح لطف اٹھانا ہو تو ضرور منگائیے قیمت ؏

شہاب کی سرگزشت

اردو میں پہلا افسانہ ہے جو تحلیل نفسی کے اصول پر لکھا گیا ہے اور اپنی بلند تخیل اور ندرت بیان کے لحاظ سے بے مثل ہے۔ ؏

گہوارۂ تمدن

اس میں ثابت کیا گیا ہے کہ تمد[illegible] شائستگی کی ترقی کسقدر عورت کی[illegible] اور مدنیت اس کی کسقدر گرانبار[illegible]

نرخنامہ اجرت اشتہارات

(۱) اجرت اشتہار بہر حال پیشگی آنا لازمی ہے۔ (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد کا اشتہار دیں گے ان کو ۲۰ فیصدی کمیشن دیا جائیگا۔ (۳) میعاد اشتہار کے اندر ۲ مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے

[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ
چھ مرتبہ	۵۰ روپیہ	۳۰ روپیہ	۱۲ روپیہ

[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
تین مرتبہ	۳۰ روپیہ	۲۰ روپیہ	۱۲
ایک مرتبہ	۱۲ روپیہ	۸ روپیہ	۵

جلد ۱۱ - شمارہ ۲

ز فبر ۱۱۰۴

اڈیٹر - نیاز فتحپوری

فہرست مضامین ماہ مارچ ۱۹۲۷ء

نگار شین پریس لکھنؤ میں باہتمام وصل بلگرامی چھپا

منیجر نگار نے لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ ۰۱۳۶ ھ

ایڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۱۱	ماہ مارچ ۱۹۲۷ء	شمارہ ۳

ملاحظات

گزشتہ مہینے کا رسالہ تقریباً چھپ کر طیار ہو چکا تھا کہ بعض اسباب کی بنا پر نگار کے دفتر کو فوراً لکھنؤ منتقل کرنا پڑا اور ایک چٹ چھپوا کر چسپاں کر دی گئی تاکہ اس نقل مکانی کی اطلاع ناظرین کو ہو جائے۔

اس میں کلام نہیں کہ نگار کا بھوپال سے کسی اور جگہ (اور وہ جگہ قرب وطن کے وجہ سے اور نیز اس لئے کہ بد طفولیت سے لیکر آغاز شباب تک کا بڑا حصہ یہیں کی فضا میں بسر ہوا تھا لکھنؤ سے بہتر کوئی اور نہ ہوسکتی تھی) منتقل ہونا ایک ننلیک در ضروری تھا۔ اور میں اس سے قبل بارہا ملاحظات کے تحت میں اس طرف اشارہ بھی کرچکا تھا، لیکن ۲ر فروری تک خود مجھے بھی اس کا علم نہ تھا کہ دوسرے ہی دن ۳ر فروری کو دفعتہً یہ عزم انا بد ہو جائے گا اور وہ ارادہ جو مہینوں سے دماغ میں گردش کر رہا تھا یوں یک بیک قوۃ سے فعل میں آسکے گا۔

ہرچند دنیا میں جتنے کام ہوتے ہیں وہ اچانک ہی ہوتے ہیں اور "پس وپیش" کی دنیا میں زندگی بسر کرنے والے مشکل سے کاما ہوسکتے ہیں، لیکن باوجود اس علم کے میں اس مسئلہ کو برابر ملتوی کرتا چلا آرہا تھا اور ایک خاص وقت کا منتظر تھا، بے خبر کہ دنیا میں وقت کا انتظار جبکہ وہ خود کسی کا انتظار نہیں کرتا لایعنی سی بات ہے اور واقعات سے بڑی بڑی تجاویز کا آن واحد میں بدل جانا بھی نادر الوقوع امر نہیں۔

بہر حال کسی مزید تفصیل کا اظہار کئے بغیر مجھے اس ماہ کے رسالہ میں ذرا وضاحت کے ساتھ یہ ظاہر کر دینا ضروری تھا کہ دفتر لکھنؤ آ گیا ہے اور اگر کوئی خاص سبب پیدا نہ ہو گیا تو نگار کو اپنی زندگی اب یہیں بسر کرنا ہے اور یہیں کی فضا میں اپنی حیات کے تمام مدارج و منازل طے کرنا ہیں خواہ میں کہیں اور کسی حال میں رہوں۔

اسمیں شک نہیں کہ لکھنؤ کو جس حد تک صحافت کا تعلق ہے، اب کوئی علمی و ادبی مرکزیت حاصل نہیں ہے اور نہ یہاں کا ذوق علم ایسا ہے جس پر اعتماد کر کے کوئی شخص نشاط عمل اپنے اندر پیدا کر سکے۔ اور یہی سبب ہے کہ یہاں کی آب و ہوا کو رسایل کے لئے ناموافق کہا جاتا ہے، لیکن اگر مصر کی شاہنشاہی پر کنعاں کی گدائی کو ترجیح دی جا سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ میں لاہور و دہلی کی آسانیوں پر لکھنؤ کے مصائب و مشکلات کو ترجیح نہ دوں جسے فتحپور سے زیادہ نزدیک ہونے کا فخر حاصل ہے۔

مقامی رسایل میں باوجود عدم استطاعت وسایل و ذرایع مغربی صحافت کی تقلید میں مرقع نے بھی جنوری کی اشاعت کو سالانہ نمبر کی حیثیت سے شایع کیا تھا اور غالباً خلاف حق ہمسائگی ہوگا اگر اس کے ترتیب دینے والے کی سعی کی داد نہ دیجائے۔ اس میں بجائے تصاویر کے شعراء اساتذۂ قدیم و جدید کے متعدد ایسے مکتوبات درج تھے جو انھیں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے اور مضامین کے لحاظ سے بھی کافی تنوع تھا

بعض مضامین تاریخ و انتقاد کے بھی اچھے تھے، لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ مذہبی مسائل کو شجر ممنوع قرار دیتے ہوئے جناب گویا جہان آبادی کا مضمون انھوں نے علیؑ کے متعلق نگار کے جواب میں کیسے شایع کیا۔ شاید اس لئے کہ اگر کوئی گمراہی میرے مضامین سے پیدا ہو گئی ہے تو وہ اس طرح دور ہو سکے، لیکن اگر جواز کیلئے صرف یہ شرط کافی ہو سکتی ہے تو میں بھی عرض کر سکتا ہوں کہ جس چیز کو وہ سلامت روی سمجھتے ہیں، میرے نزدیک وہی گمراہی ہے اور اس لئے مجھے بھی اس بنا پر حق حاصل ہے کہ اس سے لوگوں کو آگاہ کر دوں۔

رہا جناب وصل کا یہ فرمانا کہ اس قسم کے سوالات کے جوابات دینے کے لئے ہندوستان میں بڑے بڑے لوگ موجود ہیں یہ کام انپر چھوڑ دیا جاتا تو بہتر تھا، سو اس کے متعلق بغیر اس جسارت کے کہ میں اُن اعاظم رجال و اکابر امت کی فہرست مرتب کر کے اُن کے مفید کارناموں پر تبصرہ کرتا، یہاں صرف اس قدر عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ جناب وصل جس شخص پرستی سے معمور ہے اس سے میں بحمد اللہ بہت دور ہوں اور میں ایک لمحہ کے لئے یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ صرف چند درسگاہوں کی چار دیواری میں محدود ہو گیا ہے۔ اور خدا جس قدر سرمایۂ عقل و فراست نوع انسان کو دیا تھا، وہ رازی و غزالی تک پہونچکر ختم ہو گیا ہے۔ جناب وصل نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ وہ میرے مضمون کے جواب پر تبصرہ کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن اُنھوں نے خود اس کو مناسب نہیں سمجھا حالانکہ وہ اپنے نوٹ میں جو کچھ لکھ چکے ہیں وہ بھی تبصرہ ہی ہے اور اُس سے جو کچھ مترشح ہو رہا ہے وہ کافی ثبوت ہے میرے نقطۂ نظر سے

اس دوران میں مجھے مسلسل سفر کرنا پڑا اور اب تک اطمینان سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوا۔ نگار مشین پریس کے قیام ابتدائی مشکلات، دفتر نگار کے انتقال مکانی کی زحمتوں اور ایک نئی جگہ پہونچکر اُس کو اپنے ذوق کی ضروریات کے مطابق بنانے کی دقتوں نے توازن عمل، اور، توازنِ ذہن و دماغ، دونوں کو درہم برہم کر رکھا ہے اور شاید ابھی ایک مہینے تک یہ منتشر شیرازہ یکجا نہ ہو سکے

یہی سبب ہے کہ اس مہینے میں نہ استفسارات کا جواب دے سکا، نہ معلومات کا حصہ مرتب کر سکا اور نہ احباب کے خطوط کا جواب وقت پر لکھ سکا، لیکن یہ یقین ہے کہ اپریل کا رسالہ اس سے زیادہ منظم حالت میں اور مئی کی پوری کیفیت اعتدال کے ساتھ شائع ہو سکے گا

اُن حضرات کی خدمت میں، جن کے مضامین و استفسارات اب تک شائع نہیں ہو سکے خصوصیت کیساتھ اظہار معذرت کرتا ہوں۔ کوشش کروں گا کہ جلد از جلد اُن کی زحمت انتظار کو دور کر سکوں۔

فروری کا اخیری ہفتہ میں نے حیدر آباد میں بسر کیا لیکن اس حال میں کہ کسی ایک دوست سے بھی نہ مل سکا۔ سکندر آباد کے مجسٹک ہوٹل میں قیام رہا مگر اس طرح جیسے ایک مریض بیمارستان میں رہتا ہے۔ میں وہاں پہونچتے ہی علیل ہو گیا اور جس وقت روانہ ہوا ہوں اس وقت بھی تپ میں مبتلا تھا۔ ہر چند میں نے وہاں بہت کم حضرات کو اطلاع دی تھی، لیکن اب جو خطوط وہاں کے آ رہے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ جنھیں علم نہ ہونا چاہئے تھا وہ بھی میرے سفر سے آگاہ ہو گئے۔ بہر حال چونکہ میرا حیدر آباد جاکر کسی سے نہ ملنا بالکل میرے اختیار سے باہر تھا۔ اس لئے نہ کسی معذرت کی ضرورت ہے نہ طلب عفو بیان حقیقت کے طور پر اس قدر عرض کر دینا البتہ ضروری تھا۔

نیاز فتحپوری

عرب اور انکا تمدن

بادیہ نشین عرب جو دنیا کی نظروں میں ذلیل تھا اور جس کے زمانہ کی متمدن قومیں اُسے بے علم و ہنر سمجھکر اس کی تمام باتوں کو غیر قابل توجہ سمجھتی تھیں۔ اسلام کی جلوہ فرمائی کے بعد لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا اور وہی متمدن قومیں جو کل تک اسکی طرف توجہ کرنی اپنی ذلت سمجھتی تھیں آج اس کے نام کا کلمہ پڑھنے لگیں۔ دنیا میں مختلف تمدن گزرے، اور قومیں اپنا کمال دکھا دکھا کر رخصت ہوگئیں لیکن عرب ہی وہ قوم تھی جس کا تمدن آج تک دنیا کی زندہ قوموں میں جاری و ساری ہے، مشرق میں فینقیا، اور اشوریہ، بابل و نینوا، کے تمدن جلوہ گر ہوئے اور مغرب میں رومیوں اور یونانیوں نے اپنی دانائیوں سے دنیا کو علم و تہذیب سے آراستہ کیا، مگران تمام تمدنوں کا معمولی خاکہ بھی اگر تم دنیا کی متمدن قوموں میں ڈھونڈھوگے تو شاذ ہی پا سکو، ہاں اگر تم مرجانے والی قوم کے حالات سے دلچسپی رکھتے ہو اور دنیا میں اس کی زندہ یادگاروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہو تو آؤ کہ میں تمھیں وہاں کی سیر کراؤں، اور عرب کی بے آب و گیاہ سرزمین میں پیدا ہونے والے آقا کے غلاموں کے کارناموں سے تمھاری حیرانی میں مزید اضافہ کرسکوں۔

قومیں جب اپنی اعلیٰ زندگی کے مراحل طے کر چکنے کے بعد اسفل کی طرف گرنے لگتی ہیں تو اپنے تمام اعلیٰ اوصاف اور اپنے تمام ایجاد کردہ علوم و فنون بھی دفن کر دیتی ہیں۔ اور سوا چند آثارات و عمارات اور بعض علمی ذخیروں کے کچھ نہیں چھوڑتیں۔ لیکن عرب قوم اس سے مستثنیٰ ہے۔ میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ وہ کون سے اسباب ہیں جنھوں نے اس قوم کی اکثر چیزوں کو زندہ رکھا ہے دنیا میں اس اولوالعزم قوم کے حالات کی تدقیق میں خود اس کے ہم مذہب اور غیر مذہب مورخین نے جتنی اعتنا کی ہے وہ دنیا کی کسی قوم کے لئے نہیں کی گئی، ہاں خوبیوں کے ساتھ ساتھ لغزشوں کا بھی شمار کیا گیا ہے اور بے تعصبی کے ساتھ تعصب کا پیوند بھی جوڑا گیا ہے لیکن پھر بھی اس کے برابر کسی قوم کے حالات موافقت میں نہیں لکھے گئے۔

عرب اور ان کے تمدن پر مفصل نظر ڈالنے کے لئے زمانہ درکار ہے لیکن میں درحقیقت اُن کلی شواہد پر اکتفا کر رہا ہوں جو زندہ قومیں اپنے لئے ضروری تصور کرتی ہیں اور جن چیزوں کو غیر متمدن قومیں اپنے متمدن بھائیوں میں دیکھکر اُن کو متمدن شمار کرتی ہیں۔

عرب جو اپنی بداوت و شہری زندگی سے غیر مانوس ہونے میں دنیا کی تاریخ میں بے نظیر شمار کئے جاتے ہیں واقعتاً وہ ایسے ہی تھے اور ان کا شمار دنیا کی غیر متمدن قوموں میں بدرجہ اتم تھا۔ نہ تو ان کے پاس عیش و عشرت کے سامان تھے نہ ان کے رہنے سہنے کو بڑے بڑے محل و قصور تھے اور نہ وہ دنیا کی ان چیزوں کے خواہاں، ان کا تمدن بکریاں چرانی، اونٹوں کی پرورش کرنی، اور دودھ دوہنا تھا، اور سب سے بڑی چیز اپنے غلط طریقہ پر سمجھے ہوئے آبائی دین یعنی دین ابراہیمی کی پاسبانی تھی وہ معمولی معمولی باتوں پر آپس میں کٹ مرنا اپنے لئے باعث

فخر سمجھتے تھے۔ وہ اپنی خاندانی لڑائیوں کو جو محض معمولی باتوں پر کبھی اونٹ کے پانی پلانے کی سبقت پر اور کبھی گھوڑوں کے ایک دوسرے سے آگے بڑھجانے پر ہوا کرتی تھیں۔ مدت دراز تک جاری رکھتے تھے۔ الغرض صحیح انسانی اطلاق کے وہ بالکل مصداق نہ تھے اگرچہ انکا دماغ بہت اعلیٰ تھا اُن کی ذکاوت و ذہانت میں کوئی انکا ہمسر نہ تھا لیکن یہ چیزیں کسی اعلےٰ معلم کی نظر کرم کی محتاج تھیں، زمین صالح تھی لیکن کسی ایسے ابر رحیم کی ضرورت تھی جو اپنی سیرابی سے زمین کو سیر حاصل بنا دے اور وہ خشک زمین جو مدتوں سے آسمانی بارش کے انتظار میں اپنا مُنھ کھولے آسمان کی طرف تک رہی تھی اُسے آسمانی بارش چھولے، اور وہ دنیا کی اور زمینوں کی طرح اپنے نکالے ہوئے غلوں سے انسانوں کو فیضیاب کرے۔ کیا معلوم تھا کہ قدرت کو یہی منظور رہے کہ وہ خطۂ ملک جو کبھی دنیا کی نظروں میں نگاہ وقعت سے نہ دیکھا گیا وہ دان دور نہیں کہ دنیا کی قوموں کے لئے مشعل ہدایت بننے والا ہے اور دنیا اپنی کامیابی کا حصر اسی کی اطاعت میں سمجھنے والی ہے" اور یہی وہ خطۂ زمین ہے جہاں دین و دنیا دونوں زندہ کیجانے والی ہیں۔ بالآخر وہی ہوا اور دنیا و دین کے آخری تاجدار محمد الرسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم عرب کی سرزمین میں مبعوث ہوئے اور وہی عرب آہستہ آہستہ اپنی دینی و دنیاوی زندگی کو تکمیل تک پہنچانے لگا۔

اگرچہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا عظیم ترین مقصد دینی اصلاح تھی لیکن دنیا میں رہائش کا بہترین طریقہ بھی آپ ہی نے بتایا، اسی اصول پر صحابۂ کرام چلتے رہے اور وہ تمام دنیاوی فتوحات جو عہد صحابہ میں ہوئے وہ دین کے تابع تھے اور دین ہی کے لئے کیے گئے تھے۔

لیکن سرزمین عرب جو دور بداوت سے نکل کر دور حضارۃ میں آچکی تھی وہ اپنے تئیں دنیا کی تمام جائز چیزوں سے متمتع ہونا لازمی سمجھتی تھی اور جو اپنی اس خداداد ہمت و تفتیش سے آئندہ نسل کے لئے کوئی بیش بہا خزانہ چھوڑنا چاہتی وہ کیونکر دنیاوی ترقیوں میں کمال تک پہنچتی آہستہ آہستہ اس نے ملکوں کے نظم کی طرف توجہ کی، مفتوحہ ممالک کی سیر حاصل زمینوں کو اپنی توجہ خاص سے شاداب بنایا دنیا کے بڑے بندرگاہوں کی تسخیر کے بعد تجارتی سلسلوں کے بڑھانے کے لئے بیڑے تیار رکئے الغرض جب ملک پوری طرح اقتصادی تباہیوں کے دور سے گذر گیا اور سیاسی اغراض کے حصول کے لئے جتنی لڑائیاں جاری تھیں اختتام کو پہنچیں تو ان کی طبیعت علوم و فنون، صنعت و حرفت ایجادات و اختراعات کی طرف متوجہ ہوئی علوم و فنون جو دنیا میں کسی قوم کا حصہ نہیں وہ دوسری زبانوں کی کتابوں کے ذریعہ معلوم کئے جانے لگے اور خلیفہ مامون نے اپنے زمانے میں یونان کے تمام علوم عربی زبان میں منتقل کرالئے، اُن علوم کا بڑا حصہ فلسفہ اور منطق کے دقیق مسائل پر مشتمل اور اکثر اسلامی اصول سے ٹکراتا تھا۔ اسی لئے ایک جماعت نے جہاں اُن سے اپنی علمی معلومات میں اضافہ کیا وہاں ان کے بہترے غلط عقاید کی خوب دھجیاں اڑائیں اور ان دو علموں کو کچھ اس طرح حاصل کیا کہ وہ ان کے مذہبی کتابوں کے جزو لاینفک بن گئے، عربوں کی سب سے پہلی توجہ علم و صنعت ہی کی طرف کیوں ہوئی؟ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ جو قوم اپنے آپ کو معراج کمال پر پہنچانا چاہتی ہے وہ سب سے پہلے علوم دنیوی کے حاصل کرنے کی طرف مائل ہوتی ہے کیونکہ پہلا زینۂ ارتقا یہی دو چیزیں ہیں۔

اب میں تفصیل وار آپ کو ان علموں کو گنانا شروع کرتا ہوں جن کو عربوں نے اپنے زمانے میں ترویج دیا اور جن میں اکثر انہیں کی ایجادات ہیں۔ علم منطق، فلسفہ، ریاضی، جغرافیہ، طبعیات، جر ثقیل، فنون، کشافات علم حیوانات و نباتات، طب، مصوری، سنگ تراشی، فنون حرفتی فن تعمیر، فن تجارت،

اس کے علاوہ ایک دوسری شق ملکی و معاشرتی انتظام، بین الاقوامی تعلقات، اصول سلطنت وغیرہ، یہ بھی ایسی چیزیں ہیں جن کی بہتری اسکر تمدنی بہتری اور جنکی خرابی سے تمدنی خرابی ہے۔ یہ چیزیں بھی عرب میں بدرجۂ اتم موجود تھیں جن کا تفصیلی بیان لکھا جاتا ہے۔

یہ تو دنیا جانتی ہے کہ عرب کے ملکی و معاشرتی قوانین سب کے سب قرآن حکیم و سنت رسول کریمؐ سے ماخوذ تھے، صحابہ اور تابعین کے دور تک نہ تو انھیں زمانے نئے نئے واقعات اور نہ اس قدر عجمیت سے ممزوج و متصل کیا تھا کہ وہ نئے مسائل کی تخریج اور انکے طریق معاشرت کی طرف مائل ہوتے، ان کی معاشرتی زندگی نہایت سادہ تھی، اور وہ تمام تر قرآن و حدیث سے ماخوذ تھی قرآں نے اپنے اقربا کے ساتھ برتاؤ کے لئے جو طریقہ وضع کیا تھا وہ ان میں رائج تھا۔ آپس کے مقدمات کے فیصلے نہایت سادگی اور صحیح اصول پر کئے جاتے تھے مساوات حد درجہ قائم تھی، ایک مسلمان جو دنیا کے کسی گوشہ کا رہنے والا کیوں نہو کسی اسلامی ملک میں جاکر متبذل نہیں رہ سکتا تھا اسکے لئے وہ تمام حقوق تھے جو وہاں کے خاص مسلمان باشندوں اور امیروں کے ہو سکتے تھے، اور اپنی ذمی رعایا کے ساتھ بھی ان کا برتاؤ نہایت اچھا تھا وہ ان سے اپنی سلطنت کے ٹیکس کے لینے کے بعد ان کی جان و مال، اسباب و متاع اور انکی عزت کی نگہبانی کرتے تھے، وہ ملک کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز کئے جاتے تھے اور وہ سب کچھ کر سکتے تھے جس کا ان کا دل خواہشمند تھا۔ الغرض ان کی معاشرت زندگی نہایت مکمل تھی جس کا اعتراف ہمارے علاوہ یورپ نے بھی نہایت خندہ پیشانی سے کیا ہے۔ا

موسیو لیبلے جو ایک نہایت محقق اور عالم، مذہبی مصنف ہیں، مورخ جنہوں نے ایک بے نظیر کتاب مشرق پر لکھی ہے، وہ لکھتے ہیں "مسلمان ان نظامات میں جو اقوام مزدوری پیشہ کی بہبودی کے متعلق ہیں اسوقت تک ان سخت غلطیوں سے بچے ہوئے ہیں جو مغرب میں واقع ہوتی ہیں ان میں اب تک وہ عمدہ نظامات کامل طور سے باقی ہیں جن کے ذریعہ سے انھوں نے امیر و غریب و غلام و مالک میں صلح قائم رکھی ہے اسیقدر کہنا کافی ہے کہ وہ قوم جسکو تعلیم دینے کا دعویٰ یورپ کر رہا ہے فی الواقع وہ قوم ہے جس سے خود اُسے سبق لینا چاہئے"

عربوں کے ملکی نظامات کا پتہ وسعت کے ساتھ ان عربی تصنیفات سے لگ سکتا ہے جن میں بصراحت اس کا ذکر موجود ہے اور جو آپکے سامنے پیش کیا جاتا ہے خلفائے بنی امیہ نے مدینہ منورہ کے بعد جب دمشق کو اپنا دار السلطنت بنایا تو اسیوقت سے انھوں نے ملکی انتظامات ترقی و استواری کا کام شروع کر دیا تھا لیکن قدرت نے ترقی کا جو حصہ عباسیوں کے لئے چھوڑ رکھا تھا وہ کسی نہ کسی صورت سے انھیں سے مکمل ہونے والا تھا۔ ۱۳۲ھ میں خاندان عباسیہ نے عروج پکڑا تو انھوں نے اس دار السلطنت کو بدل کر دجلہ کے اوپر بابل کے قریب شہر بغداد کی بنیاد ڈالی جس نے بہت ہی جلد مشرق کے شہروں میں ایک عالمگیر شہرت حاصل کر لی اور آہستہ آہستہ دنیا کا عظیم ترین

شہر بن گیا۔ ہارون رشید بیس برس کی عمر میں تخت پر بیٹھا اور اُس نے بہت ہی جلد اپنے وسیع ملک کا انتظام کیا، تمام ملک میں سڑکیں بنائی گئیں اور ان پر ڈاک قائم کی گئی جن کے ذریعہ سے قاصد دور دور کے فاصلہ تک بہ آسانی و بسرعت پہنچنے لگے، نامہ بر کبوتروں کی بھی ڈاک قائم کی گئی اور اس کا انتظام بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ آج یورپ کے بعض شہروں میں ہے۔ خطوط رسانی کا صیغہ بغداد میں بھی جیسا کہ آج یورپ میں ہے ایک بہت بڑا صیغہ شمار کیا جاتا تھا، ہر ایک صوبہ میں ایک والی تھا جس کے ہاتھ میں صوبہ کی ساری حکومت تھی۔ دور کے صوبہ جات کے والی جیسے شمالی افریقہ وغیرہ وہ اکثر خلیفہ کے قائم مقام کہلاتے تھے اور انکا یہ عہدہ موروثی تھا اور یہ کسیقدر خود مختار بھی تھے، جو بالآخر پوری طرح خود مختار بھی ہو گئے۔ ملک کا مالی انتظام نہایت ہی باقاعدہ تھا، آمدنی کے ذرائع حسب ذیل تھے، اول ذاتی و شخصی محصول، دوم خفیف سا محصول مقبوضہ زمینوں پر، سوم جنگی کا محصول، چہارم غیر مزروعہ آراضی کا محصول، مورخین عرب نے لکھا ہے کہ خلافت کی مجموعی سالانہ آمدنی دس کروڑ روپیہ تھی جو اس زمانہ کے لئے ایک بہت ہی خطیر رقم ہے۔ مالگزاری کی نگرانی ایک مجلس وزرا کے سپرد تھی جسے دیوان کہتے تھے ابن خلدون لکھتا ہے کہ، انتظام مالگذاری کا دیوان اس غرض سے قائم کیا گیا ہے کہ آمدنی کی نگرانی اور بادشاہی حقوق کی حفاظت کرے اور مداخل و مخارج میں تناسب قائم رکھے اور فوج کی تعداد اور اسکی تنخواہ مقرر کرے اس دیوان میں بہت ہی لائق محاسب رکھے جاتے ہیں اور انھیں منشیان دیوان کہتے ہیں، دیوان کا اطلاق اس عمارت پر بھی ہے جسمیں وزرا جمع ہوتے ہیں، ملک کا انتظام چار صیغوں میں منقسم تھا، اول صیغہ حرب دوم صیغہ مالگذاری جس کا کام محصولات کا قرار دینا تھا، سوم صیغہ تشخیص جو محصولات کے وصول کرنے والوں کو مقرر کرتا تھا چہارم صیغہ انتظامی جس کا کام مداخل و مخارج کی نگرانی تھی، خلیفہ کے کل احکام لکھے جاتے تھے اور اس غرض سے دفتر میں رکھے جاتے تھے کہ خلفاء مابعد انکی طرف بہ آسانی رجوع کر سکیں، اس ساری کل کی کنجی ایک وزیر کے ہاتھ میں رہتی تھی جو بطور مدار المہام ہوا کرتا تھا، اور اکثر خلفاء کل امور ملکی کو اسی کے اختیار میں چھوڑ دیا کرتے تھے، شہروں کی کوتوالی کا انتظام ویسی ہی عمدگی کے ساتھ تھا جیسا کہ ڈاک اور مداخل و مخارج کا۔ تاجروں کی مجلسیں قائم کر دی گئی تھیں جنکا فرض یہ تھا کہ معاملات تجارت کی جانچ پرتال اور فریب و دغابازی کا انسداد کریں۔ خلفائے عباسیہ کے مداخل و مخارج کے انتظام نے انھیں بہت بڑے بڑے رفاہ عام کے کام کرنے کا موقع دیا تھا۔ ملک میں سڑکیں بن گئی تھیں، کاروانسرائے، مساجد، شفاخانے مدارس، ہر طرف علی الخصوص بصرہ، بغداد، موصل میں بکثرت قائم ہو گئے تھے۔ کاشتکاری اور حرفت نے بھی بڑی ترقی کی تھی، باریک اور عمدہ کپڑوں کے کارخانے، موصل، حلب، دمشق، میں قائم تھے، نمک گندھک، سنگ مرمر، لوہے اور سیسے کی کانیں بہت ہی باقاعدہ طور پر کھودی جاتی تھیں اور انکی پیداوار مصرف میں آتی تھی تعلیم عام کا صیغہ بھی ایک بہت وسیع اصول پر قائم ہوا تھا تمام حصہ عالم سے مشہور فضلاء اور اساتذہ بلائے گئے تھے علم ہیئت کی اس درجہ ترقی ہوئی تھی کہ وہ کام جس کو اسوقت یورپ کی قوموں نے بالکل زمانہ حال میں کیا ہے، اُسوقت ہو چکا تھا۔ یعنی کرّہ نصف النہار کے ایک قوس کی پیمائش کی جا چکی تھی، قدماء روم و ایران کا کلام علی الخصوص وہ کلام جو فلسفہ و ریاضیات سے متعلق تھا ترجمہ ہو چکا تھا اور کل مدارس میں پڑھا جاتا تھا، زمانہ قدیم کی تحقیقات بھی جو یورپ میں کئی صدی بعد شروع ہوئیں عربوں میں عام طرح سے

جاری تھیں عربوں نے علوم کے حاصل کرنے میں جو ان کے لئے ایک نیا شغل تھا نہایت مستعدی ظاہر کی، عام کتب خانے مدارس علمی کے مقامات پر ہر جگہ کثرت سے قائم ہوگئے تھے، عربوں میں علم حاصل کرنے کی خواہش اس درجہ تھی کہ خلفائے بغداد ہر ایک تدبیر سے دنیا کے مشہور علماو اہل کمال کو اپنے دار السلطنۃ میں جمع کرتے تھے ایک خلیفہ نے تو شہنشاہ مشرق سے محض اس لئے اعلان جنگ کیا کہ وہ ایک مشہور مہندس کو بغداد میں درس دینے کے لئے بھیجنے پر مجبور ہوجائے علماء و فضلاء ہر قوم و ہر مذہب کے، یونانی، ایرانی، قبطی، کلدی، اس شہر میں آکر جمع ہوگئے تھے اور انھوں نے اسے تمام دنیا کے علوم کا مرکز بنا دیا تھا، ابو الفرج لکھتا ہے کہ ہارون الرشید کے بیٹے مامون کا یہ قول تھا کہ علما اللہ تعالےٰ کے ان خاص بندوں میں ہیں جسے اس نے فہم و ادراک کو کامل کرنے کے لئے انتخاب کیا ہے یہ لوگ دنیا کی شمعیں اور رہبران نوع انسانی ہیں اگر یہ نہ ہوں تو دنیا پھر اپنی اصلی وحشی حالت پر آجائے، جبکہ خلفائے بغداد کے دربار میں اس قسم کے باکمال اشخاص موجود تھے تو پھر وہ کیوں نہ اپنے دار الخلافہ کو تمام عالم میں اول سمجھتے، اس دربار میں نہ فقط علم ہی کا چرچا تھا بلکہ اس کی شان و شوکت بھی بے انتہا تھی، ابو الفدا نے ۳۰۵ھ میں سفیر دولت مشرقی کے بغداد میں آنے اور اسکی پذیرائی کا حال لکھا ہے اس سے ہمیں بغداد کی مشرقی شان و شوکت کا اندازہ ہوسکتا ہے وہ لکھتا ہے کہ، خلیفہ کی ساری فوج کمر بستہ تھی سوار پیدل کی جمعیت سولہ ہزار تھی جو فوجی افسر زرق برق وردیاں پہنے اور پُر تکلف پرتلے لگائے ہوئے جنمیں موتی اور سونا چمک رہا تھا اپنے افسر اعلیٰ کے گرد صف بستہ تھے، ان کے پیچھے سات ہزار خواجہ سرا تھے جنمیں چار ہزار گورے چٹے تھے ان کے بعد سات سو محلسرا کے محافظ تھے مرصع کار بجرے اور کشتیاں دجلہ پر اپنے پھریرے کا لطف دکھا رہی تھیں، قصر شاہی کے اندر عجیب قسم کا تکلف تھا، اڑتیس ہزار شجر کے پردے جا بجا آویزاں تھے، جن میں ساڑھے بارہ ہزار ریشمی کلابتوں کے کام کے تھے، بائیس ہزار قالینوں کا فرش تھا، خلیفہ کے سامنے سو شیر ببر تماشہ کر رہے تھے اور ہر ایک کے لئے علیٰحدہ علیٰحدہ محافظ تھے۔ ایک درخت سونے اور چاندی کا تھا جس کی اٹھارہ شاخیں تھیں اور ان پر ہر قسم کی چڑیاں بیٹھی ہوئی زمزمہ سنج تھیں۔ درخت کے پتے اور چڑیاں مختلف بیش بہا فلزات سے بنی ہوئی تھیں، درخت بالکل قدرتی معلوم ہوتا تھا گویا ابھی جنگل سے اٹھ آیا ہے۔ ان تمام تیاریوں کے بیچ میں وزیر اعظم نے سفیر مشرقی کو خلیفہ کے تخت تک پہنچا دیا خلفائے بغداد کی فوجی قوت کا اندازہ ذیل کے ایک واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ شہنشاہ قسطنطنیہ جو یونان و روم کے جانشین تھے، خلیفہ کو لازمی طور پر خراج دیا کرتے تھے نیسی فورس نے جو شہزادی آئرنی کے بعد تخت پر بیٹھا اس نے خلیفہ ہارون الرشید کو لکھا کہ میں آئندہ سے خراج نہ دونگا، اس کے جواب میں جو خط خلیفہ نے لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلاطین روم و یونان کی تخت نشین اولاد کس طرح عربوں کی نظروں میں ذلیل و رسوا تھی، وہ جواب یہ ہے بسم اللہ الرحمن الرحیم، ہارون رشید امیر المومنین کی طرف سے بنام رومی کتے نیسی فورس کے، او کافر کے بچے، میں نے تیرا خط پڑھا میرے جواب کا منتظر نہ رہ تو دیکھ لیگا کہ کیا ہوتا ہے،" فی الواقع اس سگ رومی نے دیکھ بھی لیا، ہارون نے اس کے تمام ملک کو زیر و زبر کر ڈالا اور اس عیسائی شہنشاہ قسطنطنیہ کو خلیفہ اسلام کی بارگاہ میں خراج دینا ہی پڑا

یہاں تک تو ان کے معاشرتی و ملکی تمدن کا بیان تھا، اب ان کے علوم و فنون اور دوسری خوبیوں پر نظر ڈالئے،

علم ادب یعنی اپنی عربی زبان یہہ درحقیقت رسالتآب صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے قبل ہی تکمیل کو پہنچ چکی تھی حماسہ کے اکثر اشعار، سبعہ معلقہ دیوان نابغہ وغیرہ یہ سب عہد جاہلیت کے شعرا کا نمونہ ہیں، عطاظ جو مکہ سے تین دن کی راہ پر ایک قصبہ ہے وہاں شعرائے عرب کا اجتماع ہوا کرتا تھا اور ان میں کے بہترین اشعار خانۂ کعبہ کے دروازے پر لٹکا دئے جاتے تھے لیکن نثر میں اسوقت تک کوئی کمال نہ پیدا ہوا تھا اور نہ کوئی ممتاز ناثر تھا، بنی امیہ کے دور خلافت میں اکثر اہل کمال پیدا ہوئے اور بنی عباس نے توشعرا اور اہل ادب سے تمام ملک کو بھر دیا، فن ادب میں بھی مختلف شعبے ہوگئے، اور نظم و نثر، ضرب الامثال، معانی و بلاغت ولغت میں الگ الگ کمال پیدا کیا جانے لگا، جاحظ شیخ عبدالقاہر جرجانی، ابوالقاسم حریری، بدیع الزماں ہمدانی، ابوالفرج اصفہانی وغیرہ یہہ مختلف شعبوں کے امام ہوئے، نظم میں حسان بن ثابت، اعشی عروۃ الورد، ابوالعلا اموی، عتبی، ابونواس، متنبی، قطری بن الفجاہ، بانت سعاد اور دیگر بیشمار شاعر پیدا ہوئے، اور یہہ مذاق عرب کی خمیر میں داخل ہوگیا، انکا بچہ بچہ اس سے آشنا تھا، اور یہہ جس ملک میں گئے یہہ فن ان کے ساتھ گیا۔ چنانچہ یورپ نے اس فن کو اندلس کے عربوں سے سیکھا اور ان کی شاعری کا ماخذ عرب شعرا کے کلام ہیں، ردیف وقافیہ کا استعمال بھی عربوں ہی کے ذریعہ سے یورپ نے پایا اور استعمال کیا۔ طوالت مضمون کی وجہ سے میں ان کے ثبوت سے درگزر کرتا ہوں، ورنہ تفصیلاً اس کا ذکر کرتا۔

علم منطق و فلسفہ جس کو یوناں سے عربوں نے ترجمہ کیا تھا وہ وہیں تک محدود نہ تھا بلکہ ان میں خود انکی کاوش کا بڑا حصہ موجود تھا، یونان کے ماہرین، ارسطو، اسپے، ڈاکلیز، ہرقل، سقراط، ابی کیورس، اور کل فلاسفہ کی تصنیفیں عربی زبان میں ترجمہ ہوچکی تھیں اور وہ اپنی کاوشوں سے بہت جلد اپنے استادوں سے بڑھ گئے تھے، سب سے بڑی بات جو انھوں نے پیدا کی وہ یہ کہ تقلید کو چھوڑکر اجتہاد کرنے لگے تھے اور اقوال و ارا کو پس پشت ڈال کر تجربہ اور مشاہدہ سے کام لینا شروع کر دیا تھا، تجربوں اور مشاہدوں کو اقوال علمار کے مقابلہ میں اصل علمی تحقیق قرار دینا بیکن مشہور فلسفی کی طرف منسوب کیا گیا ہے لیکن یہ بالکل غلط ہے، یہہ تو ہر وہ شخص جو عربی فلسفہ سے ذوق رکھتا ہو، جانتا ہے کہ ان کا طریقہ، معلوم سے غیر معلوم کا حاصل کرنا، واقعات و حوادث کا صحیح مشاہدہ کرکے اس کی علت بتانا، اور قضایائے کاذبہ سے اجتناب، اور انھیں غیر صحیح الانتائج سمجھنا، انھیں عربوں نے بتائے اور جاری کئے، اور یورپ نے اس طریقہ کو عرب ہی سے سیکھا، اس لئے کہ یورپ کی ازمنۂ متوسطہ کی یونیورسٹیاں اس علمی تجربہ سے خالی تھیں۔

اسلام میں مشہور فلسفی، ابن رشد، غزالی، رازی، بوعلی سینا وغیرہ گزرے ہیں، یورپ کی یونیورسٹیاں مدتوں تک انہیں کے فلسفہ پر زندہ رہی ہیں خصوصاً ابن رشد کا فلسفہ تو سترہویں اٹھارہویں صدی تک یورپ میں پڑھایا جاتا رہا ہے۔ ریاضی و ہیئت کا فن یوں تو یونانیوں کے وقت کا ایجاد کردہ شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن عربوں نے جو بے نظیر ترقی اس فن کے اندر کی ہے ان کی مثال ڈھونڈنی

عبث ہے اور یہ فن کچھ اس طرح رواج پایا کہ عربوں کے بعد بھی اکثر اسلامی بادشاہوں نے اپنی فیاضیوں سے اس کی ترویج میں بڑی مدد کی، عربوں کے عروج کے دور میں یوں تو اس کا اصلی مرکز بغداد تھا لیکن، سمرقند، دمشق، قاہرہ، فاس، طلیطلہ، قرطبہ، دہلی، یہ سب شہر بھی اس کے مرکز رہ چکے ہیں، علم نجوم وعلم الافلاک میں کیا کیا چیزیں عربوں نے دریافت کی تھیں اس کے لئے تو وقت درکار ہے، اور مضمون کے بجائے کتاب ہی اس ضرورت کو پوری کر سکتی ہے، لیکن ان مشہور مہندسوں کے نام لکھتا ہوں جو اس فن میں کامل گزرے ہیں، یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ مختلف تباہیوں اور بربادیوں کے بعد بھی یہ علم مسلمانوں کی تحقیقات کا آماجگاہ وزیر بار احسان رہا ہے، اور بغداد ہی میں سات صدی تک برابر اس کی تعلیم دیجاتی رہی۔ پہلا شخص محمدؐ بن جبر البتانی ہے یہ مہندسین کا امام ہے اور اس نے تیسری صدی میں رحلت کی، ابن اماجور اور موسی ابن شاکر مورخ کے تین بیٹے جو محمد، احمد، احسن، کے نام سے مشہور ہیں یہ سب بڑے مہندس گزرے ہیں۔ اسی طرح ابو ریحان محمد البیرونی ہے جو علم ہیئت کا بڑا عالم و واقفکار تھا، دنیا کے مشہور مقامات کا سفر کیا، اور ہندوستان میں بھی آکر ہندؤں کے درمیاں رہا ان کی زبان، ان کے علوم و فنون، فلسفہ، لٹیریچر، ان کے اوضاع و اطوار، رسم و رواج، ان کے قوانین و مذہب اور ان کی ضعیف الاعتقادی کا بغور مطالعہ کیا، پھر ہندوں کو بغداد کے مہندسین کی تحقیقات پر مطلع کیا اور اپنے مشاہدات کو قلمبند کیا جو اس کے سفرنامہ کے نام سے مشہور ہے۔ ابن ہیثم مصری یہ بھی دنیا کے ممتاز مہندسین میں ہے اس کی کتاب، "کتاب المرایا والمناظر" دنیا کے بہترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے جس کا قلمی نسخہ مصر کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

علم جغرافیہ کا حال تو نہ پوچھئے بدقسمتی سے وہ علم جس کی ایجاد ہی کا نہیں بلکہ کمال اور انتہا تک پہنچا دینے کا فخر عرب قوم ہی کو ہے، آج وہ ہمارے مدارس کے نصاب سے اس طرح خارج کر دیا گیا ہے کہ کوئی عربی دان معلم یا طلبہ اس کی معمولی واقفیت کا دعوی بھی نہیں کر سکتے، جغرافیہ کے تھوڑے معلومات عرب تاجر سلیمان کے سفرنامہ سے ملتے ہیں اور غالباً سب سے پہلا جغرافیہ وہی سفرنامہ ہے، مسعودی یہ بھی ایک بڑا جغرافیہ داں ہے اور مروج الذہب، جسمیں منجملہ اور مضامین کے ملکوں کی حالت، پہاڑ، سمندر، بادشاہی خانداں ان کی اقوام کے شعبے وغیرہ معلوم ہوتے ہیں، ابن حوقل، البیرونی، جو بڑا مہندس بھی ہے، ابو الحسن علی بن ابی القاسم بن ماجور، ابن بطوطہ الاسطخری، اور سب سے مشہور جغرافی، ادریسی، یہ سب سے بڑے بڑے جغرافیہ نویس گزرے ہیں۔ اور عجب اتفاق کہ مصری شاہی خاندان کے ایک فرد کا سفرنامہ جو انھوں نے یورپ سے واپس آکر "الدنیا فی باریس" کے نام سے شائع کیا ہے اس میں ایک فہرست مسلمانوں کے مختلف علوم و فنون کے کتابوں کی دی ہے جو جرمنی سے شائع ہوئی ہیں اس میں زمخشری کی ایک کتاب، "کتاب الامکنۃ والجبال"، کا نام بھی لکھا ہے جس سے اس معتزلی عالم کی علم جغرافیہ سے واقفیت کا پتہ لگتا ہے۔ طبعیات وجر ثقیل، یوں تو عربوں کی اکثر تصنیفیں کھو گئیں لیکن جو دو چار کتابیں دست برد زمانہ سے اب تک بچ گئی ہیں۔ ان میں کتاب المناظر جس کا اوپر ذکر آچکا ہے ایک بہتر اور لاجواب کتاب ہے جس میں روشنی اور شعاعوں سے پوری بحث کی گئی ہے اور مستقیم، منعکس، منعطف، شعاعوں کی خوب خوب تفصیلیں بیاں کی گئی ہیں۔ اسی طرح

جرثقیل کے مختلف آلات جو عربوں نے ایجاد کئے تھے وہ اگرچہ ہم تک نہیں پہنچے لیکن کتابوں سے ان کا علم پہنچگیا ہے آخر یہ بڑی بڑی عمارات کے اوپر اتنے بڑے بڑے پتھروں کا پہنچانا اور بڑی بڑی چیزوں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا، کس طرح ہوتا تھا۔ گھڑی کے لنگر کا ایجاد کرنا (اور خود گھڑی کا ایجاد کرنا) اور اس گھڑی کا پتہ یعقوب ابن صبیر کے سفرنامہ سے ملتا ہے جسے میں تطویل کے خوف سے، حذف کرتا ہوں جابر ابن حیان مشہور کیمیا داں ہے، اور مختلف نامعلوم اجزا کو معلوم کرکے اس نے ان کے خواص کی تحقیق کی ہے اور وہ بڑے بڑے مرکبات جن سے یونانی بالکل ناواقف تھے۔ مثلاً الکحل۔ گندھک کا تیزاب، مارالملوک وغیرہ کو عربوں ہی نے ایجاد کیا، اور جابر کی اکثر تصنیفوں کے تلف ہوجانے کے بعد اب کتاب الاستتمام، کتاب الخواص، کتاب الاداہ، وغیرہ کا پتہ لگاہے۔ الرازی بھی علم کیمیا کا ایک بڑا ماہر گذرا ہے جس کی مشہور کتابیں، الحاوی، الجامع، کتاب الاقطاب اور منصوریہ ہیں۔ فنون واکتشافات، عربوں کی بڑی خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ عملی طور پر علوم سے حرفت میں کام لیا کرتے تھے اور اپنی حرفت میں نمایاں ترقی پیدا کرلی تھی جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے وہ گندھک، پارے، اور تانبے، لوہے، سونے کی کانوں کو نکالنا جانتے تھے اور ان کو رنگنے کے فن میں بہت ہی کمال تھا، فولاد کے آب دینے میں بہت کمال حاصل کیا تھا جیسا ہمیں طلیطلہ کی تلواروں سے معلوم ہوتا ہے اُن کے منسوجات، ہتھیار، دباغت چرم، کاغذ، تمام عالم میں مشہور تھے، عربوں کی ایک بڑی وقیع ایجاد بارود بھی شمار کیجاسکتی ہے اور اس کے ساتھ، بندوق، اور توپ بھی۔ تفصیل کو چھوڑ کر میں صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ عربوں کی تحقیقات واکتشافات جس طرح اور علوم میں ہیں اسی طرح طبعیات میں بھی ہیں۔ جن کی فہرست یوں ہے۔

(۱) اصول طبیعیات میں، اور علی الخصوص علم مناظر میں اعلیٰ درجہ کی معلومات اور باریک آلات جرثقیل کا ایجاد کرنا۔
۲ اصلی مرکبات کیمیائی، مثلاً، الکحل، شورہ، گندھک کے تیزاب اور ضروری عملیات، عرق کشی، وغیرہ کا ایجاد کرنا۔
۳ اصول کیمیا سے قرابادین، اور حرفت علی الحصول فلزات، اور فولاد کی ساخت ورنگسازی۔
۴ بارود وتوپ کی ایجاد۔
۵ چیتھڑوں سے کاغذ بنانا۔
۶ غالباً قطب نما کا جہازرانی میں استعمال۔ اور اس بے بہا ایجاد کو یورپ بھیجنا۔

مضمون اعتدال سے بہت بڑھگیا۔ پھر بھی بعض کا تذکرہ رہگیا جنپر بشرط فرصت آئندہ توجہ کیجائے گی۔

محمد عزیز الدین ندوی پھلواروی

نوٹ:۔ اس مضمون کی تحریر کے وقت عربی کتابوں کے علاوہ مندرجہ ذیل کتب پیش نظر تھیں تمدن عرب، لیبان، مسلمانان اندلس۔ (اسکاٹ) تاریخ اسلام (سید امیر علی) مولدین (مسٹر ہنری چارس لی) مسلمانان اندلس (اسٹینلی لیں پول) وغیرہ وغیرہ۔

ایک شاعر کا انجام

(افسانہ)

--- ۱ ---

جیو پیٹر سو رہا ہے، دیویاں آہستہ آہستہ خوابگاہ الوہیت کے قریب جاتی ہیں اور پھر دبے پاؤں واپس آتی ہیں۔ پرداز کنندۂ چلی رجم سبک پرواز کے ساتھ خلوتگاہ مقدس کے چاروں طرف چکر لگاتی ہیں اور لوٹ آتی ہیں۔

آفتاب بلند ہوکر کوہ اولمپس کی چوٹی کو زرکار بنا رہا ہے، چڑیاں اپنے اپنے آشیانوں سے نکل کر پرہوا ہیں، کسان ہل لیکر کھیتوں میں پہونچ گئے ہیں، لکڑہارے کلھاڑیاں لئے ہوئے خنک درختوں کی تلاش میں نکل گئے ہیں، پھول کھل چکے ہیں، سبزہ شبنم سے لہک اٹھا ہے چشموں کی روانی میں تیزی پیدا ہوچلی ہے۔ الغرض ساری کائنات بیدار ہوچکی ہے، لیکن جیو پیٹر ہنوز محو خواب ہے کیونکہ بارگاہ خداوندی کے مطرب گنگ ہیں، ان کے ساز خاموش ہیں اور وہ موسیقی جس کی نازک موجیں، جیو پیٹر کی نیند میں تھرتھری پیدا کرکے اس کو بیدار کرتی تھیں آج نہ مغنی کے گلے سے پیدا ہوتی ہے نہ بربط کے تاروں سے

--- ۲ ---

دولت کی دیوی :-

"اے شاعر، بغیر تیرے موسیقی ویران ہے اور جیو پیٹر ابھی تک بیدار نہیں ہوا، سنا ہے کہ شاعر دولت کا شیدا ہوتا ہے، اس لئے سب نے مجھے منتخب کرکے تیرے پاس بھیجا ہے کہ تجھے مناکر دربار میں لے چلوں اور اگر تو چاہے تو اس کے عوض ساری دنیا کی دولت تیرے آگے ڈال دوں"

یہ کہکر اُسنے اپنے لانبے سیاہ بال نچوڑے اور شاعر کے قدموں پر موتیوں کا ڈھیر لگ گیا۔

شاعر نے جو بالکل خاموش دونوں ہاتوں سے سر پکڑے بیٹھا تھا نگاہ اٹھاکر اوپر دیکھا اور پھر اسی طرح گردن جھکالی۔ دیوی اسکا یہ انداز دیکھکر ہنس پڑی اور شاعر کے سامنے بیشمار نقرئی پھول بکھر گئے۔

شاعر بدستور خاموش بیٹھا رہا اور دیوی یہ سمجھکر کہ شاید وہ اس سے بھی زیادہ کچھ چاہتا ہے آگے بڑھی اور بولی، "اے شاعر اگر تو اسپر بھی راضی نہیں تو میں تجھے دنیا کی وہ سب سے زیادہ قیمتی چیزیں دینے کے لئے طیار ہوں جو سوائے جیو پیٹر کے کسی اور کا حصہ نہیں۔ ہاں میں اپنے لبوں کا یاقوت، کانوں کے صدف، انگلیوں کے ہیرے اور ان سب سے بڑھکر اپنے سینہ و شانہ کا نرم دبکدار سونا بھی تیری

سپردگی میں دینے کے لئے آمادہ ہوں، لیکن خدا کے لئے تو میرے ساتھ چل اور جیوپیٹر کو کسی طرح بیدار کر"
یہ کہکر وہ شاعر کی آغوش میں مچلنے ہی والی تھی کہ اُس نے خشونت کے ساتھ اُسے ہٹا دیا اور بولا۔ "نہیں مجھے ان میں سے کسی چیز کی ضرورت نہیں اور نہ میں تیرے ساتھ چل سکتا ہوں کیونکہ میری شاعری خود ابتک محو خواب ہے"

--- ۳ ---

شہرت کی دیوی :-

"اے شاعر، میں سمجھتی تھی کہ تجھے منانے کے لئے مجھی کو آنا پڑیگا، سچ ہے تجھے دولت کی کیا پرواہو سکتی ہے، تیرا دماغ خود بے بہا خزینہ ہے بہترین جواہرات کا تجھے تو صرف شہرت درکار ہے، سو میں ایک تحفہ تیرے پاس لائی ہوں، اسے قبول کر"
یہ کہکر اس نے ایک نہایت نازک بلبلہ جس میں قوس قزح کے تمام رنگ جھلک رہے تھے، دامن میں رکھکر پیش کیا اور بولی "اے شاعر دیکھ اس کے اندر کیا نظر آتا ہے، ذرا غور کر، سارے آسمان و زمین میں تیرا ہی نام جلی حروف سے لکھا ہوا نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ بادلوں کی روانیوں، شفق کی رنگینیوں، پہاڑوں کی بلندیوں، وادیوں کی وسعتوں، سمندر کی گہرائیوں میں ہر جگہ تو ہی تو ہے۔ لے یہ طلسم بند حباب اپنے پاس رکھ اور فضاء عالم میں حکومت کر"
شاعر نے برہمی کے ساتھ اُس حباب رنگین کو لیکر زمین پر پٹک دیا اور وہ چور چور ہو گیا۔ شاعر نے پیشانی میں شکنیں ڈالکر کہا۔ "اے دیوی، مجھے ناپایدار شہرت و عزت کی ضرورت نہیں، میں تو کچھ ایسی چیز چاہتا ہوں جو میری روح کے اضمحلال کو دور کر سکے، میں جبکر کیا کرونگا جبکہ میری شاعری مجھ سے گم ہو گئی ہے"

--- ۴ ---

شعر و موسیقی کی دیوی

"اے شاعر، آج تو کیوں اسقدر افسردہ ہے، کیا تیرا ملکۂ شعری مضمحل ہو گیا ہے، کیا اب تیرا کوئی خیال موسیقی قبول کرکے تیری زبان سے شعر بنکر نہیں نکلتا۔ وہ تو مجھے معلوم تھا کہ جب تک میں نہ آؤنگی تو راز دل کسی سے نہ کہیگا، دولت تیرے سامنے کیا چیز ہے، شہرت کا ناپائدار وجود کیا حقیقت رکھتا ہے، اچھا اب اس سوگ کو دور کر اور مجھے اپنی آغوش میں لیکر اپنے سینہ کو شاعری سے بھرلے، میری زبان کو بوسہ دیکر اپنی شاعری میں الہامانہ ترنم پیدا کرلے، ہاں میری آنکھیں چوم لے تاکہ تو اپنے کلام سے لوگوں پر جادو کر سکے، لب سے لب ملا لے تاکہ تیری ہر شاعرانہ تخئیل موج بادہ بنکر نکلے"
یہ کہکر دیوی اپنے نازک ہات بڑھائے ہوئے اس کے قریب پہونچی، لیکن شاعر نے اسے روکدیا اور بولا "مجھے ایسی آورد کی شاعری درکار نہیں ہے، یہ شاعری تو تیرے سینہ و آغوش، تیرے لب و چشم کی ہوگی نہ کہ میرے دل کی۔ جا، مجھے پریشان نہ کر کہ میری دنیا

آج کیفیات کے اعتبار سے بالکل تہی دست ہے۔"

--- ۵ ---

حُسن و شباب کی دیوی :-

"اے شاعر مجھ سے زیادہ واقف الحال دنیائے شعر کا کون ہوسکتا ہے، لیکن میں نے کہا کہ پہلے اوروں کو کوشش کرلینے دوں۔ میں تو سمجھتی تھی کہ نہ تو دولت سے فریب کھانے والا ہے نہ شہرت کے سیمیائی وجود پر مٹنے والا۔ اسیطرح میں اس رمز سے بھی واقف تھی کہ جب تک احساس حسن قوی نہ ہو نہ سچا شعر پیدا ہوتا ہے نہ حقیقی موسیقی، اس لئے اے میرے اچھے شاعر، گردن اُٹھا، نگاہ اونچی کر، اور جنگل کے اس سکوں میں اپنی آغوش کو لبریز جمال بنالے۔"

یہ کہکر حُسن کی دیوی، تمام ان معطر صباحتوں کے ساتھ جو فردوس ہی کے یاسمن زاروں سے حاصل ہوسکتی ہیں، تمام ان پاکیزہ نزاکتوں کے ساتھ جو کوثر و سلسبیل ہی کی موجوں سے استعارہ ہوسکتی ہیں، تمام ان رنگینیوں کے ساتھ جنھیں صرف بہار جنت ہی پیش کرسکتی ہے۔ تمام ان کیفیتوں، سرشاریوں اور اداہائے جانستاں کے ساتھ جو صرف نوخیز شباب ہی میں نظر آسکتی ہیں، لبوں سے شراب ٹپکاتی، آنکھوں سے انسوں چھلکاتی، اعضا میں خواہش سپردگی، جوش جوانی میں التماس فشار اور سینہ کی عریانیوں میں دعوت لذات بے اندازہ ہوئے مدہوشانہ والہانہ، کورانہ آگے بڑھی تاکہ نوجوان شاعر کے سراپا میں آگ لگادے، اس کو پانی کرکے بہادے فرط لذت سے اس کی روح کو بے چین کرکے باہر لے آئے۔ مگر قبل اس کے کہ یہ بجلیاں شاعر کے خرمن ہوش سے کوئی خراج وصول کریں، شاعر نے آہستگی سے ہات بڑھا کر اُسے روکدیا اور بولا۔

اے دیوی، مجھے حسن کی قوتوں کا اعتراف ہے، اس لئے تو اس کے ثبوت میں ان اداؤں سے کام نہ لے جس سے میں ناآشنا نہیں ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ میں تجھے اس عالم میں دیکھ کر تیرے سامنے پینے لگوں، تھرتھرانے لگوں، لیکن میرے جسم کی یہ کپکپی مجھے ہلاک توکرسکتی ہے لیکن کسی شعر میں تبدیل نہیں ہوسکتی، کوئی موسیقی نہیں بن سکتی میری روح بالکل شل ہوگئی ہے، میرا دل برف سے زیادہ سرد ہوگیا ہے، ایسا سرد کہ شاید اب کوئی دنیاوی شعلہ اس میں گرمی پیدا نہیں کرسکتا۔ تو جا اور کہدے کہ شاعر مجھے نہیں ملا، کیونکہ تیری توہین مجھے گوارا نہیں ہے۔

--- ۶ ---

شاعر، تھک کر سوگیا، نیند اس کی روح کو سیر کراتی ہوئی ایشیا کے اس سب سے بڑے جزیرہ نما میں لے گئی جسے وحشی، جاہل اور غیر مہذب کہا جاتا ہے :-

رات کا پچھلا پہر ہے اور سارا گاؤں سوائے اُس آبادی کے اس حصہ کے جسے عورت سے تعبیر کیا جاتا ہے سو رہا ہے۔ ہر گھر سے

جکی کی غمگین آواز آ رہی ہے اور اسی کے ساتھ سادہ و نرم موسیقی معصوم سروں میں کبھی کبھی بلند ہو کر شاعر کی روح کو کسی خاص غور و فکر میں مبتلا کر دیتی ہے

صبح کا وقت ہے، مرد خشمگین چہرہ لئے ہوئے اٹھتا ہے اور عورت کو آواز دیتا ہے، وہ جو برتن پھیلائے ہوئے انھیں صاف کر رہی ہے، اپنے بچوں کا منھ دھلا رہی ہے اپنے انہماک میں نہیں سنتی مرد دیو کی طرح خونخوار آگے بڑھتا ہے اور اس کے نازک جسم کو سخت آزار پہونچانے لگتا ہے وہ خاموشی سے اس ستم کو برداشت کر رہی ہے اور پھر مکان کے ایک کونے میں ہاتوں کی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں ڈالکر کلائی کا خوں پونچھ رہی ہے اور روتی جاتی ہے مرد چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں پر غصہ نکالتا ہے اور انھیں اپنے قوی ہاتوں کی ضرب سے لہو لہاں کر کے گھر سے باہر نکال دیتا ہے۔ عورت اپنے جگر کے ٹکڑوں کا یہ حال گھونگھٹ کے اندر ہی اندر کنکھیوں سے دیکھتی جاتی ہے اور خاموش کھڑی کانپ رہی ہے ——— شام کو وہی ظالم مرد کسی اور گانوں کو چلا جاتا ہے اور رات کو اس کی وہی مظلوم عورت جب تنہائی میں کچھ گنگناتی ہے تو صرف یہ کہ :-

تجھ بن پیا کچھو نہ سہائے

. . . .

شاعر جاگ اٹھتا ہے لیکن ایک کراہ کے ساتھ، ایک ایسی آہ کے ساتھ جو کبھی اس کے دل سے نہ نکلی تھی۔ جیوپیٹر کے مطربوں اور مغنیوں کے ساز میں نغمہ دوڑنے لگتا ہے لیکن اسدرجہ جگر خراش و دلدوز کہ اولمپس کی فضا میں اس سے قبل کبھی نہ گونجا تھا، جیوپیٹر بیدار ہوتا ہے لیکن ایسی شدید افسردگی لئے ہوئے جو کبھی اس سے قبل اس پر طاری نہ ہوئی تھی۔ دیویاں جب شاعر کی تلاش میں پھر صحرا کی طرف جاتی ہیں تو اس کو پتھر پر سر رکھے ہوئے اطمینان کی نیند میں مصروف پاتی ہیں اس حال میں کہ اس کا کلیجہ شق نظر آتا ہے اور دل سینہ سے باہر۔

نیاز فتحپوری

دکن کے آثار قدیمہ

یادگیر

ضلع گلبرگہ کا ایک تعلقہ جی - آئی - پی - ریلوے کا اسٹیشن ہے، خطوط ۱۶ - ۴۶ شمالی اور ۷۷ - ۹ شرقی پر واقع ہے اس کے قریب سے رود بھیما بہتی ہے، اس کے نام کے متعلق کئی روایتیں مشہور ہیں مگر یہ روایت قرین قیاس ہے کہ یہاں کا قلعہ دور سے بیٹھے ہوئے بیل کیطرح نظر آتا ہے، زبان کنٹری میں بیل کو "تیو" کہتے ہیں اسی مناسبت سے اس کا نام "تیوگیری" مشہور ہوگیا، جو کثرتِ استعمال سے یادگیری بن گیا، چنانچہ اب بھی ریلوے اسٹیشن پر یادگیری ہی لکھا ہے اور تصباتی لوگ بھی یہی کہتے ہیں، یہاں کا قلعہ بہت مشہور ہے یہ قلعہ تسلط شاہان بہمنیہ سے پہلے کا تعمیر شدہ ہے، فیروز شاہ بہمنی نے اسے "فیروز گڑھ" کے نام سے مشہور کرنا چاہا مگر شہرت نہوی، سلطنت بہمنیہ کے ٹوٹنے کے بعد جب یہ قلعہ شاہان عادلشاہیہ کے تسلط میں آیا تو ابراہیم عادلشاہ نے ۹۵۳ھ ۱۵۴۶ء میں ترمیم کرائی اور ایک کتبہ نصب کرایا، کتبہ،

"اللہ ولی التوفیق در ایام خلافت ابراہیم عادل شاہ بکلر کردگی مرزا نجابت علی بیگ تاریخ غرۂ

رجب المرجب سنہ ثلثہ وخمسین وتسعمائتہ"

جسوقت یہ قلعہ سلطنت آصفیہ کے قبضہ میں آیا تو ۱۲۰۰ھ میں نواب میر نظام علی خان بہادر غفرانمآب نے اپنی تشریف آوری کی یادگار میں ایک برج "نظام برج" کے نام سے تعمیر کرایا، ۱۲۶۳ف میں جب کہ قلعہ عبود بن عبداللہ جمعدار کی نگرانی میں تھا عربوں اور رہیلوں کی جنگ ہوئی، اور بڑی خونریزی کے بعد روہیلوں نے قبضہ کرلیا، اس کے چند سال بعد قلعہ علاقۂ دیوانی میں دیدیا گیا اور اب تک ہے، یہ قلعہ نہایت ہی عمدہ حالت میں ہے اندرونی فصیل بعض جگہ منہدم ہوگئی ہے، کسی جگہ کوئی دروازہ نہیں ہے، نیچے سے اوپر تک سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ اندرون قلعہ ستیا پھل کے خودرو درخت اس کثرت سے ہیں کہ ثمرہ سالانہ (۵) پر نیلام ہوتا ہے، نصف سیڑھیاں طے کرنے کے بعد ایک عاشور خانہ ملتا ہے جس کی چند دیواریں باقی رہگئی ہیں، اس کے آگے ایک مسجد ہے جو اچھی حالت میں ہے جس کے قریب ہی محلات کے کھنڈر ہیں بالا حصار پر دو آہنی توپیں رکھی ہوئی ہیں ایک پر

۱۱۹۲ھ محمد قاسم

کندہ ہے، ان کے علاوہ اور بھی چند چھوٹی چھوٹی توپیں رکھی ہوئی ہیں، نچلے حصے میں قلعہ داروں کے مکانات وغیرہ ہیں جو منہدم ہوگئے ہیں اوپر ایک بڑا اور چند چھوٹے چشمے ہیں جن میں ہمیشہ پانی رہا کرتا ہے، قلعہ سے متصل آبادی میں سید یعقوب شاہ بخاری اور شاہ جیون صاحب کے مزار ہیں،

اسٹیشن کے قریب مسافر بنگلہ ہے جس میں سیاح وغیرہ بہ آرام ٹھہر سکتے ہیں۔

شاہ پور

یہ تعلقہ ضلع گلبرگہ کی ایک تحصیل اور اسٹیشن یادگیر سے ۲۴ میل کے فاصلہ پر ہے، مسافر بنگلہ وغیرہ موجود ہے، ۹۷۵ھ میں علی عادلشاہ نے اس قصبہ کو آباد کیا اور شاہ پور نام رکھا، اس کے بیشتر راجگانِ کرناٹک کے قبضہ میں تھا اور گنگ درگ اور پانی درگ کہلاتا تھا، ۹۷۸ھ میں کشور خاں نے قلعہ کی ترمیم کی اور نصرت آباد نام رکھا اور ایک محلہ عادل پور کے نام سے آباد کر کے شاہ پور کی آبادی کو وسعت دی یہ محلہ اب "پُرانی پیٹ" کہلاتا ہے، افضل خان وزیر نے ۱۰۲۳ھ میں ایک محلہ افضل پیٹ نامی آباد کیا اور مسجد بنوائی ۱۰۳۷ھ میں دولت خاں نے خواص پورہ آباد کیا، یہاں پر دو قلعہ ہیں جو چھوٹے قلعہ اور بڑے قلعہ کے نام سے مشہور ہیں چھوٹا قلعہ پہاڑ پر ہے اور بڑا قلعہ اس کے مشرق میں واقع ہے ان دونوں قلعوں کی تعمیر کا صرفہ ایک کروڑ پینسٹھ لاکھ چوراسی ہزار پانسو پچاس روپیہ بیاں کئے جاتے ہیں، ۱۱۱۱ھ ۱۶۹۹ء کو قلعہ شاہ پور عالمگیر کے قبضہ میں آیا۔ ۱۱۰۲ھ میں ذنکٹا نایک راجۂ شوراپور نے قلعہ پر قبضہ کر لیا مگر پھر ۱۳۱۰ھ میں سکندر جاہ بہادر کے حوالہ کر دیا،

قلعۂ شاہ پور عدم نگرانی کی وجہ سے بہت خراب ہوگیا ہے نصیل اکثر جگہ سے ٹوٹ گئی ہے، قلعہ پہاڑ پر واقع ہے اور چڑھائی کسیقدر دشوار گزار ہے قلعہ پر شلونت اپا کا دیول اور اس کے قریب ہی سید سالار مسعود کی درگاہ ہے اس کے متصل میر شمس الدین کا مزار ہے، جسکے قریب ایک پختہ مسجد ہے، اس کے آگے قلعہ پر ایک چھوٹی سی ایک خانہ کی مسجد ہے جو نہایت ہی مستحکم اور عمدہ ہے اس کے پاس ایک شش دری مکان ہے جو قلعہ داروں کے تصرف میں رہا کرتا تھا مگر اب بالکل بیکار ہے، اس کی تعمیر میں سنگِ سیلو استعمال کیا گیا ہے اس کے متصل چند اور مکانات اور کوٹھاجات شکستہ ہیں، قلعہ پر مختلف وضع اور قد و قامت کی سولہ سترہ توپیں چڑھی ہوئی ہیں، قلعہ کی پشت پر ایک تالاب ہے جس میں سرخ کنول پایا جاتا ہے، شائد اسی لئے اس کو کنول تالاب کہتے ہیں، محمد برج پر ایک کتبہ سنگ سیلو کا نصب ہے، اس کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۰۷۷ھ ۱۶۶۶ء میں برج تعمیر ہوا۔ کتبہ

توفیقِ خدا در نصرت آباد — محمدؐ برج را کردند بنیاد
بدورشہ علی سلطان عادل — اتا محمدؐ کنا یب بود فاضل
تاریخش سبع سبعین الف بود — مرتب برج شد در وقتِ مسعود

قلعہ کی مشرقی دیوار پر ایک کتبہ نصب ہے جس سے پایا جاتا ہے کہ میر تاج الدین نے بعہد علی عادل شاہ ۹۷۵ھ ۱۵۶۷ء شکستہ قلعہ دیودرگ[1] کو تعمیر کرایا۔ مگر لطف یہ ہے کہ اس قلعہ کا نام صرف گنگ درگ اور پانی درگ ہونا پایا جاتا ہے دیودرگ کے متعلق اب تک کوئی بات

[1] دیودرگ ضلع رائچور دکن کا ایک قصبہ ہے۔

معلوم نہ ہوسکی۔ کتبہ،

نصر من اللہ و نادعلی صغیر و اسائی دوازدہ امام رضی اللہ عنہ

اساس دیو درگ را اے مسلماں   ز من بشنو کہ ما گویم ز بنیاد

خراب افتادہ بد دہلیز بیر و نیش   بکر دی قرنہا مردم ازاں یاد

زمانِ شاہ عادل چون در آمد   شد آں دہلیز آباد از سر داو

پئے آبادیش کردید تاریخ ؟   بدر میر تاج الدین بد آباد

گوگی

یہ قصبہ شاہ پور سے ۸ میل کے فاصلہ پر واقع ہے، اسکی تاریخ کا صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ سلطان محمد شاہ بہمنی نے یوسف عادلشاہ کو ۸۹۵ھ ۱۴۸۹ء میں من جملہ اور مواضعات کے گوگی بھی جاگیر دی، یہی وجہ تھی کہ شاہان عادلشاہیہ نے یہیں سپرد خاک ہونا پسند کیا اور ابراہیم عادلشاہ تک سلاطین عادلشاہیہ یہیں مدفون ہیں، گوگی دو حصوں پر منقسم ہے پُرانی گوگی اور نئی گوگی نئی گوگی سلاطین عادلشاہیہ نے آباد کی، پرانی گوگی میں شاہان عادلشاہیہ کے مزار ہیں۔

دروازہ } نئی گوگی کا یہ ایک عظیم الشان دروازہ ہے، اس کے سامنے اربعہ مسجد واقع ہے گو دروازہ اب گر گیا ہے مگر اب بھی اپنی گزشتہ عظمت و رفعت کا گواہ ہے، اس کا کتبہ ٹوٹا ہوا مسجد میں پڑا ہے یہ کتبہ کسی قلعہ کا ہے جس کے برج میں اور حصار کی تعمیر کے وقت نصب کیا گیا تھا مگر معلوم نہیں اس دروازے میں کیوں لگا دیا گیا کتبہ ۷۸۸ھ ۱۳۸۶ء کا ہے اس کتبے سے بعض نئے نئے شکوک پیدا ہوتے ہیں ماہرین فن تاریخ و آثار قدیمہ کے لئے نئی چیز ہے، کتبہ،

۱ حمد حصین و شکر متین مر خدا یرا کہ در عہد بادشاہ آفتاب آثار ماہ انوار و زحل اقتدار عطارد شعار قطب فلک لک بنوالہ بتوفیق بناء حصار خطہ استاد آباد کہ کوکبۂ کنگرۂ بلند او با برج فلک ،،

۲ ہم پہلوست و برج با ثبات او با سیارات گردون ہم باز و مثل کو ہیست کہ تیغ خرشید کمر گرد ونش دروازۂ او مفتاح ابواب جناں بارہ کہ در باب بانی او معمار ،،

۳ تلکہ دیں و ایمان فرمود من بنی حصناً للہ سلام بنے اللہ قصراً ۔۔۔۔ لبا وجعل لہ الکرام موالیا گردانید بتاریخ العزۃ

۴ من ذی الحجہ سنہ ثمان و ثلاثین و سبعماتیہ بکار فرمائی ما ۔۔۔۔۔۔ خطۂ مذکور مدت اعمار با عمارت شد،،

لفظ استاد آباد نے عجیب خلش پیدا کر دی ہے

صغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کا عطر بہت مشہور ہے

اربعہ مسجد } گوگی کے دروازے کے سامنے یہ مسجد واقع ہے یہ مجموعہ ہے چار مساجد کا دو مسجدیں نیچے اور دو اوپر چھت پر واقع ہیں چھت گر گئی ہے تین مسجدیں اچھی حالت میں ہیں یہ مساجد شاہان عادلشاہیہ کی بنوائی ہوئی ہیں ۔

کالی مسجد } یہ علی عادلشاہ کی بہن فاطمہ سلطان کی بنائی ہوئی مسجد گوگی قدیم میں واقع ہے ، نہایت ہی مستحکم اور عمدہ عمارت ہے ، چوکھٹ سنگ سیاہ میں ترشی ہوئی اور نہایت ہی عمدہ گل کاری کی ہوئی ہے ، ناصیۂ دروازہ پر کتبۂ ذیل کندہ ہے ، کتبہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نصر من اللہ وفتح قریب وبشر المومنین فاللہ خیر حافظا وھو ارحم الرحمین ‘‘

مسجد کا چبوترہ (۸۶۸) فٹ مربع ہے اس کے تین در اور پتھر کا تراشا ہوا چھجہ ہے بیچ میں مینا کاری تھی جو اب جھڑ گئی ہے ، محراب کے اوپر کا حصہ گنبدی ہے اور اس میں بہترین روشن دان ہیں یہ نمایاں اور عمدہ خصوصیت ہے ، مینار سنگ خارا کے ہیں اور عمدہ طریقہ پر صاف کئے ہوئے ہیں صحن کی دیوار پر اقلیدسی اصول کی بڑی بڑی محراب ہیں جن میں جالی کا کام کیا گیا ہے ،

درگاہ چندا حسینی } کالی مسجد کے پیچھے سید شاہ جلال الدین عرف چندا حسینی کی چوکنڈی ہے یہ چوکھنڈی ایک بلند چبوترے پر واقع ہے اور مسقف ہے اندر حضرت چندا حسینی اور ان کی بیوی مخدوم جہاں اور صاحبزادے سید نور عالم مدفون ہیں چوکھنڈی کے سامنے ایک چبوترے پر سید صاحب کے والد اور چچا کے مزار ہیں ، سید صاحب کا وصال [illegible] میں ہوا ، چوکھنڈی کے جنوب میں ایک حجرہ ہے جس کے دروازہ پر عبارت ذیل کندہ ہے ، المحررہ ۱۱۴۲ھ ۔

حجرہ دنیا بلفظ سجن زاں شد متصف

تا بدان معنی حبیب اللہ گردد معتکف

شاید اس حجرے میں سید حبیب اللہ حسینی چلہ کشی کیا کرتے تھے ،

مزار سلاطین عادلشاہیہ } چندہ حسینی کی درگاہ کے مغربی جانب (۳۶) فٹ ہٹ کر دو دالانوں میں مسلسل پانچ مزار بنے ہوئے ہیں پہلا مزار یوسف عادلشاہ (المتوفی ۹۲۵ھ ۱۵۱۹ء) کا دوسرا سلطان یوسف کی بیوی کا تیسرا اسمٰعیل عادلشاہ (المتوفی ۹۳۱ھ ۱۵۲۴ء) کا چوتھا ابراہیم عادل شاہ (المتوفی ۹۶۵ھ ۱۵۵۸ء) کا اور پانچواں ابراہیم عادلشاہ کی بیوی کا ہے ، دالان کے اندر چار مزار ہیں جنہیں ملو عادلشاہ (المتوفی ۹۳۱ھ ۱۵۲۴ء) کا ہے دالان بری حالت میں ہے اور مزار بھی کس مپرسی کے عالم میں ہیں ۔

گنبد فاطمہ سلطان } انہیں مزارات کے مغرب میں مسجد کے جنوبی طرف علی دلشاہ کی بہن فاطمہ سلطان کا گنبد ہے ، گنبد کے بیچ میں فاطمہ سلطان کا مزار ہے اور پہلو میں ایک بچے کی قبر ہے ۔ یہ گنبد بھی مرمت طلب ہے ۔

مغربی دروازہ ؛ چندا حسینی کے احاطہ کے مغربی دروازے پر ذیل کا کتبہ نصب ہے ، کتبہ ،

الٰہی عاقبت محمود گرداں　　　بلائے ناگہانی دور گرداں

کہ بیشک بیابی تو رحمت خدا … تصور نما قدرت قل الہ

بدر شاہ ابراہیم عادل شاہ … کہ ابن شاہ علی عادل شاہ

بامر الہٰی چو راضی شوی … کہ بیشک و شبہ بجنت روی

بسنگ دروازہ رضا … زماں شاہ عادل سلاطیں پناہ

عمرت دراز باد چندانکہ بی نہایت … دولت ہمیشہ باشد دشمن بزیر رایت

بناکرد شیخ خاں متولی درحال … الہجریہ دہ صد و ہفت سال

کسے کہ نکردہ است این کردہ تمام … بجز نیک نامی نماند مدام

یہ کتبہ بھی بڑا دلچسپ ہے، تاریخ تعمیر کتبہ سے سنہ ۹۹۸ھ/۱۵۹۰ء ظاہر مگر لطف یہ ہے کہ ابراہیم عادل شاہ کا انتقال سنہ ۹۶۵ھ/۱۵۵۷ء میں ہوا کتبہ کو ابراہیم سے کوئی مناسبت ہی نہیں زبان اور وزن کے لحاظ سے یہی کتبہ اپنی نظیر آپ ہی ہے،

خاص باغ ابراہیم عادل شاہ کے زمانہ کا ایک باغ بھی یہاں تھا جو اب بالکل ویران ہے البتہ دروازہ پر ایک کتبہ نصب ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۹۵۵ھ/۱۵۵۰ء میں میر تاج الدین سرخیل حرم کے اہتمام سے اس کی تعمیر ہوئی ہے

مزار قاضی محمود بحری نئی گوگی میں قاضی شاہ محمود بحری کا مزار ہے، آپ یہیں کے متوطن تھے عہد عالمگیری میں شاید خدمت قضا پر مامور تھے، اور خدا رسیدہ مشہور تھے، دکھنی زبان میں آپ کی مثنوی (من لگن) بہت مشہور ہے ایک اور تصنیف عروس عرفاں جو تصوف میں ہے آپ کے اخلاف کے پاس محفوظ ہے من لگن کا ایک باصرہ نواز قلمی نسخہ بھی ہے۔ آپ کا انتقال ۱۰ شوال سنہ ۱۱۳۰ھ/۱۷۱۷ء کو ہوا اور ایک کھلی (غیر مسقف) چوکھنڈی میں آسودہ ہیں،

مزار شاہ منجن قاضی محمود کی مزار کے قریب شیخ محمد شمس الدین باقر اللہ قادری مجذوب عرف شاہ منجن کا مزار ہے آپ قاضی محمود کے مرشد تھے، قاضی جی نے آپ کی تاریخ وفات کہی ہے اور "محمد باقر آں دریائے وحدت" میں تاریخ نکالی ہے، (۱۰۹۸ھ)

مزار شاہ مجنون شمالی راستہ پر مسجد کے سامنے شاہ مجنوں قادری کا مزار ہے — آپ مجذوب تھے سنہ ۱۰۰۹ھ/۱۶۰۰ء میں بیجاپور سے گوگی آئے اور ۱۰ ربیع الاول سنہ ۱۰۶۱ھ/۱۶۵۰ء کو وصال ہوا قاضی محمود نے "دو آں سکۂ عشق شاہ مجنون" تاریخ وفات کہی۔

عیدگاہ ایک عیدگاہ سلاطین عادلشاہیہ کی بنائی ہوئی موجود ہے جس میں اب تک نماز ہوتی ہے کوئی عمارتی دلچسپی نہیں، اب تو بہت خستہ حالت میں ہے۔

"ساگر"

قدیم تاریخوں میں اس کو ساغر اور ساگر لکھا ہے، تعلقہ شاہ پور کا ایک قصبہ ہے اور گوگی سے آٹھ میل، شاہ پور سے چھ میل کے فاصلہ پر ہے

کارخانۂ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کا بہت مشہور ہے

مزار صوفی سرمست } آبادی کے باہر شیخ محمد محمود صوفی سرمست کا مزار ہے آپ خواجہ نظام الدین اولیا کے خلیفہ تھے اور غیاث پور (متصل دہلی) کے باشندے ۱۱۹۳ء کو تولد اور ۱۲۸۱ء کو فوت ہوئے، ۶۵۵ھ کو سگر آئے، آپ کی مزار کے برابر ایک چبوترے پر آپکی صاحبزادی محبوب بی بی عرف ترکش سلطانہ کا مزار ہے

مزار شرزہ خان } صوفی صاحب کی مزار کے جنوب مشرق میں ایک چبوترے پر دو مزار سنگین بنی ہوئی ہیں ایک مزار پر باسم مسنا محمد شرزہ خاں - اور دوسری مزار پر "سر فاطمہ شرزہ خاں کندہ" ہے غالباً یہ قبور الیاس شرزہ خاں ملازم علی عادلشاہ کی ہیں -

مسجد عادل خان } یہ مسجد ۱۵۲۳ء میں اسمٰعیل عادل شاہ کے زمانہ میں عادلخان وزیر نے بنوائی تھی، مسجد وسیع اور عمدہ ہے ۱۸۹۹ء میں راجگان شوراپور نے مسجد کا صدر دروازہ اکھاڑ لیا، اس مسجد کا کتبہ کسی نے تاج الدین منور کی درگاہ کے پاس پھینک دیا ہے،

درزمان عدل عادل خان وزیر پر خرد	ساختہ این مسجد جامع بتوفیق خدا
تابماند نام خیراز دائی و منور خان	این بنا کردند بهر طاعت فرد صمد
طالع وقتش طلب می کرد مهدی از حساب	سال تاریخش برآمد جامع خیر ابد

مزار آنکس خان } مسجد کے مغرب میں سید خوند میر آنکس خان[۱] کا مزار ہے جو بیجاپور کے مشہور امیر تھے،

درگاہ قتال حسینی } فیروزہ دروازہ کے پاس سید قتال حسینی کی درگاہ ہے اسی درگاہ کے چبوترے پر گچ کے مزار کے سرہانے ایک سنگ سیاہ کا کتبہ لگا ہوا ہے جس کی وضع مدور ستون کی سی ہے کتبہ کی عبارت بالکل محو ہوگئی ہے صرف (۴۰۹) انگریزی میں لکھا ہوا ہے جو پڑھا جاتا ہے -

فیروز دروازہ } صوفی صاحب کی مزار سے ڈیڑھ کوس کے فاصلہ پر فیروز شاہ بہمنی کا بنایا ہوا دروازہ ہے جس پر دو کتبے نصب ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوتوال شہر نے ۱۴۱۱ء میں شاہ دروازہ کے نام سے تعمیر کرایا - کتبہ (۱)

فضل خدائے پاک کسے را کہ رہبر است	فتح فتوح نصرت از بخشش مختصر است
ہر صبح و شام خلق بسے ہست در دعا	ہر سال نام شاہ جہاں شاہ دار دراست
در عہد بادشاہ جہانگیر دادگر	فیروز شاہ عالم و پاک و مظفر است
دروازہ طاق طاق درو در جہان لطیف	فردوس ثانی ہست کہ شانش نہ درخور است
بانی این عمارت دروازہ کوتوال	اعنی فہیم عہد شہنشاہ داور است
از ہجرت بمیر ہشتصد و دہ بر ان ۸۱۰ھ	گشتہ تمام زاں کہ دریں دہر کمتر است

[۱] یہ خوند میر آنکس خان وہ نہیں ہیں جو دولت آباد میں مدفون ہیں -

عمرش دراز بخش خدایا چو عمر نوح ایں شاہ راکہ شاہ جہاں بخت یاور است

کتبہ (۲)

بفرمان شہ فیروز اعظم کہ ہست او شاہ شاہان معظم
زہی فیروز مثل ظل فیروز رسیدش خدمت اطراف عالم
بنا شد شاہ دروازہ زہی طاق کہ از دے طاق کسریٰ گشت برہم
ہم فتح سلطانی بنا کرد کہ ہست او کوتوال شہر اعظم
کہ سال ہشتصد دہ بود تاریخ شدہ اتمام در ماہ محرم
ندیم خستہ عین غیر مسکین پسند ما بخواند خلق عالم
الہا این شہر معمور داری ۸۱۰ھ زمادر تاکہ زاید نسل آدم

مسجد جدید } دراصل یہ قدیم مسجد ہے ایک عرصہ تک عاشورخانہ بنی رہی جب دوبارہ مسجد کا کام لیا جانے لگا تو ہندوؤں کو اعتراض ہوا اور ایک مختصر سی جھڑپ ہندو مسلمانوں میں ہوگئی جس کی تحقیقات یہی ہوئی ہے ۔ یہ چھوٹی سی مسجد ہے محراب کے اوپر ایک کتبہ سنگ سیاہ کا نصب ہے ۔

"اللہ اکبر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ علی ولی اللہ حقاً حقاً کتبہ ہدی"

اسی مسجد کے محاذی ایک چبوترے پر شہر نصرت آباد (شاہ پور) کی تعمیر کا کتبہ نصب ہے جو غالباً کسی نے لاکر نصب کردیا ہے ۔

مزار منور بادشاہ } اسی چبوترے پر تاج الدین شیخ منور بادشاہ شہید کا مزار ہے جو صوفی سرمست کے صاحبزادے تھے اور ۱۳۰۰ھ میں شہید ہوئے ۔

سجادہ صاحب ۔ سگر کے مکان کی ایک دیوار پر ذیل کا کتبہ نصب ہے ۔

انا مدینۃ العلم و علی بابھا

محمد عربی کابروی ہر دو سراست کہ ہر کہ خاک درش نیست خاک بر سر او
شنیدہ ام کہ تکلم نمود ہمچو مسیح بدیں حدیث لب لعل روح پرور او
کہ من مدینۂ علمم علی درست مرا عجب خجستہ حدیثے ہست من سگ در او

باولی } حضرت صوفی سرمست کے مزار کے مشرق میں ایک ایک باولی ہے جس کی سیڑھیوں پر دو کتبے نصب ہیں، پہلے کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ فانجہاں (؟) نے ۹۲۹ھ میں انتقال کیا یا دفن ہوا کیونکہ مصرع آخر " درین روضہ شد .... " لکھ کر ختم کردیا ہے

دوسرے کتبے سے پایا جاتا ہے کہ رضی بن زید کا سنگ مزار ہے مگر معلوم نہیں کہ باولی میں کیوں لگا دیا گیا ہے۔ مسٹر سید علی اصغر بلگرامی ناظم آثار قدیمہ سرکار عالی کا خیال ہے کہ " پہلا کتبہ ظاہر کرتا ہے کہ خداوند خان کے حکم سے ۸۲۹ھ ۱۴۲۵ء میں ایک چشمہ اور روضہ بنوایا گیا اور کتبہ نمبر ۲ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان احمد شاہ بہمی کے عہد میں رضی بن زید عرف ملک قطب ملک شہید کسی روضہ میں دفن ہوئے "

" ملکھیر "

ین، جی، یس، ریلوے کا اسٹیشن حیدر آباد سے ۲۲۳ اور واڑی سے ۱۶ میل کے فاصلہ پر واقع ہے، اسٹیشن سے قلعہ اور آبادی تین میل کے فاصلہ پر ہے، یہ جاگیر ہے، یہ قدیم بستی بدھ مذہب کے راجاؤں کی آباد کردہ ہے، ابتداً اسے مظفر خاں روہیلے نے لوٹا مگر عادل شاہ نے چند ہی سال کے بعد اُس سے چھین لیا اور لوٹ میں جس قدر دولت آئی تھی اس سے قلعہ تیار کرا کر مظفر نگر عرف مال کھیڑا نام رکھا جو ملکھیڑ بن گیا ہنود کے مکانات وغیرہ دامن کوہ میں اَب بھی باقی ہیں جسے ملیا چل پربت کہتے ہیں، عالمگیر نے قلعۂ ملکھیڑ جاں نثار بیگ کو دیا تھا۔ جن کا خاندان اب تک قلعہ پر قابض ہے۔

گنا ندی کے کنارے جسے تیرتھ سوامی کا سمادھ ہے جو ہنود کے نزدیک بہت متبرک مانا جاتا ہے اس دیول کی جاترا وغیرہ کے لئے سرکار عالی سے یومیہ مقرر ہے،

اس قلعہ کی فصیل اور دروازے مستحکم اور محفوظ حالت میں ہیں قلعہ میں (۵۶) برج اور تین دروازے ہیں سب سے بڑا برج اوپری برج کہلاتا ہے، جس پر ایک کتبہ بھی ہے مگر حرف محو ہوگئے ہیں، متفرق برجوں پر دس تو پیں چڑھی ہوئی ہیں مغربی برج پر ایک ہنومان کا دیول ہے جو تعمیر قلعہ سے قبل کا بتلایا جاتا ہے، دروازۂ قلعہ کے پاس ایک اور اوپری برج پر ایک مسجد ہے قلعہ میں حضرت سید جعفر حسین کی درگاہ بھی ہے جو خواجہ بندہ نواز کے بھانجے مشہور ہیں، قلعہ ہی میں مکانات وغیرہ ہیں جو جاگیردار کے قبضہ میں ہیں۔ اوپری برج کے پاس ہی اکشوبے تیرتھ سوامی کا مٹھ ہے، بہرحال قلعہ کسیقدر اچھی حالت میں ہے،

" سیڑم "

ین، جی، یس، ریلوے کا اسٹیشن حیدر آباد سے ۹۲ میل اور جنکشن واڑی سے (۲۴) میل کے فاصلہ پر واقع ضلع گلبرگہ کا تعلقہ مستقر تحصیل اور ایک قدیم آبادی ہے وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک بزرگ یہاں مقیم تھے بادشاہ وقت نے انہیں جاگیر دینی چاہی آپ نے فرمایا " سیرام " چنانچہ یہی نام پڑ گیا مگر لوگوں نے الف اڑا کر " ر " کو " ڑ " سے بدل دیا، قصبہ کے چاروں طرف پختہ فصیل اور برج ہیں، امرائے سلطنت عادل شاہیہ کے چند محلات آبادی میں واقع تھے اور عام طور پر مشہور تھا کہ ان میں خزانہ

مدفون ہے، اسی حرص میں ایک ہنگری کے یہودی نے پندرہ ایک سال ہوئے کہ تمام مکانات کھود ڈالے مگر کچھ بھی نہ ملا البتہ اس محل میں ایک چور راستہ ہے جو ندی کے نیچے ہوتا ہوا دور تک چلا گیا ہے، فی الحال یہ راستہ عبور و مرور کے قابل نہیں ہے کیونکہ کوڑا کرکٹ سے پٹ گیا ہے یہاں پر بہ کثرت منادر ہیں جو زمین میں دب گئے ہیں جس جگہ کھودا جائے بڑے بڑے بت حجرہ وغیرہ نظر آتے ہیں۔ یہاں ایک دیول۔ "تنج لنگ" کے نام سے مشہور اور نہایت ہی عمدہ ہے ستوں بہترین نقش و نگار سے آراستہ ہیں اور سنگ سرخ کا بھی استعمال بھی کیا گیا ہے ایک دیول کو توڑ کر مسجد کے قالب میں تبدیل کیا گیا ہے اس کے سامنے ایک ستون سنگ سرخ کا ۲ ½ فٹ مربع اور (۲۵) فٹ طویل نصب ہے یہ گاؤ دم مخروطی شکل کا بنا ہوا ہے، اس قدر بڑا اور اتنی عمدہ تراش کا پتھر کسی اور جگہ نظر نہیں آیا اس کی تنصیب میں یہ لطف ہے کہ بیچ میں لوہے کی سلاخ دیکر جما دیا ہے اور اطراف کا حصہ کھلا ہے دستی یا رومال ڈال کر کھینچئے تو صاف پتہ چل جاتا ہے لوگ اس کو معلق خیال کرتے ہیں۔ بہر حال یہی ایک چیز قابل دید اور عمدہ ہے

ضلع گلبرگہ میں اور چھوٹے بڑے قصبات ایسے ہیں جن میں چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی کے منادر وغیرہ موجود ہیں مگر وہ قابل ذکر نہیں۔ انشاء اللہ اسی طرح ہر ایک ضلع اور صوبہ کی تفصیلی فہرست ترتیب دیکر "دکن کے آثار قدیمہ" ایک جگہ کر دئے جائیں گے۔

ماخذ

واقعات مملکت بیجاپور۔ جلد سوم۔ مولفہ مولوی بشیر الدین احمد تعلقہ دار وظیفہ یاب سرکار عالی

تاریخ بیجانگر .... " " " "

ضمیمہ رپورٹ ۱۳۳۴ف آثار قدیمہ مرتبہ مولوی سید علی اصغر بلگرامی،

تاریخ دکن۔ مولفہ مولوی عبدالجبار خان آصفی ملکاپوری مرحوم،

تاریخ دکن جلد سوم سلسلۂ آصفیہ مولفہ مولوی سید علی بلگرامی،

گزیٹر ضلع گلبرگہ۔ مرتبہ نواب　　بہادر اول تعلقدار وظیفہ یاب،

آثار سلف، (تفصیل عمارات گلبرگہ) " " " "

نیو امپیریل سیریز آف آرکیولاجیکل سروے آف انڈیا۔ مرتبہ مسٹر ہنری کزنس،

تمکین کاظمی گلبرگہ

انتقام

(افسانہ)

کینن ڈائل (Conon Doyle) خواہ اب روحانیت پرست ہو جائے یا تصوف پسند، لیکن دنیا نے اسے جس ذریعہ سے جانا، وہ اس کا وہی فرضی کیرکٹر شرلاک ہومز (Sherlock Holmes) ہے، جس کو عالم سے روشناس کر کے کینن ڈائل نے خود اپنی ہستی کو اس کے اندر گم کر دیا۔

ایک زمانہ تک لوگوں نے یہ بھی نہیں جانا کہ کینن ڈائل کیا بلا ہے اور اس کے افسانے محض شرلاک ہومز سے متعلق ہونے کی وجہ سے عالم میں مشہور ہو گئے۔ اس کو کہتے ہیں سیرت نگاری افسانہ اور یہ ہے وہ کامیابی جسے ہندوستان کا کوئی مصنف یا مولف شاید ابھی ایک صدی تک بھی حاصل نہیں کر سکتا۔

کوئی انگریزی جاننے والا انسان ایسا نہیں ہے جو شرلاک ہومز اور اس کی وجہ سے کینن ڈائل سے واقف نہ ہو اور اب چونکہ اس کے بعض افسانوں کا ترجمہ اردو میں بھی ہو چکا ہے اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ شاید ہندوستان کے بھی بعض افراد اس سے واقف ہو گئے ہوں گے۔ لیکن شاید یہ کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ اس کی مقبولیت کا اصل راز کیا ہے۔

ایسے افسانے جس میں کسی کا راز افشا ہو یا کسی نہایت ہی پیچیدہ جرم کا پتہ لگایا جائے یورپ میں کثرت سے لکھے گئے اور لکھے جا رہے ہیں۔ لیکن کینن ڈائل نے جو شہرت اس باب میں حاصل کی وہ کسی کو میسر نہ آئی اس کے دو سبب ہیں، ایک تو یہ کہ اس کا طرز بیاں حد درجہ دلچسپ طور پر سادہ ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ اس کے پلاٹ میں ایک بات بھی ایسی نہیں ہوتی جو آخیر میں جا کر عامۃ الورود واقعات کے تحت میں نہ آ سکے۔ وہ جب کسی راز کا افشا کرتا ہے تو اس کی بنیاد ایسے واقعات و حالات پر رکھتا ہے جن کا تعلق عام مطالعہ انسانی سے ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر واقعی ان اصول کو پیش نظر رکھا جائے تو ہر شخص شرلاک ہومز کی طرح بہترین جاسوس بن سکتا ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ کینن ڈائل کی کتنی کتابوں کا ترجمہ اردو میں ہو چکا ہے۔ لیکن یہ یقین ہے کہ ابھی بڑا حصہ اس کے افسانوں کا ترجمہ نہیں ہوا، اور اگر کوئی شخص استقلال کے ساتھ اس طرف

متوجہ ہو جائے تو یقیناً وہ نہ صرف ایک مفید کام کی طرف توجہ کرنے والا سمجھا جائیگا بلکہ مادی نفع بھی کافی حاصل کر سکے گا۔ کیونکہ صرف کینن ڈایل کا نام ہی پبلک کو اس طرف مائل کرنے کے لئے کافی ہے

یورپ کے اکثر جرائد و رسائل کینن ڈایل کے افسانے شائع کرتے رہتے ہیں۔ جو بعد کو کتابی صورت میں آکر لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوتے ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں کینن ڈائل کے آٹھ تازہ افسانوں کا مجموعہ ([illegible]) کے نام سے شائع ہوا ہے اور یہ افسانہ انھیں میں سے ایک کا اقتباس ہے۔ اقتباس اس لئے کہ ترجمہ کی مجھے فرصت نہیں ہے اور نہ اصولاً شاید اس کی ضرورت اگر اصل مصنف کے خیالات و طرز ادا کی خصوصیت محض اخذ مفہوم و اقتباس سے بھی قائم رہ سکے۔

نیاز فتحپوری

اگست کی جھلسا دینے والی گرمی شباب پر تھی۔ اور سر چھپائے ہوئے کمرے کے اندر بیٹھا ہوا اخبار دیکھ رہا تھا شرلاک ہومز ایک خط کے پڑھنے میں محو تھا، جو صبح کی ڈاک سے اُسے ملا تھا، اس لئے میں اخبار کو ایک طرف پھینک، ایک خاص خیال میں محو ہو گیا، یہاں تک کہ ہومز کی آواز نے میرے سلسلۂ تصور کو اس طرح توڑا :-

"واٹسن، تم صحت پر ہو، یقیناً کسی نزاع کے فیصلہ کرنے کا یہ طریقہ نہایت نادرست ہے۔ میں یہ سنکر چونک پڑا، اور بولا کہ "ہومز تم نے کیسے معلوم کیا کہ میں اسوقت یہ سوچ رہا تھا، مجھے حیرت ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ تم نے کسقدر صحیح اندازہ میری رفتار خیال کا کیا۔ اور وہی بات کہی جو اس وقت میرے دل میں تھی"

ہومز۔" میں نے تمھارے چہرے کی حالت اور خاصکر آنکھوں کے انداز سے تمھارے خیالات معلوم کئے۔ تم کو غالباً یاد نہ ہوگا کہ تمھارے تصور کی ابتدا کیونکر ہوئی۔ لیکن میں بتاتا ہوں۔ اخبار پھینک کر نصف منٹ تک تم بالکل خالی الذہن رہے اس کے بعد تمھاری نگاہ جنرل کارڈن کی اس تصویر پر پڑی جس کا چوکھٹا حال ہی میں لگا ہے۔ اور میں نے تمھارے چہرہ کے تغیر سے معلوم کیا کہ سلسلۂ خیالات شروع ہو گیا ہے۔ لیکن یہ سلسلۂ دور تک نہ پہنچا تھا، کہ تمھاری نگاہ ہنری وارڈ بیچر کی تصویر پڑی جو بغیر چوکھٹے کے کتابوں پر رکھی ہوئی ہے۔ اسکے بعد تمھاری نگاہ دیوار پر گئی اور تم نے خیال کیا کہ اگر اس تصویر میں بھی چوکھٹا لگ جاتا تو دیوار کی خالی جگہ پُر ہو جاتی۔ اور جنرل گارڈن کی تصویر کے محاذ میں اچھی معلوم ہوتی۔

اس کے بعد پھر تمھارا خیال بیچر کی طرف گیا، اور اس کی تصویر کو تم نے نہایت غور سے دیکھا گویا کہ تم اس کے خط و خال سے اس کی

سیرت کا اندازہ کر رہے تھے۔ اس کے بعد تمھاری آنکھ کا متجسانہ انداز اور ہوا اور تمھارے چہرے سے غور و خوص ٹپکنے لگا جس سے معلوم ہو کہ تم نیچر کے کارناموں پر غور کر رہے تھے۔ اور چونکہ ایک مرتبہ تم میرے سامنے یہ اظہار خیال کر چکے تھے کہ سول وار کے زمانہ میں فساد پسند لوگوں نے اس کے ساتھ کیسا بُرا سلوک کیا تھا۔ اس لئے میں سمجھ گیا کہ نیچر کے کارناموں کے سلسلے میں تمھارے خیال کا سول وار کی طرف منتقل ہونا ضروری ہے، اس لئے میں سمجھا کہ تم اس شجاعت کا خیال کر رہے ہو جو دونوں فریق کی طرف سے اس وقت ظاہر ہوئی تھی۔ اس کے بعد تمھارے چہرے پر اضمحلال طاری ہوا اور گردن میں خفیف سی جنبش پیدا ہوئی کیونکہ تم اس وقت بیکار جانوں کے ضائع ہونے پر متاسف تھے، اس کے بعد تمھارا ہات اس جگہ پہنچا جہاں تمھارے زخم لگا تھا، اور تمھارے لبوں پر تبسم پیدا ہوا، جس سے مجھے معلوم ہوا کہ اسوقت تم یہ سوچ رہے ہو کہ بین الاقوامی نزاع میں فیصلہ کا یہ طریقہ بھی کس قدر نادرست ہے اور یہ سمجھکر میں نے تم پر ظاہر بھی کر دیا اور تم چونک پڑے،،

میں نے یہ سنکر کہا کہ ،، جو کچھ تم نے بیان کیا حرف بہ حرف صحیح ہے اور باوجود اس کے کہ تم نے اپنے قیاس کے دلائل کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے لیکن میری حیرت بدستور قائم ہے۔

ہومز ،، خیر یہ تو نہایت معمولی بات تھی۔ لیکن اس وقت میں جس مسئلہ پر غور کر رہا تھا وہ نہایت عجیب و غریب ہے اور اس کا حل کرنا کسی کے خیالات معلوم کر لینے سے زیادہ دشوار ہے تم نے اخبار میں یہ خبر نہیں پڑھی کہ قصبہ کراڈن کی ایک خاتون جس کا نام مس کشنگ ہے ایک عجیب و غریب پارسل ملا ہے،،

،، نہیں میں نے تو یہ خبر نہیں پڑھی،،

ہومز نے اخبار لے کر میری طرف پھینکا اور کہا کہ مالیات کے کالم کے نیچے وہ خبر درج ہے، زور سے پڑھئے، میں پھر ایک بار اُسے سننا چاہتا ہوں۔

میں نے اخبار لے کر پڑھنا شروع کیا:۔

،، قصبۂ کراڈن کی ایک خاتون مس کشنگ کو کل سہ پہر کے وقت ایک پارسل ملا۔ جو زرد کاغذ میں لپٹا ہوا تھا۔ یہ پارسل کاغذ کے ایک بکس کا تھا، جس وقت بکس کھولا تو اس میں نمک بھرا ہوا نظر آیا جس کے اندر دو کان کسی انسان کے تھے جو تازہ کٹے ہوئے معلوم ہوتے تھے، یہ پارسل مقام بلفاسٹ سے پرسوں صبح کو روانہ کیا گیا تھا، اور بھیجنے والے کا نام اس پر درج نہ تھا، مس کشنگ پچاس سال عمر کی خاتون ہے اور نہایت خلوت کی زندگی بسر کر رہی ہے، نہ کسی سے اس سے خط و کتابت ہے اور نہ کسی سے ایسی ملاقات جو اُس کے پاس کبھی کوئی چیز روانہ کرے۔ چند سال ہوئے کہ وہ مقام پنگ میں رہتی تھی، اور اپنے مکان کے چند کمرے ڈاکٹری کے تین طالب علموں کو اُس نے کرایہ پر دئے تھے، لیکن چونکہ یہ طالب علم اچھے اطوار کے نہ تھے اس لئے مس کشنگ نے انھیں علٰحدہ کر دیا۔ غالباً یہ کارروائی

انہیں کی ہے، اور مس کشنگ کو پریشان کرنے کے لئے انھوں نے یہ مذاق کیا ہے اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ان میں سے ایک طالبعلم بلفاسٹ کا رہنے والا تھا۔

"اس معاملہ کی تفتیش مسٹر لسٹریڈ کر رہے ہیں جو خفیفہ پولیس کے نہایت ہی ہوشیار و کامیاب افسر ہیں"

ہومز:- یہ تو بیاں ہوا، ڈیلی کرانکل (اخبار) کا، لیکن اب وہ بھی سن لو جو مسٹر لسٹریڈ نے مجھے لکھا ہے آج صبح میرے پاس انکا خط آیا مجھ سے مخاطب ہو کر لکھا ہے کہ "یہ معاملہ زیادہ تر آپ ہی کے سلجھانے کا ہے۔ یوں تو ہمیں اُمید ہے کہ ہماری کوشش سے معاملہ واضح ہو جائے گا لیکن فی الحال سراغ میں دشواریاں ضرور ہیں، بلفاسٹ کے ڈاک خانہ کو تار دیا گیا تھا لیکن وہاں سے کچھ پتہ نہیں چلا کہ بھیجنے والا کون تھا، بکس نصف پونڈ کا ہے جس میں ڈیو تماکو آتی ہے۔ میرا بھی خیال ہے کہ یہ حرکت غالباً طالب علموں کی ہے، لیکن اگر آپ کو فرصت ہو تو مجھ سے ضرور مل لیجئے۔ میں یا تو گھر میں ملونگا یا تھانہ میں"

اب بتاؤ واٹسن کیا کہتے ہو، اگر گرمی زیادہ نہ ستائے تو آؤ تھوڑی دیر کے لئے میرے ساتھ کراڈن چلے چلو۔

چونکہ میں بالکل بیکار تھا، اس لئے تیار ہو گیا، اور جس وقت ہم لوگ کراڈن اسٹیشن پر پہنچے تو وہیں مسٹر لسٹریڈ بھی موجود تھے جنھیں ہومز نے تار کے ذریعہ سے وہاں جانے کی اطلاع دی تھی پانچ منٹ میں ہم لوگ کراس سٹریٹ میں پہنچ گئے۔ جہاں مس کشنگ کا مکان تھا۔

دروازہ پر دستک دی تو ایک خادمہ باہر آئی اور ہم لوگوں کو اندر لے گئی۔

مس کشنگ سامنے برآمدے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس نے لسٹریڈ کو دیکھتے ہی جھنجھلا کر کہا کہ وہ پارسل باہر کی کوٹھری میں رکھا ہے آپ تو خدا کے لئے اُسے یہاں سے لیجائیے۔

لسٹریڈ۔ میں اُسے لیجاؤں گا، لیکن چونکہ میں چاہتا تھا کہ میرے عزیز دوست مسٹر ہومز بھی آپ کے سامنے اس بکس کو دیکھ لیں اس لئے ابھی تک نہیں لے گیا تھا۔

——— "میرے سامنے کیوں؟"

——— "اس لئے کہ شاید اُنہیں آپ سے کچھ دریافت کرنے کی ضرورت ہو"

ہومز نے نہایت نرم لہجہ میں کہا کہ "اے محترم خاتون، یہ بالکل صحیح ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس تکلیف دہ معاملہ کی وجہ سے آپ کو بہت تکلیف اٹھانا پڑ رہی ہے،

"یقیناً مسٹر ہومز میں خلوت پسند عورت ہوں، اور یہ میرے لئے بالکل نئی بات ہے کہ میرا نام اخباروں میں آئے اور پولیس میرے گھر میں۔ میں تو پارسل کو گھر میں نہ آنے دونگی اگر آپ کو دیکھنا ہے تو وہیں باہر کی کوٹھری میں تشریف لے جائیے"

گھر کے پیچھے مختصر سے پائیں باغ میں ایک کوٹھری بنی ہوئی تھی۔ لسٹریڈ وہاں گیا اور ایک زرد رنگ کا بکس کاغذ کا لایا جو زرد کاغذ میں ملفوف تھا، اور اس پر ڈورا لپٹا ہوا تھا، یہیں ایک بنچ پر بیٹھکر ہومز نے اس بکس کو دیکھنا شروع کیا،

ہومز نے کچھ دیر تک دیکھنے اور سونگھنے کے بعد کہا کہ "ڈورا بہت عجیب ہے، مسٹر لسٹریڈ آپ کا کیا خیال ہے؟"

———"وہ تار کول سے رنگا ہوا ہے"

"بالکل ٹھیک، تم نے اس پر بھی غور کیا ہوگا کہ مس کشنگ نے اسے قینچی سے کاٹا ہے، کیونکہ جہاں یہ کاٹا گیا ہے، وہاں دونوں طرف بھچڑے نکلے ہوئے ہیں، یہ بھی قابل غور امر ہے"

———"اس میں تو شاید کوئی اہمیت نہیں ہے"

———"اس میں اہمیت اس وجہ سے پیدا ہوجاتی ہے کہ ڈورہ کی گرہ اپنے حال پر باقی ہے، جو خاص انداز کی ہے۔

———"بیشک گرہ بہت صفائی سے لگائی گئی ہے، میں اس پر غور کرچکا ہوں۔

ہومز نے مسکراتے ہوئے کہا کہ "ڈورے کے متعلق تو تحقیق ہوچکی۔ اب کاغذ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں سے قہوہ کی بو آرہی ہے۔ اس پر پتہ اس طرح لکھا ہے:۔ "مس کشنگ، کراس اسٹریٹ کراڈن" یہ غالباً موٹے نب جے (J) نب سے لکھا گیا ہے اور روشنائی بہت ادنیٰ قسم کی ہے، لفظ کراڈان کا املا بھی غلط لکھکر صحیح کیا گیا ہے، اور سوا دخط سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مرد کے ہات کا لکھا ہوا ہے۔ جس کی تعلیم معمولی ہے اور جو قصبہ کراڈن سے ناواقف ہے، بکس زرد ہے اور ہنی ڈیو تما کو کا ہے۔ اس میں سوا اس کے اور کوئی خاص بات نہیں کہ دو نشان انگلیوں نے بائیں طرف کے کونہ میں نیچے موجود ہیں۔ اس میں معمولی نمک بھرا ہوا ہے جو چمڑے وغیرہ بنانے کے کام میں آتا ہے اور نمک کے اندر یہ دو کان ہیں"

ہومز نے یہ کہتے ہوئے دونوں کان نکال لئے۔ اور اپنے گھٹنے پر ایک تختے کے اوپر انھیں رکھ لیا اور غور سے دیکھنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے یہ دونوں کان پھر بکس میں رکھدئے اور نہایت گہرے انہماک خیال میں مصروف ہوگیا۔ جب وہ غور کرکے کسی نتیجہ پر پہنچ گیا تو اس نے لسٹریڈ سے کہا کہ "تم نے غالباً یہ معلوم کرلیا ہوگا کہ یہ دونوں کان ایک آدمی کے نہیں ہیں"

———"ہاں میں اس امر پر غور کرچکا ہوں۔ لیکن اگر واقعی یہ انہیں طالب علموں کا مذاق ہے تو ان کے لئے دشوار نہ تھا کہ وہ لاشیں مطالعہ کرکے کمرے سے دو مختلف آدمیوں کے ایک ایک کان کاٹ کر بھیجدیتے"

ہومز "یہ صحیح ہے لیکن میرے نزدیک یہ طالب علموں کا مذاق نہیں ہے۔ کیونکہ دوسرے حالات سے اس کی تصدیق نہیں ہے لاش جسوقت مطالعہ کے کمرے میں آتی ہے تو پہلے اس میں پچکاری کے ذریعہ سے ایک خاص سیال شے پہونچائی جاتی ہے تاکہ جسم سڑنے سے محفوظ رہے اور ان دونوں کانوں میں اس چیز کا پتہ نہیں ہے علاوہ اس کے یہ امر بھی قابل غور ہے کہ یہ دونوں کان بالکل

تازہ کٹے ہوئے ہیں، اور کسی کند آلہ سے کاٹے گئے ہیں، اگر ڈاکٹری کا کوئی طالب علم کاٹتا تو وہ یقیناً تیز چھری استعمال کرتا۔ اور کاربولک یا اسپرٹ میں محفوظ کر کے بھیجتا نہ کہ معمولی نمک میں۔ اس لئے میری رائے تو صاف صاف یہی ہے کہ یہ معاملہ مذاق کا نہیں ہے بلکہ اس سے کوئی نہایت ہی سنگین جرم متعلق ہے"

اس وقت ہومز کے چہرہ سے حد درجہ سنجیدگی اور غور و تامل کی کیفیت پیدا تھی اور میں بھی سوچ رہا تھا کہ اگر اس سے واقعی جرم وابستہ ہے تو حد درجہ بیرحمی ظاہر کرنے والا ہے،

مسٹر لیسٹریڈ نے ہومز کی یہ رائے سن کر اس طرح جنبش دی گویا اسے پورا یقین نہیں ہے اور بولا۔ "اس میں شک نہیں کہ اس کو مذاق سمجھنے کے خلاف کچھ دلائل موجود ہیں، لیکن اس کو جرم قرار دینے کے خلاف اور زیادہ قوی دلائل ہیں، یہ عورت پنگ میں تھی اور یہاں بیس سال سے نہایت گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہی ہے اور اس دوران میں وہ ایک دن کے لئے بھی کہیں باہر نہیں گئی اسلئے کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ایک مجرم کیوں اپنے ثبوت جرم کو اس کے پاس روانہ کرتا"

"ہومز نے جواب دیا کہ" ہاں یہی وہ معمہ ہے جس کا حل ہونا ضروری ہے۔ بہرحال میں تو اس معاملہ کی تحقیق یہی سمجھکر کروں گا کہ یہ کوئی سنگین جرم ہے، جسمیں دو آدمیوں کو قتل کیا گیا ہے، کیونکہ ان میں سے ایک کان عورت کا ہے جو چھوٹا ہے، نازک ہے، اور آویزے کے لئے اس کی لَو چھدی ہوئی ہے، دوسرا کان مرد کا ہے جو موٹا بھدا اور بادرنگ ہے۔ اور وہ بھی چھدا ہوا ہے۔ یہ دونوں آدمی اسوقت تک مر چکے ہیں۔ آج جمعہ ہے۔ جمعرات کی صبح کو پارسل روانہ کیا گیا، اس لئے جرم منگل یا بدھ کو وقوع میں آیا ہوگا۔ اچھا اب یہ دیکھنا چاہئے کہ اگر یہ واقعہ قتل کا ہے تو کان کا بھیجنے والا کون ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ سوائے قاتل کے کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ لیکن مس کشنگ کے پاس بھیجنے کا کیا سبب ہو سکتا ہے۔ اگر اس سے مراد اس کو اس امر کی اطلاع دینا تھی کہ قتل کی کارروائی ہوگی یا صرف اسکو تکلیف پہنچانا مقصود تھا تو مس کشنگ کو اس شخص کا علم ہونا چاہئے۔ لیکن غالباً اس کو علم نہیں ہے۔ کیونکہ اس صورت میں وہ پولیس کو کیوں اطلاع دیتی۔ انہیں دفن کر کے خاموش ہو جاتی۔ اور اگر وہ کوئی دشمن ہوتا تو اس کا نام بتاتی۔ بہرحال گتھی اس جگہ آکر پڑتی ہے جسکے سلجھانے کے لئے مجھے مس کشنگ سے گفتگو کرنا ضروری ہے۔

لسٹریڈ نے یہ سن کر کہا کہ" میں تو جاتا ہوں کیونکہ اور ضروری کام ہیں آپ یہاں رہکر دریافت کیجئے اگر میری ضرورت ہو تو میں تھانہ میں ملوں گا"

ہم لوگ جب اندر پہونچے تو مس کشنگ نے کہا کہ "مجھے یقین ہے کہ یہ پارسل غلطی سے میرے نام آیا کیونکہ دنیا میں کوئی شخص میرا دشمن نہیں ہے۔ جو میرے ساتھ یہ سلوک کرے۔

ہومز جو اس کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا بولا "میرا بھی یہی خیال ہے اور غالباً ...."

وہ اتنا کہکر رک گیا اور میں یہ معلوم کرکے بہت متعجب ہوا کہ وہ اس عورت کے ناک نقشہ کی طرف نہایت غور سے دیکھ رہا تھا جب اس عورت نے اس کے دفعتہً خاموش ہوجانے کی وجہ سے اس کو دیکھا تو اُس نے فوراً ہی اپنی نگاہیں نیچی کرلیں - اور بولا" میں دو چار سوالات دریافت کرنا چاہتا ہوں"

"میں تو سوالات سے گھبرا گئی ہوں - لیکن پوچھئے آپ جو کچھ دریافت کرنا چاہتے ہیں -

ہومز"آپ کے دو بہنیں اور بھی ہیں - یا نہیں ؟"

"یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا ؟"

"یہ تو میں نے پہلے ہی مرتبہ گھر میں داخل ہوتے ہی جان لیا تھا - کیونکہ وہاں جو تصویر آویزاں ہے اس میں تین خاتونیں نظر آتی ہیں جن میں سے ایک آپ ہیں اور ایک دو کا بھی نقشہ آپ سے بہت مشابہ ہے اس لئے میں نے خیال کیا کہ وہ دونوں آپ کی بہنیں ہونگی"

"بیشک صحیح ہے، وہ دونوں میری بہنوں کی تصویریں ہیں - ایک کا نام سارہ ہے اور دوسری کا میری ہے"

اور یہ مجھ سے قریب ہی ایک اور تصویر آپ کی چھوٹی بہن کی ہے، جو لور پول میں کھنچوائی گئی ہے اور جو آدمی اس کے ساتھ ہے وہ غالباً بحری ملازم ہے کیونکہ اس کے لباس سے ایسا معلوم ہوتا ہے - اس وقت تک آپ کی اس بہن کی شاید شادی نہ ہوئی تھی"

"آپ نہایت ذہین قیاس کے آدمی ہیں، بیشک آپ کا یہ خیال صحیح ہے لیکن جب یہ تصویر لی گئی تھی اس کے چند دنوں بعد ہی اس کی شادی اس شخص سے ہوگئی جس کا نام مسٹر براونر ہے - وہ اس وقت جنوبی امریکہ کے جہاز ران کمپنی میں ملازم تھا، لیکن چونکہ وہ اپنی بیوی سے اس درجہ مالوف تھا کہ اسے چھوڑ نہ سکتا تھا اس لئے اس نے لندن اور لور پول کے درمیان جہاز لیجانے والا کمپنی کی ملازمت کرلی"

"کیا جس جہاز میں وہ ملازم تھا اس کا نام کانکر تھا ؟"

نہیں آخری اطلاع یہ ہے کہ مے ڈے میں ملازم تھا، وہ میرے پاس صرف ایک مرتبہ آیا تھا، وہ شراب کا سخت عادی ہے - اور نشہ میں آکر بہت لڑتا جھگڑتا ہے، اب کچھ عرصے سے میری بہن میری نے جو اس کی بیوی ہے کوئی خط نہیں لکھا، اس لئے پتہ نہیں کہ کیا حال ہے"

اسی سلسلہ میں مس کشنگ نے اپنے بہنوئی کے بہت سے حالات بیان کئے - اور ان طالب علموں کا بھی ذکر کیا جو اس کے پاس آکر ٹھہرے تھے -

ہومز نے اس کی گفتگو ختم ہونے کے بعد دریافت کیا" مجھے تعجب ہے کہ جب آپ کی دوسری بہن سارہ کی بھی شادی نہیں ہوئی تو وہ آپ کے پاس کیوں نہیں رہتی ؟"

آپ کو سارہ کی مزاجی حالت معلوم نہیں ہے میں جب کراڈن آئی تو میں نے اسے بلاکر رکھا لیکن دو مہینہ سے زیادہ نباہ نہ ہوسکا -

اب میں اپنی بہن کی خرابیوں کا حال آپ سے کیا بیان کروں۔ بہرحال یوں سمجھ لیجئے کہ وہ میرے ساتھ کسی طرح نہ رہ سکتی تھی۔"

ہومز۔ "آپ نے دوران گفتگو میں یہ بھی بیان کیا تھا کہ سارہ ایک مرتبہ اپنے بہنوئی سے بھی لڑ چکی ہے"

ہاں یہ صحیح ہے پہلے بہن اور بہنوئی سے اس کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ وہ وہیں گئی اور رہی۔ لیکن اب وہ بہت برائیاں بیان کرتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے وہاں بھی دخل در معقولات کیا ہوگا اور براونر نے سخت و سُست کہدیا ہوگا۔"

ہومز۔ "آپ کی بہن سارہ تو شاید نیو اسٹریٹ والنگٹن میں رہتی ہے۔ جیسا کہ ابھی آپ نے بیان کیا" اچھا اب میں اجازت چاہتا ہوں معاف فرمایئے آپ کو بہت تکلیف ہوئی۔"

باہر نکل کر ہومز نے ایک گاڑی کرایہ کی اور والنگٹن کا رُخ کیا۔ لیکن راستہ میں جب تار گھر ملا تو اُس نے کہیں کو تار بھی دیا۔

جب گاڑی سارہ کے مکان پر پہنچی، تو ہومز نے اتر کر دستک دی۔ اندر سے ایک نوجوان سیاہ ملبوس میں باہر آیا۔ جس سے ہومز نے دریافت کیا، "کیا مس کشنگ موجود ہیں۔"

"مس سارہ کشنگ سخت بیمار ہیں۔ کل سے بحرانی وہذیانی کیفیت طاری ہے۔ چونکہ ڈاکٹر نے سخت ممانعت کر دی ہے کہ کوئی شخص ملنے نہ آئے۔ اس لئے میں مجبور ہوں" یہ کہکر اُس نے دروازہ بند کیا اور اندر چلا گیا۔

ہومز نے کہا۔ "مجبوری ہے کیا کیا جائے"

میں نے کہا کہ "تمھیں اس سے کچھ زیادہ پوچھنا بھی تو نہ تھا" ہومز نے جواب دیا کہ "میں صرف اُسے دیکھنا چاہتا تھا۔ بہرحال مجھے جو کچھ معلوم ہونا چاہئے تھا وہ معلوم ہو چکا ہے" اور یہ کہکر اُس نے گاڑی والے سے کہا کہ کسی اچھے ہوٹل میں لے چلے۔

ہوٹل میں پہنچکر کھانا کھایا۔ اور آرام کرکے سہ پہر کو تھانے پہنچے۔ جہاں لسٹریڈ انتظار کر رہا تھا۔ اس نے دیکھتے ہی کہا کہ "مسٹر ہومز یہ تمھارے نام کا تار ہے"

ہومز نے فوراً اُسے کھولکر پڑھا اور بولا کہ "بالکل ٹھیک، میرا خیال صحیح نکلا"

لسٹریڈ نے تعجب سے پوچھا "کیا کچھ پتہ چلا"

ہومز۔ "سارا پتہ چل گیا"

لسٹریڈ۔ "تم مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟"

ہومز۔ "اس سے زیادہ سنجیدہ تو میں کبھی ہوا ہی نہیں، میرا خیال صحیح نکلا کہ یہ نہایت سنگین جرم ہے اور اس کی ساری تفصیل میں نے معلوم کرلی ہے۔"

لسٹریڈ۔ "اور مجرم کہاں ہے؟"

ہومز نے ایک کاغذ پر اس کا نام لکھکر لسٹریڈ کو دیدیا اور بولا کہ "یہ اس کا نام ہے لیکن تم کل رات سے پہلے اس کی گرفتاری نہ کر سکوگے چونکہ میں یہ نہیں چاہتا کہ میرا نام اس سلسلہ میں لیا جائے اس لئے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں کہ میں نے پتہ چلایا ہے"

اسی رات کو جب ہم مکان واپس پہنچے، تو ہومز نے کہا کہ "میں نے لسٹریڈ سے سارا حال کہہ کے بیچ کی کچھ کڑیاں دریافت کرنے کی ہدایت کردی ہے" میں نے یہ سن کے کہا کہ "کیا ابھی معاملہ تکمیل کو نہیں پہنچا۔

"نہیں مکمل تو ہوگیا ہے اور یہ بھی معلوم ہوچکا ہے کہ مجرم کون ہے لیکن ایک شخص ابھی بھاگا ہوا ہے اور اس کا پتہ چلانا رہگیا ہے

اچھا یہ بتاؤ کہ تمھارے نزدیک مجرم کون ہوسکتا ہے"

میں نے کہا۔ غالباً تم نے بروئر پر شبہ کیا ہوگا"

ہومز۔ "شبہ کیا یقین۔ اچھا اب شروع سے تمام واقعات پر سلسلہ وار غور کرو۔ جس وقت ہم نے اس معاملہ کو ہات میں لیا ہم بالکل خالی الذہن تھے، اور ہم نے کوئی قیاس قائم نہ کیا تھا۔ ہمیں جو کچھ سمجھنا تھا موقع پر جاکر سمجھنا تھا سب سے پہلے ہم نے وہاں جاکر ایک شریف خاتون کو دیکھا۔ جو اس راز سے بالکل بے خبر معلوم ہوتی تھی۔ اور وہیں ایک تصویر آویزاں دیکھی جس سے اس کی دو اور بہنوں کا ہونا پایا گیا اسلئے اسوقت یہ بات میرے ذہن میں گزری کہ ممکن ہے یہ بکس ان دونوں میں سے کسی کے پاس بھیجا گیا ہو، اس کے بعد ہم نے باغ میں جاکر پارسل دیکھا۔ اس کا ڈورا اس قسم کا تھا۔ جسے ملاح یا جہاز پر کام کرنے والے استعمال کرتے ہیں اور اس کی گرہ بھی ویسی ہی تھی جیسی ملاح لگاتے ہیں پارسل ایک بندرگاہ سے روانہ کیا گیا تھا۔ اور بکس کے اندر مرد کا جو کان نکلا تھا وہ بھی بندھا ہوا تھا۔ جو عموماً ملاحوں کے ہاں رائج ہے۔ الغرض ان تمام باتوں سے مجھے یقین ہوگیا کہ اس ٹریجڈی کے تمام ایکٹر جہاز کی ملازمت سے وابستہ ہیں۔ یا سمندر سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور رکھتے ہیں پارسل کے پتہ پر "مس۔ ایس کشنگ" (Miss S. Kushing) تحریر تھا۔ اور ہرچند بڑی بہن کا نام مس کشنگ ہونا چاہیئے لیکن میں نے خیال کیا کہ یہ ممکن ہے صرف اس (S) کسی دوسری بہن کے نام کا حرف ہو۔ اس لئے میں گھر میں داخل ہوا۔ اس خیال سے اس مسئلہ کو صاف کرنا چاہیئے۔ تم کو یاد ہوگا کہ میں مس کشنگ سے یہ کہتے ہوئے کہ "پارسل بیشک غلطی سے آپ کے نام آیا ہوگا" میں دفعتہً خاموش ہوگیا تھا، اس کا سبب یہ تھا کہ مجھے اس وقت وہاں ایک ایسی چیز نظر آئی جس نے مجھے متعجب بنادیا اور ہماری جستجو کے حدود کو بھی محدود کردیا۔ ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے واٹسن تم اس حقیقت سے ضرور واقف ہوگے کہ جسم انسانی کا کوئی حصہ اس قدر مختلف نہیں ہوتا جتنا کان۔ ہر شخص کا کان مخصوص وضع وساخت کا ہوتا ہے اور کبھی دوسرے کے کان سے نہیں ملتا۔ اس لئے تم خیال کرسکتے ہو کہ میں کسقدر متعجب ہوا ہونگا، یہ دیکھکر کہ مس کشنگ کا کان بہت کچھ اس کان سے ملتا جلتا ہوا ہے، جسے بکس میں دیکھکر ہم نے حکم لگایا تھا کہ یہ عورت کا کان ہے۔ فوراً میرا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ جس عورت کا کان کاٹا گیا ہے وہ یقیناً مس کشنگ کی عزیز ہے اور اسی لئے میں نے اس کے خاندانی حالات کی جستجو شروع کی۔ اس گفتگو کا جو نتیجہ ہوا تمھیں معلوم ہے۔ اچھا اب غور کرو کہ اس کی ایک

بہن کا نام سارہ ہے جو حال ہی میں مس کشنگ (اپنی بہن) کے مکاں سے اُٹھکر گئی ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اگر پارسل اس کے لئے آیا ہوگا تو اس پتہ سے آیا ہوگا۔ کیونکہ بھیجنے والے کو (جو برونر تھا) سارہ کے مکان چھوڑ دینے کا حال معلوم نہ تھا۔ اور باہم کشیدگی کی وجہ کر خط وکتابت مسدود تھی۔ اس گفتگو کے دوران میں یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ ایک بحری ملازم برونر سے اس کی چھوٹی بہن میری کی شادی ہوگئی تھی جو اپنے عادات وخصائل کے لحاظ سے بہت غصہ ناک اور سخت مزاج ہے اس لئے میں نے فوراً یہ خیال کیا کہ ممکن ہے کہ اس کی بیوی اور آدمی کی طرف ملتفت ہوگئی ہو۔ اور اس نے حسد کے جذبہ سے متاثر ہوکر نہ صرف اپنی بیوی بلکہ اس کے دوست کو بھی مار ڈالا ہو اور ان کے دونوں کان کاٹ کر سارہ کے پاس بھیجدئے ہوں۔ جو اس کے علم میں اپنی بڑی بہن کے پاس رہتی تھی اب رہا یہ سوال کہ سارہ کے پاس کیوں پارسل بھیجا۔ سو اس کا سبب بھی ظاہر تھا۔ کہ غالباً اس کی وساطت وشرارت سے میری کا تعلق کسی اور سے ہوا ہوگا۔ اور اسی بنا پر برونر نے اُسے نکالا ہوگا جب وہ اس کے پاس رہتی ہوگی۔ پارسل کا اس کے پاس بھیجنا گویا ظاہر کرنا تھا کہ جو بیج فساد کا تم نے بویا تھا اس کا نتیجہ بھی دیکھ لو ــــــ جس کمپنی میں برونر ملازم ہے اس کے جہاز بلفاسٹ، ڈبلن اور واٹرفورڈ جاتے ہیں۔ اسلئے اگر برونر نے یہ جرم کیا ہوگا اور اس کے بعد ہی جہاز پر چلا گیا ہوگا تو سب سے پہلے اُسے بلفاسٹ ہی ایسا مقام ملا ہوگا جہاں سے وہ پارسل روانہ کرسکتا تھا۔ میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ ممکن ہے میری کے نام عاشق نے میری اور اس کے شوہر کو مارڈالا ہو اور مردوالا کان برونر کا ہو اس لئے میں نے لورپول تار بھیجکر دریافت کیا کہ مسٹر برونر گھر پر ہے یا نہیں۔ اور مسٹر برونر مے ڈے جہاز پر روانہ ہوگیا یا نہیں۔ اس تار کے بھیجنے کے بعد ہم مس سارہ کے مکان گئے۔ میں مس سارہ کو اس لئے دیکھنا چاہتا تھا کہ دیکھوں اس کے کان کس قسم کے ہیں۔ اور کچھ حالات بھی اس سے دریافت کرتا۔ وہاں پہنچکر اس کی بیماری کا حال معلوم ہوا جس سے مجھے اور زیادہ اپنے خیال کی تصدیق ہوئی۔ کیونکہ اس پارسل کے آنے کا حال اسے ضرور شام تک معلوم ہوگیا ہوگا۔ کیونکہ کیونکہ ساری قصبہ میں یہ خبر مشہور ہوگئی تھی اور وہ سمجھ گئی ہوگی کہ یہ پارسل حقیقتاً اسی کے پاس بھیجا گیا تھا اور نیز یہ کہ وہ کان کس کس کے ہوسکتے تھے اس کے بعد تھانہ پہنچکر مجھے تار کا جواب ملا۔ کہ مسٹر برونر تین دن سے غائب ہے اور کہاجاتا ہے کہ وہ اپنے عزیزوں سے ملنے کہیں گئی ہے، اور مسٹر برونر مے ڈے جہاز پر روانہ ہوگیا ہے۔ یہ جہاز کل رات کو ٹیمس میں پہنچیگا اور وہیں اور وہیں لسٹریڈ اسے گرفتار کریگا

اس کے دو دن بعد لسٹریڈ کا خط آیا جس کا مضمون یہ تھا:۔

میرے عزیز دوست مسٹر ہومز،

آپ کی ہدایت کے مطابق کل شام کو ۶ بجے بندرگاہ پہنچکر مے ڈے جہاز پر گیا، اور دریافت سے معلوم ہوا کہ برونر نامی ایک شخص بے شک جہاز پر کام کرتا ہے، لیکن راستہ میں اس نے ایسی بدحواسیاں کیں۔ جنسے معلوم ہوتا تھا کہ اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے

اس لئے کپتان نے اسے معذول کر دیا ہے۔ میں جب برو نز کے کمرے میں پہنچا تو وہ پاگلوں کی طرح زانو پر سر رکھے مضطرب نظر آ رہا تھا میں نے اسے گرفتاری کی اطلاع دی جس پر وہ پہلے تو بہت چراغ پا ہوا۔ لیکن پولیس کی اور امداد آ گئی تو خاموشی کے ساتھ اس نے آپ کو سپرد کر دیا بعد کو جو بیان اُس نے دیا ہے اُس کی نقل روانہ کرتا ہوں:۔

نقل بیان مسٹر برونز

تین بہنیں تھیں، جن میں سے بڑی بہت شریف ہے، دوسری جس کا نام سارہ ہے پوری شیطان ہے، اور تیسری میری بیوی جس کا نام میری تھا بالکل فرشتہ خصلت تھی۔ سارا کی عمر ۳۳ سال کی تھی اور میری کی ۲۹ سال کی جب میں نے شادی کی۔ ہماری زندگی نہایت لطف و مسرت کے ساتھ بسر ہو رہی تھی کہ شامت اعمال سارا کو ایک ہفتہ کے لئے اپنے پاس بلایا۔ لیکن بعد کو وہ مستقلاً ہمارے ساتھ رہنے لگی میں ہر ہفتہ کے آخر میں ضرور گھر آ جاتا تھا۔ اور اگر کبھی مال کے لادے جانے میں دیر ہو جاتی تھی تو مسلسل ہفتہ ہفتہ بھر گھر رہتا تھا۔ چند دنوں کے بعد میں نے محسوس کیا کہ سارہ اپنا زیادہ وقت میرے پاس بسر کرنا چاہتی ہے اور تنہا میرے ساتھ ٹہلنے کے لئے باہر جانے پر زیادہ زور دیتی ہے۔ لیکن اس کا سبب مجھے معلوم نہ تھا، ایک شام جب میں جہاز سے آیا تو میری بیوی گھر میں نہ تھی میں نے سارہ سے دریافت کیا تو اس نے کہا کہ "وہ کسی دوکاندار کا حساب صاف کرنے گئی ہے" میں مضطرب تھا اور بیتابانہ ٹہل رہا تھا کہ سارہ نے کہا "کیا تم بغیر میری کے میرے ساتھ ۵ منٹ بھی اچھی طرح بسر نہیں کر سکتے؟" یہ کہکر اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے جو نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ اس کی آنکھیں سرخ ہیں میں اسکے جذبہ کو سمجھ گیا اور فوراً اپنا ہاتھ کھینچکر علٰحدہ ہو گیا وہ بھی خفیف ہو کر چلی گئی۔ لیکن اس دن سے وہ مجھ سے نفرت کرنے لگی، میں نے میری سے اس کا ذکر نہیں کیا، اور پھر زندگی بدستور ہونے لگی،

اس کے چند دن بعد میں نے محسوس کیا کہ میری مجھ سے کچھ کھنچی ہوئی رہتی ہے اور سارہ سے بہت میل بڑھ گیا ہے، اس میں شک نہیں کہ شادی سے قبل میں سخت شراب کا عادی تھا، لیکن شادی کے بعد میں توبہ کر چکا تھا۔ اب میری کی یہ حالت دیکھکر اپنی تکلیف

دور کرنے کے لئے پھر شراب پینے لگا۔

اس کے چند دن بعد ایک شخص فیربرن سارہ سے ملنے کے لئے آنے لگا، یہ نہایت حسین طرحدار اور دلچسپ انسان تھا، اس کی آمد و رفت بڑھتی رہی اور میری بیوی بھی اس کی معیت مسرور نظر آنے لگی، ایک دن میں دفعتہً تو میں نے محسوس کیا کہ پہلے وہ تو نہایت شوق سے بڑھی تھی لیکن میری صورت دیکھکر پھر مضمحل ہوگئی۔ میں سمجھ گیا کہ قدموں کی آواز پر اس نے فیربرن کی آمد کا خیال قائم کیا تھا، جس کا یہ انتظار کر رہی تھی لیکن جب بجائے اس کے میں نظر آیا تو منھ پھلا لیا۔ اب غصہ کا ضبط کرنا میرے امکان سے باہر تھا، میں فوراً سارہ کے پاس گیا اور کہا کہ آئندہ سے فیربرن میرے مکان میں نہ آئے۔ ورنہ اچھا نہ ہوگا اس نے کہا کہ اگر میرے احباب اس مکان میں نہیں آسکتے تو میں بھی یہاں نہیں رہ سکتی۔ میں نے کہا اس کا تم کو اختیار ہے، لیکن اب اگر یہ شخص کبھی میرے مکان میں آیا تو اس کا کان کاٹ کر تحفہ تمھارے پاس بھیجدونگا۔ اس واقعہ کے بعد سارہ میرے مکان سے اٹھکر ایک اور مکان میں چلی گئی۔ جہاں میری بیوی بھی چار پینے کے لئے جایا کرتی تھی، ایک دن میں نے اس کا تعاقب کیا اور جونہی میں اندر داخل ہوا وہ دیوار کود کر بھاگ گیا میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ اگر تم کبھی اس سے ملیں تو میں تمھیں مار ڈالوں گا، اور یہ کہکر میں اپنی بیوی کو گھسیٹ کر گھرے آیا یہ حقیقت ہے کہ اب یہ بھی مجھ سے نفرت کرتی تھی اور محبت کی کوئی کیفیت باقی نہ تھی۔ اس کے بعد سارہ اپنی بہن کے پاس کراڈن چلی گئی۔

گزشتہ ہفتہ کا واقعہ ہے کہ میں بڑے جہاز پر سات دن کے لئے روانہ ہوا لیکن کوہر کی شدت سے جہاز پھر ساحل کی طرف واپس کیا گیا، اور میں گھر کی طرف چلا، لیکن جونہی سڑک کی موڑ پر پہنچا میں نے دیکھا کہ ایک گاڑی میں فیربرن کے ساتھ میری ہنستی بولتی چلی جارہی ہے، یہ دیکھ کر میری جو حالت ہوئی اس کا اندازہ مشکل ہے، میں اس وقت بالکل دیوانہ تھا۔ میں اس گاڑی کے پیچھے دوڑتا ہوا گیا۔ یہاں تک کہ وہ ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے میں بھی ان کے ساتھ ساتھ تھا، لیکن ان کی نگاہوں سے بچکر چل رہا تھا، انھوں نے براٹن کا ٹکٹ لیا، میں نے بھی وہیں کا ٹکٹ لیا، اور اس ریل میں سوار ہوگیا، براٹن پہنچکر وہ برینڈ

کی طرف چلے، اور میں بھی ساتھ ساتھ رہا۔ یہاں پہنچکر انھوں نے ایک کشتی لی۔ اور اس میں بیٹھکر روانہ ہوگئے۔ میں نے بھی ایک کشتی لی، اور اُن کے پیچھے چلا، چونکہ کوہر زیادہ تھا اسلئے وہ مجھے نہ دیکھ سکتے تھے۔ میں نے جلدی جلدی کوشش کرکے فاصلہ کو کم کیا اور آخرکار اپنے آپ کو ان کی کشتی کے پاس پہنچا دیا۔

جسوقت انھوں نے مجھے اپنے قریب دیکھا تو حیرت سے اُن پر سکتہ طاری ہوگیا، اور میں نے اس وقت اس زور سے فیر برن کے سر پر لکڑی ماری کہ اس کا سر پھٹ گیا میں یقیناً میری کو ہلاک نہ کرتا اگر وہ فیر برن سے لپٹ کر اس کا ماتم نہ شروع کر دیتی؛ میں نے اسے بھی اسی جگہ ٹھنڈا کیا اور پھر ان دونوں کے کان کاٹ لئے کہ تحفۃً سارا کے پاس بھیجوں گا۔ تاکہ وہ اپنے پیدا کئے ہوئے فساد کے نتیجے سے آگاہ ہوجائے۔

اس کے بعد میں ان کی کشتی کو توڑ کر ایک تختہ سے دونوں لاشیں باندھ دیں اور سمندر میں ڈبو دیا۔ میں نے لوٹ کر جہاز میں دونوں کان ایک پارسل میں بند کئے اور بلفاسٹ سے وہ پارسل سارا کشنگ کے نام کراڈن کے پتہ سے روانہ کر دیا۔

یہ ہے میرا سارا قصہ، اب تمھیں اختیار ہے، مجھے پھانسی پر چڑھا دو یا جو چاہو کرو۔

(منقول از مرقع لکھنؤ)

ظہیر الدین محمد بابر

(گزشتہ سے پیوستہ)

بابر بہت سے عقلا، شعرا اور ماہران علم موسیقی کے نام لکھتا ہے جو اس کے شباب میں بمقام ہرات سکونت پزیر تھے۔ جامی کو ملک الشعراء کا مرتبہ حاصل تھا لیکن بابر قریب قریب ان بارہ دیگر شعراء کی سوانح عمریاں اور ہنرمند مصوروں اور مغنیوں کے حالات بیان کرتا ہے۔ پروفیسر ویمبری[۵۱] جو ان معاملات میں مستند مورخ ہے لکھتا ہے[۵۲]

"آج تربیت وشائستگی اور اعلیٰ درجہ کی تہذیب المختصر جملہ صفات جن کا کہ وہ نام جانتے ہیں اون سب کا خیال جو ایشیا یا کسی دوسرے حصۂ ملک کے مسلمانوں میں قائم ہے، اُن حالتوں سے ماخوذ ہے جو تیمور سے لیکر بابر کے وقت تک سمرقند اور ہرات میں ترقی پر تھیں"

ان اجنبی آدمیوں کے واقعات بغور پڑھنے کے بعد انکی اجنبیت ہمارے نزدیک باقی نہیں رہتی کیونکہ ہم انسانی مشترک خصایل کی باطنی کیفیت کی تمیز کرتے ہیں اور اجنبیت کی سطحی تفریق تقریباً زایل ہو جاتی ہے۔ ہر چیز زمانۂ حال کے مطابق ایسی معلوم ہوتی ہے کہ ہم کو صحیح منظر قائم رکھنے کی غرض سے اصلی معیاروں کی طرف لوٹنے میں جبر اختیار کرنا پڑتا ہے۔

۱۵۰۰ء میں ہرات میں شعرا اور صناعوں کا ایک اچھا خاصہ مجمع تھا، جن کے تعلقات قریب قریب دوستانہ تھے۔ ان کے اختلافات سے واقف ہونے کے لئے ایک سخت مناظرہ کی تلاش کی ضرورت ہے۔ علی شیر بیگ کی نظم آج بھی ہمارے دلوں پر اثر کرتی ہے لیکن ہم اسبات کو مجبوراً تسلیم کرتے ہیں کہ شیوبرٹ[۵۳] کا گیت، پی۔ ما نیر، علی شیر بیگ کے لئے محض بے سُرا ثابت ہوگا۔ ذیل کی مثال ظاہر کرتی ہے کہ بابر کہاں تک فن شاعری کی قدر کرتا تھا اور یہ مثال اسکے دل کی سادگی اور سچائی ظاہر کرتی ہے۔ وہ کہتا ہے "مینوشی کے ایک جلسہ میں شعر پڑھا گیا

محبوبی ہر عشوہ گر یرا چہ کند کس؟ جائی کہ تو باشی دگریرا چہ کند کس؟

یہ قرار پایا کہ اسی قافیہ پر ہر شخص فی البدیہ شعر کہے۔ میں نے کہا:-

مانند تو مدہوش گریرا چہ کند کس؟ ہر کاہ کشش مادہ خریرا چہ کند کس؟"

---

۵۱ آرمینیہ کا رہنے والا۔ ولادت ۱۸۳۲ء اس نے ہنگری کا سفر کیا ہے۔ مشرقی علوم کا مشہور عالم ہے۔

۵۲ تاریخ بخارا صفحہ ۲۴۱ مولف۔

۵۳ فرنیز پیٹر شیوبرٹ ولادت بمقام واٹنا دار السلطنت اسٹریا ۱۷۹۷ء وفات ۱۸۲۸ء بہت سے راگ درا گنی کا موجد۔

اس سے پہلے میں اپنی نظم قلمبند کرالیتا تھا اور جب میں نے یہ مصرعے کہے تو میرے دل میں عجیب طرح کے خیالات پیدا ہوئے اور یہ افسوس ہوا کہ زبان جو اعلیٰ سے اعلیٰ کلام کہنے پر قادر ہو اس سے ایسے ناپاک کلام ادا کرنا گوارا کیا جائے۔ اور یہ ایک قسم کا مالیخولیا ہے کہ دل جو ایسے ارفع و اعلیٰ خیالات کا سرچشمہ ہو اُسے اس قسم کے ذلیل اور مذموم تصورات میں مصروف رکھا جائے۔ اسوقت سے میں نے اندو ی مذہب ہجو یہ کلام اور ہزلیات نظم سے اجتناب کیا ہے۔ پہلے میں نے کبھی غور نہیں کیا تھا کہ یہ طرز عمل کسقدر قابل اعتراض ہے" آگے چلکر ہم دیکھتے ہیں کہ اُس نے ایک مذہبی رسالہ کو نظم میں ترجمہ کیا ہے۔۔ "میں بلاناغہ اُسے نظم کرتا ہوں اور بالا وسط روزانہ باون اشعار ہوجاتے ہیں"

ایک مرتبہ موسم سرما میں کابل جاتے ہوئے فوج برف وطوفان کی وجہ سے سخت پریشان حال ہوگئی۔ آخر کار الگ ایک غار میں ٹھہر گئے بابر نے اپنے واسطے برف میں ایک سوراخ بنایا، وہ میرے سینہ تک گہرا تھا اور وسعت میں جانماز اتنا" اور اسمیں بیٹھا۔ "بعض نے چاہا کہ میں بھی گڑھے میں چلا جاؤں مگر میں نہیں گیا۔ مجھکو یہ بات محسوس ہوئی کہ مجھے گرم جگہ میں آرام سے رہنا جبکہ میری فوج والے برف اور بوچھار کے زد میں ہیں، یا مجھے سونا اور آرام اُٹھانا جبکہ وہ سب مصیبت میں ہیں انکی شریک مصیبت ہونے سے جو انکا حق ہو گریز کرنا ہے۔ میں برابر اسی بوچھار میں بیٹھا رہا"

ایک دوسری شب کو دشمن کے مقابلہ میں کوچ کرتے ہوئے بابر ایک اونچے درہ کوہ پر چڑھ گیا " اسوقت تک میں نے سہیل ستارہ کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ (جو واقعی شمالی عرض البلد میں نہیں دکھائی دیتا) لیکن چوٹی پر پہونچتے ہی سہیل نیچے کی طرف ظاہر ہوا جو جنوب کی سمت روشن تھا۔ میں نے کہا یہ سہیل نہیں ہوسکتا۔ لوگوں نے جواب دیا، ضرور یہ سہیل ہی ہے" الغ بیگ کا خلف علم نجوم کی ذریعہ سے اُن ستاروں کے علم سے بھی جسے اوسنے کبھی نہیں دیکھا تھا واقف ہوگیا۔ ہمارے موجودہ سپاہیوں میں سے کتنے ایسے نکلیں گے جو سہیل کو دیکھیں تو پہچان لیں؟

اپنے عہد شباب میں بابر شرمگین اور حیادار تھا اور بہت عرصہ تک اُس نے شراب کا استعمال قطعاً نہیں کیا تھا۔ مابعد میں وہ

---

[۵] بابر نے قرآن خط بابری میں لکھکر مکہ معظمہ کو بھیجا تھا۔ فارسی اور ترکی زبان میں اس کا ایک دیوان بھی مشہور ہے۔ اس نے فقہ حنفی پر ایک کتاب مبین لکھی تھی فن عروض میں بھی اس بادشاہ کے رسالے مشہور ہیں حضرت مقدس کا رسالہ والدیہ بھی اُس نے نظم کیا تھا علم موسیقی اور دیگر فنوں میں بھی اُس نے کمال حاصل کیا تھا۔ میرزا حیدر اپنی تاریخ رشیدی میں کہتے ہیں کہ درحقیقت اُس سے پہلے اس خاندان میں کوئی شخص ایسا باکمال نہیں ہوا۔ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ بابر کو نظم اور نثر دونوں کی تحریر میں کمال حاصل تھا خاص کر وہ ترکی زبان میں نظم لکھنے میں اپنا جواب نرکھتا تھا۔ اپنے واقعات کو تزک بابری کے نام سے ابتدائی سلطنت سے وفات تک کے حالات میں فصیح و بلیغ عبارت میں لکھا جو فرمانرواؤں کے لئے ایک عمدہ دستور العمل اور تجربہ و عقل حاصل کرنے کے لئے بہترین قانون ہے اس تزک کو میرزا خانخانان ابن بیرم خاں نے فارسی میں ترجمہ کیا۔ فارسی زبان میں دلچسپ اشعار کہتا تھا۔ نمونہ ملاحظہ ہو

ہلاک میکندم فرقت تو دانستم | وگرنہ رفتن ازین شہر میتوانستم
تا بہ زلف سیہش دل بستم | از پریشانی عالم رستم
باز آئی اے ہمای کہ در طوطی خطت | نزدیک شد کہ زاغ برد استخوان من

نت پابندی کیساتھ مئے نوشی کرنے لگا اور وہ اپنے ہر دور شراب کا صحیح صحیح حال لکھتا ہے۔ اس لڑائی کے بعد جس میں اس نے ہندوستان کو فتح کیا وہ لکھتا ہے کہ میں نے صدق دل سے رو باکل توبہ" کرلی اس نے اپنی ساری مینا کار صراحیاں اور جام شراب توڑ ڈالے اور درویشوں اور فقرا کو دیدیے اور کل شراب کا سرکہ بنالیا اور آخر کار اپنے طریقۂ زندگی کی تبدیلی پر ایک فرمان جاری کیا اور خدا کی درگاہ میں بہت عجز والحاح کیا۔

ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ایک ظالم کیسے خواب دیکھتا ہے۔ ایک مرتبہ جبکہ بابر نے بھنگ کی گولی کھائی اور سوگیا تو اپنا خواب اُس نے یوں لکھا ہے:-

ہنوز میں اس کے نشہ میں تھا کہ میں نے چند خوبصورت باغات دیکھے۔ مختلف کیاریوں میں پھول زمین پر بچھے ہوئے تھے۔ ایک طرف کیاریوں میں زرد رنگ کے پھول کھلے تھے دوسری طرف سرخ رنگ کے پھول شگفتہ ہو رہے تھے بہت سی جگہوں پر ایک ہی تختہ میں وہ سب ایک منھ کھل رہے تھے۔ جیسے کسی نے پھینک کر منتشر کر دئے ہوں۔ میں کیاریوں کا یہ نظارہ دیکھنے کی غرض سے ایک اونچی جگہ پر جا بیٹھا۔ جہاں تک کہ نظر پہونچ سکتی تھی، ایک ہی قسم کا چمنستان پھولا ہوا تھا۔ واضح ہو کہ یہ واقعہ خواب دیکھنے کے کئی سال بعد لکھا گیا ہے اور وہ آگے لکھتا ہے:-

پشاور کے قریب بہار کے موسم میں پھولوں کے تختے نہایت خوشنما اور بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ جہاں کہیں بھی یہ سخت دل سپاہی گیا ہے وہیں اُس نے چمن اور باغ لگائے اور تفریح گاہ اور سیر کی جگہ بنائی ہیں۔

کابل سے تھوڑے فاصلہ پر بابر نے ایک چھوٹا سا حوض سنگ سرخ کا جہاں سے شہر کا منظر دکھائی دیتا تھا تیار کرایا اور اس کے کنارے پر اشعار کا کتبہ کرایا ہے۔

نوروز، نوبہار وَمے، دو لبر خوش است — بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

"میں نے ہدایت کی کہ اس حوض کے چاروں طرف پتھر لگائے جائیں اور اس کے چاروں طرف ایک خوبصورت چبوترہ نشست کی غرض سے بہت خوش قرینہ بنایا گیا۔ جسوقت کہ ارغوانی پھول کھلتے ہیں میں نہیں جانتا کہ دنیا میں کوئی جگہ اس سے مقابلہ کر سکتی ہے"

کابل سے اُس نے ہندوستان پر کئی بار یورشیں کیں جنھیں صرف حملہ کہا جا سکتا ہے اور آخر کار پنجاب کے بداندیش امرا کی مدد سے وہ ہندوستان کے فتح کرنے پر مستعد ہوا۔ ان پیچدار لڑائیوں اور عہد و پیمانوں کی تفصیل بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے نہ اُس آخری عظیم الشان جنگ کے تذکرہ کا موقع ہے جسمیں بابر نے دارالسلطنت آگرہ پر قبضہ حاصل کیا۔ اس کی فوج میں نہ صرف ترکی جرگے تھے بلکہ ہندوستانی مددگار بھی تھے۔ ان کے سپاہیانہ خد و خال میں ایسی نہ بجھنے والی آگ چمک رہی تھی جس نے بعد کو ایشیا کے غرور کو جلا کر خاکستر کر دیا۔

اس کی فتحمندی کا بڑا سبب اس کی فوجی تربیت کا طریقہ تھا جو اس نے پہلی مرتبہ جاری کیا تھا سپاہی تیر و کمان، برچھی و بھالے، شمشیر، گرز، اور بعض توڑے دار بندوقوں سے مسلح تھے۔ اس زمانہ کے محاصرہ کا توپ خانہ نہایت بھدا اور بھاری تھا۔ "جسوقت کہ گنگا پر پل طیار ہو رہا تھا اُستاد علی قلی نے اپنی توپ سے نہایت صحیح نشانہ مارا۔ پہلے دن اس نے آٹھ اور دوسرے دن سولہ فیر کئے اور تین یا چار دن وہ اسی طریقہ پر فیر کرتا رہا۔ اُسے فتحمند توپ کہتے تھے اور استاد خان اپنی کامیابی پر انعام سے سرفراز کیا گیا"

۱۵۲۶ء میں آگرہ پر قبضہ کرنے کے بعد خزانہ تقسیم کیا گیا۔ ھمایوں کو جو بابر کا خلف اکبر اور جانشین تھا علاوہ ایک محل کے ستاسی ہزار ڈالر تقسیم میں ملے۔ اس کے دوسرے بیٹوں اور امرا کو بیس ہزار سے لیکر سات ہزار پانچسو ڈالر ملے۔ "ہر ایک تاجر، ہر خواندہ آدمی فوج کا ہر شخص، میرے جملہ دوست اور رشتہ دار چھوٹا بڑا کوئی ایسا نہ تھا جسے از قسم سونا، چاندی، خلعت، جواہرات یا قیدی غلام انعام میں نہ ملے ہوں" کابل کے ہر متنفس مرد یا عورت۔ بچہ، غلام اور آزاد کو چاندی کا ایک سکہ جو قیمت میں انگریزی شلنگ کے برابر تھا ملا۔ بابر کی فضول خرچی ضرب المثل ہوگئی۔

اسیوقت میں وہ مشہور ہیرا بھی قبضہ میں آگیا۔ بابر لکھتا ہے "کہ وہ ایسا بیش بہا ہے" "کہ اس کی قیمت دنیا کے روزانہ خرچ کا نصف حصہ اندازا کی جاتی ہے"[1]

اسی طرح پر بابر تخت ہندوستان پر بیٹھا اور ایک سلطنت کا موجد قرار پایا۔ آؤ دیکھیں کہ خود فاتح نے اپنے مفتوحہ ملک کی نسبت کیا رائے ظاہر کی ہے۔

"ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہان عیش و آرام کے ایسے سامان بہت کم ہیں جنسے کہ اس کی جانب کسی قسم کی کشش ہو۔ یہاں کے لوگوں میں حس نہیں ہے اور نہ مذاق صحبت ہے۔ اہل ہند میں نہ ذہن ہے نہ ادراک، نہ اخلاق، نہ ہمدردی بلکہ اسقدر مادہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کسی قسم کی اختراع یا ایجاد اپنی دستکاری یا تجارت میں کر سکیں۔ فن عمارت میں نہ وہ کسی قسم کے نقشے بنانے سے واقف ہیں نہ انہیں کچھ مہارت ہے" "نہ تو ان کے یہاں عمدہ گھوڑے ہیں نہ کھانے کے لئے عمدہ گوشت ملتا ہے" "نہ انگور ہے، نہ تربوز، نہ برف، نہ آب سرد، نہ عمدہ غذا، نہ حمام، نہ دار العلوم۔ نہ شمع نہ مشعل اور حتیٰ کہ شمعدان تک کسی قسم کا نہیں ہے۔ خاص صفت ہندوستان کی یہ ہے کہ یہ ایک بڑا وسیع ملک ہے اور یہاں سونا اور چاندی کثرت سے ہے" "اور بہت سے مشاق و دستکار اور کاریگر ہیں۔ آگرہ خاص میں اُس نے

[1] یہ غالباً وہ پتھر تجر نور ہوگا جو اس وقت شاہ فارس کے خزانہ میں موجود ہے مگر وہ کوہ نور نہ تھا جیسا کہ بعد کے مورخین کہتے ہیں۔ مؤلف ابو الفضل نے اکبر نامہ میں یہ لکھا ہے، "حضرت جہانبانی جنت آشیانی کہ پیشتر بدار السلطنت آگرہ نزول اجلال فرمودہ بودند الماسے کہ بہشت مثقال مذن داشت و تخمین مبصران جوہر شناس بہائے آن نصف خرچ روزمرہ ربع مسکون بود و میگفتند کہ این الماس از خزانۂ سلطان علاء الدین بود کہ از اولاد بکرماجیت راجہ گوالیار بدست او درآمدہ بود بہ پیشکش کردند و حضرت گیتی ستانی بجہت خاطر گرامی ایشان قبول نمودہ باز بایشان عطا فرمودند۔

۶۸۰ کاریگر ملازم رکھے تھے جو روزانہ کام کرتے تھے اور ۱۴۹۱ سنگتراش مختلف عمارتوں میں کام کرتے تھے۔ دوسری جگہ پر وہ لکھتا ہے:
ہندوستان کے باشندے اور خاصکر افغان بہت ہی احمق اور ناسمجھ لوگ ہیں۔ غور و فکر سے مطلق کام نہیں لیتے اور دور اندیشی کو ان کے مزاج میں بہت کم دخل ہے نہ تو وہ جنگ میں مستقل مزاج رہتے ہیں اور نہ دلیر! نہ لڑ سکتے ہیں۔ اور نہ برابر خیر خواہ یا دوست رہ سکتے ہیں۔"

اس کی زندگی اب تک دوڑ دھوپ اور جنگ وجدال میں گزری ہے۔ "گیارہ برس کی عمر سے لیکر بعد میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مجھے دو رمضان ایک ہی جگہ گزارنے کا موقع ملا ہو" جب اس کی عمر چودہ برس کی تھی وہ ایک محاصرہ میں موجود تھا اور شکایتاً کہتا ہے: "دو مہینے تک سوا محاصرہ کی کارروائی کے اور وہاں کچھ کام نہ تھا نہ کوئی اچھی جنگ ہوتی تھی" اس کی ساری کارآمد زندگی انہیں اچھی جنگوں یا ہنگاموں کے دوڑ دھوپ صرف ہوئی۔ "آج میں تفریحاً گنگا کو تیر کر پار کر گیا۔ اس سے پہلے سوا ایک گنگا کے ہر دریا کو جو مجھکو ملا تیر کر پار کر چکا تھا۔"

ہندوستان میں اس کو خفیہ دشمنوں اور نیز میدان جنگ میں فوجوں کا مقابلہ کرنا پڑا تھا۔

آگرہ میں اسے باورچیوں کی دغا بازی اور چاشنی گیر کی لاپرواہی سے زہر دیا گیا۔ "چاشنی گیر کو ٹکڑہ ٹکڑہ کئے جانے اور باورچی کی زندہ کھال کھچوانے کا حکم دیا گیا۔ ایک عورت ہاتھی کے پیروں سے پامال کی گئی۔ اور دوسری بندوق کا نشانہ بنائی گئی" بابر جانبر ہو گیا۔ الحمد للہ! میں اس سے پہلے پوری طور پر نہیں سمجھتا تھا کہ زندگی ایسی پیاری ہوتی ہے۔ شاعر کا قول ہے۔ ع۔ موت کے منہ میں پہونچکر زندگی کی قدر ہوتی ہے۔ جب اس قسم کے ہولناک واقعات مجھے یاد آتے ہیں تو بے اختیاری کے ساتھ بیہوشی کی حالت طاری ہونے لگتی ہے۔ خدا نے اپنے فضل سے مجھے نئی زندگی عطا کی ہے۔ بھلا کس طرح پر میری زبان اس کا شکریہ ادا کر سکتی ہے؟"

خوش قسمتی سے اتفاقیہ ہمیں بابر کے دو خطوط ہاتھ آ گئے ہیں۔ ایک اس نے اپنے بیٹوں کو بطور نصائح اور تنبیہ کے لکھا ہے دوسرا خط اُس نے کابل کو اپنے ایک معمر اور معتبر دوست کے نام لکھا ہے۔ اول الذکر خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے لڑکوں کے چال چلن سے سخت بیزار اور مایوس ہو رہا ہے اور وہ آخر الذکر خط میں وہ اپنے دلی آلام کا اپنے دوست پر اظہار کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے: "مجھے اپنی مغربی سلطنت (کابل) کے دیکھنے کی حد سے زیادہ خواہش ہے جو بیان سے باہر ہے۔ میں خدا تعالیٰ کی ذات سے یقین کرتا ہوں کہ بہت جلد اس ملک کے معاملات ہمہ وجوہ طے ہو جائیں گے۔ جسوقت ایسا ہوا انشاء اللہ تعالیٰ میں بلا تاخیر تمہاری طرف روانہ ہوں گا۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہاں کی دلچسپی کا خیال دل سے محو ہو جائے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس دلکش سرزمین کے لطیف اور خوش ذائقہ تربوز اور انگور بھلا دئے جائیں؟ ابھی حال میں لوگ میرے لئے کابل سے صرف ایک سردہ لائے تھے۔ جب میں اسے تراش رہا تھا تو مجھے اپنی تنہائی اور جلاوطنی کے خیال سے کہ گھر سے دور کالے کوسوں پڑا ہوں۔ افسوس ہوا اور میرا دل بھر آیا اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔" وہ فوجی اور ملکی معاملات کے متعلق قابل توجہ طول طویل ہدایات لکھتا ہے اس کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا۔ بہشت کے جنوبی اور مغربی گوشہ میں

میں نے بہت سے درختوں کا باغ لگایا اور چونکہ اس کا نظارہ بہت دلچسپ تھا میں اُسے نظرگاہ کہنے لگا۔ تم بھی ضرور وہاں پر چند خوبصورت درخت نصب کردو اور اس کے چاروں طرف خوشنما اور خوشبودار پھول اور بیل لگا دو" اور وہ برابر لکھتا جاتا ہے "سید قاسم توپخانہ کے ساتھ رہیگا" معاملات سلطنت کے دیگر تفصیل وار حالات لکھنے کے بعد وہ پچھلے زمانہ کے اور دوستوں کے چند چھوٹے چھوٹے واقعات نہایت شوق کے ساتھ تحریر کرتا ہے۔ اصل واقعات سے گریز کرکے ان بیہودہ باتوں کے کہنے پر تم مجھے بُرا نہ سمجھنا"۔ "اب میں ہر قسم کی دلی دعا کیساتھ اس خط کو ختم کرتا ہوں"

۱۵۲۹ء کے آخر میں بابر کی تندرستی روز بروز خراب ہونے لگی اور اسکا بیٹا ہمایون بھی بیمار پڑ گیا ہمایون کو آگرہ لائے اور نہایت احتیاط اور دلسوزی کے ساتھ علاج کیا گیا مگر اس کی زیست سے مایوسی ہوگئی۔ بابر کے ایک معزز عہدہ دار نے جو زہد و تقوی کی وجہ سے ممتاز سمجھا جاتا تھا بابر سے عرض کیا کہ اگر آپ اپنی کسی بیش قیمت شے کو اس کی عوض میں اس وقت قربان کردیں تو عجب نہیں کہ خدا تعالیٰ اپنا فضل شامل حال کرکے ہمایوں کی جان پر رحم کرے اور تجویز کیا کہ وہ بیش بہا ہیرا جو فتح آگرہ کے وقت ہاتھ آیا تھا خیرات کرنا چاہئے۔ بابر نے جواب دیا "نہیں۔ میرے قبضہ میں سب سے زیادہ قیمتی شے خود میری جان ہے اور اس وقت میں اُسی کو نذر کرتا ہوں" اس نے جان بلب شہزادہ کے اردگرد تین چکر لگائے اور پھر سجدہ میں گر گیا۔ سجدہ سے اُٹھکر چلایا "ہمایون کی بیماری مجھ میں آگئی"[۵۱] اور درحقیقت اوسیوقت بابر کو اضمحلال شروع ہوگیا اور اس کا پیارا بیٹا توانا و تندرست ہو چلا۔ چونکہ اس کو اپنے خاندان والوں سے بیحد محبت تھی اُسنے ہمایوں سے التجا کی کہ اپنے بھائیوں[۵۲] کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کرنا اُن کے قصور کو معاف کرتے رہنا اور جیسا کہ ایسے معاملات میں بہت کم دیکھا گیا ہے بابر کی اس نصیحت پر مدتوں اس سخت زمانہ میں ہمایوں نے نہایت اطاعت کیساتھ عمل کیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں موت نے جو جلسوں کی برہم کرنے والی قبرستان کی آباد کرنے والی، ایوانوں کی غارت کرنے والی ہے اسکے کالبد خاکی کو ارحم الراحمین کے جوار رحمت میں لیگئی اور اس کے بیٹے نے بجاے اُس کے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔[۵۳]

---

۵۱ ابوالفضل نے یہ الفاظ لکھے ہیں "بر داشتیم۔ بر داشتیم"

۵۲ بابر کے چار لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں جنکے نام بالترتیب یہ ہیں (۱) ہمایون (۲) کامران (۳) عسکری مرزا (۴) ہندال مرزا (۵) گلرنگ بیگم (۶) گلچہرہ بیگم (۷) گلبدن بیگم جنکی کتاب ہمایون نامہ شائع ہو چکی ہے

۵۳ بابر کی ولادت کی تاریخ یہ ہے "چون در شش محرم زاد آن شہ مکرم۔ تاریخ تولدش ہم آمد شش محرم۔" وفات کی تاریخ یہ ہے "تاریخ وفات شاہ بابر۔ در نہ صد و سی و ہفت بوده" اور لفظ شوال بھی مادہ تاریخ ہے ذیل کے قطعہ سے آئینہ طور پر اسکے وفات کی تاریخ نکلتی ہے اول چار مصرعے علیحدہ علیحدہ بجائے خود مادہ تاریخ ہیں۔ پھر مصرع اولی کے عدد حروف بے نقطہ اور مصرع دوم کے حروف نقطہ دار کے جوڑنے سے اور اسی طرح پر مصرع اول کے حروف نقطہ دار اور مصرع دوم کے حروف بے نقطہ کے جوڑنے سے اور اسی طرح مصرع سوم و چہارم سے مادہ تاریخ نکلتا ہے وہو ہذا۔ بادشاہ دہر بابر باکمال عدل بود + واقف جہان عالم مصدر لطف الہ + سال جانِ او گزیدن جا بفردوس بگو جای فردوس آمد گزید بابر بادشاہ

مولانا شہاب الدین معمائی نے یہ تاریخ بھی لکھی ہے جس سے ہمایوں کا سنہ جلوس بھی برآمد ہوتا ہے "شہ خسروان شاہ بابر کہ داشت + در صد بندہ مانند جمشید و کے محمد ہمایون بجائش نشست چو طومار عمرش اجل کرد طے چو پرسند تاریخ اے دل بگو + ہمایون بود وارث ملک وے + دیگر پادشاہی کہ شہر یار انش + بندہ بودند حشم و منقاد + چو خدائی ندید در عالم + رفت در عالم خرابکاد"

بندہ ... سال وفات او ز ... گفت + ہمسر ... ازین ... د ر ۱ ی

بابر کی قبر پر سنگ مرمر کے دو لوح نصب کئے گئے اور جیسا کہ مشرق میں عام رواج ہے کتبہ کے ایک حصہ کے مختلف حروف سے بابر کے وفات کا سنہ ہجری معلوم ہوتا ہے۔ یہ مادہ تاریخ اس موقع پر بہت اچھا معلوم ہوتا ہے ؎

شد چو فردوسش مکان رضوان زمن تاریخ جست — گفتمش فردوس دایم جای بابر بادشاہ[1]

اس بادشاہ کے مزار کے قریب اس کی بیگمات اور اولاد مدفون ہیں اور یہ چھوٹا باغ چاروں طرف سنگ مرمر کی دیوار سے گھیر دیا گیا تھا۔ ایک شفاف رواں چشمہ اب بھی اس قبرستان کے خوشبودار پھولوں کی آبپاشی کرتا ہے فرصت اور تعطیل کے اوقات میں باشندگان کابل کا یہاں بڑا ہجوم ہوتا ہے۔ قبر کے سامنے ایک چھوٹی اور پاکیزہ مسجد سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہے۔ اس پر جو عبارت کندہ ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہجہاں[2] بادشاہ کے حکم سے یہ مسجد ۱۶۴۰ء میں تعمیر کی گئی تھی کہ غریب مسلمان یہاں نماز ادا کر سکیں[3]۔

اس پہاڑی سے جہاں سے بابر کا مقبرہ نظر آتا ہے نہایت خوشنما نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ اس کے نیچے شہر کے باغات سرسبز و شاداب نظر آتے ہیں بابر کے خاص الفاظ یہ ہیں "موسم بہار میں سرسبزی اور پھولوں کی شادابی کابل کو رشک فردوس بنا دیتی ہیں۔"

بابر نے اپنی عادات و خصایل کا مرقع ایسے الفاظ میں کھینچا ہے کہ ہر ایک فیاض دل شخص سمجھ سکتا ہے۔ وہ کامل تربیت یافتہ، شریف اور سپاہی تھا۔ اس میں دور اندیشی، علم، عزم، ثبات، حوصلہ مندی اور فیاضی اور تمام وہ اوصاف جن سے شرافت ماخوذ ہے، موجود تھے علاوہ شان اوسکی پیشانی سے عیاں تھی۔ مسٹر ارسکن مترجم تزک بابری نے انکا نہایت عاقلانہ خلاصہ لکھا ہے +

بابر کے عادات و خصائل میں جو انوکھی خوبی ہے وہ یہ ہے کہ وہ دوسرے مشرقی فرمانرواؤں سے غیر مشابہ ہے۔ یعنی مشرقی فرمانروا شان

---

[1] مولف نے صرف آخری بیت درج کتاب کی ہے پورا کتبہ یہ ہے ؎ بادشاہی کز جبینش تافتے نور آلہ + آن ظہیر الدین محمد بود بابر بادشاہ + باشکوہ و دولت اقبال و عدل و داد و دیں + اوست از توفیق و فیض و فتح فیروزی سپاہ + عالم اجسام را بگرفت و شد روشن رواں + بہر فتح عالم ارواح چون نور نگاہ + شد چو فردوسش مکاں رضوان زمن تاریخ جست + گفتمش فردوس دایم جای بابر بادشاہ + بابر کی لاش کو پہلے چھ ماہ تک باغ نور افشان واقع سواد اکبرآباد میں جو اب رام باغ مشہور ہے امانت رکھا گیا بعد میں کابل لیجاکر دفن کیا گیا۔ خواجہ کلان بیگ نے بابر کے مرثیہ میں یہ شعر لکھا تھا ؎

بے تو زمانہ و فلک بیدہ ارحیف — باشد زمانہ و تو نباشی ہزار حیف +

[2] کتبہ مسجد روضہ بابر شاہ۔ این مسجد لطیف و معبد شریف کہ سجدہ گاہ قدسیاں ہست و جلوہ گہ کرّوبیاں، بفرمان اوب معلی اعلیٰ نظرگاہ عالم بالا یعنی روضہ منورہ بادشاہ غفران پناہ رضواں دستگاہ حضرت فردوس کانی ظہیر الدین محمد بابر شاہ غازی کہ جز آن عمارتی نتواں ساخت بفرمود این نیازمند تمام شکر سراسر ستائش سراپا نمائش درگاہ الٰہی ابوالمظفر شہاب الدین محمد صاحبقران ثانی شاہجہاں بادشاہ بعد فتح بلخ و بدخشاں و سر نذر محمد خان از بلخ و شرغاں و تعاقب طریقے از کار طلبان سردار سے اورہ آن سرزمیں بان گروہ فیروزی و منہزمیت اوظفر سپاہ منزم نمود، آن میدان کہ محض کرم کارساز حقیقی نصیب این نیازمند دولت خواہ این بندہ شرمندہ احسان حضرت یزدان گشتہ آخر سال نوزدہم جلوس میمنت مانوس موافق یکہزار و پنجاہ و شش در عرصہ دو سال بچہل ہزار روپیہ انعام یافت

[3] برنس صاحب کا سفرنامہ بخارا بحوالہ مسٹر ارسکن مولف۔

دنمائش، رسم ورواج کے پابند اور ریائی چال چلن کے لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے خلاف بابر کے عادات اصل فطرتی تھے۔ وہ زندہ دل تھا اس میں شفقت اور سادگی پائی جاتی تھی اور اس نے محبت اور معمولی زندگی کے بہترین خیالات کو سلطنت کے ساتھ قائم رکھا ہم کو ایسے فرمانروا کم نظر آئیں گے جو ذہن اور لوازمۂ سلطنت میں بابر سے اعلیٰ مرتبہ پانے کے مستحق ہوں۔ اس کا پوتا اکبر شاید اپنی عمیق اور فیاض حکمت عملی کیوجہ سے اس سے سبقت لیجائے۔ اورنگ زیب کی کجرفتار حکمت عملی اس تعریف کی مستحق نہیں ہے۔ چنگیز خان اور تیمور کی قابلیت صرف عالیشان فتوحات ہی پر ختم ہوجاتی ہے۔ جو بابر کی کامیابیوں سے ضرور بڑھکر ہیں لیکن کیا بلحاظ مشغولی خاطر، اور اعتدال کیفیات خوش مزاجی اور شکستہ دل نہ ہونے کے جسکے ساتھ اس نے اپنی انتہائی خوش نصیبی اور بدبختی کو نباہا، اور کیا بلحاظ اخلاقی اور مردانگی کی خوبیوں کے جو اور فرمانرواؤں کے حصہ میں شاذ آتی ہیں، اور کیا بلحاظ علم ادب کی قدردانی اور اس کی اشاعت میں کامیابی کے بابر اور دوسرے ایشیائی شہزادوں میں ممتاز نظر آتا ہے جنہیں سے کوئی بابر کا مقابل نہیں ہوسکتا "

بابر کے دو مقولوں کے مقابلہ کرنے سے اس کی کل عملی کارروائیوں کا گر معلوم ہوتا ہے چونکہ فتحیابی حاصل کرنے اور سلطنت کو وسیع کرنے کا مجھے بڑا حوصلہ تھا لہذا میں ایک یا دو شکست کی وجہ سے خاموش نہ بیٹھتا تھا کہ کاہل کیطرح ادھر ادھر دیکھوں " اور پھر کہتا ہے " کوئی سمجھ دار آدمی کیسے اپنی عادات وخصائل میں وہ طریقہ روا رکھ سکتا ہے جس کی وجہ سے اس کے مرنے کے بعد اسکی نیکنامی پر دھبہ لگے ؟ عقل نے نیکنامی کو ایک دوسری زندگی بتایا ہے۔

مشرقی اور مغربی زندگی کے حالات بالکل مختلف ہیں۔ ہمارے اور ان کے درمیان موت کا نہایت پیچیدہ چشمہ بہتا ہے اگر ہم زمانہ اور حالت کے ان اختلافات کا ضروری لحاظ مرلرز خاطر کرسکیں تو بابر کسی طرح پر بہ حیثیت سپہ سالار، مدبر اور ادیب ہونے کے سیزر[۵۱] سے کم رتبہ پانے کا سزاوار نہیں ہے۔ اس کے خصایل سیزر سے زیادہ پسندیدہ ہیں جو ہمیں فرانس اور نیویری ہنری چہارم[۵۲] کی یاد دلاتے ہیں۔ اس نے ہندوستان کو فتح کرکے ایک عظیم الشان طاقتور سلطنت کی بنیا درکھدی اگر اس کی سب باتوں پر مجموعی لحاظ کرو تو وہ مغل بادشاہوں میں سب سے زیادہ تعریف کے لائق تھا۔

سید عبد السبحان ناظر

---

۵۱ رومن سپہ سالار جو بعد میں بادشاہ بھی ہوگیا تھا زبردست مقرر، بمثل مقنن، اور مورخ تھا ولادت ۱۰۰ برس اور وفات ۴۴ برس قبل مسیح۔

۵۲ فرانس کا ہنری چہارم ولادت ۱۵۵۳ء وفات ۱۶۱۰ء۔ فرقہ پروٹسٹنٹ کا سرغنہ ہنری نیویری کی لقب سے بہت ناموری حاصل کی لیکن فرانس کا بادشاہ ہوتے ہی اُسنے رومن کیتھولک مذہب اختیار کرنا مناسب سمجھا مگر اسکی ہمدردی فرقہ پروٹسٹنٹ کیساتھ قائم رہی۔ ریولیک ایک متعصب عیسائی کے ہاتھ سے قتل ہوا اور پریشان حال مملکت سے ایک مضبوط اور عاقل حکمران کا سایہ اٹھ گیا۔

لارڈ رپن کا عہد حکومت

(۹)

نظام کی تخت نشینی

"۳- فروری ——— ہم ریزیڈنسی کے باہر خیموں میں ٹھہرائے گئے ہیں۔ خورشید جاہ نظام کی طرف سے سب کی آؤ بھگت کر رہے ہیں۔ کمشنر انچیف، وائسرائے اور گورسٹ[۵۱] سب موجود ہیں۔ موخر الذکر بطور سیاح قیام پزیر ہیں۔ مجھ سے کہتے ہیں کہ چلئے آپ کو بلاتے ہیں اس لئے کہ عنقریب پارلیمنٹ میں بہت بڑی مہم شروع ہونے والی ہے چرچل کی تقریروں کے متعلق دیر تک بات چیت رہی۔ وہ میری طرح ان کی آئرلینڈ والی تقریر کو پسند کرتے ہیں۔ لیکن میں حرف بحرف اس سے متفق نہیں ہوں کیونکہ میں اسے خود مختار دیکھنا چاہتا ہوں +

" ہمنے ریزیڈنسی میں وائسرائے کے ساتھ کھانا کھایا جنھوں نے ہمارا نہایت تپاک سے پرجوش استقبال کیا۔ کلارک اور کی سے ملاقات کی۔ کلارک کچھ مایوس سے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کارڈری اور خورشید جاہ کامیاب ہوں گے۔ حیدرآباد میں ہیضہ کی افواہ دیدہ ودانستہ پھیلائی گئی ہے تاکہ وائسرائے تک اصلی خبریں نہ پہنچ سکیں۔ کی نے لارڈ رپن کے نام ریوے کی اسکیم کے بارے میں چٹھی لکھی ہے جو یقیناً روپیہ ضائع کرنے کا باعث ہوگی۔ بولارم جیسی دور جگہ رہنے سے جس قدر تکلیف پہنچ رہی ہے وہ حد بیان سے باہر ہے۔ لارڈ رپن بھی سخت اکتا گئے ہیں +

ہمنے ریزیڈنسی میں کھانا کھایا۔ اینی لارڈ رپن اور مسٹر گرانٹ ڈف کے درمیاں بیٹھی تھیں اور میں پرم روز کے برابر نشستوں کا یہ انتظام خاص طور پر کیا گیا تھا۔ میں تمام وقت پرم روز سے باتوں میں مشغول رہا۔ ہم بہت صفائی کے ساتھ سیاسیات پر بحث کر رہے تھے اور میں نے کہا کہ سیاسیات میں سچائی برتنا زیادہ فائدہ بخش ہے۔ انھوں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ نہ تو لارڈ رپن نے اور نہ خود میں نے پبلک معاملات میں کبھی جھوٹ سے کام لیا۔ زیادہ سے زیادہ میں اسوقت جھوٹ بولتا ہوں جبکہ بے معنی سوالات کئے جاتے ہیں اور ایسے مواقع پر جھوٹ بولنے کی کبھی کبھی ضرورت پڑ ہی جاتی ہے۔ انھوں نے لارڈ ڈفرن[۵۲] کے متعلق میری رائے پوچھی۔ میں نے کہا کہ میں انھیں سنجیدہ آدمی نہیں سمجھتا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ بعض امور میں کامیاب وائسرائے ثابت ہوں گے

---

۵۱ Gorset-

۵۲ Lord Dufferin.

کیونکہ وہ خوش اخلاقی، ہمدردی اور عمدہ تقریروں کے ذریعے ہندوستانیوں کے دلوں کو موہ لیں گے لیکن وہ انہیں آزادی دینے کے بارے میں کچھ کام نہیں کریں گے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ میں مالاباری سے خط کتابت کر رہا ہوں اور انھوں نے البرٹ بل کے بارے میں صاف صاف اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے۔ میں نے ان کا ایک خط سولین کو دکھایا تھا جس نے پڑھنے کے بعد یہ کہا کہ ایک دیسی میں اس قسم کا خط لکھنے کی کیسے ہمت ہو سکتی ہے؟ میں نے انھیں متنبہ کر دیا ہے کہ وہ مجھوٹے جیسی غلطی کا دوبارہ ارتکاب نہ کریں۔ انھوں نے کہا کہ "آئندہ نسلیں لارڈ رپن کو محسن کے بجائے غدار تصور کریں گی۔"

پٹنہ والے واقعہ کے بارے میں بھی بات چیت رہی۔ وہ کہتے ہیں کہ تحقیقات ہو رہی ہے۔ میں نے کہا کہ سولین لوگوں کے ذریعہ تحقیقات کا کام انجام نہیں پانا چاہیئے۔ اس کے بعد والسٹر پارلن کا نام لیکر کہا کہ تحقیقات ان کے سپرد کر دینی چاہیئے۔ انھوں نے کلکتہ پہنچنے کے بعد باقاعدہ تحقیقات کرنے کا وعدہ کیا ہے ٹریور ہمیں دور سے بھانپ رہا ہے لیکن ہماری آواز اس تک نہیں پہنچ سکتی۔ کارڈری بھی پریشان ہے۔ لارڈ رپن نے اب تک اس سے بات چیت نہیں کی۔

ڈنر کے بعد لارڈ رپن مجھے اندر کے کمرے میں لے گئے اور پوچھا کہ آیا نظام اپنے دلی ارادوں کو صاف صاف بیان کر دیں گے یا نہیں۔ میں نے جواب دیا کہ اس کا دار و مدار آپ کے طریقۂ گفتگو پر ہے اور اگر آپ ان کے کندھے پر ہاتھ رکھکر خوش اخلاقی سے انھیں یقین دلائیں گے کہ اپنے ارادوں کو صاف صاف بیان کر دینے سے آپ کو نہ تو تخت سے اتارا جائیگا اور نہ کسی اور قسم کی سزا دی جائیگی تو بلا شبہہ وہ اپنے جذبات کا اظہار کر دیں گے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ لوگوں نے (میری مراد کارڈری سے تھی) انہیں خوفزدہ کر دیا ہے اور اس لئے ضرورت دلاسے اور نرمی کی ہے۔ لارڈ رپن نے کہا کہ ایسے آدمی کی اشد ضرورت ہے جو نظام کے بھلے کی خاطر دیوان کو صلاح و مشورہ دے۔ ان کے یہاں جس قدر انگریز ہیں وہ تو روپیہ کے بھوکے ہیں اور سارا اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے جواباً کہا کہ ایسا آدمی چاہئے جو ریاست حیدرآباد کا بھی خواہ ہو اور اگر ارادہ موجود ہو تو ایسے شخص کے ملنے میں کوئی دقت نہ ہوگی۔ اگر میرے پاس وقت ہوتا تو یہ خدمت میں انجام دے سکتا تھا۔ اس کے بعد میں نے یونیورسٹی کے قیام کا تذکرہ کیا اور یہ دیکھکر کہ وہ دلچسپی کے ساتھ سن رہے ہیں میں نے یہ کہا کہ نظام آپ کو اس کا پیٹرن[1] بنانا چاہتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ آپ اظہار پسندیدگی کریں گے۔ لارڈ رپن نے کہا مجھے یہ اسکیم پسند ہے اور میں اس کا مربی ہونا قبول کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس سے بیحد فائدہ پہنچیگا لیکن اس کی بنا مذہب پر ہونی چاہیئے۔ میں خود نظام کو آمادہ کروں گا کہ وہ اسکی ابتدا کریں۔ میرے سوال کے جواب میں انہوں نے مذاق آمیز لہجہ سے کہا کہ میں تم کو بغاوت پھیلانے کے جرم سے بری کرتا ہوں یہ یقیناً اطمینان بخش ہے۔

۴ فروری ——— رات کو مجھے یکایک خیال آیا کہ مور تمام معاملات کو سدھارنے میں کامیاب ہو جائیگا اور اس لئے میں ان کا نام مشیر دیوان کے طور پر لارڈ رپن کے روبرو پیش کر دونگا۔ کھانا کھانے کے وقت میں پرم روز کے برابر بیٹھا۔ فادر گر

[1] (مربی) Patron [2] Godley

بھی میرے پاس بیٹھے تھے میں نے انھیں بتایا کہ دفتر خارجہ کو اندیشہ ہے کہ کہیں لارڈ رپن صوبۂ برار نظام کو واپس نہ کردیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے بدنظمی پر چشم پوشی کی تاکہ واپسی صوبہ ناممکن ہوجائے۔ برار کا قبضہ دفتر خارجہ کی پالیسی کا نہایت اہم جزو ہے اور اس لئے اُس نے ہر قسم کے ذرائع استعمال کرنے میں پس و پیش نہیں کیا۔ ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ پرم روز کو لارڈ رپن نے بلا بھیجا۔ تھوڑی دیر بعد نظام کی تشریف آوری کے لئے گارڈ آف آنر اور بینڈ آپہنچا اور ہم اپنے خیموں میں چلے گئے۔

پرم روز نے آج مجھ سے یہ بات کہی ہے کہ میری گاہ بگاہ گاڈسٹے سے خط و کتابت رہتی ہے اور یہ کہ گاڈسٹے کی طرح میں بھی جنگ مصر کے خلاف ہوں۔ میں نے اُنہیں متنبہ کر دیا ہے کہ مہدی کے خلاف ہندوستانی افواج نہ بھیجی جائیں اس لئے کہ مسلمانوں کا غصہ مشتعل ہوجائیگا۔ (انھوں نے جواب دیا کہ ۱۸۸۲ء میں یہ مسئلہ درپیش تھا کہ اگر افواج بھیجی گئیں تو مسلمان اُس کے متعلق کیا خیال کریں گے۔ لیکن اب اس قسم کا کوئی سوال پیش نظر نہیں ہے۔) وہ سلطان المعظم کا بیحد احترام کرتے ہیں۔

جب نظام تشریف لائے تو ۲۱ توپوں کی سلامی سر کی گئی۔ والٹر پالن کی زبانی مجھے اطلاع ملی ہے کہ ہز ہائنیس کی نصف گھنٹے تک وائسرائے سے بات چیت رہی۔ لنچ کے موقع پر میں سالار جنگ کے برابر بیٹھا اور انھیں دلایا کہ انتخاب دیوان کا معاملہ نظام کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے گا۔ انھوں نے چند بار مجھ سے پوچھا کہ، کیا لارڈ رپن ہمارے بہی خواہ ہیں؟، میں نے انھیں اطمینان دلایا کہ لارڈ رپن بذات خاص تو ریاست کی بھلائی چاہتے ہیں مگر دفتر خارجہ بھلائی نہیں چاہتا۔ وائسرائے اور دفتر خارجہ دو مختلف چیزیں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ، ہاں۔ ہم بھی ایسا ہی خیال کرتے ہیں۔ لیکن کیا لارڈ رپن کے متعلق آپ کو یقین ہے؟، میں نے کہا کہ، بیشک۔ ساتھ ہی میں یہ تجویز پیش کرنے والا ہوں کہ دیوان کو مشورہ دینے کے لئے کسی انگریز کا تقرر کیا جائے لیکن یہ تقرر انگریزی مفاد کے لئے نہیں بلکہ حیدرآباد کے مفاد کے لئے عمل میں لایا جائے۔

اس کے بعد میں نے یونیورسٹی کے متعلق بات چیت کی اور ان سے درخواست کی کہ نظام پر زور ڈالیں تاکہ وہ اس کا ذکر لارڈ رپن سے کردیں۔ اس کے بعد میں نے اُنہیں نصیحت کے چند الفاظ کہے۔ آپ غالباً دیوان مقرر کردے جائیں گے اور نظام کے بعد ہندوستان میں آپ ہی سب سے بڑے مسلمان ہوں گے۔ اگر آپ دنیائے اسلام کی رہنمائی کرنا چاہتے ہیں تو ہیں ہرگز ہرگز ان کے تعصبات کو مشتعل کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ آپ بیچ کا راستہ اختیار کریں۔ فوج کا جنرل موقع دیکھنے کیلئے ہراول کے ساتھ آگے نہیں جاتا۔ وہ قلب کے ساتھ رہتا ہے۔ یہی کام آپ کو کرنا ہوگا۔ اپنے لباس اور خیالات میں ضرورت سے زیادہ یورپین نہ بنئے یا کم سے کم زبان میں ان کا بہت زیادہ تتبع نہ کیجئے اس سے مسلمان ناراض ہوں گے۔ انھوں نے کہا کہ، میری جیسی تربیت پائے ہوئے شخص کے لئے ایسا کرنا مشکل ہے۔ لیکن مین نے کہا کہ اگر آپ اہم سیاسی کام کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو کچھ نہ کچھ قربانی کرنی پڑیگی۔ کم سے کم علی گڈھ والوں جیسا نہ بن جائیے۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں سید احمد کی بالکل پروا نہیں کرتا۔ میرے والد انھیں ہمیشہ بیوقوف سمجھتے رہے۔ وہ صرف دکھاوا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں یہ بات کہنے کی تو جرأت

نہیں کرتا تاہم آپ محتاط رہئے اور اعتدال کو ہاتھ سے جانے نہ دیجئے +

میرا خیال ہے کہ لائق علی دیوان ہو جائیں گے اور اگر انھیں اچھا مشیر مل گیا تو وہ بہت اچھے وزیر بن سکیں گے لیکن انکے مزاج میں ابھی بچپن ہے۔ گفتگو وہ ایسے طریقہ سے کرتے ہیں کہ اجنبی شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ بدمزاج اور اکھڑ ہیں۔ چنانچہ بعض اشخاص کی ان کی نسبت یہی رائے ہے۔ سالار جنگ نے رسول یار خاں کو میرے آنے کی اطلاع نہیں دی۔ میرا خیال ہے کہ سٹوارٹ بیلی[51] نے انھیں، نظام اور وقار الامرا کو میرے خلاف تنبیہ کردی ہے۔ سالار جنگ آج بھی اسی تپاک سے ملے جس طرح سے کہ پہلے ملے تھے۔ مگر وہ ذرا پریشان معلوم ہوتے تھے اور انھیں اندیشہ تھا کہ کہیں کوئی شخص انکی نگرانی تو نہیں کر رہا ہے +

ہم نے کیمپ میں کھانا کھایا جہاں بہت سے افسر مدعو تھے۔ میں مسٹر لیمبرٹ[52] کے پاس بیٹھا۔ یہ خفیہ پولیس کے افسر اعلیٰ ہیں کہتے تھے کہ میں نے پٹنہ کے واقعہ کا حال پرم روز سے سنا ہے اور اب میں تحقیقات میں مصروف ہوں۔ میں نے سارا واقعہ شروع سے آخر تک بیان کردیا۔ انھیں پورے واقعات معلوم نہیں تھے اور انھوں نے اس پر اظہار تعجب کرتے ہوئے کہا کہ ۱۲ سال کی ملازمت کے دوران میں میں نے ایسا واقعہ نہیں سنا۔ ان کے نزدیک یہ امر قابل یقین نہیں ہے کہ ریلوے کے اسٹیشنوں پر ہندوستانیوں کی بیعزتی روا رکھی جاتی ہے اور بظاہر وہ میرے بیان کو بھی مشکوک سمجھتے تھے۔ لیکن جہاں تک اس خاص واقعہ کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ میں انھیں یقین دلانے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔

ساڑھے نو بجے ہم وائسرائے کی لیوی[53] میں گئے اور جونہی لارڈ رپن نے مجھے دیکھا معاً وہ ہاتھ ملتے ہوئے میری جانب بڑھے اور کہا کہ میں نے نظام سے گفتگو کی ہے اور میں اپنے تئیں خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ انھوں نے اپنے دلی جذبات کا اظہار کردیا ہے! لارڈ رپن نے ٹھیک طور سے نہیں بتایا کہ دلی جذبات سے کیا مراد ہے تاہم مابعد کی ملاقات میں اُن سے معلوم ہوا کہ بعض باتیں ایسی بیان کی گئی ہیں جن سے ان کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اُن کی خواہشات کے بارے میں شبہ کی گنجائش نہیں۔ انھوں نے اپنے خیالات کو نہایت زور اور قطعی فیصلہ کے ساتھ پیش کردیا ہے اور میرا خیال ہے کہ ان کی پیروی کرنی چاہئے۔ میں نے دیوان کا نام معلوم کرنے کے لئے اصرار نہیں کیا لیکن میرا خیال ہے کہ وہ سالار جنگ ہی ہوں گے۔ میں نے پوچھا کہ کیا آپ پر اس ملاقات کا اچھا اثر پڑا ہے؟ انھوں نے کہا کہ، بلاشبہ وہ اپنی رائے رکھتے ہیں۔ لیکن میں نے انھیں ایسی ایسی باتیں سنادی ہیں جن کو وہ دوبارہ سننا پسند نہیں کریں گے۔ اور جو ان کے لئے مفید ثابت ہوں گی۔ لارڈ رپن میرے ذریعہ سے یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ خود نظام کی اس ملاقات کے بارے میں کیا رائے ہے۔ میں غالباً کل معلوم کرسکوں گا +

"اس کے بعد میں نے مشیر دیوان کے تقرر کی تجویز پیش کی جس کا کام یہ ہوگا کہ حیدر آباد کے مفاد کے لئے کام کرے۔ میں نے

۵۱ Stewart Baily

۵۲ Lambert-

۵۳ Levee

ساتھ ہی دفتر خارجہ کی پالیسی بھی بتادی جو وہ برار کے متعلق عمل میں لانا چاہتا ہے۔ لارڈ رپن نے میرے نقطۂ خیال سے اتفاق رائے نہیں کیا۔ پھر کہا کہ، کیا ہم اس طریقہ سے حیدرآباد میں اور زیادہ انگریز داخل نہ کردیں گے ؟ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعداد ضرورت سے بہت زیادہ ہے میں ان سب کو نکال دینا چاہتا ہوں "میں نے جواب دیا کہ، بلاشبہ سب کو نکال دیجئے۔ پھر میں نے کہا کہ یہ فرض منصبی مؤر کے سپرد کیا جاسکتا ہے اس لئے کہ وہ ایسا شخص ہے جو ہندوستانی اقوام کو پورے طور سے سمجھتا ہے اور ان کے ساتھ ہمدردی رکھتا ہے اور درحقیقت اُن کی بھلائی چاہتا ہے +

اس طریقہ سے ہماری گفتگو پندرہ منٹ تک ہوتی رہی۔ غریب کارڈری مجھے بھانپ رہا تھا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ وائسرائے کے مشیر کی حیثیت سے وہ میری پوزیشن کے متعلق کیا خیالات رکھتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ اس ملک میں سیاسیات کا انتظام کس عجیب و غریب طریقہ سے کیا جاتا ہے۔ میری جیب میں اخراج مصر کا حکم پڑا ہوا ہے گویا کہ میں مشہور و معروف باغی ہوں +

۵۔ فروری ـــــــ ہم چو محل نامی محل میں گئے۔ یہی وہ قدیم محل ہے جہاں تخت نشینی کے مراسم ادا کئے جاتے ہیں اور جہاں محبوب علی تخت نشین ہوئے۔ تمام شہر جھنڈیوں سے آراستہ تھا۔ ہم اس ہال میں گئے جہاں دربار منعقد کئے جاتے ہیں۔ یہاں امرا اور انگریز افسر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہماری نشستیں پہلے سے مخصوص کردی گئی تھیں میں تخت سے ذرا دور بیٹھا لیمبرٹ بالکل برابر تھے اور گورسٹ قریب تھے۔ گھنٹہ بھر کا وقفہ ہم نے رسول یار خاں اور سید حسین بلگرامی سے گفتگو کرنے میں گذارا۔ وہ دونو خوش تھے اس لئے کہ گذشتہ رات کو دو بجے اعلان ہوگیا تھا کہ سالار جنگ منیر الملک اور دیوان مقرر کئے جاتے ہیں اگرچہ آخر وقت تک یہ یقین کیا جاتا تھا کہ کارڈری اور دفتر خارجہ کامیاب ہوں گے۔

اس خبر نے بہت ابتری اور ہلچل پیدا کردی۔ بشیر الدولہ گاڑی میں بیٹھتے وقت غش کھاکر گر پڑے کیونکہ انھیں یہ خبر پہنچائی گئی تھی کہ ان کی کرسی خورشید جاہ کی کرسی سے بہت نیچے رکھی گئی ہے، اور اس لئے وہ سیدھے گھر چلے گئے۔ لیکن سالار جنگ کی فتح کی تکمیل اس وقت ہوئی جبکہ وہ اور سعادت علی نظام کی معیت میں زرد پگڑیاں باندھے ہوئے پہنچے سالار جنگ کے چہرے سے تمکنت ٹپکتی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس اعزاز سے غیر معمولی طور پر متاثر نہیں ہوئے نظام اور وائسرائے ایک ساتھ داخل ہوئے اور اپنے اپنے تخت پر بیٹھ گئے۔ مسٹر ہینڈرسن[1] کے اعلان کے بعد لارڈ رپن نے نہایت عمدہ تقریر کی جو بہترین جذبات اور نصائح سے مملو تھی اگرچہ ذاتی طور پر مجھے ذرا نا امیدی ہوئی کہ انھوں نے اس امر کا ذکر کیوں نہیں کیا کہ نظام ہندوستانی مسلمانوں کے سرتاج ہیں۔ ممکن ہے کہ اسے نامناسب سمجھا گیا ہو۔ لارڈ رپن نے بلاشبہ سر سالار جنگ مرحوم کی خدمات کا اعتراف کیا اور انڈین گورنمنٹ کی جانب سے اس پالیسی کا اعلان کیا کہ نظام کی ریاست کے ساتھ اس کے تعلقات دوستانہ رہیں گے اور یہ کہ وہ اعلیٰ نظام سلطنت اور ترقی کی حمایت کریگی +

---

[1] Mr Henderson . ط

اسپیچ کا میرے دل پر اس قدر اثر ہوا کہ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ یہی حالت نظام کی تھی۔ ان کی جوابی تقریر کی آواز مجھ تک نہ پہنچ سکی۔ مگر انھوں نے اپنے وقار کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ سب سے آخر میں فوٹو اتارا گیا۔ سالار جنگ، پیشکار اور خورشید جاہ کو تلواریں عطا ہوئیں۔ موخرالذکر کا قبضہ ہاتھی دانت کا تھا اسے دیکھکر کا غذ تراش کی یاد تازہ ہو جاتی تھی مبادا وہ گھر جاکر خودکشی کرے کیونکہ وہ بہت ناراض تھا۔ لارڈ رپن کی آواز دلکش ہے اور ان کی تقریر بالعموم وعظ کا رنگ لئے ہوئے ہوتی ہے جو اس موقع کیلئے نہایت موزوں تھی۔ میرا خیال ہے کہ سالار جنگ کا تقریر بالعموم پسند کیا جائیگا۔

یہاں سے ہم مسز کلارک کے مکان پر پہنچے جہاں کمشنر انجیف اور سر فریڈرک رابرٹس[۵۱] کے ساتھ ہم نے لنچ کھایا۔ محل اور شہر میں جو چراغاں کیا گیا تھا، اس کی نظیر میں نے پیرس کے انتہائی عروج کے زمانہ میں بھی نہیں دیکھی۔ ڈنر کے موقع پر ۲۰۰ اشخاص موجود تھے میں دفتر خارجہ کے مترجم اور ایرانی اتاشی[۵۲] کے پاس بیٹھا جن سے بہت دیر تک سبق آموز گفتگو ہوتی رہی۔ ان کی تعلیم پیٹا ورکے مسیحی اسکول میں ہوئی ہے اور اس لئے وہ کسی قدر مذہب سے دور ہٹ گئے ہیں مگر باوجود اس کے وہ اچھے سنی ہیں۔ میں نے جنگ افغانستان کے متعلق ان کی رائے پوچھی۔ انھوں نے کہا کہ نہ اسوقت میں اس کے موافق تھا اور نہ اب وہ جنگ شیر علی کے روسیوں کے ساتھ سازش کرنے کا نتیجہ تھی۔ انھوں نے یہاں تک کہا کہ سب مسلمان دل سے اس کے خلاف تھے اور اگر کوئی مسلمان یہہ کہدے کہ میں اس کے موافق ہوں تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ منافق ہے۔ ہندوستان کے مسلمان بحیثیت قوم وفادار رہے لیکن سب کے سب نہیں۔ انھوں نے ان کے باہمی تفرقات پر اظہار افسوس کیا اور کہا کہ آپ بہت مفید کام کر رہے ہیں کہ انہیں مجتمع کر رہے ہیں اگر وہ متحد ہو جائیں اور انھیں اپنی طاقت کا صحیح اندازہ ہو جائے تو گورنمنٹ مجبوراً ان کا کہا مانے گی۔ وہ میجر نیپیر[۵۳] کے ساتھ ایران جا چکے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ ایرانی ایک نہ ایک دن روس کے چنگل میں پھنس جائیں گے۔ ان کی تعداد دن بدن کم ہو رہی ہے اتنے بڑے ملک میں ان کی تعداد صرف ۵۰ لاکھ ہے۔ برخلاف اس کے افغانستان زیادہ خوشحال ہے۔ میرے ہم ملکی انگریزوں کے علاوہ اور کسی سے دغا نہیں کرتے کیونکہ وہ انھیں جاسوس قرار دیتے ہیں۔

۷ فروری ——— فریدالدین کے پاس سے تار موصول ہوا جس میں الہ آباد کے مسلمانوں کی طرف سے نظام کو مبارکباد پیش کیگئی تھی۔ سالار جنگ کو میں نے خط لکھا ہے اور ان سے استدعا کی ہے کہ آپ نظام سے کہیں کہ وائسرائے سے یونیورسٹی کا تذکرہ کریں کیونکہ وائسرائے اور این متوقع ہیں کہ نظام از خود اس مضمون کو چھیڑیں گے۔ اگر یہاں سرگرمی سے اس تحریک کو شروع نہیں کیا گیا تو پھر میں لکھنؤ کی جانب اپنی توجہ مبذول کرونگا۔ سر فریڈرک رابرٹس سے مصر اور مہدی کے متعلق طویل گفتگو رہی۔ آج کے تاروں سے معلوم ہوتا ہے کہ بیکر[۵۴] کی فوج

[۵۱] Sir Fredrick Roberts
[۵۲] Attache
[۵۳] Major Napier
[۵۴] Baker

بھاگ رہی ہے۔ بظاہر خدیو کی کچھ فوج مہدی سے جا ملی ہے۔ یہاں کے حکام ہندوستانی افواج پر آسرا رکھے بیٹھے ہیں۔ میں نے متنبہ کر دیا ہے کہ نہ صرف مسلمانان ہند بلکہ سب باشندے اس قسم کی کارروائی کو بہت بری نظر سے دیکھیں گے۔

شام کو بولارم میں وسیع پیمانے پر ضیافت تھی۔ لارڈ رپن مجھے تنہائی میں لے گئے اور پوچھا کہ ملاقات کے متعلق نظام کے اصلی خیالات کیا ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ آپ کے وعظ کا نظام پر اچھا اثر پڑا ہے اور میرے استفسار کرنے پر خود نظام نے اظہار اطمینان کیا ہے۔ نیز یہ کہ وہ یونیورسٹی سے بیحد دلچسپی لے رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ سری انگریزی یونیورسٹی قائم کیجائے۔ وائسرائے اس امر سے (سرو رنگ) خوش ہیں کہ مسلمانان ہندوستان نے نظام کی تخت نشینی کے مسئلہ میں دلچسپی لی ہے۔ لارڈ رپن کی خدمت میں۔ میں نے پھر یہ مشورہ پیش کیا ہے کہ مشیر دیوان کا تقرر کیا جائے جو ریزیڈنٹ سے کسی قسم کا تعلق و واسطہ نہ رکھے۔ لارڈ رپن سے اس مسئلہ پر گفتگو کرنے کے لئے کل وقت مقرر ہوا ہے۔

سید حسین بلگرامی کی یہ رائے ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا کبھی اس تجویز کو پسند نہیں کریگی۔ مزید برآن ایسے شخص کا ملنا دشوار ہے جس پر اعتماد کیا جا سکے۔ میں نے مور کا نام لیا۔ کہنے لگے کہ خود میری ان کے متعلق اعلیٰ رائے ہے لیکن حکومت ہند ہرگز راضی نہ ہوگی۔ میں نے کہا کہ لارڈ رپن بہت سی ایسی باتیں کر سکتے ہیں جنھیں حکومت ہند پسند نہیں کریگی اور اس لئے میری رائے میں اس خیال پر قائم رہنا چاہئے۔ کارڈیی کی ضیافت میں سید حسین کو دیکھکر مجھے خوشی حاصل ہوئی۔ ابھی دو ماہ پیشتر کا ذکر ہے کہ کارڈیی انھیں جلاوطن کرنے کا ارادہ کر چکا تھا اور انھیں نوٹس بھی دے چکا تھا کچھ شک نہیں کہ کارڈیی مشتعل ہے۔

"کرنیل ڈابس[٥١] کہتے ہیں کہ وزیر خارجہ اسٹیٹسمین کے خلاف ہتک عزت کے سلسلہ میں سرکاری کارروائی کی اجازت نہیں دیگا البتہ عبدالحق نجی کے طور پر مقدمہ چلا سکتے ہیں۔ جدید ریلوے کے متعلق ان کا خیال ہے کہ اس سے نفع ہوگا۔ بمبئی گزٹ[٥٢] کے ایڈیٹر گیری[٥٣] سے بھی دلچسپ بات چیت رہی۔

لارڈ رپن سے گفتگو کرتے وقت میں نے اپنی نا امیدی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے اپنی تقریر میں اس حقیقت کیجانب کیوں اشارہ نہیں کیا کہ نظام مسلمانان ہند کے سردار ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم نے یہ کہنے کی جرأت نہیں کی۔ ہمیں معلوم ہے کہ اگرچہ وہ مسلمان رئیس ہیں تاہم ان کی ہندو رعایا تعداد میں مسلمان رعایا سے کہیں زیادہ ہے۔ اس پر میں نے خاموشی اختیار کر لی۔

۷۔ فروری ——— لنچ کے بعد سر فریڈرک برٹس سے مصر میں انگریزی فوجی حالت کے بارے میں طویل گفتگو رہی۔ میں نے پوچھا کہ کیا یہ غلطی نہیں ہے کہ کسی ملک پر وہاں کے باشندوں کی مرضی کے خلاف خواہ مخواہ قبضہ جما لیا جائے اور ان سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ ابتدائی جنگی اصول میں یہ امر داخل ہے کہ مخالفانہ جذبات

٥١ Colonel Dobbs

٥٢ Bombay Gazette

٥٣ Geary

رکھنے والے ملک کے حتی الامکان قلیل ترین حصہ پر قبضہ رکھنا چاہئے اسی غلطی کا ارتکاب افغانستان میں کیا گیا۔ سب سے اچھی بات یہ ہوتی کہ باشندگان افغانستان سے کہدیا جاتا کہ تم اپنا حاکم منتخب کرلو اور اس طریقہ سے ان سے دوستانہ تعلقات قائم ہوجاتے لیکن حکام نے اپنا انتخاب کردہ شخص تخت پر بٹھایا اور اب وہ اسے تخت پر قائم رکھنے کے لئے وظیفہ کی ایک بہت بڑی رقم دینے پر مجبور ہوئے۔ میں نے کہا کہ خواہ کتنے ہی وظیفے کیوں نہ دئے جائیں توفیق تخت مصر پر قائم نہیں رہ سکیگا انھوں نے پوچھا کہ ع.بی نے نہر سویز کی مدافعت کیوں نہیں کی۔ میں نے جواب دیا کہ ان کا خیال تھا کہ انگریزوں سے صلح کرلیں گے مزید برآں وہ تمام یورپ کی دشمنی مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ مصر پر قبضہ رکھنا دشوار ہے کیونکہ شام سے اسپر بآسانی حملہ کیا جاسکتا ہے لیکن میں نے اس خیال کے ساتھ اتفاق رائے نہیں کیا۔ کیونکہ صرف ایک ہی راستہ ہے جہان سے فوجیں گذر سکتی ہیں اور وہاں سے ان کا لیجانا آسان کام نہیں۔ میں سر فریڈرک کو پسند کرتا ہوں۔ وہ بے تکلفانہ اپنے خیالات کا اظہار کردیتے ہیں مجھے ان کے اچھا سپاہی ہونے میں کچھ شبہ نہیں +

سہ پہر کو میر عالم کا تالاب دیکھنے کے لئے گئے۔ کارڈری نے ہمارے راستہ میں بہت مشکلات پیدا کیں مگر چونکہ وائسرائے ہماری طرف ہیں اس لئے ہم چلے گئے۔ نظام بہت خندہ پیشانی سے ملے۔ سالار جنگ ایک دو روز اور قیام کرنے کے لئے کہتے ہیں۔ ہم جھیل میں بہت دیر تک کشتی میں بیٹھے پھرا کئے۔ اس کے بعد فوٹو کھینچا گیا جسمیں میں عین وائسرائے کی کرسی کے پیچھے سالار جنگ اور کارڈری کے بیچ میں کھڑا ہوں۔ امین اور مسٹر و مسز گرانٹ ڈف نظام اور لارڈ رپن کے برابر بیٹھے ہیں اور وقار الامرا، سعادت علی، محمد علی بلٹ اور چند اور ایڈیکانگ سب سے پیچھے کھڑے ہیں۔ یہ فوٹو تاریخی ثابت ہوگا۔

۸۔ فروری —— آج صبح لارڈ رپن نے مجھے بلوا بھیجا اور واقعۂ پٹنہ پر گفتگو کی۔ میں نے کہا کہ معمولی طریقہ سے تحقیقات کرنے کے بجائے بہتر ہوگا اگر آپ اپنے کسی ایڈیکانگ (مثلاً وائسٹر پالن) کو خاص طور پر تحقیقات کے لئے مقرر کردیں۔ انھوں نے اس تجویز پر غور کرنے کا وعدہ کرلیا ہے۔ اس کے بعد میں نے ان سے کہا کہ مدراس میں رگوناتھ سے ملیں اور ساتھ ہی یہ بھی جتا دیا کہ حکام ان سے خوش نہیں ہیں۔ انھوں نے ان کا پتہ لکھ لیا ہے۔ اس کے بعد گارڈن کے متعلق گفتگو ہوتی رہی جسکے بارے میں آج یہ تار موصول ہوا ہے کہ اسے مہدی کی افواج نے گرفتار کرلیا ہے۔ میں نے کہا کہ میں بغیر کسی خطرے کے مہدی کے پاس جاسکتا ہوں اور ساتھ ہی اس شیخ کا ذکر کیا جو مہدی سے خط و کتابت رکھتا ہے اور کہا کہ یہ شخص بھی ہمراز ہوگا۔ لیکن انھوں نے کہا کہ گورنمنٹ آپ پر عتاب کی نظر رکھتی ہے اور اس لئے اندیشہ ہے کہ وہ آپ کی خدمات سے فائدہ نہیں اٹھائے گی۔ لیکن میں آپ کی سفارش کردوں گا بشرطیکہ میری رائے لی گئی +

سب سے آخر میں لارڈ رپن نے مجھ سے کہا کہ سالار جنگ سے کہدو کہ جس قدر جلد ممکن ہو ملک کی مالیات کے بارے اعلان شائع کردیں اور بتادیں کہ کسقدر رکمی ہے اور کسقدر قرض لینا چاہتے ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے مشورہ دیا کہ عبدالحق

Times of India ٹائمز

سے بگاڑ نہ کریں اس لئے کہ انڈیا آفس اس کی پشت پر ہے اور اگر اس کی جانب سے غفلت کی گئی تو ممکن ہے کہ وہ خوفناک شخص ثابت ہو۔ یہ بہتر ہوگا کہ اسے کوئی عہدہ دیدیا جائے۔ (یہ بات پیغام میں شامل نہ تھی) دانشمندی اسی میں ہے کہ عبد الحق کا منھ بند کردیا جائے۔ ریلوے کی اسکیم کے متعلق اُن کا خیال ہے کہ اس میں خسارہ نہیں رہیگا۔ سب سے آخر میں لارڈ رپن نے کہا کہ سالار جنگ کو میری جانب سے یقین دلادو کہ جب تک میں ہندوستان میں ہوں ان کی برابر حمایت کرتا رہوں گا۔ میں نے کہا کہ اگر آپ کے چلے جانے کے بعد سالار جنگ اور ریزیڈنٹ کے درمیاں تعلقات خراب ہوگئے تو ممکن ہے کہ اول الذکر آپ کو لکھیں۔ لارڈ رپن نے کہا کہ بہتر یہ ہے کہ اس مضمون کا کوئی پیغام نہ دیا جائے۔ تمھارے کہے بغیر وہ خود لکھینگے اور میں ہمیشہ حیدرآباد کی جانب اپنی توجہ مبذول رکھونگا اور اگر وہاں خرابی پیدا ہوگئی تو مجھے اس کی خبر یقیناً کی جائے گی۔ مجھے خوشی ہے کہ یہاں آنے سے مجھے لوگوں سے واقفیت ہوگئی اور میں ریاست کے معاملات سے ہمیشہ دلچسپی لیتا رہونگا۔ میں نے پوچھا کہ کیا نظام نے آپ سے یونیورسٹی کا ذکر کیا ہے۔ اس کا جواب انھوں نے اثبات میں دیا اور کہا کہ میں نے مشورہ دیا ہے کہ اس کی لاگت کا اندازہ کرلیں اور خواہ مخواہ یک لخت ایسی کارروائی نہ کربیٹھیں جس سے مالیات پر غیر معمولی دباؤ پڑجائے۔ میں نے کہا کہ روپے کے مقابلہ میں ہمیں آپ کی سرپرستی کی زیادہ ضرورت ہے۔ اس کے بعد میں نے ان کے مہربانی آمیز سلوک کا شکریہ ادا کیا اور جانے کی اجازت چاہی۔

وائسرائے اور گرانٹ ڈف آج مدراس جارہے ہیں اور ہم بھی جنہ رگھاٹ کا ارادہ کررہے ہیں۔ کارڈری دو تین دن اور قیام کرے گا اور اس کے بعد تین ماہ کی چھٹی پر انگلستان چلا جائیگا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ واپس نہیں آئیگا۔ ہم نے سید حسین بلگرامی کے ساتھ کھانا کھایا اور صورتِ حالات پر گفتگو کی۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے مالیات کے متعلق بیان تیار کردوں گا اور جسقدر کمی ہے اُس کو پورے طور پر دکھادوں گا۔ میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ تمام کارروائیوں میں ایمانداری کو ملحوظ رکھوں اس لئے کہ یہی بہترین ذریعہ ہوسکتی ہے۔ میں نے اس ارادہ کو پسند کیا اور کہا کہ اتنا یاد رکھئے کہ حیدرآباد کی ریاست صرف اس لئے بچی ہوئی ہے کہ انگلستان کی پبلک اس کی حمایت پر ہے۔ ہندوستان کے دفتر خارجہ کی پالیسی غاصبانہ ہے اور اگر انگریزی رائے مخالف نہ ہوتی تو دفتر خارجہ کبھی کا بر آزاد و خود مختار ریاست کو ہضم کرلیتا۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ اپنی تمام کارروائیوں میں آپ حکومت ہند کے مقابلہ میں بلا وجہ ایمانداری برتئے۔ اور اسی میں آپ کی قرار واقعی حفاظت مضمر ہے۔ ریلوے کے متعلق انھوں نے کہا کہ اب کوئی چارۂ کار نہیں۔ یہ صرف ریاست کو تباہ کرنے کی غرض سے ہمارے سر منڈھی گئی ہے۔ اخراجات سے زیادہ آمدنی ممکن نہیں۔ مزید برآں ریاست کو مجموعی آمدنی کا دسواں حصہ یعنی ۳۰ لاکھ روپیہ سالانہ ۲۰ سال تک اس میں لگانا پڑے گا۔ یونیورسٹی کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ راہ میں بہت سی دشواریاں حائل ہیں بہرحال انھوں نے میرے مسودہ کو پڑھنے کا وعدہ کیا ہے۔ اگر یہ لوگ سرگرمی کے ساتھ کام نہ کریں تو اس صورت میں یونیورسٹی کہیں اور قائم ہونی چاہئے۔

چراغ علی سے مہدی کے بارے میں بحث رہی۔ حاضرین میں سے بعض اس بنا پر اس کے مخالف تھے کہ مہدی سلطنت عثمانیہ

India office 51

کے خلاف ہے۔ مگر اکثر اصحاب کی رائے یہ تھی کہ وہ مسلمان ہیں اور اسلامی مفاد کی نمائندگی کرتے ہیں اور اس بنا پر ہمیں ان کی تائید کرنی چاہئے۔ بعینہ یہی رائے میری ہے +

رسول یار خان یونیورسٹی کے متعلق بہت سرگرمی سے حصہ لے رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اسے یہاں کی حکومت سے آزاد رکھنا چاہئے
بلبل دکن نے نظام کی شان میں ایک قصیدہ سنایا جس کو انھوں نے فارسی اور انگریزی زبانوں میں لکھا تھا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ میں سات زبانوں میں نظم لکھ سکتا ہوں۔ لیکن انکی انگریزی نظم مضحکہ انگیز ہے۔

بعد میں ہم گھوڑ دوڑ دیکھنے گئے۔ سالار جنگ سے یونیورسٹی کے بارے میں مختصر سی بات چیت کی۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ یا تو آپ نہایت سرگرمی سے اس خیال کو عملی صورت دیجئے ورنہ ہم حیدر آباد کا خیال چھوڑ دیں گے انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ میں پوری طاقت سے کام لونگا۔ وہ گلبرگہ یا اورنگ آباد میں یونیورسٹی قائم کرنے کے سخت موید ہیں۔ مگر رسول یار خان گولکنڈہ کی رائے دیتے ہیں اسلئے کہ وہاں کی بیشمار عمارات سب کام میں آجائیں گی۔ کل سالار جنگ سے کھانے کے موقع پر پھر گفتگو ہوگی۔ پرسوں نظام کے ساتھ الوداعی ڈنر کھانا ہوگا۔ اور اگر میں اس کام کو انتہا تک پہنچا سکا تو مجھے اطمینان رہیگا کہ میں نے موسم سرما میں کچھ کام کیا۔ یہی ایک فصل ہے جسے میں نے تیار کیا ہے اور جس کی میں نے گزشتہ کئی برسوں سے اپنے اشکوں سے آبیاری کی ہے +

کلارک اورنگ آباد کے حق میں ہیں اور کہتے ہیں کہ وہاں بیشمار پرانی عمارات ہیں جو یونیورسٹی کے لئے موزوں ہوسکتی ہیں۔ سید حسین نے مجھے ایک طویل طویل تار دکھایا جسے کارڈری نے "ٹائمز آف انڈیا"[1] کے نام روانہ کیا ہے۔ اس میں ریاست حیدر آباد کی جدید کونسل کی تشریح کی گئی ہے اور اسے زیادہ سخت کارروائی اختیار کرنے کا نیا سبب قرار دیا ہے۔ ریلوے اسکیم کو ترقی دینے کا مشورہ دیا گیا ہے اور ان وجوہ پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کے باعث کارڈری اور ٹریور موسم گرما میں چلے جانے پر مجبور ہوئے ہیں + سید حسین نے اس تار کی خفیہ کاپی حاصل کر لی ہے +

۱۰۔ فروری ——— بلبل آج ملنے کے لئے آئے انھوں نے ہمارے اعزاز میں عربی کا قصیدہ لکھا ہے اور اسے اپنے ہمراہ لائے ہیں اُن کی درخواست ہے کہ میں لارڈ رپن کی خدمت میں ان کا ہفت زبان کا قصیدہ پیش کرادوں میں نے انگریزی حصہ کی غلطیاں درست کردی ہیں مگر اس پر بھی وہ نہایت مضحکہ تحریر معلوم ہوتی ہے +

سید حسین نے بھی یونیورسٹی کے قیام کے لئے بہترین کوشش کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ ہم دونوں نے متفقہ طور پر کام کرنے کی رضامندی ظاہر کی ہے۔ صرف تفصیلات باقی رہ گئی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ گولکنڈہ اپنی خراب آب وہوا کی وجہ سے غیر موزوں ہوگا میرا خیال ہے کہ سید حسین اپنی نگرانی میں کام کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ وہ لکھنؤ میں پروفیسر رہ چکے ہیں۔ محمد کامل بھی آئے۔ وہ کہتے ہیں کہ سب لوگ لارڈ رپن کے مداح ہیں کیونکہ انھوں نے ریاست کو تباہی سے بچالیا ہے +

---

[1] Times of India

سالار جنگ کی فرانسیسی گورنس[1] میڈم آئل گیگ ناڈ[2] ملنے کے لئے آئیں۔ انھوں نے ریاست کی زندگی اور سیاسیات کے متعلق بہت سی عجیب وغریب باتیں سنائی ہیں۔ سر سالار جنگ مرحوم بہترین اور شریف ترین آدمی تھے۔ اپنی زندگی میں انھوں نے نہ کوئی بُرا لفظ استعمال کیا اور نہ کوئی غیر ایماندارانہ فعل ان سے سرزد ہوا۔ سب لوگ حتیٰ کہ اُن کے دشمن بھی ان کا احترام کرتے تھے۔ امیر الکبیر نے جو ان کے سخت ترین دشمن تھے مرتے وقت اُنھیں بلایا اور اپنے بچوں کو ان کے سپرد کیا۔ جب میں نے سالار جنگ کی موت کے بارے میں سوال کیا تو کہا کہ مجھے اس بارے میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ انھیں زہر دیا گیا تھا۔ بدھ کے دن رات کے نو بجے تک اُنھیں کوئی شکایت نہ تھی۔ مگر اُس کے بارجود جمعرات کے دن شام کے سات بجے ان کا انتقال ہوگیا۔ منگل کے دن ریزیڈنسی میں دعوت تھی۔ ان کی علامتوں سے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ اُنھیں ہیضہ ہوگیا ہے۔ قے بالکل نہ تھی سوائے اس کے کہ حلق میں اُنگلیاں ڈال کر انھوں نے ایک دو مرتبہ خود قے کر ڈالی وہ گلے اور سینہ میں سوزش اور پیاس کی شدت کی شکایت کرتے تھے۔ موت کے بعد ان کی رنگت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی دو انگریز ڈاکٹروں میں سے ایک کی رائے تھی کہ ہیضہ ہے اور دوسرے (بومونٹ) کی رائے اس کے خلاف تھی۔ انھوں نے بتایا کہ زنان خانہ میں کس قدر بھاگ دوڑ مچ رہی تھی اور یہ کہ دو مقدس آدمیوں کے دم کئے ہوئے پانی کا کسقدر استعمال کیا جارہا تھا ڈاکٹروں کو تو تین بجے کے قریب اسوقت بلایا گیا جب کہ آس بالکل جاتی رہی تھی۔ وزیر موصوف کے سب رشتہ دار جمع تھے اور جب عورتوں نے ان کی وفات کی خبر سنی تو انھوں نے چلانا، بُرا بھلا کہنا، رونا پیٹنا اور زمین پر لوٹنا شروع کر دیا، اپنے زیوروں کو توڑ ڈالا اور اسقدر آپے سے باہر ہوئیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ پاگل ہوگئی ہیں۔ ایک ہفتہ تک کسی کو پورا ہوش نہ تھا۔

شام کا کھانا سالار جنگ کے یہاں کھایا۔ کوئی انگریز موجود نہ تھا۔ سب آپس ہی کے آدمی تھے۔ موجودہ سیاسی واقعات پر بہت دلچسپ گفتگو رہی۔ سالار جنگ نے بتایا کہ شہر کا انتظام اور چراغان کا معاملہ سب میرے ہاتھ میں تھا۔ مجموعی خرچ ۲۲ ہزار سے زیادہ نہیں ہوا۔ حالانکہ خورشید جاہ کے سپرد شہر کے باہر کا حصہ تھا اور میرا خیال ہے کہ اُنھوں نے چار لاکھ روپیہ صرف کیا۔

کھانے کے بعد سالار جنگ سے پرائیویٹ گفتگو رہی۔ لارڈ رپن کے پیغامات میں نے پہنچا دئے۔ انھوں نے سب پر عمل کرنے کی آمادگی ظاہر کی ہے میں نے انگریزی سیاسیات کی حقیقت سے انھیں آگاہ کر دیا اور درخواست کی کہ اگر نئی مشکلات پیدا ہوں تو انکی اطلاع مجھے دے دیں اور ساتھ ہی ان دستاویزات کی نقل بھیجیں جنھیں آپ پبلک کے فائدہ کے لئے شائع کرنا چاہتے ہوں اُنھوں نے ریلوے اسکیم کے متعلق معتدل الفاظ میں صدائے احتجاج معرض تحریر میں لانے کا وعدہ کیا ہے تاکہ نقصان کی سالک ذمہ داری انگریزی حکومت پر بھی رہے۔ بڑے بڑے انگریز مدبرین کی نسبت گفتگو رہی۔ لٹن کے وہ خصوصیت سے مداح تھے میں نے مشورہ دیا ہے کہ کسی پر اعتماد کرنے کی ضرورت نہیں۔

یونیورسٹی کے بارے میں وہ اب بہت سرگرم معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنی جیب سے چندہ دینے اور ریاست سے روپیہ دلانے

---

[1] Governess

[2] Mademoiselle Gaignard

کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن میں نے اُنھیں تنبیہ کر دی ہے کہ ریاست پر زیادہ مالی دباؤ نہ ڈالا جائے۔ انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ آئندہ سال تک کام کی ابتدا کر دی جائیگی اور اس وقت لارڈ رپن ہندوستان ہی میں ہوں گے۔ آج کی گفتگو کے سوائے سالار جنگ سے کبھی اسقدر اطمینان سے گفتگو نہیں ہوئی۔

اخبارات سے معلوم ہوا ہے کہ گارڈن کی نسبت جو اطلاع شائع ہوئی تھی وہ غلط ہے۔ اس لئے مجھے امید ہے کہ انھیں میری چٹھی وقت پر مل جائیگی اور وہ میری نصیحت پر کاربند ہوں گے۔ حالات سے تو جدید جنگ کی تمہید معلوم ہوتی ہے۔

۱۱۔ فروری ــــــ سید علی شوستری سے مہدی کے متعلق گفتگو رہی۔ ان کا خیال ہے کہ وہ سچا مہدی نہیں ہے اس لئے کہ اُن کے ظاہر ہونے سے پیشتر ے سال تک مسلسل قحط نہیں پڑا۔ مزید برآں وہ یکایک حجاز سے ظاہر ہوں گے اور بلحاظ قومیت عرب ہونگے میں نے انھیں یقین دلایا ہے کہ وہ خالص عرب ہیں۔ بہر حال وہ اس سے متفق ضرور ہیں کہ اگر وہ مہدی نہیں ہیں تو کم سے کم حامی المسلمین ضرور ہیں۔ وہ ہکس[۵۱]، مانکریف[۵۲] اور بیکر کی شکستوں سے بہت خوش تھے۔

۱۱۔ فروری ــــــ محمد کامل چاہتے تھے کہ میں مسلمانوں کے جلسہ میں تقریر کروں۔ لیکن چونکہ وقت کم ہے اور ممکن ہے کہ کارڈری رخنہ انداز ہو اس لئے میں نے انکار کر دیا ہے۔ رسول یار خان کو میں نے صراحت کے ساتھ یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ لارڈ رپن اور چند دیگر انگریزوں کو شکریہ کا ایڈرس پیش کریں کیونکہ انھوں نے ریاست کو تباہی سے بچا لیا ہے۔

ہم نے پورنی کے محل میں کھانا کھایا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں نظام اپنی والدہ، اپنی دادی اور اپنی ایک بیوی اور بچوں کے ساتھ قیام پزیر ہوگئے ہیں۔ چند انگریز بھی تھے اور تاریخ میں پہلی مرتبہ شراب میز پر رکھی گئی۔ اگرچہ نظام نے اسے ہاتھ تک نہیں لگایا تاہم یہ بدعت بہت خراب ہے۔ انگریزوں کی موجودگی کے باعث کھل کر بات چیت نہیں ہوسکی اور میرا خیال ہے کہ نظام کو نیند سی آرہی تھی کیونکہ وہ صبح سے مختلف کاموں میں مشغول ہیں۔ سالار جنگ نے نہایت سرگرمی سے کام شروع کر دیا ہے اور اگر یہ سلسلہ قائم رہا تو سب معاملات دو باصلاح پر آجائیں گے۔ ہم اس کے بعد سب سے رخصت ہوئے نظام نے اپنا فوٹو بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔

۱۲۔ فروری ــــــ یہاں سے ہم گلبرگہ پہنچے رسول یار خان دوسرے اسٹیشن تک ساتھ تھے۔ ہنڈرسن[۵۳] (خفیہ پولیس کا افسر) اسی ٹرین میں تھا۔ اس سے بھی حیدرآباد کے معاملات پر گفتگو رہی۔ اس کا خیال ہے کہ ریلوے سے چند سال کے بعد نفع ہونا شروع ہو جائیگا۔ میں نے پوچھا کہ آخر انگلستان کی گورنمنٹ اس اسکیم پر کیوں زور دے رہی ہے۔ کہنے لگے کہ یہ سب بیرنگ کی

---

۵۱ Hicks

۵۲ Moncreiff

۵۳ Henderson

کارروائی ہے۔ گزشتہ اتوار کو سالار جنگ سے گفتگو ہوئی تھی اُس کے متعلق میرا خیال ہے کہ میں نے اسے تمام وکمال درج نہیں کیا واقعہ یہ ہے کہ جب شملہ میں لارڈ رپن سالار جنگ مرحوم سے ازسرنو خوش ہوگئے تو وہ ان گفتگو میں اُنھوں نے پختہ وعدہ کیا کہ اگر تمام معاملات درست حالت میں رہے تو جونہی کہ نظام بالغ ہوجائیں گے صوبجات برار واپس کردیئے جائیں گے اس وعدہ کی خبر دفتر خارجہ کو ہوگئی ہے اور وہی ان تمام تکالیف کا ذمہ دار ہے جو اس وقت سے لیکر اب تک رونما ہوتی ہیں۔

نوجوان سالار جنگ کی یہ رائے ہے کہ ریلوے کی اسکیم پر اس لئے زور دیا جارہا ہے تاکہ حیدرآباد کی مالی حالت بے ترتیب ہوجائے۔ ان کے والد کو خطرہ کا بخوبی احساس تھا، اور وہ صرف اس لئے شامل رہے کہ وہ ہندوستان کے دفتر خارجہ کا منہ بند کرنا چاہتے تھے کیونکہ اُنھوں نے کلارک سے کہا تھا کہ، میں نے جان بوجھ کر سانپ کے منہ میں اپنا پیر ڈالدیا ہے لیکن میں ہر وقت اسے نکال لینے کی قدرت رکھتا ہوں، جو لوگ اُن سے اچھی طرح واقف ہیں وہ کہتے ہیں کہ اُنھوں نے حقیقتہً اسکیم کو کبھی پسند نہیں کیا۔ لیکن ان کی وفات کے بعد سے کارڈری نے جس شد ومد کے ساتھ اس کو ترقی دینی شروع کی وہ اس قدر بدنام کرنے والی ہے کہ یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ کارڈری بغیر بالائی احکام کے کارروائی کررہا ہو۔ خود اُس نے مجھ سے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے اور اگرچہ دفتر خارجہ پورے طور سے ریاست کو تباہ نہیں کرسکا تاہم ایک حد تک اسے کامیابی نصیب ہوچکی ہے، اگر کارڈری لارڈ رپن کو یہ ترغیب دینے میں کامیاب ہوجاتا کہ نظام کی بلوغت کی عمر کو دو سال تک کے لئے اور ملتوی کردیا جائے تو ریاست کی مالی حالت اس قدر بدتر ہوجاتی کہ پھر اس کا سنبھلنا ناممکن ہوجاتا وہ اب صرف اس قدر کامیاب ہوگئے ہیں کہ لارڈ رپن باوجود اپنی ایمانداری اور ہمدردی کے برار کے بارے میں اپنا وعدہ وفا نہ کرسکے۔ کارڈری حیدرآباد چھوڑکر جارہا ہے مگر اس کی گرمی کا معاوضہ کسی اور جگہ مل جائیگا۔ اگر خود کارڈری مجھے اپنی کارروائیوں سے واقف نہ کرا دیتا یا اگر یہ تمام واقعات خود میرے سامنے ظہور پذیر نہ ہوتے تو میں ہرگز اُن کا یقین نہ کرتا۔

۱۳- فروری ــــــ صبح سویرے گلبرگہ کے گرد و پیش کے دیہات دیکھنے کے لئے وہ زیادہ خوشحال معلوم ہوتے ہیں۔ ایک گاؤں میں ہم نے پہلی مرتبہ یہ بات سنی کہ وہاں کوئی شخص مقروض نہیں ہے کیونکہ سب کے پاس کھانے کو بہت کچھ موجود ہے لوگ نمک کے محصول کے شاکی نہیں ہیں۔ لگان آراضی مجموعی پیداوار پر ۲۰ فیصدی کے قریب ہے میں نے بندوبست کے افسران کو یہ رائے دی ہے کہ لگان میں تخفیف کرانے کی کوشش کریں۔

مولویون کو یونیورسٹی کے بارے میں اپنا ہم خیال بنانے کے بعد ۴ بجے ہم عازم بمبئی ہوگئے۔

نوٹ:- ایک قابل اعتماد ہندوستانی نے مجھے اس طول طویل سازش کا حال حسب ذیل الفاظ میں بتایا ہے جسکا مقصد یہ تھا کہ گورنمنٹ آف انڈیا صوبجات برار کو ہمیشہ کے لئے اپنے قبضہ میں رکھے وہو ہذا:۔ لارڈ رپن کی سیاحت حیدرآباد کے ۲ سال بعد لارڈ کرزن نے حیدرآباد کی سیاحت کی جہاں محل میں ایک ضیافت کے موقع پر اس نے حکومت ہند کے لئے دائمی اجارہ پر صوبجات برار کو حاصل کرلیا۔ نظام نے اپنے مہمان کے پاس خاطر کی غرض سے زبانی رضامندی کا اظہار کردیا جس وقت انہیں وعدہ یاد دلایا گیا، اور انہیں تخت سے اتار دینے کی دھمکی دینے کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے اس معاہدہ پر دستخط ثبت کردیئے جیسے ریزیڈنٹ نے ان کے سامنے رکھدیا تھا یہ طریقہ صرف اس لئے اختیار کیا گیا تھا کہ لارڈ رپن کا وعدہ جو تخت نشینی کے موقع پر کیا گیا تھا فراموش کردیا جائے اس قسم کی مثالیں بہت سی مل سکتی ہیں نظام نے اس واقعہ کے بعد چار دن تک کھانا نہیں کھایا۔

فارسی زبانؑ

(آغاز اسلام سے اسوقت تک)

آفتاب اسلام کے طلوع کے وقت ایران میں نوشیروان عادل کی حکومت تھی، جو دولت ساسانیۂ ایران کے آخری بادشاہوں میں ہے، اس بادشاہ کے زمانہ میں فارسی کی چار مختلف شاخیں ملک میں رائج تھیں، اور ان چاروں زبانوں کا وجود دولت ساسانیہ (۲۲۶ء - ۶۵۱ء) کی ابتدا سے چلا آتا تھا، اور یہ چاروں شاخیں فارسی قدیم سے نکلی تھیں، جو ایراں کی قدیم ترین زبان تھی،

۱- پاستانی } یہ مذہبی زبان تھی جس میں مذہبی کتابیں لکھی جاتی تھیں، کتاب "استا" جس کے متعلق زردشتیوں کا عقیدہ ہے کہ یہ اُن کے پیغمبر زردشت پر خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے، پاستانی زبان میں لکھی ہوئی ہے اس کتاب کا کچھ حصہ اب تک ایران، اور ہندوستاں کے آتش پرستوں کے پاس موجود ہے، یہ کتاب مذہبی تعلیمات، فلسفی مضامین، علم ہئیت، طبعیات، قوانین مدینہ، مذہبی احکام، علم النبات، قصص، اور تاریخ وغیرہ پر مشتمل ہے، یہ کتاب اگرچہ نہایت فصیح زبان میں ہے، مگر بعض مقامات پر اس قدر مشکل، اور مغلق ہوگئی ہے کہ بغیر شرح دیکھے ہوے مطالب حل نہیں ہو سکتے۔

آتش پرستوں کے علما نے اس کی ایک مفصل شرح لکھی ہے جس کو "زند" کہتے ہیں۔ یہ بھی پاستانی زباں میں ہے پاستانی زبان اہل علم کے حلقہ میں منحصر تھی، فارسی کی تین اور شاخوں میں جن کا ذکر آئندہ آئے گا۔ پاستانی کے بہت کم الفاظ مستعمل ہیں پاستانی موجودہ فارسی سے اس قدر مختلف ہے کہ اس کے مقابلہ میں بالکل ایک اجنبی زبان معلوم ہوتی ہے، مثال کے طور پر ذیل کی عبارت ملاحظہ فرمایئے جو ہم کتاب اُستا سے نقل کرتے ہیں۔

سروش یشت با دوخت سروشم اشیم ہورودم ورت تراجنم فرادد
کیستم اشہ دنم اشہہ رتیم برمیدہ - یودمینو دسود نیا اہمائہ، دنیام
ویسہ ید اہورو فردا اشروہ۔

اُستا کی اس عبارت کا مضمون قرآن کریم کی اس آیت سے ملتا ہے

قل من کان عدوا لجبریل فانہ نزلہ علی قلبک باذن اللہ

مصدقا لما بین یدیہ وہدی وبشری للمومنین۔

یعنی جو لوگ (یہودی) جبریل کے دشمن ہیں۔ (تو ہوا کریں) بیشک جبریل نے خدا کے حکم سے قرآن تمھارے قلب پر نازل کیا ہے، دراں حالیکہ یہ تصدیق کرتا ہے ایسی کتابوں کی جو اس سے قبل نازل ہوئی تھی۔ اور یہ قرآن ہدایت ہے اور بشارت ہے ایمان لانے والوں کے لئے۔

اس کے علاوہ کتاب اوستا کی بہت سی آیتیں اپنے مفہوم اور معنے کے لحاظ سے توریت انجیل اور قرآن شریف سے ملتی ہیں اسی بنا پر یہ خیال کیا گیا ہے کہ اوستا بھی ایک الہامی کتاب ہے۔

کتاب ژند جو اوستا کی شرح ہے جو ۲۱ جلدوں میں ختم ہوتی ہے۔ زرتشتی علما نے ژند کی بھی ایک نہایت مبسوط شرح لکھی تھی یہ سب مذہبی کتابیں اسطخر کے کتب خانہ میں محفوظ تھیں جس کو اہل فرنگ (Persepolis) کہتے ہیں اور اسی طرح اسوقت تک محفوظ رہیں جب کہ سکندر مقدونی نے دارا پر ۳۳۱ء قبل مسیح میں فتح پائی اس نے تمام کتب خانہ پر قبضہ کرلیا۔ یونانی مورخین جن میں پلوطرخوس بھی ہے بیان کرتے ہیں کہ جب سکندر کا داخلہ پایۂ تخت ایران میں فاتحانہ طریقہ پر ہوا تو وہ حالت سکر میں تھا اس نے شہر اور کتب خانہ کے جلا دینے کا حکم دیدیا۔ لیکن ایرانی مورخین لکھتے ہیں کہ صرف سکندر کی قومی عصبیت نے اسکو ناجائز فعل پر مجبور کیا تھا وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ سکندر ایران سے صنعت وحرفت اور زراعت کی کتابیں ایران سے مقدونیہ میں لے گیا اور ان کا یونانی زبان میں ترجمہ کرایا۔ لیکن تمام مورخین کا خواہ وہ ایرانی ہوں یا یونانی اسپر اتفاق ہے کہ جب سکندر شہر چھوڑ کر نکلا تو اسے شہر کے جلانے اور کتابوں کے قیمتی ذخیرہ کے ضائع ہوجانے کا بڑا افسوس تھا۔

۲۔ دری زبان یہ ایک سرکاری زبان تھی بادشاہوں وزیروں اور حاکموں کے درمیاں یہی گفتگو کا ذریعہ تھی اس کا سلسلہ کیانی بادشاہوں تک پہونچتا ہے جب ۴۶۶ء قبل مسیح میں بہمن بن اسفندیار بادشاہ ہوا تو اُس نے حکما وعلماء کی ایک جماعت کو جمع کرکے دری زبان کے قواعد منضبط کرنے کا حکم دیا تاکہ پاستانی زبان سے مخلوط نہ ہوجائے۔ اور اسی طرح دوسرے زبانوں کے اختلاط سے بھی محفوظ رہے۔ چنانچہ علما نے اس حکم کی تعمیل میں قواعد وضع کئے، اور ایسے اصول مستنبط کئے جن کی وجہ سے دری زبان نے ایک مستقل صورت اختیار کرلی اور عوام الناس کے غیر صحیح تلفظ اور محاورات سے محفوظ رہکر مصنفین، شعرا اور اہل موسیقی کی مخصوص زبان بن گئی۔ شاہی فرمان، احکامات، اور تاریخی اثرات جو پتھروں پر کندہ پائے گئے ہیں اسی زباں میں لکھے ہوئے ہیں۔ یہ زبان تقریباً ۵۵۰ برس تک مستعمل رہی یہاں تک کہ ۳۳۱ء قبل مسیح میں سکندر مقدونی کا مشہور حملہ ایراں پر ہوا۔

۳۔ پہلوی زبان سکندر مقدونی اور اس کے خلفاء کا عہد حکومت ایران میں ۶۰ سال سے زیادہ نہ رہ سکا جب کہ

سلطنت کا خاتمہ ہوا تو ایران میں طوائف الملوکی رونما ہوئی مختلف خاندانوں نے ایران کے صوبوں پر علٰحدہ علٰحدہ حکومتیں قائم کیں۔ جن میں اشکانیوں کا خاندان سب میں زیادہ مشہور ہے۔

مرور زمانہ سے ایرانیوں کا امتزاج کلدانی، آسوری، سیریانی اور یونانی اقوام کے ساتھ بڑھتا گیا اور ان کی زبان میں مختلف زبانوں کے الفاظ داخل ہوتے گئے۔ ۵۰۰ برس تک یہ حالت جاری رہی۔ یہاں تک کہ ایران کا تخت حکومت خاندان ساسانیہ کے قبضہ میں آیا۔

ساسانی دور حکومت میں ایران کے مشہور شہر آذربیجان میں پہلہ نامی ایک زبردست عالم پیدا ہوا جو علم و حکمت میں بڑے فضل و کمال کا مالک تھا۔ اس نے دیکھا کہ فارسی مختلف زبانوں کا ایک مجموعہ بن گئی ہے، اس نے بڑی سعی و کاوش سے غیر زبانوں کے تمام غیر ضروری الفاظ فارسی سے خارج کر دیے اور اس زبان سے جس میں غیر زبانوں کے دخیل الفاظ کثرت سے پائے جاتے تھے۔ ایک نہایت مہذب زبان تیار کی جو بہت مقبول ہوئی۔ اور واضع لغت کی مناسبت سے اس کو پہلوی کہنے لگے۔

اس واقعہ پر چند سال گزرنے کے بعد ساسانی بادشاہوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ملک میں مذہبی اور ادبی کتابیں بالکل مفقود ہو گئی ہیں۔ اور سب سے مقدس کتاب اوستا، اور اس کی شرح ژند کا بھی نام و نشان نہیں پایا جاتا۔ کیونکہ اس تمام مذہبی اور ادبی ذخیرہ کو سکندر مقدونی تباہ کر چکا تھا اس لئے ان مقدس کتابوں کو از سر نو زندہ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ بڑی تلاش و جستجو کے بعد اوستا اور ژند کا ایک ایک ناتمام نسخہ دستیاب ہوا۔ پھر ایک مجلس علمی قائم کی گئی جس کے متعلق اوستا اور ژند کی شرح کا کام کیا گیا۔ اس مجلس نے اُستا اور ژند کی مفصل شرح لکھی، جس کو پاژند کہتے ہیں۔ یہ شرح پاستانی زبان میں تھی، اور اس قدر مشکل تھی کہ پاستانی جاننے والوں کو بھی سخت دشواریاں پیش آتی تھیں، لہذا پھر شاہان فارس کے حکم سے ایک دوسری شرح پہلوی زبان میں لکھی گئی۔ جو وساتیر کے نام سے مشہور ہوئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ایران میں تین زبانیں رائج تھیں ایک مذہبی زبان جسے پاستانی کہتے تھے، دوسری ملکی، جو پہلوی کہلاتی تھی، تیسری عام لوگوں کی زبان جس کا کوئی خاص نام نہ تھا۔ شعرا نے پہلوی زبان اختیار کی، اور کثرت سے اس زبان میں شعر لکھے گئے۔ ظہور اسلام سے دو صدی قبل کا کلام اس وقت تک موجود ہے۔ اور یہ اس امر کی ایک واضح دلیل ہے کہ پہلوی زبان ظہور اسلام سے پہلے ختم نہیں ہو چکی تھی جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے، بلکہ آج کل بھی جو فارسی مستعمل ہے اس کے ہر دس الفاظ میں پانچ یا چار پہلوی الفاظ پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ ذیل کا شعر ملاحظہ ہو جو کرمان شاہ کے قریب قصر شیریں میں خط مسماری سے لکھا ہوا پایا گیا ہے۔

هژبرا گیہاں انوشہ بزی جہان را بدیدار توشہ بزی

اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ اے زبردست بہادر تو اس دنیا میں عزت اور وقار کے ساتھ زندہ رہ اور دنیا کو تیرے دیدار سے فخر حاصل ہو۔ اس شعر میں ہژبر۔ گیہاں۔ زی۔ جہاں۔ دیدار۔ یہ پانچ لفظ پہلوی زبان کے ہیں، اور اس وقت تک فارسی میں مستعمل ہیں۔

۴۔ دیہاتی زبان

یہ زبان قدیم زمانہ سے کوہستانی خانہ بدوش قبائل میں چلی آ رہی ہے۔ اس کی متعدد شاخیں ہیں یہاں تک کہ تقریباً ہر قبیلہ جو دوسرے سے علٰحدہ رہتا ہے ایک جدا زبان استعمال کرتا ہے اور دوسرا قبیلہ اس لفظ، اور مخصوص محاورات و مصطلحات کو نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن باوجود ہزارہا سال گزر جانے کے اس زبان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ جس کا سبب یہ ہے کہ یہ خانہ بدوش قبائل چونکہ متمدن نہیں ہیں اور نہ کبھی انھوں نے متمدن دنیا سے کوئی تعلق رکھا اس لئے اُن کی زبان بالکل محفوظ اور غیر متغیر رہی۔

یہ چاروں زبانیں جن کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں، حقیقت میں قدیم ترین فارسی کی مختلف صورتیں ہیں۔ اور ان سب کا ماخذ وہی پرانی زبان ہے، اصل لغت، اور قواعد صرف و نحو کے لحاظ سے بھی ان میں اشتراک پایا جاتا ہے جو وحدتِ اصل کی دلیل ہے

عربی زبان کا فاتحانہ سیلاب اور فارسی کا زوال

ایران پر عربی تسلط کے بعد فارسی زبان میں ضعف پیدا ہونے لگا۔ عرب فاتحین جن میں مذہبی اور قومی عصبیت بدرجۂ کمال پائی جاتی تھی۔ فارسی اور اس کے علوم و فنون سے نفرت کرتے تھے اور چونکہ تقریباً تمام ایران نے اسلامی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ اس لئے انھیں خود عربی سیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ جو علاوہ مذہبی زبان ہونے کے فاتحین کی زبان بھی تھی، اہل فارس نے عربی علوم فنون جس سعی و کوشش سے حاصل کئے اور ان کو ترقی دی اس کے ثبوت میں اسلامی تاریخ کے صفحات ہمیشہ پیش کئے جا سکتے ہیں عجم نے یہاں تک عربی زبان میں کمال حاصل کیا، اور ایسے زبردست مصنفین اور ارباب تحقیق ان میں پیدا ہوئے کہ خود عربوں میں ان کی مثال نظر نہیں آتی،

عرب چونکہ کسی خاص تمدن کے مالک نہ تھے، بلکہ ظہور اسلام سے قبل جزیرۂ عرب میں نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے، اس لئے جب انھوں نے ایران پر قبضہ کیا، اور ایرانی تمدن، اور اہل فارس کے عیش تنعم سے واقف ہوئے تو رفتہ رفتہ وہی ایرانی تمدن میں جذب ہوتے گئے، یہاں تک کہ عباسی خلافت بالکل اکاسرۂ فارس کی نقل نظر آتی تھی۔ آداب معاشرت وضع، لباس، کھانا، دربار کی شان، غرض ہر شعبۂ زندگی میں اہل عجم کا تمدن بالکل نمایاں نظر آتا تھا۔ فاتحین اور مفتوحین کا یہ اختلاط فارسی زبان کے لئے نہایت مہلک ثابت ہوا، فارسی کی کس مپرسی اہل ایران میں

عربی علوم و فنون کا شوق، دربار میں ایرانیوں کا دخل، یہ سب اسباب تھے فارسی کے زوال اور انحطاط کے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربی الفاظ اس کثرت سے فارسی میں داخل ہوئے کہ اصل زبان کا لطف بالکل مفقود ہو گیا۔ اگرچہ اس اختلاط سے عربی زبان بھی محفوظ نہیں رہی، اور اس میں فارسی کے دخیل الفاظ کثرت سے مستعمل ہونے لگے۔ لیکن عربی چونکہ فاتح قوم کی زبان تھی اور اس کی قدر تھی، اس لئے وہ فارسی میں جذب نہیں ہوئی بلکہ فارسی کو اپنے اندر جذب کر لیا،

یہ عربوں کے فتح و استعمار کی ایک خصوصیت تھی، کہ جس ملک پر وہ قبضہ کرتے تھے وہاں کی زبان بھی کچھ عرصہ کے بعد یا تو بالکل معدوم ہو جاتی تھی، یا اس میں عربی الفاظ اس کثرت سے داخل ہو جاتے تھے، کہ سوائے ضمائر و روابط کے زبان میں اور کچھ باقی نہیں رہتا، شام، مصر، ٹونس، الجزائر، اور مراکو کی زبانیں عربوں کے فاتحانہ سیلاب کے سامنے قائم نہ رہ سکتی، اور فارسی باقی رہی مگر برائے نام، فارسی زبان پر عربی تسلط اس درجہ سرعت کے ساتھ ہوا کہ ظہور اسلام سے دو صدی بعد خلیفہ مامون (۱۹۸ھ - ۲۱۸ھ) کی مدح میں عباس مرزونی دربار میں ایک قصیدہ پڑھتا ہے جس کے مطلع میں سات عربی لفظ پائے جاتے ہیں۔ مطلع یہ ہے۔

اے رسانیدہ بدولت فرق خود تا فرقدین   گسترانیدہ بجود و فضل در عالم یدین

شعرائے فارس میں اگرچہ چند ہستیاں ایسی نہ پیدا ہوتیں، جنھوں نے فارسی کی بقا کے لئے اپنے کلام میں حتی الامکان عربی الفاظ کا استعمال نہیں کیا، تو موجودہ صورت میں بھی فارسی کا باقی رہ جانا دشوار تھا۔ ان میں سب سے زیادہ ممتاز شخصیت حکیم ابوالقاسم فردوسی طوسی (متوفی ۴۱۱ھ) کی ہے جس نے شاہ نامہ کے ساٹھ ہزار شعروں میں بہت کم عربی الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ (ماخوذ)

ابوالمحاسن محمود علی خاں

اردو زبان کا ایک جدید و بسیط لغت

نور اللغات جس کی ترتیب پر گورنمنٹ کی طرف سے فاضل مولف کو چھ ہزار روپیہ کا انعام ملا ہے اس لغت میں ایک ایک لفظ کے مختلف معانی سے ماہرانہ گفتگو کی گئی ہے۔ اور اساتذہ کا کلام سند آ پیش کیا گیا ہے اس کو امیر اللغات کا سلسلہ سمجھنا چاہیئے۔ حرف خ تک کے لغات دو جلدوں میں درج ہو چکے ہیں، آئندہ جلدیں زیر طبع ہیں۔ جلد اول عـ۱۲ (مجلد) عـ۱۰ (غیر مجلد) علاوہ محصول۔ جلد دوم ۸؎ (مجلد) عـ۶ (غیر مجلد) علاوہ محصول۔ ہر فرمائش کیساتھ چوتھائی قیمت آنا ضروری ہے۔ منیجر نگار لکھنؤ

دینِ مسیحی یا آفتاب پرستی[1]

جناب مخدوم و مکرم بندہ۔ السلام علیکم

آپ کا یہ پُرانا نیاز مند اس کو کسی طرح پسند نہیں کرتا کہ ایک لٹریری اور تاریخی رسالہ میں مذہبی بحث کو چھیڑا جائے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی گوارا نہیں ہے کہ جب ایک مرتبہ یہ بحث چھڑ جائے خاص کر غیر مسلم کی طرف سے تو اس کو یونہی چھوڑ دیا جائے اس کے معنی کمزوری کے ہیں۔ کسی عیسائی کے سوالات کے جواب جس خوبصورتی سے آپنے دئے ہیں وہ آپ کے لئے قابل مبارکباد ہیں خدا کرے آپ کو علماء ملت کی طرف سے کفر کا سرٹیفکٹ مل جائے

غرضکہ حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق بہت مزے کی بحث نگار میں چھڑ گئی ہے اب جی چاہتا ہے کہ کسیطرح چھیڑ خوباں سے چلے جائے اسد۔ میں ایک مضمون خدمت گرامی میں بھیجتا ہوں۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہ بہت طویل ہے مگر اس کے ساتھ ہی نہایت دلچسپ اور معنی خیز ہے۔ مصنف کا مقصود صرف یہ ہو کہ مسیحیت حقیقت میں آفتاب پرستی ہے۔ نیز یہ کہ اس کے تمام اصول مذہبی آفتاب پرستوں سے ماخوذ ہیں۔ انھوں نے بہت خوبصورتی کے ساتھ اس کو ثابت کیا ہے۔ شروع شروع میں تو یہ بہت ہی خشک معلوم ہوتا ہو۔ مگر جیسے جیسے آگے بڑھیئے اس کی دلچسپی بڑھتی جاتی ہے۔ بہرحال جیسا بھی کچھ ہے میں نے اس کا لفظی ترجمہ کیا ہے۔ اور آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں اگر (۱) آپ کو یہ پسند ہو۔ اور (۲) اسکے طویل ہونے سے آپ نہ گھبرا جائیں تو اس کو نگار میں شائع کر دیجئے۔ (بشرطیکہ آپ اس مضمون کو پسند فرمائیں) آپ پر کفر کا فتویٰ پاس ہو جائے۔ میں نے اپنا تو کچھ نہ کچھ دفعیہ کر لیا ہے۔

نیاز مند قدیم

محمد خلیل الرحمٰن

---

[1] ذیل کا مختصر مضمون ایک جرمن محقق کے صحیح دماغ کا نتیجہ ہے۔ راقم نے اس میں سوائے اس کے اور کچھ تصرف نہیں کیا ہے کہ اسکو ہندوستانی لباس پہنا دیا ہے اگر اس میں کوئی بات آپ کے خلاف مزاج ہو تو اس کا ذمہ دار اور جوابدہ راقم کو قرار نہ دیا جائے گر اس کو اس کا اعتراف ہو کہ ہندوستانیوں کے قول وفعل کے مطابق ہر مترجم جاہل ہوتا ہو۔ اس سلسلہ میں خواجہ کمال الدین صاحب کی کتاب "سورسز آف کرسچینٹی" (ینابیع المسیحیت) دیکھنا زیادہ مفید ہوگا۔

آدم کا بہشت سے نکالا جانا زمانۂ قدیم کے لوگوں کا یہ اعتقاد تھا کہ تہذیب و تمدن خدا کے ارادہ کا براہ راست نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کا شیوع محض، بطور حادثہ یا اتفاق انسان کے ان قوے کے بُرے استعمال کا نتیجہ ہے جو اُس کو خدا تعالے نے عطا کئے تھے۔

یہ کہنا چاہئے کہ عورت نے مرد کو اپنے اصلی اور صحیح کام سے فریب دے کر غافل کرایا کہ اس کو نیکی اور بدی کی تمیز بتلادی اور اس کو متمدن مخلوق بنادیا۔ آدم کے گناہ سے جہاں خوشی اور اطمینان گیا وہاں زندگی بھی خراب گئی۔

اُمید نجات لیکن یہ امید کی جاتی تھی کہ یہ حالت ہمیشہ کے لئے قائم نہیں رہ سکتی۔ یہ زندگی جو اس قدر سخت اور تکلیف دہ ہے صرف آزمائش ہے جو جلد ختم ہو جائیگی۔ ان کا خیال تھا کہ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے کہ بھیڑیا ایک بھیڑ کے بچے کے ساتھ بیٹھا رہیگا، بڑے بڑے سرکش لوگ ضعیفوں پر رحم کریں گے اور غریبوں کو ظلم سے بچائینگے۔

صدیوں پر صدیاں گزرتی چلی گئیں کہ مصیبت زدہ انسان اپنے اسی دہوکے میں رہا کہ دیوتاؤں کی مدد سے اُن کی مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائیگا، انسان کو آخر کار خوشی و سرور نصیب ہوگا، اور اس کی وہی کیفیت ہو جائیگی جو ابتدار زندگی میں تھی کہ جس کو وہ [۱] سنہرا زمانہ کہتا تھا۔

نجات دہندہ کا انتظار خیال و عقاد یہ تھا کہ دیوتا زمین پر بنفس نفیس نہیں آئیں گے، بلکہ وہ کسی کو بھیجینگے جو ان کی طرف سے بولے گا اور اُن ہی طرف سے کام کریگا بالجملہ وہ اُن کا قائم مقام ہوگا۔

ایشیا کے بہت سے بادشاہوں، مثلاً اشور بنی پال بادشاہ نینوہ، اور سایرس بادشاہ ایران نے یہ دعویٰ کیا، یا ان کی رعایا نے ان کی نسبت یہ حسن ظن رکھا کہ دیوتاؤں نے اُن کو اس لئے اپنا برگزیدہ کیا ہے کہ وہ خوشی و سرور دنیا میں لیکر آئیں [۲]

اسی طرح بنی اسرائیل کی کئی نسلیں کسی ایسے آدمی کی امید میں بیٹھی رہیں کہ جس کو خدا تعالیٰ اٹھائیگا چنانچہ یہ غریب موسیٰ سے لیکر یحییٰ تک اسی امید کے سہارے جیتے رہے۔ موسیٰ نے تو ان کو فرعون سے رہائی دلائی، مگر یحییٰ نے اُن کے لئے کچھ نہ کیا گو انھوں نے اُن (یحییٰ) کو "اپنا مسیحا" [۳] سمجھا۔ جب یسوع آئے تو یہودیوں میں سے بہت ہی کم آدمیوں نے ان کو پہچانا۔ یہی لوگ "کرسچین" [۴] کہلائے۔

یسوع اگر تاریخی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو یسوع کے متعلق جو کچھ بھی ہمیں معلوم ہوتا ہے وہ بہت ہی چھوٹی سی بات ہے، اتنی

---

[۱] تاریخی زمانہ بہت طویل سمجھا گیا تھا۔ برس کے چار موسم سنہرے، چاندی، تانبے اور لوہے کے رنگ کے تھے۔ عقاد یہ تھا کہ یہ زمانہ لوہے کے رنگ کا ہے اور قریب الختم ہے۔ سال آئندہ کے موسم بہار سے سنہرا زمانہ شروع ہوگا اور اسی کا تحت انتظار ہے۔ [۲] نکلر زمرن کی کتاب مسیحیت و بائبل (مطبوعہ برلن ۱۹۰۳ء) صفحہ ۳۰۔ [۳] ابتدائی عیسائیوں کے قول زریں کے موافق یحییٰ مسیح کے مبشر تھے۔ [۴] لفظ کرایسٹ (جس کا ترجمہ یسوع) کیا جاتا ہے اصل میں یونانی لفظ ہے۔ یہ لفظ عبرانی لفظ مسیحا کا ترجمہ ہے۔

چھوڑی کہ اُن کی ہستی ہی معرض شک و شبہ میں پڑجاتی ہے۔ یہ شک و شبہ باوجود ہر قسم کی تحقیقات کے اب تک جوں کا توں چلا آتا ہے اور یسوع کوئی تاریخی آدمی قرار نہیں پاتے۔ مگر خیر، ہم اُس کو تسلیم کئے لیتے ہیں کہ وہ اس دنیا رکون و فساد میں موجود تھے۔ شاید اس قدر فرض کر لینا بھی صحیح نہ ہو، مگر غالب خیال یہ ہے کہ وہ موجود تھے[1]۔ یہ فرض کر لینے کے بعد کہ وہ موجود تھے ان کی سوانح حیات چند فقروں میں ختم ہو جاتے ہیں۔ وہ ناصرہ، واقع گلیلی میں پیدا ہوئے؟ ان کے والدین کاریگر یا دستکار تھے! اُن کے کئی بھائی اور کئی بہنیں تھیں وہ ان سب میں بڑے تھے۔ تیس یا پینتیس[2] برس کی عمر میں ان کو اس جرم میں قتل کر دیا گیا کہ اُنھوں نے اپنے زمانہ کے اصحاب بست و کشاد کے خلاف کچھ کہہ دیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خوبصورت آدمی تھے اور جو کچھ کہتے تھے اس کا اثر ان کے سامعین یا ملنے والوں پر بہت پڑتا تھا۔ ان کا نصب العین یہ تھا کہ کسی طرح وہ سنہرے زمانہ کو دنیا میں پھر لے آئیں۔ مگر جب ان کو یقین ہو گیا کہ اس میں وہ کامیاب نہیں ہوسکے اور وہ قتل کئے جانے والے ہیں تو ان کو اسی میں سلامتی معلوم ہوئی کہ وہ اپنے معتقدین سے یہ کہہ جائیں کہ میں بہت جلد اس دنیا میں پھر آؤنگا اور اس وقت وہ سنہرا زمانہ لے کر آؤنگا۔ جس کے لانے کے لئے میں کوشش کرتا رہا ہوں، مگر کامیاب نہیں ہوا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ان کا یہ دلی خیال تھا چنانچہ لوقا ۲۱-۲۳ میں ہے کہ "میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک یہ تمام باتیں نہ ہولیں یہ نسل ہرگز تمام نہ ہوگی۔ (لوقا ۲۱-۲۳)

مگر یہ نسل بھی گزر گئی اور تمام باتیں پوری نہیں ہوئیں۔

اب اس سے یہ امر صاف ظاہر ہے کہ اگر اس زمانہ کے لوگ بجائے معتقدات کے عقل سے کام لیتے تو یسوع کی زندگی کے پچاس برس بعد ایک بھی عیسائی دنیا میں نظر نہ آتا کیونکہ جو وعدہ اپنی واپسی کا انھوں نے تعدی کے ساتھ کیا تھا وہ اب تک پورا نہیں ہوا۔

مگر باوجود ان تمام باتوں کے موجودہ زمانہ کے ذی ہوش آدمی مسیحا کی آمد کے منتظر ہیں۔ کلیسا اب تک یہی کہلاتا چلا آتا ہے کہ خدا نے یسوع کے جسم میں حلول کر لیا ہے۔ وہ ایک مرتبہ دنیا میں آ چکے ہیں اور ایک زمانۂ نامعلوم میں پھر آ کر تمام بنی آدم کا انصاف کریں گے اور ان کے افعال کے موافق اُن کو انعام یا سزا دیں گے

اناجیل

خدا کے انصاف کی یہ امیدیں ہم کو انجیل ہی کے ذریعہ سے پیدا ہوئی ہیں۔ انجیل، بلکہ صحیح طور پر اناجیل[3]، یسوع کے سو برس کے بعد لکھی گئیں، اور وہ بھی اس لئے کہ ان کی ہستی کا ان لوگوں کو یقین دلایا جائے جو انکو ماننے میں تامل کر رہے تھے

---

[1] اس کے متعلق گگنے برٹ نے اپنی کتاب "مختصر تاریخ مسیحیانِ قدیم" میں بہت ہی مختصر دلایل دئے ہیں (صفحہ ۱۵۷)

[2] اصلیت یہ ہے کہ انجیلوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ کلیسا نے صرف چار انجیلوں کو صحیح ماناہے کہتے ہیں کہ یہی چار الہامی یا صحیح ہیں باقی فضول رضعی یہ چار کس طرح صحیح قرار پائیں؟ یہ قصہ نہایت دلچسپ ہے، مگر یہاں اسے بیان کرنا بے محل ہے سوال یہ ہے کہ چار کیوں صحیح قرار دی گئیں۔ سینٹ ایرینیوش کہتے ہیں کہ دنیا میں چار موسم چار ہی ہوائیں اور زمین کے چار ہی کونے ہوتے ہیں اور ہر ایک کے لئے ایک ستون کی ضرورت ہے اسکے متعلق آگے ملاحظہ ہو

[3] ابتدائی عیسائیوں نے یسوع کی سوانحعمری اس واسطے نہیں لکھی کہ وہ ہر لحظہ اُن کی واپسی کے منتظر تھے۔

یسوع کے دنیا سے اُٹھ جانے کے سو برس بعد اہل دنیا کو اس کا علم ہوا کہ وہ کیا تھے اور کون تھے۔ یہ ضرور تھا کہ کسی کسی کو یہ بات یاد تھی کہ وہ بہت نیک دل آدمی تھے۔ نیز یہ کہ انھوں نے اپنی زندگی کو اپنے ان مخترعہ اصول پر قربان کر دیا جو ان کے نزدیک بہترین تھے ان کو بہت ہی عزیز تھے۔

اُن سے پہلے جن لوگوں نے اپنے آپ کو نجات دہندہ بتلایا، یا لوگوں نے قرار دے لیا اُن میں سے کسی نے بھی اپنے آپ کو قربان کر ڈالنے کی ایسی مثال نہیں دکھلائی جیسی کہ یسوع نے۔ یہی وہ چیز تھی جسکے ذریعہ سے انسانوں نے ان میں وہ نشانیاں دیکھیں جو اُس شخص میں ہونی چاہئیں جس کا مدتہا مدید سے انتظار تھا۔[۱]

یسوع بطور مسیحا کے عقیدہ یہ تھا کہ یسوع کے تشریف لانے سے پہلے ان کے پیشرو لوگوں نے جو فوق العادت باتیں دکھلائی تھیں وہ صرف اس لئے تھیں کہ دنیا کو اُن کے لئے تیار کر رکھیں، تاکہ جیسے ہی وہ آئیں تمام دنیا اُن کو پہچان لے

یسوع کو چونکہ لوگ نجات دہندہ سمجھتے تھے اس لئے لازمی منطقی نتیجہ یہ ہوا کہ وہی مسیحا ہیں اور وہ پُرانے پیغمبروں سے زیادہ معجزات دکھلا سکتے ہیں[۲]

موسیٰ نے بنی اسرائیل کو ایک صحرا میں بطور خرقِ عادت پیٹ بھر کر کھلایا تھا، اس لئے یسوع نے بھی ایک جمِ غفیر کو جو ان کا وعظ سننے آئے تھے، بطور خرق عادت پیٹ بھر کر کھلایا۔

اس زمانہ کے لوگوں کو پکا عقیدہ تھا کہ جب سنہرا زمانہ دنیا پر آئے گا تو اندھوں کو نظر آنے لگیگا، گونگے گانے لگینگے، لنگڑے خرگوشوں کی طرح بھاگنے لگینگے اور مُردے زندہ ہو جائیں گے۔ اسی طرح جب سنہرا زمانہ لے کر یسوع آگئے تو ان ہی اندھوں گونگوں کو اچھا کر دیا اور مردوں کو اٹھا بٹھایا۔

ایک اور پکا عقیدہ یہ تھا کہ وہ سنہرا زمانہ اپنے ساتھ پورا انقلاب لیکر آئیگا اور دنیا کے رسم و رواج میں پوری تبدیلی ہو جائیگی، اسی وجہ سے یہ تسلیم کر لیا گیا کہ یسوع نے صحیح یا غلط یہ کہا ہے کہ اول آخر ہو جائیگا اور آخر اول خاص کر اس بادشاہت میں جس کو وہ سمجھتے تھے کہ میں قائم کرونگا۔

سب جانتے ہیں کہ یسوع ناصرہ میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن پُرانی روایات کے موافق جو بنی اسرائیل کے ذریعہ سے ہر جگہ پھیلی ہوئی تھیں، مسیحا بیت اللحم میں پیدا ہونے والے تھے، کیونکہ بیت اللحم داؤد کی پیدائش کی جگہ تھی اور داؤد بنی اسرائیل کے جد اعلیٰ تھے۔ چونکہ مسیحا وہ شخص تھا کہ جو بنی اسرائیل کو سلطنت روم کے ظلموں سے بچانے والا تھا جس طرح کہ داؤد نے فلسطین میں

[۱] ایشیا ہی کو نہیں ساری دنیا کو انتظار تھا۔ اُن کو یہ امید تھی کہ اُن کے آتے ہی دنیا میں دفعتہً انقلاب ہو جائیگا۔

[۲] عام اعتقاد یہ تھا کہ چونکہ یسوع مسیحا ہیں اس لئے ان کا کام ہی یہ تھا کہ معجزے دکھلائیں (ای ہیوٹ جلد چہارم صفحہ ۱۰)

بچا یا تھا۔ اس لئے اگر وہ پیدا ہوگا تو بیت اللحم ہی میں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ انجیل کے مصنف یہ کہتے ہیں کہ یسوع یعنی مسیحا بیت اللحم ہی میں پیدا ہوے تھے (ناصرہ کا ذکر ہی اُڑ گیا)

نجات دہندہ اور سورج دیوتا

میں اوپر یہ کہہ چکا ہوں کہ یسوع کے انتقال کے سو برس کے بعد اناجیل لکھی گئی ہیں۔ فرض کیجئے کہ نپولین کی بابت اب تک کسی کو کچھ نہ معلوم ہوا اور آج کوئی اس کی سوانح عمری لکھنے بیٹھے تو ظاہر ہے کہ اس سوانح میں لاطایل قصہ کہانی کا بڑا حصہ ہوگا اور یہ بھی اس حالت میں کہ ہم خلاق وہمہ سے تو غرض نہیں رکھتے خاص کر وہ ایسا خلاق وہمہ جو دیوتاؤں کے متعلق کام کر چکا ہے اور بہت سوں کو دیوتا بنا چکا ہے۔

پھر اس کا تصور کیجئے کہ آج سے بیس صدی پیشتر لوگوں کا کرۂ ارض کی نسبت کیا خیال تھا۔ وہ بھولے بھالے لوگ یہ سمجھتے تھے یہ دنیا ایک بکس ہے اس کا نچلا حصہ زمین ہے ڈھکنا آسمان ہے اور پہاڑ اس کے چہار اطراف ہیں اس دنیا میں جو اس طرح محدود ہے، ہر چیز ایک دوسرے سے وابستہ ہے آسمان، زمین کا آئینہ ہے انسان جو زمین میں رہتا ہے وہ ان دیوتاؤں کی تصویر ہے جو آسمان پر رہتے ہیں۔ مظاہر قدرت جو ظاہر ہوتے ہیں ان میں اور انسان کے افعال میں گہرا تعلق ہے۔ اس لئے انسان کی خوشحالی و بدحالی اسی کے قبضہ قدرت میں ہے جو موسموں کو بدلتا ہے۔

زمانۂ حال میں ہم کہتے ہیں "کہ بارش ہو رہی ہے یا دھوپ نکلی ہوئی ہے" جب ہم یہ کہتے ہیں تو ہمارا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ایک طاقت بارش کرتی ہے اور دوسری دھوپ نکالتی ہے۔ ہمارے نزدیک تو دھوپ کا نکلا ہونا بارش کا ہونا سردی یا گرمی کا موسم، ایسے الفاظ ہیں جو ہمارے محسوسات کو ظاہر کرتے ہیں، لیکن زمانۂ قدیم کے لوگ ان مظاہر قدرت کو قادر مطلق مانتے تھے۔ آفتاب اور دھوپ کا نکالنا یہ خدا کا کام تھا اور ہوا اور طوفان شیطان کا۔

خدا جب کبھی زمین پر اترے گا تو وہ عام طور پر انسانی صورت میں اتریگا، نہایت خوبصورت جوان ہوگا۔ کیونکہ اس کے سارے کام اچھے اور خوبصورت ہیں۔ وہ عالم شباب میں مریگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اچھے دن جلدی ختم ہو جاتے ہیں۔ دوسرے سال یہ خدا پھر جی اٹھیگا۔ پھر مریگا اور پھر جی اٹھیگا۔ وعلیٰ ہذا۔ یہ نوجوان سورج دیوتا ہمیشہ تمام دیوتاؤں سے زیادہ خوبصورت ہوگا۔ عورتوں کا یہ خاص طور پر محبوب ہوگا۔ شدہ شدہ یہ دیوتا بھی تقریباً اسی عمر میں، جس میں کہ یسوع نے وعظ شروع کیا تھا وعظ کرنا شروع کریگا۔ یہی وہ دیوتا ہوتا ہے جسکو مہذب دنیا دیوتا مانتی ہے۔ مصر قدیم میں اسی قسم کا دیوتا اوسی اس تھا، ایرانی اُسے مہر کہتے تھے۔ شام میں اس کا نام

---

۵۱ عربوں نے صرف نپولین کا نام ہی سنا ہے یا اُس کی کچھ اور حکایات انھوں نے اس کے متعلق سیکڑوں قصہ کہانیاں بنا رکھی ہیں۔

۵۲ شیطان کا ہمیشہ سانپ یا اژدہا یا کسی اور درندے کی شکل میں ظاہر ہونا کہا جاتا ہے دیکھئے صفحہ ۱۲

۵۳ تفصیل کے لئے ماہ اپریل کا رسالہ ملاحظہ فرمائیے

۵۴ مہر کے معنی ظاہر ہیں کہ سورج کے ہیں۔

اڈونس تھا، ایشیا رکوچک میں اسے ٹس کہلاتا تھا، یونانیوں نے اس کا نام بیکچس رکھا تھا سوائے چند مخصوص باتوں کے جو چنداں اہمیت نہیں رکھتیں یہی ایک دیوتا ہے، جو مختلف ناموں کیساتھ پوجا جاتا تھا۔

ایک اہم واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سورج دیوتا کے متعلق جو قصے کہانیاں مشہور رہیں وہی زمانہ قدیم کے بڑے آدمیوں پر منطبق ہونے چاہئیں اور ہوتے ہیں۔ اگر اس کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات آسان سی رہ جاتی ہے کہ جس نجات دہندہ کا انتظار ہے چونکہ وہ نسل انسانی پر ویسا ہی اثر انداز ہوگا جیسا کہ آفتاب دنیا پر، اس لئے اس نجات دہندہ اور سورج دیوتا کو ایک ہی آدمی قرار دے لینا نہایت ضروری ہے! یا یوں تبدیل الفاظ یوں کہنا چاہئے کہ نجات دہندہ فی الحقیقت سورج دیوتا کا سروپ ہے۔ اقوام بایدہ نجات دہندہ کے ویسے ہی منتظر اور ویسے ہی امیدوار تھیں جیسے کہ شعراء موسم بہار کے۔

باقی ——— باقی

محمد خلیل الرحمٰن
مترجم اخبار الاندلس وغیرہ

استفسارات

عیسیٰ علیہ السلام

(۱)

(جناب حامد حسین صاحب بلرام پور)

"نگار" ماہ ستمبر ۱۹۶۶ء میں بہ عنوان استفسارات محمد اکبر خانصاحب کراچی کے استفسارات پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بابت جو طولانی مضمون آپ کا شایع ہوا ہے میری نظر سے بھی گزرا۔ اس سے پیشتر حضرت خضر علیہ السلام کا ذکر جس مضمون میں ہے اور جس کی بنا پر محمد اکبر صاحب کو شکایت کی ضرورت محسوس ہوئی ہے وہ میں نے نہیں دیکھا لہٰذا اس کی بابتہ اظہار خیال سے قاصر ہوں۔ لیکن اس مضمون میں جو خیالات آپ نے ظاہر فرمائے ہیں وہ قرآن حکیم اور معتقدات اسلامی کے خلاف ہیں۔ لہٰذا ایک مسلمان کی حیثیت سے مجھے بھی کچھ عرض کرنا ہی گو اس تصدیعہ دہی کا کوئی مفید نتیجہ نہیں معلوم ہوتا کیونکہ یہ زمانہ آزادی کا ہے ہر شخص بغیر قاضی و محتسب کا خوف کئے ہوئے انا الحق کہہ سکتا ہے۔ یہ ذیل ملاحظات محمد اکبر خانصاحب کی "سنجیدہ برہمی" جس "شاعرانہ شوخی" کے ساتھ آپنے بقول خود (ظاہر بیں اور کوتاہ اندیش حضرات کے نقطۂ نظر سے) اپنی نامسلمانی کو اس کے آخری حدود تک پہنچا دیا ہے اور اوٹلے تیرہ سو سال سے مسلمانوں کے انحطاط پذیر ذہنیت کا جو مرثیہ پڑھا ہے وہ میرے دعوے کی بیّن دلیل ہے۔

محمد اکبر خانصاحب کی مثال دیکھکر مجھے تصدیعہ دہی کی جرأت نہ کرنا چاہیئے تھی لیکن جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا ہے اس کو "اپنی نامسلمانی کی آخری حدود" سے نامزد فرمایا ہے لہٰذا اب مجھے اطمینان ہے کہ اس سے آگے آپ کہاں جائیں گے۔

گو پورے مضمون میں جو خیالات آپ نے ظاہر فرمائے ہیں وہ قرآن حکیم کے سیاق عبارت اور مفسرین کرام کے اجماع کے خلاف ہیں اور جا بجا اپنے حسب منشار مطلب نکالنے کے لئے آپ نے ترجمہ میں بھی تصرف فرمایا ہے۔ لیکن میں اس وقت صرف بحث کے تیسرے جزو یعنی معجزات کی بابتہ عرض کروں گا۔

(عبارت نگار) سب سے پہلا معجزہ تو یہ ہے کہ آپ نے گہوارہ سے گفتگو کی اُن کے متعلق ہم کوئی مزید بحث نہ کریں گے۔ کیونکہ گزشتہ صفحات میں ہم اس کی حقیقت واضح کر چکے ہیں اور گہوارہ سے بات کرنیکا مفہوم صغرسنی میں بات کرنیکا ہے اور یہ کوئی معجزہ نہ

(گزارش) دیکھنا یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے گہوارہ میں کیسی باتیں کیں۔ ویسی ہی کہ جیسے عام بچے۔ اماں۔ ابا۔ ام وغیرہ

بولتے ہیں۔ یا ایسی جن کا صدور ایک بچہ سے مافوق العادۃ سمجھا گیا

فرشتے نے جب حضرت مریم کو اللہ کی طرف سے بیٹے کی خوشخبری دی تو منجملہ اور صفات کے اُن کا یہ وصف بھی بیان کیا کہ "وہ لوگوں سے کلام کریگا گہوارہ اور بڑھاپے میں" (آل عمران) خدا نے حضرت عیسیٰ کو مخاطب کرکے جہاں اپنی نعمتیں یاد دلائی ہیں وہیں اس نعمت کا بھی ذکر کیا ہے کہ "تونے بات کی لوگوں ـــ گہوارہ میں اور بڑھاپے میں" (سورۂ مائدہ) ظاہر ہے کہ فرشتہ کی خوشخبری اور خدا کے انعام میں گہوارہ میں لوگوں سے کلام کرنے کی صفت ضرور کوئی مافوق الفطرت بات ہوسکتی ہے ورنہ اس خصوصیت کے اظہار کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

یہ خصوصیت سورۂ مریم کی آیات سے اور بھی واضح ہوجاتی ہے "پھر مریم اپنے لڑکے کو قوم کے پاس (اٹھالائی) انھوں نے کہا اے مریم تو عجیب چیز لائی ہے۔ اے ہارون کی بہن نہ تیرا باپ خراب آدمی تھا اور نہ تیری ماں خراب تھی پھر اشارہ کیا وہ تم نے لڑکے کی طرف "لوگوں نے کہا کہ ہم کیا بات کریں اس سے جو تھا ایک لڑکا گہوارہ میں (جو گود میں ایک بچہ ہے) عیسیٰ نے کہا میں خدا کا بندہ ہوں دی ہے اس نے مجھے کتاب اور بنایا ہے مجھے نبی الخ

حالانکہ آپ نے حسب منشاء خود ترجمہ میں تصرف فرمایا ہے (جو ایک ذمہ دار اہل قلم کی دیانت سے بعید ہے) لیکن آپ کی کوشش بالکل فضول ہوئی اور بجائے کسی فائدہ کے بات ہی مہمل ہوگئی۔

پہلی غلطی یہ کی کہ فاتت بہ قومہا تحملہ کا ترجمہ "پھر مریم اپنے لڑکے کو قوم کے پاس لائی" فرمایا ہے۔ حالانکہ تحملہ کی موجودگی میں ترجمہ بجائے لائی کے اوٹھالائی ہونا چاہیئے تھا یعنی گود میں اوٹھالائی۔

دوسری جگہ آپنے "قالو کیف نکلم من کان فی المھد صبیا" کا ترجمہ فرمایا ہے کہ "لوگوں نے کہا کہ ہم کیا بات کریں اس سے جو تھا ایک لڑکا گہوارہ میں"، حالانکہ صحیح ترجمہ یوں ہونا چاہیئے تھا کہ "لوگوں نے کہا ہم کیا بات کریں اس سے جو گود میں ایک لڑکا ہے"۔ بجائے وہ ہے " تھا " معلوم نہیں کس لفظ کے معنی آپ نے لئے ہیں۔

ترجمہ میں یہ صریح غلطی آپ نے اس ضرورت سے فرمائی کہ ایک دوسری آیت کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت مریم حضرت عیسیٰ کو قوم کے سامنے کسی سواری پر لائیں لہذا جہاں آپ نے یہ فرض کرلیا کہ حضرت عیسیٰ کی عمر اس وقت بیس سال سے متجاوز ہوچکی تھی اور منصب نبوت عطا ہوچکا تھا وہیں ان آیات کا ترجمہ اپنی مرضی کے موافق کرلیا اور مجھے افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ یہ بہت بڑی جسارت ہے؛ حالانکہ یہ تسلیم کرلینے کے بعد بھی کہ حضرت مریم حضرت عیسیٰ کو کسی سواری پر لائیں دوسری آیات کے ترجمہ میں تغیر و تبدل کے بغیر یوں ظاہر ہوسکتا ہے کہ حضرت مریم خود کسی سواری پر آئی ہوں اور حضرت عیسیٰ اُن کی گود میں ہوں ایسی صورت میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ اُن کو سواری پر لائیں اور کوئی اخلاق نہیں رہجاتا ہے۔

اب جس بہت سے آپ کا ترجمہ بیکار ہوگیا۔ ملاحظہ فرمایئے۔ جو بات اُن لوگوں نے حضرت عیسیٰ کی بابتہ بقول آپ کے بیس سال کی عمر میں کہی کہ ہم اس سے کیا بات کریں جو ایک لڑکا تھا گہوارے میں وہی سو برس کے بڈھے کی بابت بھی کہی جاسکتی ہے اور یہی اعتراض خود قائلین ہو سکتا تھا پھر ایسی بے نتیجہ بات وہ لوگ کیوں کہتے۔

یہ کلام پاک کا اعجاز ہے کہ تھا اور ہے کے ادنیٰ تغیر میں بھی انسان کامیاب نہیں ہو سکتا، کیونکہ خدا نے خود ہی اُس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے ورنہ اگر انسان کا زور چلتا تو مخالفین اسلام جو ہمہ وقت اُس کے مٹانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں کب کا مسخ کر چکے ہوتے۔

اِن آیات کریمہ کا سیاق عبارت بھی یہی ظاہر کرتا ہے کہ قوم نے حضرت عیسیٰ کی مافوق الفطرت پیدائش پر حضرت مریم کو ملامت کی تب حضرت مریم نے لڑکے کی طرف اشارہ کیا اور حضرتِ عیسیٰ نے گود میں یہ باتیں کہیں کہ میں خدا کا بندہ ہوں۔ دی ہے اُس نے مجھے کتاب، اور بنایا ہے مجھے نبی۔ الخ

ظاہر ہے کہ گود کے بچے ایسی باتیں نہیں کر سکتے جیسی حضرتِ عیسیٰ نے کہیں اور یہ اس مافوق الفطرت کا نتیجہ تھا جس کی فرشتے نے خدا کی طرف سے حضرت مریم کو خوشخبری دی تھی اور جس کو خدا نے منجملہ اپنی نعمتوں کے حضرت عیسیٰ کو یاد دلایا تھا۔ اور اس کو معجزہ نہ کہنا زیادتی ہے آپ نے حضرتِ عیسیٰ کی گفتگو سے دو نتیجے نکالے ہیں (۱) یہ کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش میں حضرت مریم کے چال و چلن کے متعلق کوئی سوال ہی درپیش نہیں تھا اور حضرت عیسیٰ یوسف نجار (اپنے باپ اور حضرت مریم کے شوہر) کے بیٹے تھے ورنہ جب انھوں نے گفتگو کی تھی تو حضرتِ مریم کی برائت کے متعلق بھی کہتے (۲) اس وقت ان کی عمر بیس سال سے متجاوز تھی اور منصب نبوت عطا ہو چکا تھا۔ لیکن یہ دونوں خدشے صحیح نہیں ہیں اس لئے کہ ان لوگوں کے ان اعتراض سے کہ اے مریم تو ایک عجیب چیز لائی ہے نہ تیرا باپ خراب آدمی تھا نہ تیری ماں خراب تھی بالکل واضح ہے کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش میں حضرت مریم کے چال و چلن پر انھیں شک تھا۔ لیکن حضرتِ عیسیٰ نے باوجود صغر سنی گود میں ایسی گفتگو کی کہ میں خدا کا بندہ اور نبی ہوں اور مجھے کتاب عطا ہوئی ہے تو انھوں نے خود ہی سمجھ لیا کہ یہ کوئی مافوق الفطرت ہستی ہے ورنہ اتنا بڑا بچہ ایسی باتیں کیونکر کر سکتا ہے اس لئے اور کسی گفتگو کی ضرورت ہی نہیں رہتی تھی (۲) آپ صرف اس بنا پر قیاس کرتے ہیں کہ یہ گفتگو منصب نبوت پر فائز ہونے کے بعد ہوئی کہ حضرت عیسیٰ اگرچہ بچہ تھے تو قبل از وقت عطائے منصب نبوت کا ذکر کیسے کرتے لیکن چونکہ آپ سے یہ باتیں ایک معمولی انسان کے موافق اپنی قوت ارادی سے سرزد نہیں ہوئیں لہٰذا آپ پر یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا اور یہ تسلیم کر لینے میں کیا نقص پڑتا ہے کہ ارادۂ اللہ کے مطابق اُن کی زبان سے الفاظ نکلوا دیے گئے۔ دیگر معجزات کی تفصیل حسب ذیل ہے جن کی بابت آپ نے اظہار خیال فرمایا ہے۔

(۱) مٹی کی چڑیا بنا کر حضرت عیسیٰ کا اس کے اندر پھونک مارنا اور اُڑ جانا۔

(۲) اندھے کوڑھیوں کو اچھا کرنا۔

(۳) مردہ کو زندہ کرنا۔

(۴) غیب کی خبر دینا اس قبیل سے کہ لوگ کیا کھاتے ہیں اور گھروں میں کیا رکھتے ہیں۔

(۵) حضرت عیسیٰ کی دعا پر دسترخوان کھانیکا آسمان سے نازل ہونا۔

(انتخاب عبارت نگار)

(۱) معجزہ اوّل کے متعلق بعض مفسرین کا خیال ہے کہ واقعی وہ مٹی کی چڑیاں بناتے تھے اور اس میں جان ڈالتے تھے بعض کا بیان ہے جس میں سرسید مرحوم بھی شامل ہیں کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ کے عہد طفلی کا ہے اور بچپن میں لڑکے اس قسم کی باتیں کیا ہی کرتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک یہ دونوں باتیں سمجھ سے باہر ہیں اور اس لئے کہ کسی شے میں جان ڈالنا یا کسی چیز کو پیدا کرنا صرف اللہ کا کام ہے اور اس لئے کہ اگر مٹی کی چڑیاں بنا کر ان میں جان ڈالنے کا واقعہ صرف ان کے عہد طفلی کے کھیل سے متعلق تھا تو خدا اپنی نعمتوں کے سلسلے میں اس کا ذکر نہ کرتا جیسا کہ سورۂ مائدہ کی آیتوں سے ظاہر ہے۔

(۲) انجیل کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو آسانی سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ حضرت عیسیٰ نے جہاں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ سب قصص و حکایات اور امثال و تشبیہات کی صورت میں بیان کیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے لٹریچر کی یہی شان تھی اس لئے غور کرنا چاہئے کہ لفظ خلق سے یہاں کیا مراد ہے اور نفخ کے بعد طائر کی طرح اڑ جانا کیا معنی رکھتا ہے"

(۳) "آیت متذکرۂ سورۂ آل عمران کے معنی یہ ہوئے کہ تم لوگوں کو جو مٹی سے نیچے ہو بلند پرواز اور بلند خیال انسان بناتا ہوں"

(الف) آپ نے یہ تحریر فرما کر کہ بعض حضرات مفسرین معجزۂ اوّل کے قائل نہیں اور بعض جن میں سرسید مرحوم بھی شامل ہیں یہ ثابت کرنیکی کوشش فرمائی ہے کہ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ جمہور علماء امت کا اجماع معجزۂ اوّل کے حق میں ہے اور اگر سرسید مرحوم کے علاوہ کچھ اور حضرات خلاف ہیں تو ان کا شمار ہزار ہا مفسرین کرام قائلین معجزہ کے مقابلہ میں صفر کے برابر ہوگا۔

(ب) مفسرین کرام کی صف میں سرسید مرحوم کا کیا درجہ تھا لوگ جانتے ہیں ساتھ ہی موصوف کے ہم خیال دیگر مفسرین کی تعداد اور اسمائے گرامی آپ کو ظاہر کر دینا چاہئے تھے تاکہ لوگ اندازہ کر سکتے کہ اس قدر اور ایسے لوگوں کی مخالفت سے مسئلہ مختلف فیہ کہا جا سکتا ہے یا نہیں۔

(ج) سرسید مرحوم اور دیگر مفسرین کی طرف سے جو خیال آپ نے ظاہر فرمایا ہے اس کی بابت مجھے صاف صاف عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ غلط ہے ان حضرات نے ہرگز ایسی بات نہ لکھی ہوگی کیا آپ ان حضرات کو عقل سلیم سے اس قدر بے بہرہ سمجھتے ہیں جو یہ رائے رکھتے ہوں گے کہ لڑکے عموماً مٹی کی چڑیاں بنا کر اور اس میں جان ڈال کر اڑا دیا کرتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ جن حضرات نے یہ خیال ظاہر کیا ہوگا کہ یہ حضرت عیسیٰ کے لڑکپن کا واقعہ ہوگا ان کا منشا حضرت عیسیٰ کے علو مراتب کا اظہار ہوگا کہ بچپن ہی سے امداد غیبی شامل حال تھی اور وہ کھیل میں مٹی کی جو چڑیاں بناتے تھے خدا کے حکم سے ان میں جان ڈالدیتے تھے۔

مندرجہ بالا مغالطوں کے علاوہ ساڑھے تیرہ سو برس کے طویل زمانہ میں جس قدر مفسرین کرام گزرے ہیں جن کو مخبر صادق (ارواحی فداک) نے العلما امتی کا بنیا (انبیاء) بنی اسرائیل کے قابل فخر لقب سے یاد فرمایا ہے سب کی رائے سے آپ اختلاف فرماتے ہیں اور آپ کے نزدیک یہ دونوں باتیں سمجھ سے باہر ہیں کیونکہ کسی شے کا پیدا کرنا یا اُس میں جان ڈالنا صرف اللہ کا کام ہے۔

کیسی بوالعجبی ہے کہ جن بزرگوں کی عمریں خدمت قرآن وحدیث اور اعلائے کلمۃ اللہ میں گزر گئیں وہ اس باریکی تک نہ پہنچ سکے۔ کہ کسی شے کا پیدا کرنا یا کسی چیز میں جان ڈالنا صرف اللہ کا کام ہے" اور ایک ادبی رسالہ جاری کرکے آپ کو یہ عرفان حاصل ہو گیا۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

اگر آپ سورۂ مائدہ کی آیات "جب کہے گا اللہ اے عیسیٰ ابن مریم یاد کر میری نعمت کو اپنے اوپر اور اپنی ماں کے اوپر جب میں نے مدد کی تیری روح القدس کے ذریعہ سے تو نے بات کی لوگوں سے گہوارہ میں اور بڑھاپے میں۔ جب میں نے سکھائی تجھے کتاب وحکمت توریت وانجیل اور جب بنایا تو نے مٹی سے طائر کی صورت میں پھر تو نے پھونکا اس میں اور وہ ہو گیا طائر میرے حکم سے اور اچھا کیا تو نے اندھے کو اور کوڑھی کو میرے حکم سے اور جب تو نے نکالا مردے کو میرے حکم سے اور جب میں نے باز رکھا بنی اسرائیل کو تجھ سے جبکہ تو اُن کے پاس کھلی ہوئی نشانیاں لایا۔ لیکن کافروں نے کہا یہ کھلا ہوا جادو ہے۔"

یا سورۂ آل عمران کی آیات "میں لایا ہوں تمہارے پاس نشانی تمہارے رب کی میں بناتا ہوں تمہارے لئے مٹی کے طائر کی صورت میں پھر پھونکتا ہوں پس وہ ہو جاتا ہے ایک طائر اللہ کے حکم سے اور اچھا کرتا ہوں اندھے کو اور کوڑھی کو اور جلاتا ہوں مردے کو اللہ کے حکم سے اور خبردار کرتا ہوں تم کو اس سے کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا گھروں میں بچاتے ہو تحقیق کہ اس میں نشانی ہے تمہارے لئے اگر تم ایمان لانے والے ہو۔" پر غور فرماتے تو معلوم ہوتا کہ جان ڈالنے کی بابتہ خدا نے تصریح فرما دی ہے کہ میرے حکم سے اور حضرت عیسیٰ نے یہی واضح فرما دیا ہے کہ "پس وہ ہو جاتا ہے طائر اللہ کے حکم سے" اور مفسرین کرام یا کسی مسلمان کا یہ عقیدہ کبھی نہیں رہا ہے کہ حضرت عیسیٰ میں بہ حیثیت انسان یہ قوت موجود تھی۔ بلکہ یہ کہ یہ قوت بطور معجزہ خدا کی طرف سے خاص طور سے عطا ہوئی تھی۔

(۲) عبارت متذکرہ بالا نمبر ۲ میں آپ نے جو غلط بحث فرما دیا ہے اس پر شاید غور نہیں فرمایا ہے براہ عنایت اب غور فرمایئے۔
"خلق اور نفخ" الفاظ قرآن کی معنی متعین کرنے کیلئے آپ فرماتے ہیں کہ اگر انجیل کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ حضرت عیسیٰ نے جہاں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ سب قصص وحکایات اور امثال وتشبیہات کی صورت میں بیان کیا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے لٹریچر کی یہی شان تھی اس لئے غور کرنا چاہیئے کہ خلق سے یہاں کیا مراد ہے اور نفخ کے بعد طائر کی طرح اڑتا کیا معنی رکھتا ہے۔

سبحان اللہ ایسے ہی منطقی دلائل سے دن کو رات زمین کو آسمان اور سفید کو سیاہ ثابت کر دیا جا سکتا ہے یہ کہاں کا انصاف ہے کہ الفاظ قرآنی کے معنی کی تلاش میں آپ لوگوں کو عہد نزول انجیل مقدس کا راستہ بتا دیں حضرت عیسیٰ کی گفتگو اور انجیل مقدس کے الفاظ کے اس وقت خواہ کچھ ہی معنی لئے جاتے ہوں الفاظ قرآن کے معنی متعین کرنے میں آپ ان سے کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکتے صرف وقت نزول قرآن پاک کے محاورہ عرب کی تحقیق کرنا ہوگی۔

(۳) عبارت متذکرہ صدر نمبر ۳ میں آیت کے جو معنی آپ نے بتائے ہیں وہ بوجوہات غلط ہیں۔

(۲) دونوں صورتوں میں مٹی سے طائر کی صورت بنانے روح پھونکنے اور پھر طائر ہو جانے اندھے کوڑھی کو اچھا کرنے۔ مردے جلانے کی بابت ایک ہی الفاظ استعمال ہوئے اگر آپ کے خیال کے مطابق یہ الفاظ اپنے صحیح معنوں میں مستعمل نہ ہوئے ہوتے بلکہ امثال و تشبیہات استعمال کئے گئے ہوتے تو یہ ضروری نہیں تھا کہ دونوں موقعوں پر یکساں تشبیہات مستعمل ہوتیں جو عبارت حضرت عیسیٰ کی طرف سے ہے اور جو خدا کی طرف سے دونوں میں کہیں نہ کہیں کسی تشبیہ میں فرق ہونا چاہیے تھا اس یکسانیت سے ثابت ہوتا ہے کہ جو الفاظ دونوں صورتوں میں استعمال ہوئے ہیں اپنے اصلی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔

(ب) یہ صحیح ہے کہ کلام پاک میں کہیں تشبیہ و استعمال سے بھی کام لیا گیا ہے لیکن ہر موقع پر سیاق عبارت سے صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ یہ لفظ بطور استعارہ استعمال ہوا ہے مگر آیات متذکرہ بالا میں یہ صورت نہیں ہے اور اگر آپ کے بتائے ہوئے معنی مان لئے جائیں جو ساڑھے تیرہ سو برس کے عرصہ میں آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آئے تو کلام الٰہی پر جس کی فصاحت و بلاغت مسلمہ ہے سخت اعتراض وارد ہوتا ہے۔

(ج) آپ کے نزدیک آیت کے معنی یہ ہوئے کہ تم لوگوں کو جو مٹی سے بنے ہوا لخ

لیکن حضرت عیسیٰ نے فرمایا ہے کہ " میں بناتا ہوں تمہارے لئے مٹی سے طائر کی صورت میں " اور دونوں فقروں کے مفہوم میں زمین و آسمان کا جو فرق ہے ظاہر ہے۔

(د) حضرت عیسیٰ نے پہلے فرمایا ہے " کہ میں لایا ہوں تمہارے رب کی طرف سے نشانی " اور پھر تفصیل کی ہے کہ یوں مٹی سے طائر بناتا ہوں۔ اندھے کوڑھی کو اچھا کرتا ہوں وغیرہ۔ اور نشانی انہیں امور کو کہا جا سکتا ہے جو بہت واضح۔ خاص اور مہتم بالشان ہوں آپ کے بتائے ہوئے مطلب میں کوئی بات نشانی کی تعریف میں نہیں آسکتی۔ اس لئے کہ اگر حضرت عیسیٰ نے کسی کو تعلیم الٰہی کے ذریعہ سے بلند پرواز اور بلند خیال انسان بنا دیا ہو یا کسی گنہگار کو گناہوں سے بچا کر اخلاقی تعلیم سے زندہ کر دیا ہو تو یہ چونکہ اندرونی اصلاح تھی لہٰذا دوسرے لوگوں کو نہ اس کا علم ہو سکتا ہے نہ وہ قائل ہو سکتے ہیں کہ یہ کوئی خدا کی طرف سے نشانی ہے درحالیکہ اور لوگ بھی کچھ نہ کچھ اصلاح دوسروں کی کر سکتے ہیں۔

(۵) سورہ مائدہ میں خدا نے حضرت عیسیٰ کو مخاطب کر کے جب سب نعمتیں یاد دلائی ہیں تو فرمایا ہے کہ "جب تو لایا ان کے پاس کھلی ہوئی نشانیاں۔ لیکن کافروں نے کہا کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے" ان کھلی ہوئی نشانیوں کو کھلا ہوا جادو اسی وقت کہا جا سکتا تھا جبکہ ان کا صدور عام قوت انسانی سے باہر اور ان کا سمجھنا بھی عقل انسانی سے ماورا ہوتا۔ کسی کی اندرونی اصلاح کو کھلا ہوا جادو نہیں کہا جا سکتا۔ لہذا ماننا پڑیگا کہ طائر بنانے۔ اندھے کوڑہی کو اچھا کرنے۔ مردے کو جلانے وغیرہ کی بابتہ جو الفاظ کلام پاک میں مستعمل ہوئے ہیں اپنے صحیح معنوں میں استعمال کئے گئے ہیں نہ بطور تشبیہ و استعارہ۔ طائر بنانے کے جو معنی آپ نے بیان فرمائے ہیں وہ اوپر عرض کئے گئے ہیں اندھے کوڑہی کو اچھا کرنے اور مردے کو جلانے کا مطلب آپ کے نزدیک اخلاقی بیماریوں کی اصلاح ہے لہذا معجزہ ۱ و ۲ و ۳ کے متعلق مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا معجزۂ اول ہی کے سلسلہ میں عرض کر دیا۔

(عبارت نگار متعلق معجزہ نمبر ۴)

ان الفاظ سے کہ "میں تم کو بتاتا ہوں یا تنبیہ کرتا ہوں کہ تم کتنا اور کیا کھاتے ہو اور کیا جمع کرتے ہو" میری سمجھ میں نہیں آتا اخبار عن الغیب کیونکر سمجھ لیا گیا۔

(گزارش) اخبار عن الغیب اس لئے سمجھ لیا گیا ہے کہ اول تو حضرت عیسیٰ نے منجملہ اپنے اور اوصاف کے جو ان کو خدا کی طرف سے بطور نشانی مرحمت ہوئے تھے اس صفت کو بھی بیان فرمایا ہے دوسرے یہ کہ ہر شخص لوگوں کی بابتہ یہ نہیں بتا سکتا کہ انہوں نے کیا کھایا ہے اور کیا ان کے گھر میں ہے۔

(عبارت نگار متعلق معجزہ نمبر ۵)

کلام مجید سے کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مائدہ نازل کیا گیا۔ علاوہ اس کے مائدہ سے یہاں کھانیکا دسترخوان مراد نہیں ہے۔ بلکہ مقصود صرف روزی ہے اور حضرت عیسیٰ کی دعا بعینہٖ ویسی ہی تھی جیسی کہ انجیل میں پائی جاتی ہے "کہ اے خدا ہمارے آج کی خوراک دے"۔ مائدہ کی ان آیتوں سے صرف یہ واضح ہوتا ہے کہ حواریوں نے وسعت رزق طلب کی تھی اور اسی کی بابتہ حضرت عیسیٰ نے دعا فرمائی سو اس کے قبول ہونیکا ثبوت آج کل عیسائیوں کی دنیاوی ترقی ہے"۔

(گزارش) سورۂ مائدہ کی آیات کا ترجمہ یہ ہے "کہا انہوں نے ارادہ کرتے ہیں کہ کھاویں ہم اور آرام پکڑیں ہمارے دل اور جانیں ہم کہ سچ کہا ہے تم نے ہم سے اور ہم اس پر گواہ ہوں۔ کہا عیسیٰ نے یا اللہ پروردگار ہمارے اتار ہمارے اوپر خوان آسمان سے اور ہو وے عید ہمارے واسطے اور ہمارے اگلے اور پچھلوں کے لئے اور نشانی تیری طرف سے اور رزق دے ہم کو اور تو بہتر رزق دینے والا ہے۔ کہا اللہ نے تحقیق میں اتارنے والا ہوں اس کو تمہارے اوپر۔ پس جو کوئی کفر کرے اس کے بعد میں تحقیق میں عذاب کروں گا اس پر ایسا کہ نہ کرونگا کسی پر عالموں میں سے"۔

آیات کریمہ مذکورہ سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ کے حواریین نے نزول مائدہ کی خواہش کی تھی جس کا مقصد یہ بتایا تھا کہ ہم اس کو کھائینگے اور ہمارے قلب کو اطمینان حاصل ہوگا۔ اور ہم جانیں گے کہ تم دعوی نبوت میں سچے ہو اور ہم دوسرے لوگوں کے سامنے تمہارے سچے نبی ہونے کی شہادت دیں گے چنانچہ حضرت عیسیٰ نے بارگاہ خداوندی میں دعا فرمائی (۱) مخصوص نزول مائدہ کیلئے (۲) عام طور پر وسعت رزق کیلئے (نہ کہ آپ کے قول کے مطابق محض وسعت رزق کے لئے) خدا نے فرمایا ہے کہ ہم مائدہ اتارنے والے ہیں۔ لیکن اگر اس کے بعد پھر کوئی کفر کریگا تو اس پر ایسا سخت عذاب نازل کریں گے جیسا تمام عالموں میں سے کسی پر نہ کریں گے۔
مفسرین کرام نے اس موقع پر تصریح فرمائی ہے کہ اس قدر سخت وعید کی وجہ یہ تھی کہ حواریین جو متواتر نشانیاں دیکھکر ایمان لا چکے تھے۔ پھر حضرت عیسیٰ کا امتحان کرنا چاہتے تھے اور یہ گستاخی تھی سوائے اس قدر ذکر کے جو ان آیات کریمہ میں ہے نزول مائدہ کی بابتہ کلام پاک میں اور زیادہ صراحت نہیں ہے کہ نازل ہوا یا نہیں۔
شیخ ابن کثیر رحمتہ نے بروایت مجاہد و حسن فرمایا ہے کہ مائدہ نازل نہیں ہوا کیونکہ شرط اس قدر سخت تھی کہ حواریین ڈر گئے اور پھر سوال کی ہمت نہیں کی لیکن جمہور امت اور مشاہیر ائمہ علماء کا قول ہے اور اخبار و آثار سلف اس کے موئد ہیں کہ مائدہ نازل ہوا (تفسیر مواہب الرحمٰن)
بہر حال جب قرآن کریم میں نزول مائدہ منصوص نہیں ہے تو اجماع امت کے خلاف بھی آپ انکار کر سکتے ہیں لیکن آپ سے انکار کے بعد بھی دو فائدے حاصل ہوتے ہیں۔
(۱) حضرت عیسیٰ کی دعا کے ایک جزو کی مقبولیت آپ بھی تسلیم کرتے ہیں یعنی وسعت رزق کی گو اسی کو کل دعا کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور صرف یہی بات معجزہ سے کیا کم ہے۔
(۲) نزول مائدہ کی بابتہ قرآن حکیم سے جب اس قدر ثابت ہے کہ حواریین نے خواہش کی۔ حضرت عیسیٰ نے دعا فرمائی اور اللہ نے وعدہ فرمایا تو اگر حواریین سخت شرط سے ڈر نہ جاتے (یا اگر آپ یہ وجہ نہ مانیں تو جو وجہ ہو) تو اللہ اپنا وعدہ ضرور پورا کرتا بہر حال اس معجزہ کے عطا کرنے میں بھی خدا کی طرف سے کوئی کمی نہیں ہوئی۔
جملہ معجزات میں ہر جگہ تاویل کی ضرورت آپ کو یوں محسوس ہوتی ہے کہ یہ باتیں قانون قدرت کے خلاف ہیں اور آپ کی سمجھ سے باہر ہیں۔
لیکن زرا غور تو فرمائیے ع ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجاست
عقل انسانی کی ہستی ہی کیا ہے جو اس کے کارخانۂ قدرت کے رموز سمجھ سکے اور جب بڑی بڑی مقدس ہستیوں نے لاعلم لنا الا ما علمتنا۔ کہکر اپنی عاجزی تسلیم کرلی تو ہماری آپ کی عقلیں کس شمار و قطار میں ہیں۔ اگر آپ وہی بات مان سکتے ہیں جو آپ کی عقل میں آتی ہو تو کائنات کے ذرہ ذرہ میں جو بے شمار رموز و اسرار ہیں سب کو چھوڑ کے صرف ایک ہی بات بتا دیجئے کہ حضرت عیسیٰ کی دعا اگر دربارۂ وسعت رزق مقبول ہوئی اور بقول آپ کے عیسائیوں کی موجودہ دنیاوی ترقی اس کا ثبوت ہے یہ بات عقل میں کیونکر

آتی ہے۔

اگر آپ خدا کو قادر مانتے ہیں تب تو کوئی دشواری نہیں رہتی جہاں سب باتیں قانونِ قدرت کے موافق ہوتی ہیں وہ جس بات کو چاہے خلافِ معمول بھی واقع ہو سکتی ہے۔ جس طرح عجیب الخلقت جانور اور انسان پیدا ہوتے ہیں عورت کے پیٹ سے سانپ پیدا ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ لیکن افسوس یہ ہے کہ ہم لوگ مادیت سے اس قدر مرعوب ہیں کہ بقول حضرت اکبر مرحوم ؎

ولیکن اس نئی تہذیب کے بزرگ اکثر — خدا کو اور نہ طریقِ دعا کو مانتے ہیں
زبانی کہتے ہیں سب کچھ مگر حقیقت میں — وہ صرف قوتِ فرماں روا کو مانتے ہیں

خوش قسمتی سے ہم لوگ ایسے زمانے میں پیدا ہوئے ہیں جب حضور خاتم النبیین رحمۃ اللعالمین کے ظہور قدسی کی برکت سے ہر طرف تہذیب و تمدن کا دور دورہ ہے اور بعثت انبیا کی ضرورت باقی نہیں رہی اس لئے ہمارے ذہن میں اس تاریک زمانہ کا صحیح نقشہ نہیں آتا ہے جب قدرت کو کسی قوم یا ملک کے لئے نبی مبعوث کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ فرض کیجیے کہ ایک نبی کی وفات کو عرصہ گزر چکا ہے اس کی قوم رفتہ رفتہ احکام خداوندی فراموش کر چکی ہے بجائے عقیدۂ توحید و عبادت الٰہی معبودان باطل کی پرستش ہوتی ہے شراب خواری، قماربازی۔ چوری۔ قتل اولاد۔ ظلم و تعدی کی گرم بازاری ہے قاعدہ قانون۔ تہذیب۔ اخلاق۔ سب بالائے طاق غرضکہ جب ہر اعتبار سے حالت سقیم ہو جاتی ہے۔ عقیدۂ توحید فنا ہونے کے قریب ہوتا ہے۔ تو غیرت خداوندی جوش میں آتی ہے اور کسی شریف ترین خاندان سے پھر ایک نبی مبعوث ہوتا ہے جو قوم کے سامنے خدا کی بھیجی ہوئی کتاب پیش کرتا ہے اور اس کے احکام کے بموجب عمل کرنے کی ہدایت کرتا ہے اور ان کی بداعمالیوں پر خدا کے عذاب سے ڈراتا ہے۔

اب ذرا غور فرمائیے کہ ایک تنِ تنہا شخص جس کے ساتھ نہ کوئی فوج ہے نہ توپ خانہ نہ ہوائی جہاز نہ مشین گن ایک پوری قوم یا ملک کے مقابلہ میں بھیجا گیا ہے جس کے قلوب بداعمالیوں سے سیاہ ہو چکے ہیں جس میں تربیت پذیری کی صلاحیت نہیں جو اپنے معبودان باطل کے خلاف ایک حرف سننے کے لئے تیار نہیں ہے ایسی صورت میں کیونکر اصلاح ہو سکتی ہے۔ ایسے ہی موقع کے لئے نبی کو معجزہ عطا ہوتا تھا اور جب کوئی ایسا مافوق العادۃ فعل نبی سے صادر ہوتا جو عام انسانی قوت و فہم سے بالاتر ہوتا تھا تو بڑے بڑے جابرہ کے سر جھک جاتے تھے اور ان کو قائل ہونا پڑتا تھا کہ واقعی یہ خدا کا بھیجا ہوا نبی ہے اور تائید غیبی اس کے ساتھ ہے۔

حالانکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر نبی سے معجزہ کا اظہار ہو۔ جہاں ضرورت ہوئی معجزہ عطا ہوا اور جہاں ظاہری معجزہ کی ضرورت نہیں پڑی وہاں قوم کے دل میں نبی کی کشش پیدا کر دی گئی اور وہ خود بخود رجوع ہو گئی۔ اور یہ بھی معجزہ سے کم نہیں۔

آج جبکہ ہم اس تاریک زمانے کی فضا کا اندازہ کرنے سے قاصر ہیں یا اس دورِ مادیت میں خدا کو قادر مطلق محض زبان سے کہتے ہیں اور دل سے یقین نہیں کرتے تو یہ صرف ہمارا کھوٹ ہے جس کی سزا بھی بقول حضرت اکبر بھگت رہے ہیں ؎

آپ منکر ہیں غلامی بھی نہیں ملتی ہے
سلطنت کر گئے عقبیٰ سے ڈرانے والے
اکبرؔ

۲

(جناب محمد عبدالحمید صاحب ۔ مالیگاؤں)

ستمبر نگار میں سلسلۂ استفسارات آپ نے جو تحریر حضرت مسیح کی ولادت ۔ وفات اور معجزات سے متعلق لکھی ہے مجھے اس میں کچھ شکوک ہیں امید کہ آپ رفع فرمائیں گے ۔ اس صحبت میں میں صرف انہیں شکوک کو پیش کروں گا جن کا تعلق مسئلہ ولادت سے ہے ۔

(۱) آپ فرماتے ہیں " کہ جب مریمؑ نے کہا میرے کیسے بیٹا ہوگا جبکہ مجھے کسی مرد نے چھوا تک نہیں تو فرشتہ نے کذالک (ایسا ہوگا) یعنی تمہیں مرد چھوئیگا اور تمہارے اولاد ہوگی۔

اگر کذلک کا ہر جگہ یہی مفہوم ہے جو آپ فرماتے ہیں تو قال ربک ہو علی ہین اور لنجعلہ آیۃ کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی کیونکہ والدین کی وساطت سے مولد کا ہونا کوئی استعجاب اور اشکال طلب امر نہیں ۔ حتیٰ کہ فرشتے کو حضرت مریمؑ کے اسکات و اطمینان کے لئے ہو علی ہین اور لنجعلہ آیہ کہنے کی ضرورت ہوئی ۔

(۲) آپ فرماتے ہیں " لنجعلہ آیۃ للناس ورحمۃ منّا کا تعلق حضرت عیسیٰ کی آئندہ زندگی اور نبوت سے ہے نہ کہ ولادت اور طریق ولادت سے "

ولادت سے متعلق مریمؑ کی طلب توجیہہ پر فرشتہ کا جواب علیّ ہینٌ ہوتے ہوئے لنجعلہ آیہ کو حضرت عیسیٰ کی آئندہ زندگی سے متعلق حرف لام کو بیکار کر دینا ہے حضرت عیسیٰ کی زندگی اور نبوت تو ضرور خدا کی رحمت تھی لیکن خدا کی آیت (نشانی) ہونا ان کی غیر معمولی ولادت ہی کے لئے چسپاں ہے ۔

(۳) آپ فرماتے ہیں " اگر ولادت مسیح کے غیر معمولی طور پر ہونیکا اظہار مقصود ہے تو یخلق کیف مایشار کہا جاتا نہ کہ یخلق مایشار "
کیا لفظ ما کی تعمیم اس قدر محدود ہوتی ہے کہ اس میں واقعہ کی نوعیت داخل نہیں ہو سکتی ۔ کیا جو چاہتا ہے کرتا ہے کے یہ معنی نہیں کہ جیسا چاہتا ہے کرتا ہے ۔

(۴) آپ فرماتے ہیں " سوان سے بھی عیسیٰ کی ولادت غیر معمولی طور پر ثابت نہیں ہو سکتی "
میں نے قرآن مجید پر اس واقعہ سے متعلق ایک سرسری نظر ڈالی ہے جس سے معلوم ہوا کہ لفظ کن فیکون کا استعمال کل آٹھ مقامات پر ہوا ہے ۔ ممکن ہے غائر نظر کے بعد دو ایک اور مقام پر مل جائے ان مقامات میں چار تو خود مسیح کی ولادت ہی سے متعلق

موہنی کی یاد

دور ہیں تو کیا ہوا میں اُنھیں بلاؤں گی — جذب دل کی قوتیں آج آزماؤں گی

ہے سنگار انھیں عزیز ہاں سنگار کر تو لوں — ان کو پھر بلاؤنگی پہلے بن سنور تو لوں

آئینہ تو دیکھ لوں مانگ تو سنبھال لوں — ان کو جو پسند ہے وہ پھبن نکال لوں

کیا ہوا یہہ حال ارے تو ہی ہے موہنی — جس سے آئینہ کی گود پہلے بھر سی جاتی تھی

پہلے جسم میں لباس کیسا جذب رہتا تھا — موج بحرِ حسن ہے آئینہ یہہ کہتا تھا

اب لباس ہے کہیں جسم زار ہے کہیں — دھوکا ہو رہا ہے مجھکو اسمیں ہوں بھی یا نہیں

شکل میری مٹ گئی میں خیال رہ گئی — گھُل کے دردِ ہجر کی اک مثال رہ گئی

حلقے میری آنکھوں میں ہائے کیسے پڑ گئے — آہ رُخ کے خال و خد کس قدر بگڑ گئے

سب اُلجھ رہے ہیں بال خشک ہو رہے ہیں گال — پیلے پڑ گئے ہیں ہونٹھ پہلے رہتے تھے جو لال

آہ سوزِ ہجر نے کیا سے کیا بنا دیا — رنگ روپ سب مرا خاک میں ملا دیا

خون پہلے خشک ہو کے دل کی آگ بن گیا — دل میں آگ جب بڑھی سوکھ تن بدن گیا

کیا سنگار بن پڑیگا کیا پھبن بناؤں گی — وہ بہار جوشِ حسن اب کہاں سے لاؤنگی

دل کی آگ ہی مدد کچھ کرے تو بات ہے — جوشِ شوق مجھ میں رنگ کچھ بھرے تو بات ہے

شمعِ سوزِ دل تری آج ایسی لَو بڑھے — نور برسے ہر طرف رُخ پہ ایسی ضَو بڑھے

ان کے جاتے ہی مرا کیا یہہ حال ہو گیا — گلشنِ جمال آہ پائمال ہو گیا

مجھ سے بڑھکے انکو اپنا یہہ چمن عزیز تھا — رنگِ رُخ عزیز تھا تن بدن عزیز تھا

وہ جو پوچھینگے تو میں بات کیا بناؤں گی — اُن کے آگے کیا یہی شکل لیکے جاؤنگی

میری شکل دیکھکر رُخ کا رنگ فق نہ ہو — آنکھیں ڈبڈبا نہ آئیں ہائے یہہ قلق نہ ہو

کیا خیال آگیا کانپ اُٹھی لرز گئی ہ — قلب بھی لرز گیا روح بھی لرز گئی ہ

مجھ سے خوش نہ ہوسکیں تف ہے میری زندگی — ہائے اُن کو ہو ملال اور پھر وہ مجھ سے ہی

میری زندگی کا راز اُن کی ہی خوشی تو ہے — اُن کو لطفِ زندگی اور مجھ سے ہی تو ہے
کس سے حالِ دل کہوں غمگسار کون ہے — آئینے تیرے سوا رازدار کون ہے
تو ہی کچھ جتن بتا تو ہی کچھ مدد بھی کر — اُن کے رنگ کی بہار چھائے مجھ پہ سر بسر
تن پہ اُن کا ہو سہاگ رخ پہ ان کا رنگ ہو — جسم کے روئیں روئیں میں جوش ہو ترنگ ہو
سر سے پاؤں تک مرے اک پھبن ہو میں نہ ہوں — یہہ بدن بہار کا پیرہن ہو میں نہ ہوں
کنگھی جلد جلد چل دل مرا دُکھا نہ تو — چوٹی جلد گندھ بھی جا جی مرا جلا نہ تو
ڈھیلی پڑ کے چوڑیاں کیسی بولنے لگیں — سب پہ رازِ دردِ دل آہ کھولنے لگیں
کنگھی کب سے کی نہیں کیا اُلجھ رہی ہے لٹ — سر پہ خاک جم گئی بال سب گئے چکٹ
میری لٹ الجھ نہ تو بات کو سمجھ تو جا — تجھ کو سر چڑھاوں میں جلدیے سلجھ تو جا
مان لے کہا مرا آج دِق نہ کر بہت — گُن میں مانونگی ترا دیکھ عمر بھر بہت
تجھکو مجھ سے کد ہے کیوں میں نے تیرا کیا کیا — یہہ خطا ضرور کی ہاں تجھے بھلا دیا ہ
آ گئے جو آج وہ دل کو تجھ پہ واردوں گی — روز روز یاد کر کے پھر تجھے سنوارونگی
کتنے بال ٹوٹ کر آہ سر سے آ رہے ہیں — ضعف نے ستم ستم کیسے ظلم ڈھاے ہیں
سر پہ بال بھی رہے مانگ کیا بناؤنگی — سر وہ دیکھینگے تو میں کسقدر لجاونگی
کنگھی چوٹی ہی کے ہات آج میری لاج ہے — رنگِ ہاں کے ساتھ سب سرخروئی آج ہے
ساری جسم زار کی لاغری چھپائیگی — زیوروں کی پھبن حسن بنکے چھائیگی
اک ادا نظر فریب مجھ پہ چھا ہی جائیگی — انکی آنکھ کچھ نہ کچھ دھوکا کھا ہی جائیگی
آنکھ کو تو اس طرح دھوکا دے سکونگی میں — اُن کے دل کو کس طرح دھوکا دیسکونگی میں
اس میں ہو گی پہلے والی موہنی بسی ہوئی — صورت بہار نو رنگ میں بھری ہوئی
اس کے آگے ہے عبث یہہ سجاوٹیں مری — اُن پہ کھل ہی جائینگی سب بناوٹیں مری
بن تو لوں سنور تو لوں خیر دیکھا جائے گا — اُن سے بھی تو کچھ نہ کچھ مجھکو ہات آئیگا
آہٹ انکی پاتے ہی جسم پھول جائے گا — رنگ کی طرح بدن میں پیرہن سمائے گا
بیخودی شوق میں آنکھ لڑ ہی جائیگی — لاکھ مٹ گئی ہوں میں جان پڑ ہی جائیگی

ان کے فیض حسن سے حسن آ ہی جائے گا
میرا چہرہ سیاہ نور با ہی جائے گا

دل کے آستانہ پر کس نے یہ قدم رکھا
جوش اضطراب شوق موج برق بن گیا

حسن مجھ میں آگیا رنگ رُخ بدل گیا
یک بیک چراغ نور آئینے میں جل گیا

آئینے میں جلوہ گر یہ بہار نور ہے
عکس ہے میرا کہ اک آبشار نور ہے

میں وہی ہوں موہنی یا شبیہ یار ہوں
آئینے بتا تو دے کس سے ہمکنار ہوں

شام موہن لعل بی اے جگر بریلوی

حدیثِ میکدہ

کسی میخوار سے پیر مغاں نے یہ کہی اچھی
خودی کا بھی ہو جس میں کچھ اثر وہ بیخودی اچھی

سرور، بادۂ عظمت نہیں گر کاسۂ سر میں
تو اس ناگفتہ بہ ہستی سے تیری نیستی اچھی

اگر جویائے ساغر ہے تو نادان ظرف پیدا کر
تو پہلے مستحق تو بن جو خواہش ہے تری اچھی

کہاں اک تجھ سا نووارد، کہاں آداب میخانہ
چلا آتا ہے محفل میں، رہی یہ دل لگی اچھی

ترا مقصود مینوشی سے ہے ہرزہ سرائی کا
تجھے مطلب ہے پینے سے ملی جیسی بری اچھی

ہوا وارفتہ گر تو جذبۂ بے اختیاری سے
مرے نزدیک غم اچھا نہ پھر تیری خوشی اچھی

شرار بادۂ رنگیں کی تابانی کو کیا جانے
تو کیا سمجھے کہ ہے پیر مغاں کی دوستی اچھی

نکل صف سے نہ کر بدنام ناحق بزم رنداں کو
تری دلجوئی سے نادان تیسری دشمنی اچھی

محمود اسرائیلی

رجز حیات

۱

دلِ مضطر تری بے تابیاں ہی　　مظاہر ہیں حیاتِ مستتر کی
دلِ بیدار یہ بیخوابیاں ہی　　کمندیں ہیں تری اونچی نظر کی

۲

تو ہے روشنگرِ آئینۂ دہر　　تری سرگرمیوں میں ارتقا ہے
دل؟ اور اسکو مہر این کینۂ دہر!!　　ترے ہر فعل میں مضمر بقا ہے

۳

تو لیلائے چمن ہے اے دل! اے دل!　　ترے دیوانے اسرارِ نہاں ہیں
تو شمعِ انجمن ہے اے دل! اے دل!　　ترے پروانے اسرارِ نہاں ہیں

۴

کلیدِ قفلِ گنجِ کن فکاں تو ہے　　کہ تو دانندۂ رازِ جہاں ہے
زماں تو اور زمین و آسماں تو　　تری وسعت محیطِ این و آں ہے

۵

تلاطم خیزیاں ہیں تیرے شایاں　　سکوں کے نام سے نا آشنا رہ
کہ تو ہے قلزمِ مواجِ عرفاں　　بلائے کشمکش میں مبتلا رہ

امینِ حزین

حیات

ہوگئی تسخیر وہ دنیا مرے اشعار سے
لے سکے جس کو نہ شاہانِ جہاں تلوار سے

روحِ انساں زندہ تر ہی عشق کے آزار سے
بزمِ گیتی کی بقا ہے عاشقانِ زار سے

اشکِ خوں آنکھوں کو لب کو آہ دل کو حسرتیں
نعمتیں کیا کیا ملی ہیں حسنِ بے آزار سے

ٹوٹتے ہیں میرے سکن میں ستارے دمبدم
جگمگاتی ہیں نگاہیں لذتِ دیدار سے

آج زاہد کو بیاں کرنی ہے رودادِ بہشت
کون اٹھتا ہے تمھارے سایۂ دیوار سے

موجبِ قہر و غضب اہلِ ورع کے جرم ہیں
ہے فروغِ مغفرت زندانِ ظلمت کار سے

آرہے ہیں پھول کس کو ڈھونڈتے بازار میں
کون بد قسمت تہی دامن گیا گلزار سے

بھول جا نظارۂ گنگ و جمن کو ہمنشیں
خونِ دل کو گرم کر افسانۂ تاتار سے

یہ بھی کوئی زندگی ہے اے اسیرانِ قفس
زندگی کا لطف پوچھا چاہئے احرار سے

زندگی جن کی ہے لاخوفٌ علیھم کی دلیل
دہر میں ڈرتے نہیں جو توپ اور تلوار سے

جھومتا ہے گو نجتا ہے آسماں پر ابر کیا
ایک قطرہ پی کے میری ساغرِ پندار سے

انجمن کی انجمن مدہوش ہوجانے کو ہے
بادۂ عرفاں ٹپکتا ہے مری گفتار سے

وہ فروغِ صبحِ ہستی ظلمتِ شب میں نظیر
میرے پہلو میں چلا آیا حرا کے غار سے

صفدر حسین خاں نظیر لودھیانوی

کلام آزاد

سختی تعزیر اُٹھالی جائیگی　رحم کی خواہش دبالی جائیگی
کیا خبر تھی۔ پردہ ہائے لطف میں　جور کی بنیاد ڈالی جائیگی
کون واقف تھا کہ شکل آرزو　درد کے قالب میں ڈھالی جائیگی
اب دل ناکام ہے اور فرط یاس　اب طبیعت کیا سنبھالی جائیگی
حسرتِ اظہارِ غم برحق۔ مگر۔　بات بھی مُنھ سے نکالی جائیگی
التماس شوق سے کیا فائدہ　جانتا ہوں۔ بات ٹالی جائیگی
شکر کو شکوہ تو ثابت کیجئے　شرم سے گردن جھکالی جائیگی
شکوۂ غم پر کہا تو یہ کہا　لذتِ غم بھی اُٹھالی جائیگی
نازِ خودداری غلط ثابت ہوا　عادتِ تسلیم ڈالی جائیگی
گاہے ماہے پھر ملامت ایگاں　ورنہ پھر دنرات ڈھالی جائیگی
نالۂ آزاد سے ہے یا مضحکہ　آہِ درویش اور خالی جائیگی

(جناب حکیم آزاد انصاری)

واردات دل

(حضرت دل شاہجہاں پوری)

حسنِ ازل ہے جلوہ گر آئینۂ مجاز میں　عشق نے روح پھونکدی جذبۂ امتیاز میں
اُٹھے تو درد کیطرح بیٹھے تو گرد کی طرح　عمر ہمین گزار دی دشتِ جنوں نواز میں
چشم وفا نواز سے شانِ نیاز دیکھئے　پست ہے رعب غزنوی بارگہ ایاز میں
حاصلِ تہائے غم پوچھئے اُس غریب سے　عرصۂ حشر ہے نہاں جسکی شب دراز میں
سنگِ درِ حبیب کو جبہ سہی قبول کی　فرق نہ آئے اے جبین حوصلۂ نیاز میں
عشق رسول پاک سے ہو اثر پذیر دل　نالہ کریں جو ہند میں گونج اٹھے حجاز میں
عشقِ وفا پرست کی شان ہے جدا ہے دل
ہستیٔ دل مٹائیے رہگزر نیاز میں

افکار ہاشمی

(جناب سید ابوالقاسم ہاشمی)

لذت آشامِ خلش پابندِ ذوقِ ہوش تھا　دل میں تھا ہنگامۂ فریاد لب خاموش تھا
کیف جامِ بیخودی تھا مضمرِ رازِ سلوک　فی الحقیقت باخبر ہونا ہی ننگِ ہوش تھا
کیا دکھائیں دیکھئے لیل و نہارِ زندگی　آج پہلے سے مریضِ شامِ غم بیہوش تھا
یہ بھی تھی ضبطِ تپش کی منزلِ راہِ نیاز　گریۂ شمع لحد بھی نالۂ خاموش تھا
پردۂ شب میں یہ چھیڑا کسنے سازِ سوزِ دل　راز بانگ لن ترانی کیوں ہمہ تن گوش تھا
امتیازِ بیخودی کا یہ بھی تھا نازونیاز　کون کہتا ہے کلیمِ طور کو بیہوش تھا
رنگ آمیز جنوں تھیں ہجر کی نیرنگیاں　ہستی جام جہاں میں بیخودی کا جوش تھا
خندۂ صبحِ کفن تھا کاشفِ رازِ حیات　آئینۂ فطرت کا خواب ہستی خاموش تھا
بھول بیٹھا ہاشمی ذلتِ ہستی کا سبق　عالم اکبر کے اک ساغر سے یہ مدہوش تھا

کیفیات کیف

(جناب کیف مرادابادی)

نگارخانۂ قدرت کا آئینہ ہوں میں　کوئی نہ دیکھے جسے اسکو دیکھتا ہوں میں
فریب خوردۂ مجبوریٔ وفا ہوں میں　کسی حسین کی باتوں میں آگیا ہوں میں
طلسم خانۂ الفت میں کھو گیا ہوں میں　نگاہِ ناز بتادے مجھے کہ کیا ہوں میں
میں جانتا نہیں ہے ہجر کیا وصال کیا　مگر کسی کو شب و روز ڈھونڈتا ہوں میں
تجھے ہے اپنی جفا کی قسم مجھے تو نہ بھول　کہ اس جہاں میں اک تجھکو جانتا ہوں میں
دعائے نیم شبی صرفِ آرزو ہے عبث　کہ لوحِ دہر سے مٹ جانا چاہتا ہوں میں
جمال دیکھ کے غش کھا گیا کمال کیا　کسی کے چھپنے سے دیوانہ ہو گیا ہوں میں
یہ بزم نازنہ ماتم کدہ کہیں بن جائے　مجھے نہ چھیڑ کہ اک دکھ بھری صدا ہوں میں
بہت غرور تھا اس عشق پہ مجھے اے کیف
ویارِ حسن میں ٹھکرا دیا گیا ہوں میں

جذباتِ فراق

(جناب فراق گورکھپوری)

آخر فراق بن گئی جان پر تری — کمبخت [illegible] کسی پہ نظر تری
موج ہوا کے ہاتھ میں ہے دامنِ بہار — [illegible] ہے کوئی کھڑا راہ پر تری
کیا پردہ داریاں ہیں تری اے نگاہِ مست — نہ پا سکا کوئی بھی نہ اے بیخبر تری
اک وقت ہوگا ہم سے جو دیکھا نہ جائیگا — ہم جانتے ہیں اے شبِ ہجراں سحر تری
اے وعدہ کرکے بھولنے والی تری نثار — جینا پڑیگا کتنے دنوں بات پر تری
جانے ہوؤں کو دیکھ کے انجان بن سکوں — پا جاؤں جو کہیں تو چرا لوں نظر تری
ناکامیاں ملی ہیں کچھ اے جلوہ گاہِ ناز — ہم تیرہ بخت آ سے بھتے امید پر تری
کچھ لڑکھڑا رہی ہے نسیمِ بہار بھی — اٹھی چلی ہے سوئے گلستاں نظر تری
یہ سوز و ساز اے غمِ ہستی ترے نثار — تصویر ہو کے رہ گئی شمعِ سحر تری

صبحِ شبِ فراق ہوئی اور ابھی فراق
بیٹھا ہے اپنے گھر کو کئے رہگزر تری

کلام صادق

(جناب محمد صادق ایوبی)

دیکھئے دشت میں کیا حشر بپا ہوتا ہے — عازمِ راہ کوئی آبلہ پا ہوتا ہے
ڈوبنے والے بھی ساحل پہ پہنچ جاتے ہیں — کون دریائے حقیقت میں فنا ہوتا ہے
درپئے پرسشِ آزارِ محبت کیوں ہے؟ — چارہ گر! درد مرا اور سوا ہوتا ہے

کاٹنا قیدِ مصیبت کا ہے آساں کوئی!
مر کے صادق کہیں انسان رہا ہوتا ہے

افکارِ ہادی

(جناب ہادی صاحب مچھلی شہری)

ہمیں کہ جانِ مرا رنجِ انتظار آمد — ہزار بار برفت و ہزار بار آمد
بملکِ عشق ز نا داری خودم نالم — ازاں زماں کہ مرا اندکے قرار آمد
دلم چرا بطپیدن نمی دہد اذنے — مگر ز گفتۂ امید اعتبار آمد
بمرگِ خویش خودم را ہلاکِ غم دارم — بجانِ عشق و دلم سخت بیقرار آمد
فلک بگردشِ خود ہم ز کجروی ماند — ہماں زمانہ کہ دستم بدستِ یار آمد
دلم ز لطفِ تو ساقی تشکرے دارد — کہ مست آمد و نادیدہ خمار آمد
ہمیں بس است ز لطفِ نگاہِ تو گفتن — کہ داغ بر دلِ بیچارہ بے شمار آمد
ز بسکہ ہر نگہِ یاسِ من زبانے داشت — چگونگیِ دلِ زار آشکار آمد
فشاں دہد بر خم رنگِ نا پریدۂ من — کہ دل ز بوتۂ عشقِ تو کم عیار آمد
منم ز داولِ ہستی ستم رسیدۂ ہجر — کہ دیدہ وا نشدہ عہدِ انتظار آمد
ز اشک دیدہ کہ پر خونِ لختہا دل است — نفوذِ تیر نگاہت با عنبار آمدہ
نگاہِ من سبد گل شدہ ست از فیضش — بدوشِ رنگِ رخت موجۂ بہار آمد
دلم بناخوشیِ عشق شاد و خرسند است — مریض ہیں کہ خودش دد دچارہ کار آمد
بہیچ رہ گزر شتم ز منزلِ تب و تاب — دلم بیادِ غمش سوخت چوں قرار آمد
ز کوی او کہ گزرگاہِ صد تمنا ہا است — نسیم نافۂ تاتار در کنار آمد

ز روے سوز کہ در سینہ داشتم ہادی
چو نالہا بکشیدم ہمہ شرار آمد

مولانا شبلی مرحوم

- الغزالی قسم اول عہ
- الغزالی قسم دوم عہ
- سوانح مولانا روم قسم اول عہ
- سوانح مولانا روم قسم دوم عہ
- دیوان شبلی فارسی عہ
- کلیات شبلی عہ
- مکاتیب شبلی حصہ اول ۱۲ر
- مکاتیب شبلی حصہ دوم ۱۲ر
- الفاروق قسم اول ے
- الفاروق قسم دوم عہ
- شعر العجم حصہ اول ے
- " حصہ دوم عہ
- " حصہ سوم عہ
- " حصہ چہارم ے
- " حصہ پنجم عہ
- علم الکلام عہ
- الکلام قسم اول عہ
- الکلام قسم دوم عہ
- سفرنامہ روم و شام قسم اول عہ
- قسم دوم عہ
- مقالات شبلی قسم اول عہ
- قسم دوم ۱۲ر

- مجموعہ نظم شبلی اردو ۴ر
- اورنگ زیب پر نظر ۸ر
- حیات سعدی ۸ر
- رسائل شبلی عہ
- المامون عہ
- سیرۃ النعمان عہ
- مضامین عالمگیر قسم اول عہ
- " قسم دوم عہ
- مجموعہ کلام شبلی ۱۲ر
- آغاز اسلام قسم اول ۸ر
- بیان خسرو ۸ر
- موازنہ انیس و دبیر قسم اول عہ
- " قسم دوم ے

مولانا شرر لکھنوی مرحوم

- امام شافعی ۴ر
- ابو بکر شبلی عہ
- جنید بغدادی عہ
- خواجہ معین الدین چشتی ۶ر
- سکینہ بنت حسین ۶ر
- ملکہ زنوبیہ ۴ر
- قرۃ العین ۳ر

- شیریں ملکۂ عجم ۴ر
- مخدرات عہ
- مخدرات تیموریہ عہ
- صد پارۂ دل حصہ ۱ عہ
- " " ۲ عہ
- تاریخ سندھ حصہ ۱ عہ
- عصر قدیم عہ
- صقلیہ میں اسلام ۴ر
- تاریخ خلافت ۴ر
- اقوام کرد ۴ر
- جویائے حق کامل للعہ
- لعبت چین عہ
- عزیزۂ مصر عہ
- فاتح مفتوح عہ
- بابک خرمی کامل عہ
- الفانسو ۱۲ر
- ایام عرب کامل عہ
- فتح اندلس عہ
- ماہ ملک عہ
- قیس و لبنیٰ عہ
- یوسف و نجمہ کامل عہ

- زوال بغداد ۸ر
- درگیش نندنی ۸ر
- طاہرہ عہ
- مینا بازار عہ
- مقدس نازنین عہ
- رومتہ الکبریٰ عہ
- فلپانا عہ
- شوقین ملکہ عہ
- فلورا فلورنڈا عہ
- منصور موہنا ۸ر
- حسن انجلینا ۸ر
- ملک العزیز ورجنا ۱۲ر
- فردوس بریں ۸ر
- شہید وفا ۸ر
- حسن بن صباح ۴ر
- اسیری بابل ۴ر
- ہندوستان کی موسیقی ۴ر
- ہندوؤں کا تعلق اردو سے ۴ر
- حسن کا ڈاکو عہ
- دربار حرام پور ۱۰
- آغا صادق کی شادی ۱۰

- عیب دان دلہن عہ
- دلچسپ کامل ۱۲ر
- دلکش ۶ر
- میوۂ تلخ ۸ر
- بدر النساء کی مصیبت ۳ر
- خوفناک محبت عہ

مرزا غالب مرحوم

- اردوئے معلی عہ
- عود ہندی عہ
- دیوان غالب جیبی ے
- دیوان غالب کل صر

مولانا شہری مرحوم

- حیات انیس عہ
- ایشیائی شاعری عہ
- نورجہاں بیگم ۸ر
- ٹیپو سلطان عہ
- حیدر علی سلطان عہ

مولانا حالی مرحوم

- یادگار غالب ے
- حیات سعدی عہ
- مقدمۂ شعر و شاعری عہ
- حیات جاوید عہ
- دیوان حالی عہ

مستورات کے لائق مطالعہ کتابیں

رسول عربی - نبی کریم صلعم کے مقدس حالات خاص مستورات کے لئے سہل اور عام فہم زبان میں قیمت ۸/

امت کی مائیں - رسول اکرم کی ازواج مطہرات کے حالات آپس کا حسن سلوک رسول اللہ کی خانہ داری ۷/

بنت الرسول خاتون جنت حضرت فاطمہ زہرا رض کی سوانحعمری خواتین اسلام کے لئے قابل تقلید نمونہ ۵/

معلمہ یا بہشتی جھومر لڑکیوں کے لئے اسلامی دستور العمل جملہ مسائل نسوان ایک دلچسپ قصہ کی شکل میں ۱۲/

حوران جنت - عرب کی تمام عالمہ، فاضلہ، شاعرہ، محدثہ اور فقیہہ مسلمان بیبیوں کے حالات ۴/

پہیلی نامہ - کئی سو دلچسپ پہیلیاں مع بوجھ کے درج ہیں ۲/

لوری نامہ روتے بچوں کو ہنسنے ہنسانے اور جاگتوں کو نیند کا متوالا بنانے والی دلکش لوریاں - ۳/

ترکی کھانے - ترکی قوم کے عمدہ عمدہ لذیذ کھانوں کے پکانے کی ترکیبیں درج ہیں ۴/

نیا باورچی خانہ ہندوستانی مسلمانی، ہندوانی اور انگریزی کھانوں کے پکانیکی مکمل ترکیبیں ۲/

جذبات اسلام - مولانا حالی، شبلی، اور حکیم رسوا کی علمی و قومی تاریخی نظموں کا مجموعہ ۴/

راہ جنت بیبیوں کو دینداری کی زندگی بسر کرنیکی ترغیب دلانیوالے آسان دلچسپ قصے ۳/

دیگر تصنیفات

بادۂ ناب - مجموعہ رباعیات فارسی میر ولی اللہ صاحب بی اے ۴/

مطالبۂ فطرت - (مجلد) انگا فلسفہ اسلام پر ایک بیمثل تصنیف مصنفہ محمد فاروق - ایم ایس سی - قیمت عہ/

حلقۂ مسموم - کینن ڈائل کے ایک علمی افسانہ کا ترجمہ عہ/

سالومی - اسکر او ائلڈ کا نہایت مشہور ڈراما مترجمہ مجنوں گورکھپوری ۱۲/

نمکدان فصاحت - عربی - فارسی اردو کے بہترین علمی ادبی تاریخی لطائف کا مجموعہ - عہ/

تذکرۂ حضرت بلھے شاہ - پنجاب کے نہایت مشہور بزرگ کے تاریخی حالات مستند ذرائع سے ۸/

جہاں آرا بیگم - شاہزادی جہاں آرا بنت شاہجہاں کی نہایت مستند و دلچسپ تاریخ ۸/

بندگی - امام ابن تیمیہ کی مشہور کتاب "العبودیت" کا بیمثل ترجمہ حقایق دینی و تصوف کی بے نظیر کتاب قیمت عہ/

لسان الغیب - حافظ شیرازیؒ کی مکمل سوانحعمری اور انکے دیوان کی بہترین شرح جلد اول ے/ جلد دوم عا/

فتنہ خلق قرآن - امام عبد العزیز بن یحییٰ کی کتاب "الحیدہ" کا ترجمہ مسئلہ قرآن کے متعلق ایک بے نظیر محاکمہ ۱۰/

کاس الکرام - عمر خیام کے مفصل حالات زندگی، اور رباعیات کی مکمل شرح اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے - قیمت ے/

ابومسلم خراسانی - جرجی زیدان مصری کے مشہور ناول کا اردو ترجمہ - قیمت صرف عا/

منیجر نگار بک ایجنسی نظیر آباد لکھنؤ

(مطبوعہ نگار مشین پریس نظیر آباد لکھنؤ - باہتمام مقبول حسین وصل بلگرامی)

نیاز فتحپوری

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

جلد ۱۱ شمار ۴

نگار

فہرست مضامین اپریل ۱۹۲۷ء

جلد ۱۱	اپریل ۱۹۲۷ء	شمار ۴

نگار مشین پریس لکھنؤ میں چھپا
اور منیجر "نگار" نے نظیرآباد لکھنؤ سے شایع کیا

ہندی زبانوں میں کس قسم کا لٹریچر آچکا ہے اور آئندہ کیا ضرورت ہے جس وقت یہ رپورٹ مرتب ہوکر آجائیگی، اسوقت فیصلہ کیا جائے گا کہ کس قسم کی تصانیف ملک کے ارباب علم سے طلب کی جائیں اور کن لوگوں کو رفقا کی حیثیت سے خاص علمی خدمات پر مامور کیا جائے۔

اکاڈیمی کی تحریک سب سے پہلے خان بہادر حافظ ہدایت حسین نے کونسل میں پیش کی تھی جسکو رائے راجیشور بلی صاحب وزیر تعلیمات نے پروان چڑھایا اور ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو نے (اکاڈیمی کا مستقل صدر ہونے کی حیثیت سے) اسکی ترتیب و تہذیب میں دلچسپی سے حصہ لیا اور لے رہے ہیں اس لئے یقیناً ملک و قوم کو ان حضرات کا ممنون ہونا چاہئے اور کوشش کرنی چاہئے کہ اکاڈیمی کے مقاصد کو تکمیل کی حد تک پہونچائیں۔

اکاڈیمی کی شعبۂ اردو کے ممبروں میں سے علاوہ مسٹر رشید احمد صدیقی ایم اے کی۔ سر عبد الرؤف صاحب الہ آبادی بھی شریک نہ ہوسکے، لیکن ان کی عدم شرکت نہ غیر متوقع تھی نہ باعث افسوس وہ اس لئے کہ کچھ عرصہ سے وہ دائم المرض ہیں اور یہ اس لئے کہ اُنھوں نے کبھی اردو ادبیات سے دلچسپی لینے کا دعویٰ اس سے قبل نہ کیا تھا، لیکن اس میں کلام نہیں کہ مولوی عبد الماجد دریابادی کا اس میں شرکت اختیار کرنا اور نہ صرف یہ بلکہ گورنر کے استقبال کے لئے دوسرے صف بستہ ممبروں کے ساتھ ملکر کھڑا ہونا، کم از کم میرے لئے ضرور حیرتناک تھا، کیونکہ وہ اس جماعت کی ممبری کو (باوجود اس کے کہ خود ہی اُنھوں نے اس کو قبول کیا تھا) اپنی پیشانی کے لئے بدنما داغ سے تعبیر کرچکے تھے اور میں ڈر گیا تھا کہ اگر صاحب موصوف کا یہی خیال قایم رہا تو وہ یقیناً اس جماعت کے نظام سے کوئی دلچسپی نہ لیں گے اور اسی طرح ہمارا ایک اہم ممبر ہات سے نکل جائے گا۔ لیکن مقام شکر ہے کہ اُنھوں نے اپنے سیاسی معتقدات کو، ادبی ضروریات کے مقابلہ میں غیر مرجح قرار دیا اور زبان کی خدمت میں حصہ لینے کی غرض سے حکومت کی نامزد کردہ جماعت سے عدم تعاون نہیں کیا۔ اکاڈیمی کے ۲۰ ممبروں میں سے جماعت عاملہ کا جو انتخاب ہوا ہے، اس میں مسلمانوں یا اردو کی طرف سے سید سجاد حیدر صاحب رجسٹرار مسلم یونیورسٹی، خان بہادر حافظ ہدایت حسین صاحب کانپور اور ڈاکٹر جسٹس سلیمان الہ آباد، نمائندگی فرمائیں گے اور ہماری رائے میں یہ بہترین انتخاب ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم بات جس کا میں نے اس وقت تک ذکر نہیں کیا اور جس کا آئندہ چلکر ایک مستقل موضوعِ بحث یا نزاعِ کفر و دیں کی صورت اختیار کرلینا غیر ممکن نہیں ہے، سنسکرت اور عربی فارسی الفاظ کے استعمال کا مسئلہ ہے لیکن اگر دونوں جانب سے وہ طرز عمل پیش نہ کیا گیا جس کو سعدی نے "اگر زنجیر باشد بگسلانند" سے تعبیر کیا ہے، تو امید ہے کہ ایک درمیانی راہ ایسی پیدا ہوسکے گی جسپر اردو ہندی لٹریچر کے حامی دونوں ایک ساتھ اس منزل کو طے کرسکیں گے،

حکومت نے اکاڈیمی کے شعبۂ اردو کے لئے جن حضرات کو ممبر کی حیثیت سے نامزد کیا ہے وہ یہ ہیں:۔

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۱۱	اپریل ۱۹۲۷ء	شمارہ ۴

ملاحظات

صوبۂ متحدہ میں ہندوستانی اکاڈیمی کے بروئے کار آنے کا علم اکثر حضرات کو ہو چکا ہے اور اس لحاظ سے کہ اردو ہندی ادبیات کی ترقی کے لئے یوپی گورنمنٹ کا صحیح معنی میں یہ پہلا قدم ہے، مجھے بھی اس کا ذکر کرنا چاہئے تھا، لیکن چونکہ یہ تجویز اسوقت تک علمی صورت اختیار نہ کرچکی تھی اس لئے میں نے خاموشی اختیار کی اور منتظر رہا تا آنکہ کوئی اسلوب اس کا قائم ہو جائے چنانچہ ۲۹ مارچ کو لکھنؤ میں گورنر یوپی نے اس کا افتتاح کیا اور ۳۰ کو ڈاکٹر سرتیج بہادر کی صدارت میں اکاڈیمی کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔

حکومت نے ۵۰ ہزار کی سالانہ رقم اردو ہندی کی ترقی کے لئے منظور کی ہے اور ارباب اکاڈیمی کو اختیار دیدیا ہے کہ وہ اُسے بہتر تصنیفات و تالیفات کی فراہمی میں صرف کرے۔ ۳۰ مارچ کے پہلے اجلاس میں جہاں مجھے بھی اکاڈیمی کے ایک ممبر کی حیثیت سے شریک ہونے کی عزت حاصل تھی قابل ذکر کام ایک یہ ہوا کہ موجودہ ممبروں نے کثرت رائے سے ۶ ممبروں کا اور انتخاب کیا جس میں حسرت موہانی بھی شامل ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ ایک کمیٹی منعقد کی گئی جو رپورٹ پیش کریگی کہ اس وقت تک اُردو

ہندی زبانوں میں کس قسم کا لٹریچر آچکا ہے اور آئندہ کیا ضرورت ہے جس وقت یہ رپورٹ مرتب ہوکر آجائیگی، اسوقت فیصلہ کیا جائے گا کہ کس قسم کی تصانیف ملک کے ارباب علم سے طلب کی جائیں اور کن لوگوں کو رفقا کی حیثیت سے خاص علمی خدمات پر مامور کیا جائے۔

اکاڈیمی کی تحریک سب سے پہلے خان بہادر حافظ ہدایت حسین نے کونسل میں پیش کی تھی، جسکو رائے راجیشور بلی صاحب، وزیر تعلیمات نے پروان چڑھایا اور ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو نے (اکاڈیمی کا مستقل صدر ہونے کی حیثیت سے) اسکی ترتیب و تہذیب میں دلچسپی سے حصہ لیا اور لے رہے ہیں اس لئے یقیناً ملک و قوم کو ان حضرات کا ممنون ہونا چاہئے اور کوشش کرنی چاہئے کہ اکاڈیمی کے مقاصد کو تکمیل کی حد تک پہونچائیں۔

اکاڈیمی کی شعبۂ اردو کے ممبروں میں سے علاوہ مسٹر رشید احمد صدیقی ایم اے کی۔ سر عبدالرؤف صاحب الہ آبادی بھی شریک نہ ہوسکے، لیکن ان کی عدم شرکت نہ غیر متوقع تھی نہ باعث افسوس وہ اس لئے کہ کچھ عرصہ سے وہ دائم المرض ہیں اور یہ اس لئے کہ اُنھوں نے کبھی اردو ادبیات سے دلچسپی لینے کا دعویٰ اس سے قبل نہ کیا تھا، لیکن اس میں کلام نہیں کہ مولوی عبدالماجد دریا بادی کا اس میں شرکت اختیار کرنا اور نہ صرف یہ بلکہ گورنر کے استقبال کے لئے دوسرے صف بستہ ممبروں کے ساتھ ملکر کھڑا ہونا، کم از کم میرے لئے ضرور حیرتناک تھا، کیونکہ وہ اس جماعت کی ممبری کو (باوجود اس کے کہ خود ہی اُنھوں نے اس کو قبول کیا تھا) اپنی پیشانی کے لئے بدنما داغ سے تعبیر کر چکے تھے اور میں ڈر گیا تھا کہ اگر صاحب موصوف کا یہی خیال قایم رہا تو وہ یقیناً اس جماعت کے نظام سے کوئی دلچسپی نہ لیں گے اور اسی طرح ہمارا ایک اہم ممبر ہاتھ سے نکل جائے گا۔ لیکن مقام شکر ہے کہ اُنھوں نے اپنے سیاسی معتقدات کو، ادبی ضروریات کے مقابلہ میں غیر مرجح قرار دیا اور زبان کی خدمت میں حصہ لینے کی غرض سے حکومت کی نامزد کردہ جماعت سے عدم تعاون نہیں کیا۔ اکاڈیمی کے ۲۰ ممبروں میں سے جماعت عاملہ کا جو انتخاب ہوا ہے، اس میں مسلمانوں یا اردو کی طرف سے سید سجاد حیدر صاحب رجسٹرار مسلم یونیورسٹی، خان بہادر حافظ ہدایت حسین صاحب کانپور اور ڈاکٹر جسٹس سلیمان الہ آباد، نمائندگی فرمائیں گے اور ہماری رائے میں یہ بہترین انتخاب ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم بات جس کا میں نے اس وقت تک ذکر نہیں کیا اور جس کا آئندہ چلکر ایک مستقل موضوعِ بحث یا نزاعِ کفر و دیں کی صورت اختیار کر لینا غیر ممکن نہیں ہے، سنسکرت اور عربی فارسی الفاظ کے استعمال کا مسئلہ ہے لیکن اگر دونوں جانب سے وہ طرز عمل پیش نہ کیا گیا جس کو سعدی نے "اگر زنجیر یا شد بگسلا نند" سے تعبیر کیا ہے، تو امید ہے کہ ایک درمیانی راہ ایسی پیدا ہو سکے گی جسپر اردو ہندی لٹریچر کے حامی دونوں ایک ساتھ اس منزل کو طے کر سکیں گے۔ حکومت نے اکاڈیمی کے شعبۂ اردو کے لئے جن حضرات کو ممبر کی حیثیت سے نامزد کیا ہے وہ یہ ہیں:۔

۱ــــ پنڈت منوہر لال زتشی۔ ایم۔ اے۔ پرنسپل جوبلی انٹر کالج لکھنؤ
۲ــــ مہدی حسن صاحب ناصری۔ ایم۔ اے۔ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول بارہ بنکی۔
۳ــــ نعیم الرحمان صاحب ایم۔ اے۔ لکچرار ع۔ بی فارسی الہ آباد یونیورسٹی
۴ــــ سید ضامن علی صاحب ایم۔ اے۔ لکچرار اردو الہ آباد یونیورسٹی
۵ــــ مسعود حسن صاحب ایم۔ اے۔ ریڈر لکھنؤ یونیورسٹی۔
۶ــــ سید سجاد حیدر صاحب بی۔ اے۔ رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علی گڈھ
۷ــــ رشید احمد صاحب صدیقی۔ ایم ے۔ لکچرار اردو مسلم یونیورسٹی
۸ــــ مرزا محمد عسکری صاحب لکھنؤ
۹ــــ نور الحسن صاحب بی۔ اے ال ال بی وکیل لکھنؤ
۱۰ــــ حضرت صفی لکھنوی
۱۱ــــ سر عبد الرؤف الہ آباد
۱۲ــــ پنڈت دیا نرائن نگم کان پور
۱۳ــــ پریم چند صاحب بنارس
۱۴ــــ عبد الماجد صاحب بی اے دریابادی
۱۵ــــ نیاز فتحپوری

گذشتہ ماہ کے رسالہ میں بھی اور اس مرتبہ بھی میں نے یہ سلسلۂ استفسارات صرف ان حضرات کے مضامین شائع کئے ہیں جو حضرت عیسیٰ کے مسئلہ ولادت و وفات میں مجھ سے اختلاف رکھتے ہیں، اب صرف ایک مضمون پروفیسر زبید احمد صاحب کا اور رہگیا ہے جسمیں زیادہ سنجیدگی کے ساتھ میرے دلائل کو رد کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور جو الناظر میں شائع ہو چکا ہے اگر ضرورت ہوئی تو آئندہ مہینے سے بھی شائع کر دونگا اور جون کے رسالہ میں ان سب کا جواب ایک ساتھ دیکر اس قصہ کو ختم کر دوں گا، ورنہ اس کا اقتباس دیتے ہوئے مئی کے رسالہ میں اس کو طے کر دونگا اور بہت سے استفسارات کا انبار اتنا ہو گیا ہے کہ اب میں زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔

نیاز فتحپوری

ہمایون شہنشاہ ہندوستان

(سنہ ۱۵۳۰ - سنہ ۱۵۵۶ء)

دانشمند برنیر مابعد عہد کے واقعات بیان کرتے ہوئے ایک فقرہ میں سلطنت مغلیہ کی حکمت علی کا عیب بیان کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے "میری خواہش ہے کہ اس سلطنت کے ناگوار طریقہ پر غور کیا جائے جسمیں تاج کے قبضہ کا معاملہ نامکمل اور زبردست کی فتحیابی پر چھوڑ دیا جاتا ہے"، ہر بادشاہ کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں یا بعض اوقات پوتوں اور بھتیجوں کے ہواخواہوں میں ہمیشہ تخت نشینی پر جھگڑے اور فسادات ہوا کئے۔ جو زبردست ہوتا وہ کامیاب ہوتا اور پھر اپنے رقیبوں سے پیچھا چھوڑا کر مستقل طور پر امن امان قائم کرنے کی کارروائی شروع کرتا۔ اس کے مخالف یا تو فوراً قتل کئے جاتے، یا انکی آنکھیں پھوڑ دیجاتیں۔ یا گوالیار کے پہاڑی قلعہ مین قید کر دئے جاتے، یا انیون کی کثرت استعمال سے ان کے حواس مختل کرائے جاتے، یا تو ایران کو بھاگ جاتے، یا حج بیت اللہ کرنے پر مجبور کئے جاتے۔ اگر جدید حکمران ایسا زبردست نہ ہوتا کہ اس قسم کی سخت سزائیں حریفوں کو دیسکتا تو وہ دعویداروں کو سلطنت کے دور دراز حصوں پر صوبہ دار بنا کر بھیجدیتا تھا جہاں سے وہ اکثر آ آکر اوسکی حکومت میں رخنہ اندازیاں کیا کرتے تھے۔

ہندوستان کا وہ عہد حکومت نہایت ہی کامیاب اور سرسبز کہا جا سکتا ہے جس میں سلطنت کے وارث اور زندہ دعویدار بہت کم ہوتے تھے۔ آخری زمانہ کے مغل فرمانروا اس راز کو بخوبی سمجھ گئے تھے اور ایسے چالاک و ظالم تھے کہ اپنی تحفظ کی غرض سے اس حکمت علی کو انتہائی حد تک تمام و کمال کام میں لاتے تھے۔

ہمایون مغل فرمانروا ایک مثال ہے جس کی تمام عمر شورش یا جلاوطنی میں صرف ہوئی کیونکہ وہ بہت زیادہ شفقت کرنیوالا اور مثل بیٹوں کے محبت کرنے والا اور ایسا نرم مزاج تھا کہ اس کی حکمت علی کو انتہائی حد تک عمل میں نہ لا سکتا تھا۔ وہ خالص ترک تھا جس میں ابتک ہند و خون کی آمیزش نہوئی تھی۔ بابر ہمایوں کا پدر بزرگوار ترکی خیالات کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں وہ دور اندیش، پڑھا لکھا، چست و چالاک، حوصلہ مند اور فیاض تھا۔ یہ وہ اوصاف ہیں جنسے شرافت کا نام ماخوذ ہے۔

مرنے سے ایک ذرا پہلے بابر نے اپنے بیٹے اور وارث (ہمایون) کو بلا کر وصیت کی کہ اگر اللہ تعالیٰ اسے تخت و تاج نصیب کرے تو اپنے بھائیون کے خون سے اپنا دامن آلودہ نہ کرے بلکہ ان کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کرے۔ ہمایون نے اس وصیت پر عمل کرنے کا وعدہ کیا اور باوجودیکہ اس کے بھائی۔ (کامران، ہندال، مرزا عسکری) برابر اس کے مخالف رہے اور اکثر میدان جنگ میں مقابلہ پر آئے تاہم وہ چند سال تک یکلخت اور اس کے بعد بھی اکثر مختلف موقعوں پر جبکہ ان کو شکست

ہو لی، انکی مخاصمانہ کارروائیاں بھولاتا رہا۔

اس کی نرم مزاجی ہی اس کے سارے تکلیفات کا چشمہ تھی جیسا کہ بہت سے ایسے اوصاف کہ جو معمولی آدمی کے لئے ہر دلعزیزی کا باعث ہوتے ہیں سلطنت کے لئے تقریباً بربادی کا سبب ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب تک کہ جنگ کے ذریعہ سے یا کسی اور طرح پر اسکے بھائی اسکی سلطنت کے آخری زمانہ میں علٰحدہ نہیں ہوسے اسوقت تک سلطنت میں کسی قسم کا امن پیدا نہیں ہوا۔ ہندوؤں نے ایسے معاملات کو اچھا انجام دیا جیسا کہ ایک قدیم مورخ کی بیان کردہ روایت تمثیلاً حسب ذیل پیش کیجاتی ہے۔

"سلطان محمود کے زمانہ میں ایک ہندو راجہ نے اپنے دشمن کے مقابلہ میں جو اس کا حریف تھا سلطان سے مدد چاہی۔ اُس نے سلطان کو اس موقع کی حالت یوں لکھی ہے۔ ہمارے مذہب میں بادشاہوں کا قتل خلاف قانون ہے۔ لیکن یہ رسم ہے کہ جب کوئی بادشاہ اپنے دشمن پر قابو پا جاتا ہے تو وہ خاص اپنے تخت کے نیچے ایک چھوٹا اور تاریک کمرہ بناتا اور اسمیں اپنے دشمن کو قید کردیتا ہے۔ صرف ایک سوراخ کھلا رہتا ہے اور روزانہ اس کمرہ میں مقید بادشاہ کو ایک کشتی میں کھانا رکھکر اس تہ خانہ میں بھیجدیتا ہے یہانتک کہ ان میں سے کوئی بادشاہ مرجاتا ہے"

ہمایوں ۱۵۳۰ء میں تخت نشین ہوا، اسوقت اس کا بھائی کامران، دارالحکومت کابل کا گورنر تھا جہاں سے بابر ہندوستان فتح کرنے کی غرض سے روانہ ہوا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ بابر کا ارادہ تھا کہ اس کے مرنے پر سلطنت کے حصے بخرے نہ ہونے پائیں اور کابل ہندوستان کی ماتحتی میں قائم رہے۔ شاہی فوج میں خاصکر قرب وجوار کے ترک، مغل اور افغان سپاہی بھرتی کئے گئے تھے حالانکہ ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد بطور مددگار فوج کے موجود تھی اگرچہ وہ مغلوں سے بھی کم مطیع تھے۔ فوجی عہدہ دار خصوصاً ایرانیوں میں سے یا ایران کے باہر غیر ملک والوں میں سے مقرر کئے جاتے تھے۔ ہمایون نے کامران کو کابل کی سلطنت معہ چند ممالک کے جنہیں پنجاب اور دریائی سندھ کے سرحدی علاقے شامل تھے حوالہ کردئے تھے۔ شہزادہ ہندال، مرزا عسکری سنبھل اور میوات کے صوبہ دار مقرر کئے گئے ہمایوں گو ہندوستاں کا شہنشاہ تھا لیکن اُس نے فوجی طاقت کے ایسے ذرائع قائم نہ رکھے محض خنگی مدد سے اس کا قیام ہو سکتا تھا۔ فوج اب تک موجود تھی لیکن اس کی خنگی طاقت کے ترقی دینے یا قائم رکھنے کا کوئی پائدار ذریعہ نہ تھا۔

بادشاہ کی لڑائیون کا آغاز حملہ گجرات یا مختلف مقامات کی بغاوتوں کے فرو کرنے سے ایک پہاڑی قلعہ کے محاصرہ میں دو ایسے واقعے پیش آئے جن سے ہمایوں کی اعلیٰ درجہ کے خاصۂ طبعی کا اظہار ہوتا ہے۔ محاصرہ کے ابتدائی مدارج میں نہایت کامیابی ہوئی قلعہ تک پہونچنے کے جو آسان راستے تھے اُن پر قریب قریب فوجی سپاہی متعین تھے۔ اس میدان مرتفع کے ایک جانب جسپر کہ قلعہ بنا ہوا تھا قریب قریب عمودی شکل کا چٹان تھا۔ ہمایوں نے اسی طرف شبخون مارنے کا ارادہ کیا لہذا فولادی میخین طیار کی گئیں اور ٹیلہ کے سامنے کی طرف مثل سیڑھی کے داہنے بائیں ایک ایک کرکے گاڑدی گئیں۔ تین سو سپاہیوں کی ایک جماعت نے

نے جس میں بادشاہ خود بھی شامل تھا یہ خوفناک حملہ سر کیا۔ میخوں کے ذریعہ سے قلعہ پر چڑھنے والوں میں ہمایوں اکتالیسواں شخص تھا۔ یہ معلوم ہوا تھا کہ قلعہ میں بہت سا خزانہ ہے لیکن سخت تلاش کے بعد بھی وہ ہاتھ نہ آیا۔ اس نازک موقع پر ہمایوں کے سرداروں نے مشورہ دیا کہ قیدیوں کو سخت اذیت دیجاوے یہاں تک کہ وہ خزانہ کا اقرار کریں۔ ہمایوں کی رائے تھی کہ نہیں، بلکہ ان کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کیا جائے اور ایسا ہی کیا گیا چنانچہ ایک قیدی کی مخبری کے مطابق جو اس نے اپنے فیاض فاتح سے کی تھی ایک چوڑے چکلے حوض کا پانی نکلوا دینے پر اس کی نیچے تہ خانہ سے خزانہ برآمد ہو گیا۔

ہمایوں کی اعلیٰ درجہ کی ذاتی شجاعت اور انسانیت ان دونوں واقعات سے بخوبی ظاہر ہوتی ہیں۔

میرزا عسکری اور اس کا چھوٹا بھائی جس کی سپردگی میں یہ جدید مقبوضات دئے گئے تھے بہت جلد سرکشی ظاہر کرنے لگا۔ ایک بزم طرب میں اس نے بہت زیادہ شراب پی لی اور فخریہ کہنے لگا "کہ میں بھی بادشاہ اور ظل اللہ ہوں"۔ ٹھیک اسیوقت شیر شاہ افغان والی برار سے لڑائی نہایت سرگرمی کے ساتھ شروع ہو گئی۔ صوبہ بنگال پر شیر شاہ کی فوج قابض ہو چکی تھی۔ ہمایوں کو برسات کے موسم میں مصروف جنگ ہونا پڑا۔ سپاہی موقع پاکر غداری کرنے لگے اور شاہزادہ ہندال بلا اجازت اپنی ساری فوج لیکر چلتا ہوا۔ شاہزادہ کامران کابل سے ایک بڑی فوج لیکر بظاہر بادشاہ کی مدد کی غرض سے لیکن فی الحقیقت بشرط امکان سلطنت پر قبضہ کرنیکے خیال سے روانہ ہوا۔

ہمایوں کو مجبوراً آگرہ واپس آنا اور شیر شاہ سے جنگ میں مصروف ہونا پڑا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۵۳۹ء میں ہمایوں کو شکست فاحش ہوئی۔ اس کی بیگم گرفتار اور اس کی ساری فوج منتشر و ابتر ہو گئی۔ تینوں بھائی آگرہ میں جمع ہوئے اور باہمی مصالحت ہو کر حفاظت کی تجاویز مشورہ کی غرض سے پیش ہوئیں۔ میرا ارادہ نہیں ہے کہ میں ۱۵۴۰ء کی دوسری جنگ کے واقعات بیان کروں جس کا خاتمہ یوں ہوا کہ شیر شاہ کو کامل طور پر فتح حاصل ہو گئی۔ (وہ ہندوستان کا بادشاہ ہو گیا) دہلی اور آگرہ اس کے قبضہ میں آگئے اور بادشاہ اور اس کی بیگمات کو بھاگ کر لاہور جانا پڑا۔ لاہور میں دوسری مجلس شوریٰ قرار پائی اور جیسا کہ ایک ہندوستانی مورخ لکھتا ہے "بادشاہ پر یہ بات بخوبی ظاہر ہو گئی کہ بھائیوں اور امراء سلطنت کو راضی کرنا اس کے امکان سے باہر ہے۔ چنانچہ وہ مایوس ہو گیا"۔

شاہزادہ ہندال ایک طرف روانہ ہوا۔ شاہزادہ کامراں کی "بیوفائی ثابت ہو گئی" اور کابل کی طرف چلدیا اور جیسا کہ ایک ہندوستانی مورخ لکھتا ہے "اس کے بھائیوں نے سپہر سلطنت پر نفاق کے تیر چلانے شروع کردئے"۔ ہمایوں یسی جگہ کی تلاش میں ادھر ادھر پھرا جہاں سے بقیہ حصۂ سلطنت کا انتظام کر سکے۔ سندھ کا صوبہ جو ٹھیک کابل سے جانب جنوب واقع ہے تیمور کے مقبوضات کا ایک جزو تھا اور دیگر مقبوضات جنھیں تیمور فتح کر چکا تھا اس کی اولاد کی ملکیت میں تھے جو اسے فتح کرکے قایم رکھ سکتے تھے اس لئے بادشاہ بھی اپنی پسماندہ فوج کو ہمراہ لیکر سندھ کو روانہ ہوا اثنار راہ میں وہ شہزادہ ہندال کے خیمہ میں قیام پذیر ہوا

اور اچانک مہنداں کے استاد شیخ علی اکبر جامی کی نوجوان لڑکی پر فریفتہ ہوگیا۔ اس کی عمر ہنوز چودہ برس کی تھی۔ شادی کی بات چیت ہوگئی تھی لیکن منگنی کی رسم ہنوز طے نہ ہوئی تھی۔ بادشاہ نے اس سے بہت جلد شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگرچہ وہ بادشاہ کے رتبہ کے مناسب نہ تھی اس کا باپ سید یعنی آل رسول تھا اور اس کا خاندان علم و فضل، زہد و تقویٰ کی وجہ سے ممتاز سمجھا جاتا تھا۔ شادی دوسرے روز ہوگئی۔ لیکن شاہزادہ مہنداں کا کیمپ مالک تخت و تاج کے لئے مناسب جگہ نہ تھی۔

،، دہ درویش در گلیمے بخسپند و دو بادشاہ در اقلیمے نگنجند،،

چنانچہ ہمایوں اپنے ایک ماتحت کے وعدوں پر بھروسہ کرکے سندھ کے ریگستان میں آیا لیکن وعدے پورے نہوئے اس صحرا نوردی سے ہمایوں کی جماعت کو سخت مصیبتیں پہونچیں۔ بعض اوقات ان کو صرف جنگلی بیروں پر اکتفا کرنا پڑا۔ پینے کا پانی بھی دستیاب نہ ہوا اور دشمنوں نے ایذائیں پہونچائیں۔ وسط ریگستان میں امرکوٹ کے سنسان قصر شاہی میں ۱۵ اکتوبر ۱۵۴۲ء کو بیگم کی بطن سے شاہزادہ اکبر[لہ] تولد ہوا۔

ہمایوں اسوقت چند میل کی مسافت پر خیمہ زن تھا کہ شہزادہ کی ولادت کی خبر اس کو ملی۔ اس کے پاس کوئی ایسی بیش قیمت چیز موجود نہ تھی جو وہ قاصد کو اور معدودے چند دوستوں اور رفقا کو دستور کے مطابق انعام عطا کرتا۔ اس نے ایک نافۂ مشک توڑ کر اپنے وفادار رفقا میں تقسیم کیا۔ شاہزادہ کا نام جلال الدین محمد اکبر شہنشاہ رکھا گیا اور بادشاہ کے ہمراہیوں کی مختصر جماعت کی وفادارانہ دعا کے مطابق تمامی دنیا میں اس شہزادہ کی شہرت بوے مشک کی طرح پھیلی۔

میرزا عسکری شاہزادہ کامران کی طرف سے قندہار کا حاکم تھا۔ ہمایوں کی اب یہ خواہش ہوئی کہ میرزا عسکری کو بھگا کر اپنا طرفدار بنائے اور قندہار کو اپنا مامن قرار دے۔ بادشاہ ہنوز شہر سے ۱۴۰ میل کے فاصلہ پر تھا کہ اسکو مخبری ہوئی کہ اسکا بھائی میرزا عداوت کی نظر سے اس کے مقابلہ پر آرہا ہے اور بادشاہ کو اپنی جان بچانے کے لئے بھاگنا چاہئے۔ چنانچہ ہمایوں اس اضطراب کے ساتھ بھاگا کہ صغر سن شاہزادہ اور اکثر ساتھی کیمپ ہی میں چھوٹ گئے۔ ہمایوں اور اسکی بیگم معہ چالیس آدمیوں کی جماعت کے بھاگ کر ایران پہنچے اکبر اور ہمایوں کے پسماندہ ہمراہیوں کے ساتھ میرزا عسکری مہربانی سے پیش آیا اور اس سب کو قندہار لے آیا۔ اکبر کو کابل بھیجا

لہ مولانا نورالدین ترخان نے یہ تاریخ ولادت لکھی ہے۔ رباعی۔ چون کلک قضانشان تقدیر نوشت آیات آبدار ہمہ تفسیر نوشت
از بہر ولادت شہنشاہ جہاں تاریخ شہنشہ جہانگیر نوشت۔ ایک فاضل عصر نے یہ لکھا ہے۔ للہ الحمد کہ آمد بوجود
آنکہ از کون و مکاں منتخب است بادشاہی کہ زشاہانِ جہاں اکبرش نام و جلالش لقب است شب در وز دمہ و سال میلاد
شب یکشنبہ و پنج رجب است۔ ملک الشعرا فیضی نے اپنی تحریرات میں اکبر کے نام بدایع پیش کرتے ہوئے لکھا ہے۔ رباعی
نورے کہ زمہر عالم آرا پیداست از جبہۂ شاہنشہ والا پیداست اکبر کہ بآفتاب دارد نسبت این نکتہ زبینات اسما پیداست

جب میرزا عسکری اور اس کی سپاہ مع شاہزادہ اکبر کے واپس آرہی تھی تو ہمایوں کے ایک وفادار ساتھی نے کوشش کی کہ کسی طرح بچے کو ان لوگوں کے قبضہ سے خفیہ طور پر نکال کر اس کے والدین تک پہونچا دے۔ یہ تجویز محافظین کے سامنے بغرض مباحثہ پیش کی گئی اور بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ ہمایوں کے پاس اس امر کی ضرور کوئی معقول وجہ رہی ہوگی کہ اس نے اپنے بچہ کو بھائی کے قبضہ میں چھوڑ دیا اور اس لئے نہ تو محافظین کو مناسب ہے کہ اکبر کو حوالہ کر دیں نہ شہنشاہ کے رفقا رطریق کو موقع ہے کہ وہ اس معاملہ میں جسے وہ خود پورے طور پر نہیں سمجھتے دست اندازی کریں۔ اس پر وہ سپاہی اکبر کی دہد تک پہونچا اور محافظین کے سردار سے شہزادہ کی پگڑی میں سے ایک چھوٹی پٹی لی اور اس نشانی کو لیکر وہ ہر سپاہی کے پاس ہوتا ہوا اپنے آوارہ گرد بادشاہ کا شریک قسمت ہونے کے لئے اور اس نونہال شاہزادہ کی خیریت کی خبر پہونچانے کے لئے وہاں سے روانہ ہوا یہ وحشیوں کے ناشائستہ اطوار نہیں ہیں

تین برس تک بادشاہ سندھ میں رہا اور طرح طرح کی مشکلات و مصائب اُٹھاتا رہا۔ اب وہ اپنے خاندانی دوست شاہ طہماسپ بادشاہ ایران کی مدد حاصل کرنے کی غرض سے روانہ ہوا۔ ہمایوں کا نہایت اعلیٰ پیمانہ پر خیر مقدم کیا گیا اور طرفین میں ہر قسم کے معاہدے ہوئے۔ ہمایوں شاہ ایران کو قندہار واپس کرنے پر راضی ہوگیا اور بعوض بارہ ہزار بہمہ وجوہ ایرانی مسلح فوج کی مدد کے مسلمانوں کے شیعہ[۵] طریقہ اختیار کرنے پر مجبور ہوا۔

ہمایوں نے شاہ ایران کو جو خط روانہ کیا اس کے لفافہ پر یہ شعر تحریر کیا ؎

کہ گزشت از سرما انچہ گزشت　　　چہ بہ دریا چہ بہ کہسار وچہ دشت

پھر بھی قبل اس کے کہ ہمایوں کے اچھے دن آئیں اُسے بہت مصائب برداشت کرنے پڑے۔

اس کی زندگی انقلاب سے پُر تھی۔ اوائل عمر میں اُس کو رہنے کے لئے فردوس کی طرح ایک محل نصیب تھا لیکن آخری زمانہ میں وہ اپنی سکونت کے لئے ایک گھر کا محتاج تھا گویا کہ وہ خانہ بدوش تھا۔ شاہزادہ کامران کابل میں حکومت کرتا تھا قندھار اسی کے قبضہ میں تھا جس سے اس کے بھائی میرزا ہندال نے چھین لیا تھا، اس کے بعد پھر فتح ہوگیا اور اب میرزا عسکری کے قبضہ میں تھا چوتھا بھائی غیر ملک کی فوج کی سپہ سالاری میں اس کے خلاف کوچ کر رہا تھا۔ محاصرہ کے بعد ہی شہر فتح کر لیا گیا۔ عسکری کو معافی دی گئی لیکن وہ بھاگا اور پھر پکڑا گیا اور قید کر دیا گیا، اور قندہار۔ ایرانیوں کے حوالہ کر دیا گیا۔

چونکہ سردی کے ایام آگئے تھے ہمایوں کی فوج کو پناہ کی ضرورت تھی اور ایرانی شاہزادہ نے جو فوج کی کمانڈ کر رہا تھا عین موقع پر انتقال کیا بادشاہ نے اس مرتبہ قندھار کو ایرانیوں کے قبضہ سے نکال کر اپنا صدر مقام قرار دیا اور فوراً ہی سرمائی دورہ کابل کی طرف کر دیا۔ شاہزادہ ہندال فتحمند فوج میں آملا اور شاہزادہ کامران اپنا صدر مقام چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کی ساری فوجیں بادشاہ

[۵] اس کا مورث اعلیٰ تیمور شیعہ مذہب رکھتا تھا اگرچہ مجھے کہیں یہ بات نہیں ملی کہ یہ دلیل اس کے تبدیل مذہب کے لئے پیش کی گئی تھی۔ مصنف ۱۲

کی طرف چلی آئیں۔ صغرسن شاہزادہ اکبر جس کی عمر اسوقت قریب تین برس کی تھی، باپ کو واپس دیا گیا چند مہینوں کے بعد ہمایوں نے بدخشاں (تیموری مفتوحات کا دوسرا شہر) پر حملہ کیا۔ اس پر کامران واپس آیا اور کابل پر دوبارہ مع شاہزادہ اکبر کے قبضہ کیا ہمایوں اور ہندال کی فوجوں نے فوراً لوٹ کر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ ایشیائی مورخین کا بیان ہے،، کہ کامران نے نہایت نامردی سے حکم دیا کہ شاہزادہ اکبر کو فصیل پر جہاں توپ کے گولوں اور بندوق کی گولیوں کی بوچھار ہو رہی تھی کھڑا کر دیا جائے۔ لیکن اللہ تعالےٰ نے اس کا بال بھی بیکا نہ ہونے دیا۔ کامران ایکبار پھر بھاگنے پر مجبور ہوا اور بدخشاں اب اس کے قبضہ میں آگیا۔ لیکن ۱۵۴۷ء میں ہمایوں نے اسے پھر فتح کر لیا اور اس موقع پر کامران کو ہمایوں اور ہندال نے قید کر لیا۔

بادشاہ نے کامران کے ساتھ نہایت مہربانی کا اظہار کیا جسکو پھر شاہی اعزاز حاصل ہوا، میر عسکری اس وقت آزاد کر دیا گیا اور چاروں بھائیوں نے باظہار محبت ایک ہی دسترخوان پر طعام نوش کیا۔ چند ماہ بعد کامران اور عسکری نے پھر بغاوت کی اور کابل پر قابض ہو گئے اور شہزادہ اکبر (بیش بہا یرغمال) پھر اُن کے ہاتھ آگیا۔ ایک مرتبہ اور بادشاہ نے کابل پر حملہ کیا اور کامران پھر بھاگنے پر مجبور ہوا۔

یہ پیہم حملے، محاصرے تسخیریں اور زحمتیں مثل قوم سیوکس کے ایک گروہ کے تاریخ کی معلوم ہوتی ہیں جو مغلوں کی تاریخ میں اس ابتدائی زندگی نمونہ پیش کرتی ہیں جس کے بعد ان کے قدم ہندوستان میں مستقل طور پر جم گئے۔ ایسی تاریخ بہ سبب ایک ہی قسم کے خیالات ہونے کے طبیعت اکسا نیوالی اور بے لطف ہے اور ہم لوگوں کو مناسب ہے کہ ہم اس خیال سے اس کو بالکل نظرانداز کر دیں کہ یہ باتیں چار صدی ماقبل ترکستان کے وحشی قوموں میں موجود تھیں۔ لیکن کیا اسی زمانہ میں یورپ کی لڑائیاں زیادہ مختلف طور پر ہوتی تھیں؟ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ جدید طرز جنگ نپولین[1] کی فتوحات سے شروع ہوتا ہے۔ وحشی قوموں کے بارہ میں کیا ہم آج بھی ظالمانہ انقلابات کی قریب قریب ویسی ہی مثالیں جنوبی امریکہ کے ریاستوں میں نہیں پاتے ہیں؟ چلی[2] میں۔ ارجنٹائن[3] میں برازیل[4] میں ہنڈوراز[5] میں؟ جہاں کوئی شخص قیدی نہیں بنایا جاتا۔ مردوں کی لاشیں نہایت سنگدلی سے ٹکڑے ٹکڑے کیجاتی ہیں مفتوحہ شہر لوٹ لئے جاتے ہیں اور ان کے باشندوں کیساتھ نہایت بیدردی سے ظلم کیا جاتا ہے۔

---

[1] نپولین اعظم فرانسیسیوں کا شہنشاہ زبردست فاتح جس نے اپنی فتوحات کا یورپ میں سکہ بٹھا دیا تھا۔ پیدائش ۱۷۶۹ء میں وفات ۱۸۲۱ء۔

[2] چلی، جنوبی امریکہ کے مغربی ساحل پر واقع ہے۔

[3] ارجنٹائن، جنوبی امریکہ کے جنوب میں واقع ہے۔

[4] بریزل، جنوبی امریکہ کے شمال و مشرق واقع ہے۔

[5] ہنڈوراز، برٹش ہنڈوراز، نوآبادی واقع وسطی امریکہ۔

کوچۂ غیر میں ملا دہ ہمیں　　ہرزہ تازی نے رہنمائی کی

ناصح

ناصح کا وجود عشق کی ضروریات میں شمار ہوتا ہے۔ شعرا نے اسپر خوب خوب طبع آزمائیاں کی ہیں۔ مومن کا ایک شعر بہت مشہور ہے۔ ہم اس کو لکھکر مضمون ختم کرتے ہیں۔

آئے دن کی ذلتوں اور روزمرہ کی تکالیف سے ناصح کو کوفت محسوس ہوتی ہے۔ وہ عاشق سے استدعا کرتا ہے کہ خدا کے لئے اس عشق خانہ برانداز سے دست کش ہوجاؤ۔ مگر عاشق کے رگ و پے میں عشق کا زہر غم سرایت کر چکا ہے۔ اسے اپنی زیست کا سامان نظر آتا ہے۔

چھٹ کر کہاں اسیر محبت کی زندگی　　ناصح یہ بند غم نہیں قید حیات ہے۔

عزیز
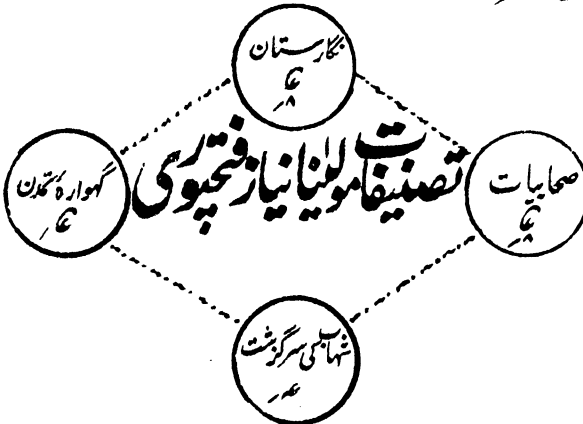
میمونہ

(فسانہ)

میمونہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کے والد ریاض الحسن تعلیم یافتہ لوگوں میں سے تھے۔ مسلمانوں میں جو انگریزی تعلیم کی طرف انیسویں صدی کے اخیر میں میلان شروع ہوا تھا اور جس کے اثر سے بعض لوگ مغرب پرست بن گئے تھے۔ اسی دور کے طالب علموں میں سے یہ تھے۔ لیکن ابتدا ہی سے ان کا مزاج انتہا پسند نہ تھا۔ میانہ روی انکا شیوہ تھا۔ اس لئے زندگی میں داخل ہونے کے بعد گو اُنھوں نے اپنی معاشرت وطرز بود وماند میں کوئی مکمل انقلاب تو پیدا نہ کیا۔ مگر نئی تہذیب کی چند ابتدائی اور غالباً مفید باتیں انھوں نے ضرور اختیار کریں، ایک کوٹھی میں رہنا شروع کر دیا اور کوٹھی کے چاروں طرف ایک باغ لگایا۔ احاطہ کے لئے جو دیوار تھی وہ بہت کافی بلند تھی اور جسوقت زنان خانہ سے تفریح کی خواہش کی جاتی، اور مردانہ آمد ورفت بند ہو جاتی تو باہر سے بے پردگی کا قطعاً احتمال نہ رہتا تھا۔ میمونہ اُنکی بڑی تمناؤں کی لڑکی تھی۔

ابتدائی چند سالوں میں اُن کے کوئی اولاد نہیں ہوئی، اور یہ بالکل مایوس ہو چکے تھے کہ تائید غیبی سے اُنھیں یہ گوہر نایاب میسر آیا۔ جسقدر محبت میمونہ سے ہونی چاہئے تھی وہ ظاہر ہے۔ پھر اُن کی خوش قسمتی سے لڑکی حسین، ذہین اور طباع تھی۔ اس کی تعلیم وتربیت کا نہایت معقول انتظام کیا گیا۔ لیکن کسی مدرسہ یا کالج میں داخل کرنا نہ تو دل نے گوارا کیا اور نہ مناسب سمجھا گیا۔ جو کچھ تعلیم تھی گھر پر ہی اُستاد اور استانیوں کے ذریعہ سے دلائیگئی۔ لاڈ پیار ہر چند بہت تھا۔ لیکن ماں کی صحبت نے لڑکی کی طبیعت کو بہت سنبھالے رکھا۔ ماں بہت ہی سنجیدہ اور سمجھدار عورت تھی۔ اور اگرچہ اُن کا دل یہی چاہتا تھا کہ بیٹی کی ہر خواہش پوری کریں۔ لیکن جی پر جبر کر کے کبھی اُسے حد سے نہ گزرنے دیتی تھی۔ تعلیم اردو، فارسی اور تھوڑی بہت انگریزی کی دی گئی تھی۔ طبیعت میں نفاست اور سلیقہ فطرت کی طرف سے تھا۔ ماں اور باپ بیٹی کی تربیت وتعلیم سے ہر طرح پر مطمئن تھے اور اب اُس کے لئے ایک مناسب بر کی جستجو انھیں دامنگیر تھی۔ میاں بیوی رات کو دیر تک جاگتے رہتے اور اسی بات پر گفتگو کیا کرتے کہ میمونہ کے رفیق زندگی میں کیا کیا خصوصیات ہونی چاہئیں۔ کن قابلیتوں کے شخص کے ساتھ میمونہ کا نباہ ہو سکتا ہے اور وہ کس کے ساتھ آسایش کی زندگی بسر کر سکتی ہے۔ ایک بات زرا بیوی کے دل میں کھٹکتی تھی۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ میمونہ عام سطح سے ذرا زیادہ بلند ہو گئی ہے۔ تنہائی پسند ہے اور عام طور پر مجمع میں کھنچی ہوئی سی رہتی ہے۔ بدگماں لوگ اُسے مغرور سمجھنے لگے ہیں۔ مگر ریاض الحسن بگڑ کر کہتے ہیں کہ ،، دنیا کی باتوں کا تم کہاں تک خیال کرو گی۔ ہمارے جاہل اور تنگ خیال رشتہ داروں

کے نزدیک وہ بیشک مغرور ہے۔ اُن کے معیار پر بیشک وہ پوری نہیں اُترےگی۔ ان کی بدتمیزیوں اور نادانیوں سے یقیناً وہ ہمدردی نہیں رکھیگی اور اگر اُس کا یہی قصور اُسے معتوب کئے ہوئے ہے تو میں خوش ہوں۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ میری تربیت بالکل ضائع نہیں گئی۔ غرضکہ رات کو وہ یہ سوچتے اور دن کو اس بات کی تلاش میں رہتے کہ کوئی مناسب منگیتر ملجائے۔ رشتے مختلف جگہ سے آتے تھے، لیکن کچھ تو ایسے تھے جو اُن دونوں کی نگاہ میں نہیں جچتے تھے اور کچھ ایسے جنھیں میمونہ نے جس کی آواز کو وہ اس معاملہ میں کافی اہمیت دیتے تھے، پسند نہ کئے۔

---- ۲ ----

میمونہ کو پندرہواں سولھواں سال لگ چکا تھا۔ نوجوانی کی امنگوں نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ شعر و نغمہ اسکے عزیز ترین مونس و ہمدرد تھے۔ افسانے اور رنگین قصے اس کے مطالعہ کا ایک بڑا جزو بن گئے تھے۔ لیکن اُنھیں پڑھکر اُسکی تسکین نہ ہوتی تھی۔ قصہ پڑھ کر اُسے اُلجھن سی ہوجاتی تھی، وہ اسے نامکمل خیال کرتی تھی۔ ذوق ابتداہی سے پاکیزہ تھا اُستادوں کے کلام نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ لکھنے والے ہرچند برگزیدہ و منتخب ہوتے تھے، مگر اُس کے وجود کی شعریت کو وہ کسطرح اپنی تصانیف میں منتقل کر سکتے تھے۔ اس کی طبیعت دریا تھی پرجوش، ایک صحرا تھی وسیع، ایک سمندر تھی بے پایاں، ایک فضا تھی سکوں کوش، ایک ساحل تھی ہمت شکن، ایک نغمہ تھی سحر آفرین، ایک التجا تھی بلند پرواز۔ غرضکہ اس کی ہستی پر شباب اپنے وجود کی لامتناہیوں میں اسقدر سرشار تھی کہ بعض وقت وہ خود گھبراجاتی تھی اور کہہ اٹھتی تھی کہ، "اے میرے معبود! میرا انجام کیا ہوگا؟

---- ۳ ----

ریاض الحسن صاحب کے ایک کالج کے دوست عبدالرحمٰن الہ آباد آئے ہوئے تھے۔ اُن کا نوجوان لڑکا اُن کے ہمراہ تھا انیس آگرہ کالج میں تعلیم پا رہا تھا۔ یہ زمانہ کالج کی تعطیل کا تھا۔ اُن کے والد کو ایک خاص ضرورت سے الہ آباد آنا پڑا اور چونکہ اپنے دوست سے ملے ہوئے بہت عرصہ گذر گیا تھا اور اُنھیں انیس کو دیکھنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا اس لئے تعارف کے لئے اُسے بھی ہمراہ لیتے آئے۔ ریاض الحسن اپنے دوست سے ملکر بہت خوش ہوئے، اور اُن کے لڑکے کو بھی بہت پسند کیا۔ چہرے سے ہوشمندی اور بلند اقبالی ظاہر ہی ہوتی تھی، والد نے افتخار پدرانہ کیساتھ اپنے بچے کے ایک نئے اعزاز کا تذکرہ کیا۔ کالج میگزین میں اسی زمانہ میں انیس کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کی بہت دھوم تھی۔ دوست احباب اور ان کے والد کے ملاقاتی سب تعریف کرتے تھے۔ انھوں نے انیس سے کہا کہ اپنا وہ مضمون چچا جان کو سنائے۔ انیس نے ایک اصلی نہ کہ بناوٹی تکلف کیساتھ اپنے مضمون کی خامی اور اپنے خیالات کے ارتقا کا عذر پیش کرکے بات کو ٹالنا چاہا

زیادہ اصرار پر اُسے مضمون سنانا پڑا اور ریاض الحسن نے بہت تعریف کی۔ اسی وقت اپنے مہمانوں سے درخواست کی کہ میں اپنی اہلیہ اور میمونہ کو بھی اس مضمون کو سنانا چاہتا ہوں۔ وہ سنکر بہت خوش ہونگی۔ اسلئے مجھے اجازت دیجئے کہ میں جاکر یہ مضمون خود ہی سنا آؤں۔

گھر میں مضمون سنا گیا۔ لیکن جس حصۂ مضمون نے میمونہ کو بہت زیادہ متوجہ کیا وہ حسب ذیل تھا:۔

"بعض مفہوم ایسے ہیں جن کے ادا کرنے کے لئے الفاظ وضع نہیں ہوے ہیں۔ تہذیب جدید کی جس خصوصیت سے مجھے سخت عناد ہے وہ اُس کا جنون اظہار ہے۔ مشاہدہ، تجزیہ، تحلیل، تفہیم، تجربہ، اظہار۔ یہ جذبہ ہے جو اس دور کے ہر فرد پر حاوی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ طریقہ کار فی نفسہ بُرا ہے۔ میرا اعتراض محل استعمال پر ہے علمی تحقیق و اکتشاف کے لئے ممکن ہے یہ ناگزیر ہو۔ لیکن جب یہ ہوا اُن فضاؤں کو مسموم کرنا شروع کردیتی ہے، جن کا تعلق محض محسوسات سے ہے تعقل و ادراک سے نہیں تو میں برداشت نہیں کرسکتا کیونکہ میں سمجھتا ہوں اور واقعات میری تائید کرتے ہیں کہ اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اصلیت اور حقیقت کی جگہ فریب اور دروغ گوئی کا دور دورہ شروع ہوجاتا ہے۔ اور نظام معاشرت اُس دور تاریک سے گزرنے لگتا ہے جبکہ اہل بصیرت کو تباہی و ادبار منڈلاتے ہوئے نظر آنے لگتے ہیں۔

محبت جیسی پُروقار و باتمکنت شے جب ہر بوالہوس کی ستم ظریفیوں کی رہین منت ہونے لگے تو میرے ضبط و سکون کیلئے اس سے زیادہ کوئی موقع آزمایش کا نہیں ہوسکتا۔ محبت کی وہ خودداریاں، وہ عزت نفس، وہ استغنا، وہ شان بے نیازی جسکے روبرو بعض وقت حسن کو بھکاری بن جانا پڑتا ہے، جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ وہ سب غارت ہوئے چلے جارہے ہیں تو مجھے بالکل تاب نہیں رہتی۔ علم سے فائدہ اٹھانے کے لئے اور سینکڑوں راہیں ہیں اس راہ کی کٹھن اور دشوار گزار منزلوں کو تو اُنھیں کے حال پر چھوڑ دیا جاتا۔ مکہ و مدینہ کے مسافر ریل اور موٹر کے محتاج نہیں ہیں۔ لیکن نہیں۔ زمانہ کا اقتضا شاید یہی ہے۔

عورت آہ اُسکی محبت کیا اب پردہ دری کیساتھ بھی منظر عام پر آئیگی اور بلند آہنگی سے اپنا اعلان کریگی شعر و شاعری فسانہ نگاری، اظہار تمنا کیا عورت کی طرف سے شروع کیا جائیگا۔ اے میرے خدا کیا اب یہ سب کچھ ہوگا۔ محبت کی رازداریاں رمز و کنایہ، غمزہ و اشارہ، شرم و حجاب کیا یہ سب رخصت ہوجائینگے؟ کیا عورت کا محبت کرنا اسٹیج پر آکر باقاعدہ ایکٹ کرنیکے مترادف ہوگا؟ کیا اُس کی جادو بیانی محبت کے اسرار بیان کرنے میں کامیاب ہوگی؟ کیا وہ سب کچھ کہہ دیگی اور کر دکھائیگی، جو اُسے نہ کہنا چاہئے اور نہ کرنا، اور جو صرف وہ محبت کرنیوالے دل محسوس کرتے ہیں، لیکن سمجھتے نہیں۔ آہ کیا وہ بہکی بہکی باتیں، مہمل و بے ربط گفتگو، معصوم سراسیمگی، قوت گفتار کی مجبوریاں و بیچارگیاں، ہکلم خاموش، یہ سب ہمیشہ کے لئے رخصت ہوئے اور اُن کی جگہ نہایت

پاکیزہ، منتخب موزوں، بلیغ، واضح، جامع، مانع، طرز کلام کو عطا کر دی گئی۔ اگر یہ سچ ہے تو آئیے اس ویرانہ کی آبادی پر دو آنسو بہا ڈالیں۔ اور عورت کی محبت سے اس عہد حاضر میں بالکل ناامید ہو جائیں"۔

جوانی کی راتیں مرادوں کے دن! اور میمونہ۔ تعین تمنا سے محروم تجسیم مدعا سے معذور، ترکیب مقاصد میں ناکام۔ یہ جوش طبیعت، یہ طوفان تخیل یہ سیلاب جذبات اور ایک حصار سنگیں میں مقید۔ میمونہ اُڑ جانا چاہتی تھی، پھیل جانا چاہتی تھی، تمام کائنات میں جاری و ساری ہونے کے لئے بیقرار تھی ایک طائر تھی تو گرفتار! ایک پری تھی، شیشہ میں بند اور خاصکر آج جبکہ چاندنی اپنے شباب پر تھی اور گزشتہ روز کے ترشح نے تمام باغ میں نکھار پیدا کر دیا تھا۔ شادابی اور رونق معلوم ہوتا تھا پھٹ پڑینگی۔ اور اس گوشۂ زمین کو اڑا کر پرستان میں پہنچا دینگی۔ اس کی طبیعت کی بیچینی بے انتہا ترقی کر گئی تھی وہ چاہتی تھی گلاب کو چوم لے، سرو سے لپٹ جائے۔ چاندنی کو اپنے دل میں اُتار لے۔ دیوانہ وار پھر رہی تھی ایک نشہ و سرور طبیعت پر چھایا ہوا تھا۔ نگاہ کے سامنے اندھیرا سا تھا خمار سے آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں۔ عضا میں میٹھی میٹھی دکھن سی تھی۔ وہ فوارہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ پیازی رنگ کی ساری پہنے ہوئے تھی آنچل بے خبری میں سر سے سرک گیا تھا۔ گھنے سرو اس فوارہ کے کونوں پر لگے ہوئے تھے۔ دوب کا فرش اس کے چاروں طرف بچھا تھا۔ ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ درخت ہل رہے تھے۔ گلاب کی ٹہنی جس کے سرے پر ایک بڑا پھول لگا ہوا تھا جھوم جھوم کر فوارے سے ہم آغوش ہو رہی تھی —— آب سیمین گلاب سُرخ —— آہ کیا منظر تھا۔ میمونہ بڑھی، اور بے اختیاری کے عالم میں فوارے اور گلاب کے درمیان مُنھ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ چاند اُس کے چہرے پر روشنی ڈال رہا تھا۔ پھول اس کے گالوں سے لگ لگ کر گدگدی پیدا کر رہا تھا۔ پھوار اس کے چہرے پر موتی بکھیر رہی تھی۔ ساری تمام تر ہوئی جا رہی تھی۔ آنکھوں میں پانی بھر گیا اور ایک پھریری سی آئی۔ آنکھیں بند کر لیں۔ پیچھے ہٹی۔ اور ایک ہلکے، قہقہہ کے ساتھ اس نے پھر آنکھیں کھولیں، اور کیا دیکھا —— دیکھا کہ ایک حسین نوجوان دو زانو کھڑا ہے، اس کے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے ہیں۔ اس کی آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھی ہوئی ہیں ایک مجسمہ عبادت ہے۔ ایک پیکر پرستش ہے۔ اُس نے دیکھا۔ ٹھٹکی اور اُسکی آنکھوں میں جنبش محسوس کر کے ایک دبی ہوئی چیخ کے ساتھ کوٹھی کی طرف بھاگ گئی۔ عبادت کرنے والا بھی چونک پڑا۔ ایکدم کھڑا ہو گیا۔ کھڑے ہونیکی جھلک بھاگتے بھاگتے میمونہ نے بھی دیکھ لی۔

انیس الہ آباد کی خوب سیر کرنے کے بعد اپنے تھکے ہوئے اعضا کی خستگی رفع کرنے کے لئے باغ میں چلا آیا تھا۔ اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ کوٹھی میں اس وقت پردہ ہے وہ ٹہلتا ٹہلتا اس فوارے تک پہنچ گیا تھا اور اس منظر کی دلآویزی سے بہت متاثر تھا اور اپنے تئیں ایک نئے عالم میں پا رہا تھا۔ میمونہ کی آمد ایک پُر تخیل طبیعت کے لئے ایک الہٰۂ سحر کی آمد تھی۔

• صفدر علی محمد علی کی دوکان بہت مشہور ہے

کیونکہ یونانیوں کی بت پرستی جو درحقیقت حسن و فطرت پرستی تھی اس کے لئے بہت رعنائیاں رکھتی تھی۔ وہ اس وقت یونان کا ایک پجاری بن گیا تھا۔ اور اللہ الصحرا کے روبرو اپنا ہدیۂ نیایش پیش کر رہا تھا۔ لیکن اس طرح میمونہ کے بھاگ جانے سے اُسے ہوش آیا اور اُسے یقین ہوا کہ موجودہ زمانہ میں دیویاں یوں زمین پر نہیں اُتر آتیں۔ یہ تو کوئی عورت تھی اور معاً اس کے دل میں خیال آیا کہ، "کہیں یہ میمونہ تو نہیں ہے"

---۵---

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا میری جان تو بہت آفت میں پڑ گئی ہے۔ اُدھر لڑکی روز بروز نڈھال ہوئی چلی جاتی ہے لاکھ سمجھاتی ہوں۔ نہیں مانتی۔ نہ ہنستی ہے نہ بولتی ہے۔ باغ میں تفریح کو بھی نکلتی ہے تو خاموش، نہ کچھ طبیعت میں شگفتگی پیدا ہوتی ہے۔ نہ جی بہلتا ہے۔ ادھر ہر طرف سے پیام چلے آ رہے ہیں تقاضے ہوتے ہیں۔ صاف جواب دینے پر بھی نہیں مانتے اصرار کرتے ہیں۔ اور اُس کی نگاہ میں کوئی جچتا ہی نہیں۔ تم نے فوٹو بھی منگوا کر دکھائے۔ لیکن کوئی پسند ہی نہیں آتا۔ میں کہتی ہوں کیا کنواری رہنے کا ارادہ ہے تو ایک غمگین مسکراہٹ کے ساتھ گردن جھکا لیتی ہے۔ بعض وقت تو مجھے الجھن سی ہونے لگتی ہے، اور میں خیال کرتی ہوں کہ تم نے اُسے اس قدر اختیار دیکر سر پر چڑھا لیا ہے میں یہ تم سے کہتی ہی تھی کہ تم نے اُسے تعلیم ضرورت سے زیادہ دیدی ہے۔ اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ میرا خیال صحیح ہے۔ اور عبد الرحمن کے لڑکے کا کچھ پتہ نہیں، وہ عجب لاأبالی قسم کا آدمی ہے۔ باپ کے مرنے کے بعد تم نے لکھا بھی کہ یہاں چلا آئے۔ تم اس کے تمام اخراجات اٹھاؤ گے، مگر اُسنے عجیب باتیں کیں۔ مجھے تو اُس سے نفرت ہو چلی ہے، میری لڑکی کی گمراہی کا وہی باعث ہے۔ معلوم نہیں باغ میں اُس روز کہاں آن مرا تھا۔ وہاں مٹ بھیڑ ہونے کے بعد سے ہی میں میمونہ کے تیور بدلے ہوئے دیکھتی ہوں میں تو گھبرا گئی ہوں۔ سنا تھا کہ وہ رڑکی میں تھا، اور وہاں ــــ تم سے کس نے کہا تھا کہ وہاں سے پیدل جوالاپور، ہردوار اور پہاڑ کی طرف نہر کی پٹڑی پٹڑی روانہ ہو گیا۔ ایسے دیوانے شخص سے میری لڑکی کا نباہ ہو چکا۔ وہ مضمون لکھا تھا سب کہتے تھے بڑا ہونہار ہے۔ لیکن مجھے تو اسی روز سے دماغ میں کچھ فتور معلوم ہوتا تھا تعلیم کا معقول انتظام اخراجات کی تمام کفالت اور کیا چاہیئے تھا۔ لیکن اسکی طرف سے وہی یاوہ گوئی کہ "میں آپ کی عنایت کا بہت ممنون ہوں، اور عمر بھر اس غمگساری کو نہیں بھولونگا۔ لیکن میری عزت نفس گوارا نہیں کرتی کہ صحت و تندرستی کی حالت میں اپنا بار کسی پر ڈالوں۔ اس کے علاوہ ممکن ہے آپ کے یہاں قیام کرنے سے میری وہ خوابیدہ تمنائیں بیدار ہو جائیں جن کو نہ معلوم میں کس جبر و تشدد سے ضبط کئے ہوئے ہوں۔ ہم ابتدا ہی سے متوسط الحال طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمیں امارت و حکومت سے سروکار نہیں۔ مجھے اپنی کمزوریوں کا احساس ہے، اس لئے کچھ زیادہ عرض نہیں کر سکتا۔ امید ہے کہ جناب میری اس صاف تحریر سے کبیدہ خاطر نہ ہوں گے" مجھے تو کمبخت لفظ بہ لفظ یاد ہو گیا۔

اتنی مرتبہ اُسے پڑھا کہ کچھ مطلب نکال سکوں۔ لیکن خبط اور بکواس کا کچھ مطلب ہو تو آدمی کی سمجھ میں آئے۔

---- ۶ ----

ریاض الحسن کو ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ اپنی لڑکی کو پہاڑ پر لے جائیں۔ کیونکہ اُس کی تندرستی کی حالت خراب ہوتی جارہی ہے اور ضرورت تبدیل آب وہوا کی ہے۔ اس غرض کے لئے چند مصلحتوں کی بنا پر منصوری پہاڑ کو منتخب کیا گیا۔ وہاں ایک عمدہ بنگلہ نہایت پر فضا مقام پر کرایہ لیا گیا۔ اور چند روز وہاں قیام کرنے کا ارادہ کرکے سکونت اختیار کرلی گئی۔ ایک روز ایک رکشا پر میمونہ اور اُس کی والدہ، اور دوسری پر ریاض الحسن تفریح کے لئے کیملس بیک روڈ پر چلے جا رہے تھے، کہ انھوں نے دیکھا چند پہاڑی ایک زخمی بیہوش شخص کو اُٹھائے ہوئے اوپر چڑھ رہے ہیں۔ ریاض الحسن کو جستجو ہوئی کہ معلوم کرے کون ہے پہاڑیوں نے اُن سے کہا کہ ایک شخص ہے جو روزانہ ادھر ادھر کی پہاڑیوں پر چڑھا کرتا تھا۔ اور بعض ایسے خطرناک مقامات جہاں جانے سے ہمیں بھی ڈر معلوم ہوتا ہے، جایا کرتا تھا۔ اُن میں سے ایک وجیہ نوعمر بولا میں روز انہیں دیکھا کرتا تھا اور مجھے ایک طرح کا اُنس اُن سے ہو گیا تھا۔ آج اسی طرح یہاں سامنے چڑھ رہے تھے کہ گر پڑے۔ وہ تو میں نے انہیں گرتے ہوئے دیکھ لیا۔ اب اُٹھا کر انہیں لائے ہیں۔ معلوم نہیں ان کا کوئی وارث بھی ہے یا نہیں۔ پولس میں لے جانے کا ارادہ ہے ریاض الحسن کی نظر چہرہ پر جو پڑی تو کچھ مانوس سا معلوم ہوا، اور فوراً شبہ ہوا کہ کہیں یہ انیس تو نہیں ہے۔ شبہ نے یقین کا درجہ اختیار کیا، اور اُنھوں نے انیس کو اپنی رکشا میں ڈالنے کے لئے کہا۔ خود ایک دوسرے رکشا والے کو آواز دیکر اُس میں سوار ہوگئے۔ پہاڑیوں کو انعام دیکر رخصت کیا اور انیس کو اپنے ہمراہ لے آئے

---- ۷ ----

انیس ایک معزز تاجر ہے۔ اس کی زندگی کا آزاد دورِ فراغت شروع ہوگیا ہے۔ اُس کی تجارت کی ابتدا نہایت کم قوت تھی۔ لیکن اپنی محنت، جفاکشی، سلیقہ وحسن انتظام سے اُس نے بمبئی کے بڑے بڑے تاجروں میں رسوخ پیدا کرکے اچھا ساکھ اور اعتبار پیدا کرلیا ہے۔ اس کا ذاتی سرمایہ بھی کافی ترقی پاگیا ہے اسے یہ اطمینان ہے کہ میں اپنے عروج کے لئے کسی غیر کا ممنون احسان نہیں ہوں۔ میمونہ سے اس کی شادی منصوری سے واپسی پر ہی نہایت خاموشی سے ہوگئی تھی۔ لیکن وہ اس بات کا عزم وارادہ کرکے گیا تھا کہ میں اپنے دستِ بازو کی قوت کا امتحان کرونگا۔ چنانچہ اب وہ اپنے آپ کو اس قابل پاتا ہے کہ میمونہ کو اپنا کہکر پکار سکے اور اپنی دیوی کی پزیرائی اُس کے رتبہ کے لائق کرسکے۔ رخصت ہو چکی ہے۔ باغ میں مصروف سیر ہیں فوارہ کے قریب پہنچکر بیٹھ جاتے ہیں پانی سے کھیل رہے ہیں۔ راز ونیاز کی گفتگو ہے۔ انیس نے کچھ محبت کے متعلق کہا ہے۔ میمونہ بناوٹی غصہ کیساتھ تیوری پر بل ڈال کر جواب دیتی ہے "بس رہنے دیجئے۔ خدا کے لئے محبت کے ایسے درس نہ دیا کیجئے۔ وہ تو یوں کہئے سخت جان ہی بہت تھی کہ جانبر ہوگئی اور ملنا نصیب ہوگیا۔ ورنہ آپنے اپنی طرف سے تو ہلاک کرنے میں کوکسر اُٹھا نہ رکھی تھی۔

"مشہود"

دینِ مسیحی یا آفتاب پرستی

(گزشتہ سے پیوستہ)

پیدائش نجات دہندہ

اگر زمانۂ قدیم کی قصہ کہانیوں کا اُسی طرح اعتبار کیا جائے جیسا کہ والٹیئر[1] سے پہلے علم طور پر کیا جاتا تھا تو ہم کو ماننا پڑے گا کہ اُس زمانہ میں سلطنتوں کے بنانے والے اور نئے نئے مذاہب کے پیغمبروں کی نسل اچھی نہ ہوگی، یا اُن کی پیدایش فوق العادت طریقہ پر ہوئی ہوگی۔ ان میں سے اکثر لقیط تھے اور بعض کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ اُن کے باپ تھا ہی نہیں، یا آنکہ وہ کسی دیوتا کے بیٹے[2] تھے۔

ان بڑے آدمیوں کی نسل کا عجیب وغریب اور مرموز ہونے کا باعث کیا ہے؟ کوئی شبہ نہیں کہ اس کی اصلیت صرف یہ ہے کہ زمانۂ قدیم کے لوگوں کے نزدیک آفتاب بھی ایک عجیب وغریب اور مرموز چیز تھی۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ آفتاب کہاں سے آتا ہے اور کس وقت، کہاں سے طلوع کرتا ہے۔ جیسی اُس کی روشنی حیرت انگیز ہوتی ہے ویسی ہی اس کو سخت خوفناک چیزوں سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ رات کے اندھیرے کو صفحۂ دنیا سے محو کرنے کے لئے اس کو سخت ترین لڑائی لڑنی پڑتی تھی، گو انجام یہ ہوتا تھا کہ آفتاب ہی کو فتح ہوتی تھی اور اس کی شعاعیں اندھیرے کو شکست دیتی تھیں اور بادلوں کے پار ہو جاتی تھیں۔

بچے کا خطروں میں گرفتار ہونا

جس بچہ کا دنیا کو انتظار تھا اور جس میں سورج دیوتا حلول کرنے والا تھا وہ پیدا ہوتا ہے تو اسکو خطروں سے سابقہ پڑتا ہے، کہیں سردی میں چھوڑ دیا جاتا ہے، کہیں گرمی میں پھینک دیا جاتا ہے کہیں دریا میں ڈال دیا جاتا ہے، کہیں پہاڑ پر رکھدیا جاتا ہے یا کوئی ظالم اس کا جان لیوا موجود رہتا ہے۔ مثلاً شہر بابل کے بانی کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس کی ماں نے اُس کو ایک ٹوکرے میں رکھکر فرات میں بہا دیا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے

---

[1] ایک مشہور فلسفی۔

[2] یہ یاد رکھنا چاہئے کہ زمانۂ قدیم کے لوگ اولاد کے متعلق عجیب عجیب خیالات رکھتے تھے۔ سیمسن اور سیموئل بانجھ عورتوں کے بطن سے تھے فیثاغورس کے معتقدین کہتے تھے کہ اُن کا اُستاد ایک باکرہ کے پیٹ سے تھا، جو اپولو (یعنی سورج دیوتا) کی محبوبہ تھی۔ یہی قصہ افلاطون کے متعلق اس کے شاگرد بیان کرتے تھے۔ اور رومولوس، بانی شہر روم دیوتا مریخ کا بیٹا ایک داشتہ عورت سے تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

کہ کالدیا کے میدان میں اگر سورج کو طلوع ہوتے دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرات ہی میں سے نکل رہا ہے۔[۵۰]

یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ رومولوس دریائے ٹائبر میں اور پرسیوس سمندر میں بہایا گیا تھا۔

کوہستانی ممالک میں یہ بچہ سب سے بلند چوٹی پر رکھدیا جاتا ہے، کیونکہ اُن کے نزدیک آفتاب رات کے وقت کسی بلند چوٹی پر آرام کرتا ہے؟ مثلاً اوڈی پس استھرون کی چوٹی پر رکھدیا گیا تھا۔[۵۱] اور اقوام کے بڑے بڑے آدمی کسی کھوہ میں پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ یونان میں زیوس اور ایران میں مہر۔

چرواہوں کی قوم میں نجات دہندہ کسی اصطبل میں پیدا ہوتا ہے، جیسا کہ مصریوں کے عقیدہ کے موافق ہورس۔ اگر یہ نہ ہوگا تو چرواہے بھی اس کی پیدایش کے گواہ ہوں گے مثلاً مہر۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ رومولوس اور اوڈی پس چرواہوں کو ہی پڑے ملے تھے، انھیں نے اُن کو متبنیٰ کرکے پالا پرورش کیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ یسوع بھی ایک اصطبل ہی میں پیدا ہوئے تھے اور چند چرواہے بھی اُن کی پیدایش کے وقت وہاں موجود تھے۔

قصہ مختصر، ساری دنیا کو عیسائیوں کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ انھوں نے اپنے پیغمبر کے عشق اور اُن کی شخصیت کی بڑھی ہوئی محبت میں اُن کو خدا کا بیٹا بنا دیا۔ گو یہ کوئی نئی بات نہ تھی، کیونکہ اورفیوس فیثا غورس، افلاطون اور اُن کے علاوہ اور بہت سے بزرگ لوگوں کو اُن کے معتقدین نے خدا کا بیٹا بنا دیا تھا۔ عیسائیوں نے اسی پر بس نہیں کیا، بلکہ انھوں نے اپنے اُس پیغمبر کو جس کا حال تاریخ کو معلوم نہیں، یا اتنا معلوم ہے کہ نہونے کی برابر ہے بے شمار قصہ کہانیوں کا ہیرو بنا دیا، جیسا کہ افلاطون فیثا غورس اور اورفیوس کو لوگوں نے بنا دیا تھا یسوع کے سوانح حیات جیسا کہ انجیل سے معلوم ہوتے ہیں اگر کوئی غور سے پڑھے تو معلوم ہوتا ہے کہ اور دور دراز کار افسانوں کی طرح وہ بھی ایک افسانہ ہے[۵۲]! گو وہ بہت مشہور اور مقدس ہے

۵۱ ماس پیرو کی "ایشیا کی تاریخ قدیم"، جلد اول صفحہ ۹۷ ملاحظہ فرمائیے۔

۵۲ پہاڑ ہی پر عیسیٰ کی صورت بدل گئی۔ پرس اور یعقوب اور اس کے بھائی یوحنا کو ہمراہ لیا اور انھیں ایک اونچے پہاڑ پر لے گیا اور ان کے سامنے اُن کی صورت بدل گئی اور اُنکا چہرہ سورج کی مانند چمکا (متی ۱۷-۱ و ۲) پہاڑ ہی پر یسوع کا انتقال ہوا تھا۔ اسیطرح ہرکولیس کا۔ کوہ زیتون ہی کی چوٹی سے یسوع آسمان پر گئے تھے۔

۵۳ شمسی دیوتاؤں کے متعلق جو افسانے ہیں اُن کے ماخذ اگر تلاش کرنے ہوں تو، باہن میکس مولر کی "عجیب وغریب اصنام پرستی کے افسانے"، صفحہ ۴۶۶ اور جیری میاس کی کتاب کا صفحہ ۹ ملاحظہ ہو۔

— — — — — — — — — —

نجات دہندہ کو تکالیف پہونچائی جاتی ہیں۔

یہ کہا جاتا ہے کہ جب یسوع پیدا ہوئے تو ہیروڈ نے لوگوں کو ورغلایا کہ جتنے بچے پیدا ہوں سب کو قتل کر دیا جائے[51]۔ کیونکہ اُنہی میں سے ایک اُس کی سلطنت کا خاتمہ کرے گا۔ سایرس کو اُس کے دادا اسٹیاگس نے اور پرسیوس کو بھی اس کے دادا اکری سیوس نے اسی بنا پر ستایا تھا۔

ہیرڈو کا قصہ ہو یا اکری سیوس یا اسی قبیل کے کسی اور شخص کا یہ سب انہی پرانی باتوں کو یاد دلاتے ہیں۔ یہ سب لوگ اپنے آپ یا اپنی سلطنت کو نوزائیدہ بچوں کی بلند نظری سے بچاتے ہیں۔ یہ قیامت تک جاری رہنے والی کشش و کوشش، جو ایک ظالم اور ایک بچے، یا زمانۂ ماضی و استقبال، یا زمانۂ تاریک اور عہد زریں (جو اس بچہ کے پیدا ہونیکے ساتھ ہی آتا ہے) کے درمیان میں جاری رہتی ہے۔ یہ پولٹیکل اور مذہبی رقابت جو چلی آتی ہے۔ پرانے زمانہ کی تحریرات، انجیل اور دوسری کتابوں میں درج ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ یہ کیا ہے؟ یہ وہی کشش و کوشش ہے، جو ہر صبح کو آفتاب کو شب گزشتہ سے، یا موسم بہار کو موسم سرما سے کرنی پڑتی ہے۔

نجات دہندہ کی تاریخ پیدایش

یسوع کی تاریخ پیدایش کا انجیل میں کہیں ذکر نہیں ہے نہ ابتداءً عیسائی اُن کی تاریخ پیدایش کی خوشی مناتے تھے۔ کچھ زمانہ گزرا تو ۶ جنوری اُن کی تاریخ پیدایش قرار دی گئی، اور اُس دن کا نام اپی فینی رکھا گیا۔ اس لفظ کے معنی ہیں "ظہور" (یعنی خدا کا انسانوں میں ظہور)

لیکن سوال یہ ہے کہ عیسائیوں نے ۶ جنوری کو یہ فخر کیوں عطا کیا؟ اسلئے کہ مصری اپنے سورج دیوتا کی پیدایش کی خوشی ۶ جنوری کو مناتے تھے۔ اسکے بعد جب وہ زمانہ آیا کہ مذہب عیسائی ایشیا سے یورپ میں منتقل ہوا اور روم میں اُس نے اپنے پیر جمائے (جو دنیا بھر کا دار السلطنت تھا) تو فوراً ہی اس کو دنیا کے اور مذاہب سے مقابلہ پڑا، مثلاً مِتھر کے ایرانی پوجاریوں کا مذہب ہم اُوپر کہہ آئے ہیں کہ ایران میں مِتھر وہی حیثیت رکھتا ہے جو سورج دیوتا اور ممالک میں۔

سنہ عیسوی کی ابتدائی صدیوں میں جتنے مذاہب دنیا میں تھے سب کے سب روم میں جا دھمکے، اور ہر ایک مذہب کی یہاں خوب آؤ بھگت ہوئی وجہ یہ تھی کہ روم کو اپنے پرانے دیوتاؤں، مثلاً جیوپیٹر، منروا وغیرہ، پر کچھ زیادہ عقیدہ نہیں رہا تھا، اور وہ بغیر کسی دیوتا کے زندہ بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ جتنے مذاہب روم میں پہونچے تھے اُن میں سے صرف دو پر شہر والوں کی نظر عنایت ہوئی؛ ایک عیسائیت اور دوسرے مِتھر والوں کا مذہب۔

یہ دونوں مذہب کچھ اس طرح مماثل تھے[52] کہ خداوندان کلیسا اس عجیب مماثلت کا اگر کچھ جواب دے سکتے ہیں تو صرف یہ کہ

۵۱ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ غریب ہیرڈ یسوع کی پیدایش سے بہت پہلے مر چکا تھا۔

۵۲ مماثلت نہ صرف مراسم مذہبی میں تھی، بلکہ اخلاقی معاملات و احکام میں بھی۔ دیکھئے ایس ایناش جلد دوم صفحہ ۲۳۰)

"اس مذہب کو نکال کر شیطاں نے عیسائیوں سے بدلہ لینا چاہیئے"۔

یہ ظاہر ہے کہ دو مذہبی اصول جو ہر صورت میں ایک دوسرے سے مماثل ہوں، ایک مقام میں زندہ نہیں رہ سکتے تھے ایک کو ختم ہو جانا چاہیئے تھا مگر روم والوں نے ایک کو منظور اور دوسرے کو نامنظور کرنے میں بہت دیر لگائی۔ چوتھی صدی عیسوی کے نصف اول میں شاہ کانس ٹین ٹن جو قرعہ پھینکتا ہے تو مذہب عیسوی کا نام نکلتا ہے۔ مگر اسی صدی کے نصف آخر میں جولین نے مذہب مہر کو گلے لگایا۔ لیکن آخر فتح مذہب عیسوی ہی کو ہوئی

اگر اہالی روم بجائے عیسائیت کے مہر والوں کا مذہب قبول کر لیتے تو چنداں فرق نہ پڑتا، نہ اہل یورپ موجودہ حالت سے اچھے رہتے، نہ بُرے۔ کیونکہ ہم کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ مذہب سے "انسانیت نہیں بنتی، بلکہ اس کے خلاف انسان ہی پرانے مذاہب کو غارت کرتا اور نیا مذہب بناتا ہے[1]۔ مذہب ایسا آئینہ ہے جو بدلتا رہتا ہے اور اس میں انسانی ترقیات کی کشش وکوشش کا ہر وقت عکس پڑتا رہتا ہے۔ اگر مہر کا مذہب مقبول ہوتا تب بھی کرسمس کی عید جنتریوں میں ۲۵ ردسمبر کو لکھی جاتی، جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے اس کے ساتھ ہی ایسٹر بھی ہوتا اور دیگر تہوار بھی۔

ایرانی مہر دیوتا کی تاریخ پیدائش ۲۵ ردسمبر ہی کو بتلاتے ہیں۔ یہ وہ تاریخ ہے کہ جب دن بڑھنے لگتا اور آفتاب کی شعاعیں سیدھی اور تیز ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ اب یہ اتفاق کی بات تھی کہ عیسائی جو اپنے مذہب پر ابھی پوری طرح مستحکم نہیں ہوئے تھے، ان دو تہواروں کے قریب قریب پڑنے سے گھبراتے تھے اور ایک کو دوسرے سے گڈمڈ کر دیتے تھے (یاد رہے کہ مہر کی پیدائش کی ۲۵ ردسمبر کو[2] اور یسوع کی پیدائش کی ۶ رجنوری کو عید منائی جاتی تھی) ناچار کلیسا نے یہی مناسب سمجھا کہ یسوع کی پیدائش ۲۵ ردسمبر کو[3] قرار دیدے

---

[1] ای رینان بہت صحیح کہتا ہے کہ یہ بالکل فضول بات ہے کہ کوئی شخص عیسائیت یا الٰہیات سے نفرت ظاہر کرے۔ عیسائیت کو کسنے بنایا اور الٰہیات کو کس نے؟ انسان صرف اسی بیڑی کو پہنتا ہے جو خود اُسی کے ہاتھ کی بنائی ہوئی ہوتی ہے۔ انسان ہی نے ان سب کو بنایا ہے اور ہم تسلیم کرتے ہیں کہ خوب بنایا ہے"۔ (تاریخ مذاہب صفحہ ۴۱۶)

[2] تیسری صدی عیسوی کے آخر یا چوتھی صدی کے شروع میں ۳۷۵ء کے قریب ایشیائی کلیسا نے ۲۵ ردسمبر کو مسیح کی پیدائش منانے کا فیصلہ کیا ہے

[3] جسوقت یسوع کی پیدائش کلیسا مناتا ہے اسی ساعت میں ۲۵ ردسمبر کو سینٹ انسٹاسیا کی پیدائش بھی منائی جاتی ہے، جو افسانہ کہ مشہور ہے اس کے موافق یہ سینٹ پیدائش کے وقت موجود تھا، بلکہ مقدس کنواری کی دائی کا کام اُسی نے کیا تھا۔ اُس کی اصلیت بہت صاف اور سیدھی ہے۔ لفظ "انسٹاسیا" کے لغوی معنی ہیں "حشر، اُٹھنا"، یہ سینٹ یسوع کے جی اُٹھنے کا گویا مجسمہ تھا؛ یعنی آفتاب کے نکلنے کا نشان (ملاحظہ ہو سینٹی ویں صفحہ ۱۰۸)

اس انتظام کی عنایت ہے کہ ایماندار عیسائی یسوع کی پیدائش کو مہر کی پیدائش سے خلط ملط نہیں کرنے پاتے!
غرض اس واقعہ کے بعد یہ ہر دو مذاہب ایک دوسرے سے سرکاری طور پر مدغم کر دیئے گئے۔ عیسائیت نے کیتھولک صورت اختیار کر لی یسوع سادہ اور دلکش تعلیمات کے بدلے میں مہر کے مذہب کی بہترین صورتیں آ کر ایک خوبصورت چیز بن گئی یعنی ایسی چیز ہو گئی جس کو سب قبول کر سکیں اور دنیا کی اقوام کے دلوں پر اثر بھی پڑ سکے۔ (اس زمانہ میں سوا رومیوں کے اور بڑی قوم کوئی تھی بھی نہیں) دنیا کی ان اقوام نے آخر مذہب عیسوی کو اپنی بہترین چیزیں دیدی تھیں

مبشر مفصلۂ بالا خیالات کو پیش نظر رکھکر اور لوگوں کے دلوں سے پرانے دیوتاؤں کا خیال نکالنے کی غرض سے یحییٰ کی پیدائش کی تاریخ ۲۴ جون قرار دی گئی۔ یہ وہ تاریخ ہے کہ دن چھوٹے ہونے شروع ہو جاتے ہیں قدیم کفار (غیر عیسائی) لوگوں کی شروع موسم گرما کی عید کی جگہ عیسائیوں نے "یوحنا کے دن" کی عید منانی شروع کر دی۔ قدیم کفار میں ایک رسم تھی کہ وہ ۲۴ جون کو پہاڑ کی اونچی چوٹیوں پر بڑے بڑے الاؤ سلگایا کرتے تھے۔ اس کے یہ معنی تھے کہ وہ عروج آفتاب کی خوشی کرتے اگر الاؤ نہ سلگا سکتے تو یہ کرتے تھے کہ گول پہیہ کی طرح ایک چیز بناتے تھے، جو آفتاب کی قائم مقام ہوتی تھی، اور اس کو جلا کر پہاڑ پر سے لڑھکا دیتے تھے وہ نیچے پہونچکر بجھ جاتی تھی۔ کلیسا کا فائدہ اسی میں تھا، اور وہ اس کو اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اسے ان تماشاؤں کا مددگار ہونا چاہیے کیونکہ وہ مبشر کی یوم ولادت کے دن ہی پڑتے تھے یا آنکہ مبشر کی یوم ولادت اسی روز قرار دیدی گئی تھی۔ کیونکہ جہاں یوحنا نبی، یسوع کا ذکر کرتے ہیں وہاں کہتے ہیں کہ ضرور ہے کہ وہ بڑھے اور میں گھٹوں (یوحنا ۳-۳۰) یہی وجہ ہے کہ کفار کا شروع موسم گرما کا الاؤ، یوحنا نبی کی یوم ولادت کا الاؤ بن گیا۔

اس کے علاوہ انجیل میں یسوع کو "روشنی" کہا گیا ہے؟ روشنی بھی وہ کہ اگر وہ نہ ہوتی تو دنیا موت کی تاریکی میں غائب ہو جاتی۔ آباء مقدس کہتے اور بار بار کہتے چلے آتے ہیں کہ یحییٰ مبشر ہیں یسوع کے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں کئے جا سکتے جس طرح کہ دن رات سے جدا نہیں ہو سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ یوحنا نبی "جلتا اور چمکتا چراغ" (یوحنا ۵-۳۵) کی صورت میں ایسی حالت میں دنیا پر ظاہر ہوئے تھے کہ اس وقت رات کی تاریکی ہی تاریکی تھی۔ بنو اسرائیل تھوڑی دیر یہ "جلتا اور چمکتا چراغ" دیکھ کر خوش ہو گئے تھے۔ لیکن کلیسا نے اس روشنی کو جو مبشر نے مستعار لی تھی، آفتاب (یعنی یسوع) کی روشنی سے الگ ہی رہنے دیا۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا کسی مبشر کا آنا اشد ضروری تھا؟ ایک مرتبہ مسٹر بوسے نے پوچھا تھا کہ کیا روشنی کو کسی ثبوت کی ضرورت ہے؟ کیا اس کی ضرورت ہے کہ کوئی شخص ہم کو آفتاب دکھلا کر یہ کہے کہ یہ آفتاب ہے؟ کیا ہر شخص کی آنکھ آفتاب کی روشنی کو بغیر بتلائے نہیں دیکھ سکتی"؟ مگر نہیں اس کی سخت ضرورت ہے وجہ یہ ہے کہ ہماری بصارت بہت کم زور ہے۔

اگر یکایک آفتاب نکل آئے تو ہماری آنکھیں چوندھیا جائیں، البتہ اگر رفتہ رفتہ ہم کو عادت ڈالی جائے تو ہماری آنکھوں میں جو کمی ہے اس کی تلافی ہو جائیگی"۔ اسی وجہ سے یسوع کی پیدائش سے پہلے یہ ضروری تھا کہ ایک مبشر آئے تاکہ بنو اسرائیل یسوع کی آمد کے منتظر رہیں اور اُن کے قبول کی استعداد اُن میں پیدا ہو جائے۔

لیکن یہ بھی کافی نہیں تھا۔ ایک فرشتہ، ملکہ فرشتہ مقرب، یعنی روشنی کا دیوتا نجات دہندہ کی پیدائش[۵۱] سے نو مہینہ پیشتر آسمان سے اُترتا ہے اور مریم کو اطلاع دیتا ہے کہ وہ اُس نجات دہندہ کی والدہ بننے والی[۵۲] ہیں۔

عقلمندوں کے ستارے[۵۳] نے دنیا کو پیدائش یسوع کی بشارت دی تھی، اُسی طرح جیسے صبح کا ستارہ، صبح ہونے کی خبر دیتا ہے[۵۴]

سورج دیوتا بحیثیت شفیع ہم دیکھ چکے ہیں کہ زمانۂ قدیم کے بڑے آدمیوں کو اکثر آفتاب کہا گیا ہے، بلکہ آفتاب اور وہ شخص ایک ہی چیز سمجھے گئے ہیں۔ اس کے برعکس، اور دیوتاؤں کی طرح، آفتاب بھی ایک آدمی کی صورت میں بتلایا جاتا ہے[۵۵]

غرض آفتاب انسانی شکل میں آدمیوں اور خدا کے درمیان میں شفیع یا سفارشی سمجھا جاتا ہے۔ خدا ساتویں آسمان پر رہتا ہے اور اس کا انسان سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ سوال کہ روشنی کہاں سے آتی ہے چنداں اہمیت نہیں رکھتا۔ اہم بات صرف یہ تھی کہ روشنی گرمی دینے اور دنیا میں اجالا کرنے کے لئے آتی ہے نیز یہ کہ آفتاب ہر صبح کو اس واسطے نکلتا ہے کہ وہ دنیا کو رات کی تاریکی سے بچائے اور روزانہ طوفانوں سے محفوظ رکھے۔

---

۵۱ مریم کے دن"، کی عید ۲۵ مارچ کو منائی جاتی ہے، یعنی کرسمس (یوم ولادت مسیح) سے پورے نو مہینہ پہلے یحییٰ کی رحم مادر میں آنے کی تاریخ کی عید ۲۴ ستمبر کو منائی جاتی ہے یعنی پورے نو مہینہ پہلے۔

۵۲ ایک ہزار برس پیشتر ایک فرشتہ آسمان سے سیمسن کی پیدائش کا اعلان کرنے کے لئے اُترا تھا۔ سیمسن ایک افسانہ کا ہیرو ہے؛ اس نام کے معنی ہیں "چھوٹا آفتاب"، سیموئیل کے پیدائش کی خوش خبری ایلی نے دی تھی، جو مقتدر مذہبی تھا فیثا غورس کا مبشر یائی تھی آتا تھا۔ (دیکھئے ربائین یہود کی حکایات)

۵۳ وہ ستارہ پرست ہی تھے جنھوں نے سب سے پہلے یسوع کے سامنے اپنا سر جھکایا اس سے تین سو برس پیشتر سکندر کے پیدا ہونیکی رات کو عقلمندوں نے ایک ستارہ کو دیکھ کر یہ پیشینگوئی کی تھی کہ ایشیا کی تباہی قریب ہے

۵۴ ساتویں صدی میں ایک مقدس نجومی نے یہ رائے دی تھی کہ ستارۂ مشتری کا نام یحییٰ رکھدیا جائے کیونکہ یحییٰ وہی ستارہ صبح ہے جو صبح کی خبر دیتا ہے"۔ ۵۵ چنانچہ مصری آفتاب کے طلوع ہونے کو نئے پیدا ہونے والے بچہ سے مماثلت دیتے تھے؛ آفتاب نصف النہار کو کامیاب بہادر سے اور ڈوبتے ہوئے آفتاب کو بوڑھے آدمی سے جو عمر کے بوجھ سے کبڑا ہو گیا ہو اور بغیر عصا کے نہ چل سکتا ہو۔ شروع سرما کے آفتاب کو اس بچہ کی تصویر

روشنی کا دیوتا، سورج دیوتا یا اسی قسم کے کوئی اور الفاظ ہوں، مقصود صرف یہ ہے کہ خدا کا بیٹا[1]، جلد یا دیر میں اپنے باپ کا قائم مقام[2] ہو کر آئیگا۔ خرافات الاصنام میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ آفتاب وہ دیوتا ہے جس کے ہاتھ میں زمانہ مستقبل ہے۔ وہی ایک ذات ہے جو انسانوں کے لئے تکلیف اٹھاتا اور مرجاتا ہے[3]

چنانچہ اڈونس کے متعلق لکھا ہے کہ ایک روز عالم شباب میں وہ لبنان کے پہاڑ کے پاس ایک دریا کے کنارے سیر کر رہا تھا کہ اسٹارٹے اس کو ملا اور اڈونس اسٹارٹے پر عاشق ہوگیا۔ چند روز کے بعد اڈونس کو ایک جنگلی سور نے مار ڈالا۔ یہ جنگلی سور اصل میں ایک دیوتا تھا کہ جو اس وقت اس صورت میں تھا۔ یا بہ تبدیل الفاظ یوں کہنا چاہئے کہ موسم گرما کے آفتاب کو موسم سرما کے آفتاب نے قتل کر ڈالا۔ اسٹارٹے اپنے عاشق کے قتل ہونے پر بہت رویا اور پھر اس کو دفن کردیا۔ پھر بھی اس کو صبر نہ آیا تو اس نے یہ ارادہ کیا کہ عالم بالا پر جاکر اپنے عاشق کو موت کے ہاتھوں سے چھڑا لے۔ اسمیں وہ کامیاب ہوا۔ اڈونس کو زمین پر اتار لایا۔ پھر اس کو ایک صاف پانی کے فوارے پر لے گیا۔ اور وہاں اس کو بہت سی خوشبوئیں لگا کر خوب نہلایا

اڈونس کی موت اور اس کا عالم بالا پر پہنچ جانا اصل میں یہ علامت ہے کہ موسم سرما شروع ہوگیا۔ اس کا پھر جی اٹھنا گویا موسم بہار کی پیدائش ہے۔ اسٹارٹے گویا مجسمہ ہے نیچر کا، جو زمین کی ماں ہے، اور یہ کبھی خوش نظر آتی ہے اور کبھی رنجیدہ یعنی اگر آفتاب زور سے چمکتا ہے تو وہ خوش نظر آتی ہے اور اگر وہ چھپ جاتا ہے تو رنجیدہ ہوجاتی ہے۔

اصول عشاء ربانی

لیکن اڈونس صرف آفتاب ہی کا مجسمہ نہیں ہے، بلکہ وہ فصلوں اور سبزیوں کا بھی دیوتا ہے۔ وہ گیہوں کا دانہ بھی ہے، مگر وہ دانہ جو مرنے والا معلوم ہوتا ہے، تمام موسم سرما میں زمین میں دفن رہتا ہے، اور موسم بہار میں زندگی پالیتا ہے اور آخر کاشتکار کی درانتی پھر اسے کاٹ لیتی ہے۔ وہ انگور کا بیج بھی ہے جو

---

[1] خرافات الاصنام میں آفتاب اصل میں آسمان کا بیٹا ہے۔ یسوع نے اپنے آپ کو "باپ کا بیٹا" کہا ہے (یا لوگوں نے ان کے ذمہ لگا دیا ہے کہ انھوں نے یہ کہا) اس کا ترجمہ عبرانی زبان میں "بر ابا" کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ برابا سے کے افسانہ کی یہی اصلیت ہو جس نام سے کہ یسوع مشہور ہیں ممکن ہے کہ وہ کسی دوسرے کا نام ہو۔

[2] یہاں تک کہ بابل والوں کا دیوتا جو "باپ" کہلاتا تھا، کوئی بڑا کام نہیں کرتا نہ اس کے متعلق کوئی بڑا کام تھا یورپ کے قرون وسطے میں تمام یورپ میں خدا یا باپ کے لئے قربانگاہیں معدودے چند تھیں۔ کینا تو ایک بھی اس کے نام کا نہ تھا عیسائیوں کی جنتری میں تو ایک دن بھی خدا کے نام پر نہیں ہے۔ [3] آفتاب کا مرنا اس لئے ضروری ہے کہ تھکی ماندی زمین پھر قوت پالے اور اچھی فصل اور پھل دے۔

[4] پامپیائی میں ایک قدیم زمانہ کا بت سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ اڈونس دیوتا کا بے جان جسم ایک کپڑے میں لپٹا ہوا ہے اور اس کا سر سٹارٹے کی گود میں ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا کہ کسی عیسائی بت ساز نے اسی خیال کو لیکر مریم کا بت بنایا ہے کہ وہ اپنے بیٹے پر رو رہی ہیں

موسم گرما میں پکتا ہے اور خزاں میں شراب دیتا ہے یعنی اپنا خون بنی نوع انساں کو پلا کر اُن کو خوش کرتا ہے۔
آسمان پر کوئی نہیں پہونچ سکتا۔ سورج اور بھی دور تھا۔ گیہوں کا دانہ اور انگور کا بیج۔ روٹی اور شراب، آفتاب کے
عطیات ہیں۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعہ سے آدمی نیچر سے مل سکتا ہے ہر ہفتہ یا ہر سال خاص مراسم کے ساتھ روٹی
کھانے یا شراب پینے سے مصیبت زدہ ارواح کو سکون و اطمینان حاصل ہوتا تھا۔
قدیم زمانہ کے یونانیوں میں ایک رسم تھی کہ جس روز اناج کھیتوں سے اٹھکر آتا تھا تو شہر کے لوگ اور کاشتکار،
آقا اور غلام نئی شراب چکھتے اور سورج دیوتا کی حمد کے گیت گاتے تھے؛ کیونکہ یہی دیوتا انسان اور نیچر کو آزاد کرانیوالا ہے[۵]
فصل کے پکنے کے بعد مقتدایان مذہب لوگوں کو خاص مراسم کیساتھ اناج کی ایک ایک پھلی دیتے تھے اور اُس کو سب سے
بڑی، نہایت عجیب اور سب سے مکمل راز کی چیز کہتے تھے۔

برکت دینا

غرض کفار قدیم یہ سمجھتے تھے کہ بذریعہ عناصر ہی سورج دیوتا اپنے معتقدین سے ملتا ہے اسی طرح
عناصر ہی کے ذریعہ سے یسوع عیسائیوں کو برکت دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ "میں انگور ہوں"
یہی وجہ ہے کہ قرن وسطی کے مصور اور بت ساز ان کی تصویر یا بت یوں بناتے ہیں کہ انگوروں کا رس نکالا جارہا ہے اور وہ
اس پر جھکے ہوے ہیں۔ ایک درجگہ ان کی زبان سے کہلایا گیا ہے کہ "مین وہ روٹی ہوں جو آسمان سے اُتری۔ اگر کوئی آدمی
اس روٹی کو کھاے تو وہ ہمیشہ زندہ رہیگا"
ایک امر یہ بھی قابل غور ہے کہ یسوع بیت اللحم میں کیوں پیدا ہوے؟ یہی گاؤں اس کے لئے کیوں انتخاب کیا گیا کہ
وہاں اتنا بڑا واقعہ ہو؟ یہ تو معلوم ہی ہو چکا ہے کہ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہاں داؤدؑ پیدا ہوے تھے۔ مگر ایک اور
وجہ یہ بھی ہے (جو عیسائی عالم علوم الہیات کی نگاہ میں کچھ کم وقیع نہیں ہے) کہ بیت اللحم کے معنی "روٹی کا گھر" ہے
آبار کلیسا کے خیال کے موافق یسوع نے چند روٹی کے ٹکڑوں مین اتنی برکت پیدا کر دی تھی کہ اُنکو اُن پانچ ہزار
آدمیون نے سیر ہو کر کھالیا، جو ان کا وعظ سننے کے لئے جمع ہو گئے تھے۔ یہ معجزہ گویا اُن کی اور طاقتوں کی پیش بینی
تھی گویا جو افسانہ کہ گھڑا گیا ہے۔ اُس کے موافق جس شام کو وہ مرے اُسی شام کو اُنھوں نے اور شراب اور روٹی کو برکت دی تھی
جس روز اُنھوں نے روٹی کو المضاعف کیا ہے اُسی روز اُنھون نے دو مچھلیوں کو بھی المضاعف کیا تھا۔ یہی وجہ ہے
کہ شروع زمانہ کے عیسائی یسوع کو مچھلی کی صورت مین پیش کرتے ہیں۔ یوں یسوعؑ نے نہ صرف اپنے آپ کو مچھلی بنا دیا

---

[۵] فصل کو پکانے اور اٹھانے والے دیوتا ڈیلچس، کو الیو تھیریس بھی کہتے تھے یعنی آزادی دہندہ۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ نیچر ہر ایک کیساتھ
یکساں سلوک کرتا ہے؛ آفتاب کے نزدیک غریب اور امیر برابر ہیں عورت مرد یکساں ہیں اور آقا اور غلام میں کوئی تفریق نہیں۔

بلکہ روٹی اور شراب بھی بنا دیا۔ یقیناً اُن کو اپنے وعدوں کا خیال تھا اور وہ اُن کو ایفا کرنا چاہتے تھے
لیکن آدمی نہ صرف روٹی ہی کھاکر زندہ رہتا ہے، نہ صرف مچھلی ہی کھاکر۔ آخر اور جانوروں کا گوشت بھی تو وہ کھاتا ہے
اور سورج نے تمام جانوروں اور ترکاریوں کو بھی تو بنایا ہے۔ سورج دیوتا جس جانور کے جسم میں چاہے حلول کر سکتا ہے۔
چنانچہ مصریوں کا اعتقاد تھا کہ اُن کا سورج دیوتا بیل کے جسم میں حلول کئے ہوئے ہے اور بابل اور یونان میں بیل کی جگہ
سانڈ کے جسم میں۔ مگر عیسائیوں نے بھیڑ کے بچے کو انتخاب کیا۔ آگے چل کر معلوم ہوگا کہ یہ انتخاب کیوں کیا گیا۔ (باقی آئندہ)

محمد خلیل الرحمن

شرلاک ہومز کا مرضِ موت

(فسانہ)

مسز ہڈسن (اُس مکان کی مالکہ جس کی بالائی منزل میں شرلاک ہومز سکونت رکھتا تھا) اس میں شک نہیں کہ اپنی غیر مطمئن زندگی کے لحاظ سے سخت بدقسمت عورت تھی کیونکہ ہومز کی بے اصول معاشرت، اس کے پاس ہر وقت بُرے بھلے لوگوں کی آمد و رفت، اور سب سے زیادہ خود ہومز کی مجنونانہ حرکتوں نے اسے پریشان کر رکھا تھا،

ہومز آدھی رات کو اُٹھتا اور موسیقی شروع کر دیتا، رات کو دو بجے بیدار ہوتا اور پستول کی مشق کرنے لگتا، کبھی ساری رات چھت پر زور زور سے ٹہلنے میں بسر کر دیتا، اور کبھی ساری شب وہ علمی تجربوں اور دوسرے ہنگامہ خیز مشاغل میں گزار دیتا۔ ظاہر ہے کہ مسز ہڈسن ان صورتوں میں نہ اطمینان سے سو سکتی تھی نہ سکون کیساتھ کوئی اور کام کر سکتی تھی، لیکن کچھ تو اس وجہ سے کہ ہومز سے اس کو مالی فائدہ بہت تھا اور کچھ اُس تعلق دیرینہ کیوجہ سے جو اتنے عرصہ کے قیام میں اس کے ساتھ پیدا ہو گیا تھا، وہ نہ صرف ان تمام تکلیفوں کو برداشت کرتی تھی بلکہ ہومز کی وہ بہت عزت کرتی تھی، اور اس سے متنفر ہونے کی بجائے اس کی زندگی پر اپنا دل دُکھاتی تھی۔

میری شادی کو دوسرا سال تھا اور میں اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا تھا کہ مسز ہڈسن دفعتہً گھبرائی ہوئی آئی اور بولی کہ "ڈاکٹر واٹسن، تمھارا دوست ہومز قریب مرگ ہے۔ تین دن سے اس کی حالت بدتر ہوتی جاتی ہے اور شاید ہی آج کا دن خیریت سے گزرے۔ میں نے بہت کہا لیکن وہ کسی طرح ڈاکٹر بلانے پر راضی نہیں ہوا، آج جب میں نے اس کی حالت زیادہ خراب دیکھی تو بولی کہ تم اجازت دو یا نہ دو میں تو جاتی ہوں اور کسی کو بُلا کے لاتی ہوں، یہ سنکر وہ بولا کہ اچھا واٹسن کو بلا لاؤ۔ اس لئے میں تمھارے پاس آئی ہوں اگر تم نے ایک گھنٹہ کی بھی دیر کی تو میں نہیں کہہ سکتی وہ تمھیں زندہ بھی ملیگا یا نہیں"

یہ سنکر میں گھبرا گیا، کیونکہ اس سے قبل ہومز کی علالت کا کوئی حال معلوم نہ ہوا تھا۔ میں نے فوراً کپڑے پہنے اور مسز ہڈسن کے ساتھ ہو لیا۔ راستہ میں میں نے اس سے زیادہ تفصیلی حالات معلوم کئے تو پتہ چلا کہ وہ دریا کے قریب کسی گندی گلی میں چند دن سے ایک معاملہ کا سراغ لگا رہا تھا کہ وہیں سے یہ بیماری لایا اور گزشتہ بدھ کی سہ پہر سے صاحب فراش ہے اس دوران میں اُس نے نہ غذا کی نہ پانی پیا اور حالت بدتر ہوتی جا رہی ہے۔

جس وقت میں ہومز کے کمرے میں پہونچا تو اس کی حالت دیکھکر مجھے سخت صدمہ ہوا، چہرہ اُترا ہوا تھا، ہونٹ خشک تھے

اور آنکھ اور رخسار سے بخار کی سرخی اور چمک نمایاں تھی، وہ مجھکو دیکھ کر نہایت ضعیف آواز سے بولا کہ "کیوں واٹس، آخر کار وقت اخیر آہی گیا"۔

میں اس کے قریب پہونچکر اس کی نبض دیکھنا چاہتا تھا کہ ہومز نے حد درجہ اضطراب کے ساتھ کہا کہ "خبردار میرے پاس نہ آنا" میں نے پوچھا "کیوں" اس نے جواب دیا کہ "میری خواہش یہی ہے اور کیا یہ وجہ کافی نہیں ہے"، میں کچھ دیر تک اس کی حالت کو دیکھ کر افسوس کرتا رہا اور پھر بولا کہ "ہومز، میں تمھارے علاج کے لئے آیا ہوں اور بیمار کی خواہش کوئی چیز نہیں ہوا کرتی"۔

ہومز۔ "لیکن میں تم کو تمھارے ہی فائدہ کی وجہ سے اپنے پاس نہیں آنے دیتا، کیونکہ جس مرض میں مبتلا ہوں وہ اُن قلیوں کی بیماری ہے جو جزیرہٗ سماترا سے پھیلی ہے اور یہ اس قدر سخت متعدی ہے کہ صرف چھونے سے دوسروں کو لگ جاتی ہے"۔

یہ سنکر میں نے کہا کہ "اگر یہ صحیح بھی ہو کہ چھونے سے بیماری لگ جاتی ہے تو بھی ہومز تم سمجھ سکتے ہو کہ تمھارے لئے میں اس کی کیا پروا کر سکتا ہوں" یہ کہکر میں پھر آگے بڑھا۔ لیکن اس مرتبہ ہومز نے بہت زیادہ برہمی کے ساتھ کہا کہ "اگر تم رہ سکتے ہو تو رہو، ورنہ چلے جاؤ"۔

میں ہومز کی اس قدر عزت کرتا تھا کہ کبھی اس کے حکم سے سرتابی نہیں کی، لیکن اب جبکہ وہ بیمار تھا اور اپنی حالت کا صحیح اندازہ نہ کر سکتا تھا، میں اپنے پیشہ کے فرایض کو شدت سے محسوس کرنے لگا اور ہومز کی اس برہمی کی پرواہ نہ کرکے بولا کہ "ہومز تم اسوقت حواس میں نہیں ہو، بیمار ہوکر آدمی بچہ ہوجاتا ہے۔ تم کچھ بھی کہو میں ضرور معائنہ کرکے تمھارا علاج کرونگا"۔

یہ سنکر اس نے خونخوار نگاہوں سے مجھے دیکھا اور بولا "اگر کسی ڈاکٹر کا علاج کرنا ضروری ہے تو پھر کوئی شخص ایسا ہونا چاہئے جسپر مجھے اعتماد ہو" میں نے جواب دیا "کیا مجھ پر اعتماد نہیں ہے"۔

ہومز۔ "تمھاری دوستی پر ضرور اعتماد ہے، لیکن واٹس، معاف کرنا، ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے میں تم پر بھروسہ نہیں کر سکتا"۔

یہ سنکر مجھے سخت تکلیف پہونچی لیکن میں نے اپنے آپ کو زیادہ متاثر نہیں ہونے دیا اور بولا کہ "اگر مجھ پر اعتماد نہیں ہے تو میں کوئی دخل نہ دونگا لیکن یہ تو اجازت دو کہ میں کسی اور ڈاکٹر کو لے آؤں۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ میں تمھیں مرتا ہوا دیکھوں اور خاموش بیٹھا رہوں"۔

ہومز۔ "تم کو میری گفتگو سے تکلیف پہونچی ہوگی لیکن میں تم پر تمھاری عدم واقفیت ظاہر کرنے کے لئے یہ سوال کرونگا کہ تم تپانلی بخار اور فارموسا کے امراض سیاہ کے بابت کیا علم رکھتے ہو؟"

"میں نے تو کبھی ان بیماریوں کا نام بھی نہیں سنا"۔

——— "واٹس، مشرق میں بہت سی عجیب وغریب بیماریاں ہیں جن کا علم مغرب کے ڈاکٹروں کو نہیں ہے۔ حال ہی میں ایک معا
کی تفتیش کے سلسلہ میں مجھے بہت سی ایسی بیماریوں کا نہ صرف علم ہوا ہے بلکہ انھیں میں سے ایک میں مبتلا بھی ہوگیا ہوں جس کا
علاج تم نہیں کر سکتے"۔

——— "اچھا تو میں ڈاکٹر انسٹری کو بلانے جاتا ہوں جو گرم ممالک کی بیماریوں کا اس وقت بہت بڑا ماہر سمجھا جاتا ہے"۔
یہ کہکر میں جانا ہی چاہتا تھا کہ ہومز نے شیر کی طرح جست کی اور فوراً دروازہ کے قفل میں کنجی لگاکر پھر بستر پر گر پڑا جیسے کوئی
گولی کھاکر پڑ جائے اور بولا کہ "میں جانتا ہوں تم میری بھلائی چاہتے ہو، لیکن جب تک میں اجازت نہ دوں تم نہ جاؤ اور
جس کو میں کہوں اسے بلا کے لاؤ۔ اب چار بجے ہیں، تم چھ بجے جاؤ اور اسوقت تک تم مجھے خاموش پڑا رہنے دو کیونکہ میں بہت
تھک گیا ہوں"۔

یہ کہکر وہ خاموش ہوگیا اور میں نے بھی ارادہ کر لیا کہ چھ بجے تک خاموشی کیساتھ انتظار کرونگا۔ چند منٹ تک میں اسکے
مضمحل وافسردہ چہرہ کو دیکھتا رہا اور یہ محسوس کرکے کہ شاید وہ سوگیا ہے، آہستہ آہستہ اٹھا تاکہ کمرے کے دیواروں میں
لٹکی ہوئی مجرموں کی تصاویر کو دیکھوں۔ اتفاقاً میری نگاہ ایک میز پر پڑی جہاں مختلف چیزیں منتشر حالت میں پڑی ہوئی
تھیں۔ انھیں میں ایک چھوٹا سا صندوقچہ ہاتھی دانت کا نظر آیا اور میں نے چاہا کہ اُسے اٹھاکر دیکھوں، لیکن میرا ہاتھ
طرف بڑھا ہی تھا کہ ہومز دفعتہً چیخ اُٹھا اور ایسی بھیانک آواز سے چیخا کہ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور جسوقت میں نے
اس کو پلٹ کر دیکھا تو سخت خوف مجھ پر طاری ہوا کیونکہ اس کے جسم کی رگیں کھنچی ہوئی تھیں چہرہ تمتمایا ہوا تھا، آنکھیں ابلی
تھیں صندوقچہ میرے ہاتھ میں دیکھتے ہی بولا کہ فوراً رکھدو، اسی لمحہ میں میز پر رکھدو میں نہیں چاہتا کہ کوئی شخص میری چیزوں
چھوئے، کیا تم مجھے پریشان کرنے آئے ہو"۔ یہ کہکر وہ پھر بستر پر پڑ گیا اور مجھے اس کے اس انداز سے سخت تکلیف پہونچی
لیکن پھر یہ خیال کرکے کہ یقیناً اس کا دماغ متاثر ہے اور بحرانی کیفیت اسپر طاری ہے خاموش ہوگیا۔
اب چھ بجنے میں کچھ منٹ باقی تھے کہ پھر اُس نے سلسلۂ گفتگو شروع کیا اور بولا کہ "مسٹر واٹس تمھاری جیب میں
کچھ ہے یا نہیں؟"۔

میں نے جواب دیا کہ "ہاں ہے"

——— "کوئی چاندی کا سکہ ہے"

——— "بہت ہیں"۔

——— "کتنے"

ـــــــــ پانچ"

بہت کم ہیں۔ خیر۔ تم چاندی کے سکے تو جیب گھڑی میں رکھ لو اور باقی خُردہ پتلون کی جیب میں تاکہ توازن درست ہو جائے" میں سمجھ گیا کہ وہ ہذیانی کیفیت میں مبتلا ہے اور اسی طرح بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا" گیس روشن کردو لیکن نصف۔ میرے پاس میز پر کاغذ اور خطوط رکھدو اور اسی صندوقچہ کو چمٹی سے پکڑ کر میرے قریب لے آؤ"

جب میں یہ کر چکا تو اُسنے میرا شکریہ ادا کیا اور کہا "اب تم جاؤ اور مسٹر کلورٹن اسمتھ کو جو ۱۳ لور برک اسٹریٹ میں رہتا ہے بلالاؤ"

میں اسکی ہذیانی حالت سے مایوس ہو گیا تھا اور سمجھتا تھا کہ اب کسی ڈاکٹر کا آنا بیکار ہوگا، لیکن یہ خیال کرکے کہ کیوں اسکی اس خواہش کو مسترد کیا جائے میں طیار ہو گیا۔ لیکن چونکہ میں اس شخص سے واقف نہ تھا اس لئے میں نے کہا کہ "میں نے تو یہ نام کسی ڈاکٹر کا نہیں سُنا ہے"

ہومز ـــــ "تمھارا یہ سننا ممکن ہے کیونکہ وہ شخص جو اس مرض کا ماہر ہے کوئی ڈاکٹر نہیں بلکہ ایک زراعت پیشہ شخص ہے۔ مسٹر کلورٹن اسمتھ، سماٹرا کے مشہور باشندوں میں سے ہے اور آج کل لندن میں مقیم ہے۔ اس کی رقبہ کاشت میں یہ مرض پھیلا اور اس کو کافی مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ وہ بڑا با اصول انسان ہے اور چونکہ چھ بجے سے قبل وہ نہیں ملسکتا تھا اسی لئے میں نے تمھیں اسوقت تک روکا۔ اگر تم اُسے کسی طرح یہاں تک لاسکو تو مجھے اُمید ہے کہ وہ میری مدد کر سکیگا"

ہومز کی ساری گفتگو کا خلاصہ یہ تھا ورنہ اس نے اس مدعا کو خدا جانے کس قدر ٹوٹے الفاظ میں سانس توڑ توڑ کر بیان کیا۔ گزشتہ چند گھنٹوں کے اندر ہی اس کی صورت بہت بدل گئی تھی۔ اس نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ "تم اُس سے صرف میری موجودہ کیفیت بیان کردو اور جس حال میں تم مجھے دیکھ رہے ہو وہ اس سے جاکر کہدو۔ ایک مرنے والے ہذیانی انسان کی جو حالت ہو سکتی ہے اس کا ذکر اس سے کردو۔ میری زندگی اس کے آنے پر منحصر ہے اس کو کسی نہ کسی طرح مجبور کرو کہ یہاں آجائے وہ مجھ سے برہم ہے۔ اُس کے بھتیجے کے معاملہ میں میری اُسکی مخالفت ہو گئی ہے۔ اس لئے وہ مجھ سے ضرور عداوت رکھتا ہوگا، تاہم اگر تم اُسے یہاں کسی طرح لاسکتے ہو تو میری جان بچ سکتی ہے ورنہ نہیں"

ـــــــ "میں ابھی جاتا ہوں اور گاڑی میں بٹھا کر لاتا ہوں"

ـــــــ "نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ یہاں آنے کا اقرار کریگا تو ضرور آئے گا اور پھر تم کوئی بہانہ کرکے وہاں سے چلے آنا، اس کو یہ نہ معلوم ہو کہ تم اس کے ساتھ آؤ گے"

میں اُس کی ہدایات سنکر نیچے اُترا اور یہاں اسکاٹ لینڈ یارڈ کا انسپکٹر مسٹر مارٹن سادہ لباس میں مجھے ملا۔ اُس نے ہومز کا حال مجھسے دریافت کیا اور میں نے اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ حالت بہت نازک ہے۔" اُس نے یہ سنکر خاص انداز سے مجھے دیکھا اور بولا کہ "ہاں میں نے بھی کچھ ایسا ہی سنا تھا۔" میں اس گفتگو کے بعد گاڑی میں بیٹھا اور روانہ ہوگیا۔

مسٹر کلورٹن مکان پر موجود تھا لیکن جسوقت اس کا ملازم میرا کارڈ لے گیا تو اُسنے اس قدر زور سے کہ میں بھی باہر سُن سکتا تھا دریافت کیا کہ "یہ کون شخص ہے وہ کیا چاہتا ہے۔ میں نے تم کو بارہا سمجھایا کہ مطالعہ کے اوقات میں حرج نہ کیا کرو۔ جاؤ کہدو کہ میں اسوقت نہیں مل سکتا، اگر واقعی اُسکو کوئی ضرورت ہے تو صبح آئے۔"

میں یہ سنکر سخت فکرمند ہوا اور ہومز کا بستر مرگ پر تڑپنا میرے سامنے آگیا، خادم یہ پیغام لیکر باہر آیا تھا کہ میں بغیر حصول اجازت اُس کو ایک طرف کرکے کمرہ کے اندر داخل ہوگیا۔

مجھکو دیکھتے ہی وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا اور بولا "اس کا کیا مطلب ہے۔ کیا میں نے تم سے ابھی نہیں کہلا بھیجا کہ کل ملنا"

——— میں نے جواب دیا کہ "اس مداخلت کی معافی چاہتا ہوں لیکن چونکہ معاملہ بہت اہم تھا اور مسٹر ہومز

——— "ہومز کا نام سنتے ہی اس کا غصہ فرو ہوگیا اور گھبرا کر بولا "کیوں ہومز کو کیا ہوگیا ہے" میں نے کہا کہ "وہ سخت بیمار ہے اور اسی لئے میں آپ کے پاس آیا ہوں"

اس نے ایک کرسی کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا کہ "مجھے یہ سنکر صدمہ ہوا۔ ہرچند میں ہومز کو کم جانتا ہوں صرف ایک معاملہ کے سلسلہ میں سرسری ملاقات ہوگئی تھی لیکن میں اس کی بہت عزت کرتا ہوں وہ تفتیش جرائم کا دلدادہ ہے اور میں تحقیق امراض کا"

——— "اسی لئے ہومز نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے اور اس کا خیال ہے کہ لندن میں صرف آپ ہی اس کی جان بچا سکتے ہیں"

یہ سنکر وہ چونکا اور بولا کہ "مسٹر ہومز نے یہ خیال کیوں قائم کیا کہ صرف میں ہی اس کی مدد کر سکتا ہوں"

——— "کیونکہ آپ مشرقی امراض کے ماہر ہیں"

——— "لیکن یہ اس نے کیونکر جانا کہ یہ بیماری مشرقی ہے"

"کیونکہ یہ بیماری اُسے اُن چینیوں کے درمیان رہنے سے ہوئی ہے جن کیساتھ وہ کسی جرم کی تحقیق میں کام کر رہا تھا"

یہ سنکر کلورٹن مسکرایا اور بولا "مجھے یقین ہے کہ اس کی بیماری زیادہ اہم نہ ہوگی۔ وہ کب سے بیمار ہے؟"

——— "تین دن سے"

——— "ہذیانی کیفیت تو ابھی پیدا نہیں ہوئی"

——— "ہوگئی ہے"

——— "تو صورت بہت نازک ہے اور مجھے جانا چاہئیے۔ اچھا تم باہر انتظار کرو میں ابھی آتا ہوں" چونکہ ہومز کی ہدایت مجھے یاد تھی اس لئے میں نے کہا کہ "مجھے اور ایک جگہ جانا ہے اس لئے آپ کے ساتھ نہیں جاسکتا"

اس نے یہ سنکر کہا کہ "اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس کے مکان سے واقف ہوں اور میں آدھ گھنٹے کے اندر وہاں پہونچ جاؤنگا"

جسوقت میں ہومز کے کمرہ میں داخل ہوا تو میرا دل ڈوبا جا رہا تھا کہ خدا جانے اسے کس حالت میں پاؤں۔ لیکن جب میں نے اُسے نسبتاً سکون کی حالت میں پایا تو مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ اس نے نہایت کمزور آواز میں دریافت کیا کہ کیوں واٹس ملاقات ہوئی"

——— "ہاں، وہ آرہا ہے"

——— "شاباش، واٹس، شاباش، اس نے پوچھا تھا کہ کیا بیماری ہے؟"

——— "ہاں اُسنے دریافت کیا اور میں نے جواب میں کہدیا کہ چینیوں کے ساتھ رہنے سے یہ بیماری لاحق ہوئی ہے"

——— "بیشک تم نے ٹھیک جواب دیا۔ اچھا اب تم جاسکتے ہو"

——— "لیکن میں انتظار کرونگا تاکہ اس کی رائے معلوم کروں"

——— "مگر میں چاہتا ہوں کہ وہ تنہا مجھے دیکھے اور آزادی کے ساتھ اپنی رائے دے اس لئے تم میرے سرہانے کے کمرہ میں چھپ جاؤ اور وہیں سے اس کی تشخیص سُن لینا"

یہ کہکر وہ اُٹھ بیٹھا اور گھبراکر بولا "واٹس خدا کے لئے جلدی چھپ جاؤ گاڑی کے پہیوں کی آواز آرہی ہے جلدی کرو اور کچھ بھی ہو تم نہایت خاموشی کے ساتھ سنتے رہے"

میں نے اس کے ارشاد کی تعمیل کی اور وہ پھر بستر پر گر پڑا۔ تھوڑی دیر بعد زینہ پر قدموں کی آواز آئی اور دروازہ کھُلا۔ مسٹر کلورٹن آکر ہومز کے سرہانے کھڑا ہوگیا تھوڑی دیر تک اس کی صورت دیکھتا رہا۔ اور پھر ہومز کا نام لیسکر پکارا جب وہ بولا تو جھنجھوڑ کر بولا "ہومز، کیا تم نہیں سنتے؟"

ہومز نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں اور بولا "آہ، مسٹر اسمتھ کیا تم ہو مجھے اُمید نہ تھی کہ تم آؤگے، بڑی مہربانی کی کیونکہ اس قسم کے امراض میں تمھاری قابلیت کا مجھے اعتراف ہے"

——"کیا تمھیں معلوم ہے کہ تم کیا بیمار ہو؟"

——"وہی بیماری ہے"

——"کیا تم علامات سے واقف ہو"

——"خوب واقف ہوں"

——"ہومز، مجھے تعجب نہیں ہے اگر تمھیں بھی وہی مرض ہو جو وکٹر کو ہو گیا تھا۔ وہ چوتھے دن مر گیا۔ حقیقتاً یہ امر بہت تعجب خیز تھا کہ لندن میں رہکر اسکو وہ مرض لاحق ہوا۔ لیکن اس سے زیادہ حیرت انگیز ہے کہ تم بھی اس مرض میں مبتلا ہو گئے"

——"لیکن اُس کی بیماری کا سبب تو تم تھے"

یہ سنکر کلورٹن مسکرایا اور بولا "تم اسے کس طرح ثابت کر سکتے ہو؟"

ہومز نے یہ سنکر کوئی جواب نہ دیا اور سراسیمگی کی حالت میں پانی مانگا۔ کلورٹن نے کہا "اے میرے دوست تمھارا وقت اخیر آرہا ہے لیکن چونکہ میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں اس لئے تمھیں پانی دئے دیتا ہوں تاکہ تم بغیر سُنے مر نہ جاؤ"

ہومز نے کہا کہ "مسٹر کلورٹن میرے لئے جو کچھ کر سکتے ہو کرو، تم مجھے اچھا کر دو میں قسم کھاکر کہتا ہوں کہ سب کچھ بھلا دونگا"

——"کیا بھلا دوگے"

——"وکٹر کی موت کو جس کے متعلق تم نے ابھی اقرار کیا کہ تمھیں اس کا باعث ہوئے تھے"

"تم بھلا دو یا یاد رکھو اب مجھ پر کچھ اثر اس کا نہیں ہو سکتا، کیونکہ تمھاری موت مجھے تمام اندیشوں سے آزاد کر دینے والی ہے۔ علاوہ اس کے یوں بھی اس وقت وکٹر کی موت کا سوال نہیں ہے بلکہ مسئلہ تمھاری موت کا پیش ہے اور اسی پر گفتگو ہونی چاہئے۔ یہ تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ یہ بیماری تمھیں چینی ملاحوں سے لگی" ہومز نے کہا کہ "میرا خیال ایسا ہی ہے"

وہ یہ سنکر ہنسا اور بولا کہ "تم کو اپنی عقل پر بڑا ناز ہے، لیکن یہ خبر نہ تھی کہ ہمکو ایسے شخص سے واسطہ پڑا ہے جو بہت زیادہ چالاک ہے۔ اچھا غور کرو۔ تمھیں کچھ خیال ہے کہ تم کیسے بیمار ہوئے"

ہومز نے کہا کہ "مجھے بالکل یاد نہیں نہ میرا دماغ اس وقت کام دیتا ہے، خدا کے لئے تمھیں بتاؤ" اسنے کہا کہ "جس دن اس مرض کی علامت تم کو لاحق ہوئیں، کوئی خاص واقعہ ہوا تھا"

——"نہیں، کچھ نہیں"

—— "پھر غور کرو"

—— "میں خیال کرنے کے قابل نہیں ہوں"

—— "اچھا تو میں بتاتا ہوں۔ کوئی چیز تمھیں ڈاک کے ذریعہ سے ملی تھی"

—— "ڈاک کے ذریعہ سے؟"

—— "ہاں، ہاں، کوئی صندوقچہ"

ہومز کی حالت اس وقت اور زیادہ بگڑ گئی اور اُس نے لڑکھڑاتی زبان سے کہا کہ "مجھے غش آرہا ہے، سنبھالو، میں مر رہا ہوں"

کلورٹن نے ہومز کو جھٹکا دیکر کہا کہ "سنو، تمھیں سننا پڑیگا جو میں کہ رہا ہوں۔ کیا تمھیں خیال نہیں ہے کہ بُدھ کے دن ایک صندوقچہ ہاتھی دانت کا تمھارے پاس آیا تھا اور تم نے اُسے کھولا تھا"

"ہاں، ہاں، مجھے یاد آیا۔ اس میں اندر کمانی لگی ہوئی تھی۔ یہی وہ صندوقچہ ہے جو میز پر رکھا ہوا ہے"

"بیشک یہی ہے اور اب دیکھو میری جیب میں جا رہا ہے تاکہ میرے خلاف شہادت میں پیش نہ ہوسکے اچھا تو ہومز سنو کہ یہ صندوقچہ میں نے ہی بھیجا تھا اور میں ہی تمھاری ہلاکت کا باعث ہوا ہوں۔ اب تم مر رہے ہو اور میں اپنا جی خوش کرنے کے لئے یہاں اسوقت تک انتظار کروں گا جب تک تمھاری سانس ختم نہ ہوجائے" چونکہ تم جانتے تھے کہ وکٹر کو میں نے ہی ہلاک کیا تھا اس لئے تمھارا ہلاک کرنا بھی ضروری ہوگیا تھا۔ اے میرے عزیز دوست بتاؤ کہ اب دم نزع تم مجھ سے کیا چاہتے ہو"

اس کے جواب میں ہومز نے دیاسلائی اور سگریٹ طلب کیا۔ اور میں یہ سنکر خوشی کے مارے بے چین ہوگیا۔ کیونکہ ہومز اب اپنی اصلی آواز سے بول رہا تھا گو اس میں ضعف ضرور تھا۔

کلورٹن متعجب ہوکر کھڑا ہوگیا اور بولا "اس کا کیا مطلب ہے" ہومز نے جواب دیا کہ "نقل کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انسان اصل سے قریب تر ہوجائے، میں قسم کھاکر کہتا ہوں کہ تین دن سے میں نے نہ کچھ کھایا تھا نہ پیا تھا اور سب سے پہلے تمھیں نے مجھے پانی کا گلاس دیا۔ سگریٹ کے لئے میں بہت بیتاب تھا، سو اب وہ بھی مجھے مل گیا"

یہ کہکر اُس نے میز سے سگریٹ لیا اور دیاسلائی سے روشن کرکے پینے لگا۔ اس کے بعد ہی دروازہ کھلا اور انسپکٹر مارٹن اندر داخل ہوا، ہومز نے کہا کہ "لیجئے اپنے مجرم کو سنبھالئے، یہاں حاضر ہے"

مارٹن کلورٹن کی طرف مخاطب ہوا اور بولا کہ "میں تم کو وکٹر کے قتل کرنے کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں" یہ کہکر اُسنے

ہاتوں یں ہتکڑی ڈالدی، اور ہومز نے مجھسے مخاطب ہوکر کہا کہ "مسٹر واٹسن، میں تم سے معافی مانگتا ہوں اگر تمھیں میری کسی بات سے تکلیف پہونچی ہو، میں جانتا تھا کہ اگر حقیقتاً بیماری کی پوری کیفیت اپنے اوپر طاری نہ کروں گا تو نہ مسز ہڈسن کو متاثر کرسکونگا اور نہ تمھیں۔ میں جانتا ہوں کہ ڈاکٹری کے فن میں تم ماہر ہو لیکن میں نے قصداً تمھاری توہین کی تاکہ تم میرا علاج نہ کرو اور میں تمھارے ذریعہ سے مسٹر کلورٹن کو بلاؤں، جس نے مجھے بیمار ڈالنے اور ہلاک کرنے کے لئے وہ صندوقچہ بھیجا تھا جسکے چھونے سے میں نے تمھیں باز رکھا تھا۔ اس کے اندر کمانی ہے جو ڈھکنے کو زور سے کھولتی ہے اور اندر کے جراثیم سانس کے ذریعہ سے جسم میں داخل ہوجاتے ہیں۔ اس نے اپنے بھتیجہ کو بھی اسی طرح ہلاک کیا اور مجھے بھی ہلاک کرنا چاہتا تھا، لیکن شکر ہے کہ وہ اپنے مقصد میں ناکامیاب ہوا، اور میں اس کی گرفتاری اور خود اس کے منھ سے اقرار جرم کرانے میں کامیاب ہوا۔ میں جانتا تھا کہ اس کی نفطرت بڑی انتقام جو ہے، اور یہ یقیناً میری بیماری کا حال سنکر آئے گا اور مجھے مرتا ہوا دیکھکر خوش ہوگا، چنانچہ میرا خیال صحیح نکلا اور مسٹر کلورٹن یہاں تشریف لائے اور خود ہی نہایت آزادی سے اعتراف جرم کرلیا جس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔"

یہ سنکر میں نے حیرت سے پوچھا کہ "خیر یہ تو سب کچھ ہوا لیکن تم نے اپنی صورت کیسے مریضوں کیطرح بنالی۔"

یہ سنکر وہ ہنسا اور بولا کہ "کیا تین دن کا فاقہ کرنے کے بعد انسان کے چہرہ پر رونق آجاتی ہے۔ رہا پیشانی کا پسینہ، آنکھ کی سرخی، لبوں کی پپڑی، سو یہ کوئی ایسی مشکل بات نہیں، ذرا سا ویسلین ماتھے پر، بلاڈونا کا ایک قطرہ آنکھ میں اور تھوڑا موم لبوں پر کافی تھا۔ میں تم کو اپنے پاس اسی لئے نہ آنے دیتا تھا کہ اگر تم نے میری نبض دیکھ لی تو معلوم کرلوگے کہ اچھا خاصہ ہوں اور پھر میرا سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا۔"

یہ کہکر ہومز نے میرا ہات پکڑا اور کلورٹن کو پولیس کی حراست میں چھوڑکر میرے ساتھ گھر روانہ ہوگیا۔"

نیاز فتحپوری

قسطاس مستقیم

(غالب و ذوق پر ایک محاکمہ)

میرس وجہ سواد سفینہا غالب		سخن بمرگ سخن رس سیہ پوش آمد

خوش طالعی سے اگلے دسمبر کی تعطیلات میں اپنے ایک مخلص کے یہاں جا نکلا۔ موصوف چونکہ علم دوست ہیں اور اردو ادبیات سے ایک خاص دلچسپی رکھتے ہیں وقت گزارنے کی غرض سے نگار کی کاپیاں اُٹھا لائے، اتفاق سے جریدہ ستمبر ہی کا ہاتھ آیا سرورق الٹتے ہی پہلی نظر "غالب کی ذہنیت" پر پڑی مضمون بہ سلسلہ ماسبق نظر آیا۔ بحکم ضرورت اور بوجہ اشتیاق اگست نمبر بھی نکالا۔ پورے مضمون کو شروع سے آخر تک مطالعہ کیا بے ربطیاں نظر آئیں اپنے دوست کو بتائیں اُنھوں نے فرمایا اسکا جواب بھی دسمبر کے پرچے میں آگیا ہے اُس تبصرے کو بھی بالاستیعاب دیکھا، مگر وہی حال اُسکا بھی پایا۔ اس میں شک نہیں کہ دونوں مضامین ایک نقطے پر ضرور متحد تھے یعنی ایک ذوق کی طرفداری اور غالب کے رشک میں اور دوسرا غالب پرستی میں کوتاہی وقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور ساتھ ہی اپنی بے مائگی کو محسوس کرتے ہوئے اُس اہتم بالشان موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے پس وپیش ہوا مگر، (ع) "بیداد تواں دید وستمگر نتوان گفت"، دل نہ مانا لکھنے بیٹھ گیا۔ اگر قارئین عالی مقدار اس کے مطالعہ کے وقت ماہ اگست، ستمبر، دسمبر کی نگار کی جلدیں پیش نظر رکھ لیں تو اُمید ہے کہ استفہام میں آسانی ہو۔ اور یہ تو اس محل پر کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ جب تک مضمون کو مکمل نہ دیکھ لیں راقم کو مورد تحسین ومستوجب نفرین نہ تصور فرمائیں۔" "حضرت زور فرماتے ہیں:"

"مغربی اصول تنقید کی روشنی میں اردو شاعری پر نظر ڈالی جائے تو سب سے پہلے جس کا فقدان نظر آئے گا وہ پیغام خاص (message) ہے..... اس کے دبستان صرف زبان سے متعلق رہے تصنیف مصنف کی زندگی کا آئینہ ہوتی ہے۔ ہر مصنف یا شاعر کی ہستی اس کے کلام میں اسکی شخصیت کی خصوصیات کو جگہ جگہ نمودار کئے بغیر نہیں رہ سکتی..... قلب کی گہرائیوں میں جو رموز واسرار مضمر ہیں انکی تصویر کشی کے لئے جن نگونگی ضرورت ہے ان کا دوسروں کو میسر آنا دشوار ہے"

میر تقی کا قنوط۔ حالی کا قومی جذبہ انکی تمام مصنفات میں جلوہ گر رہتا ہے۔ اقبال کا اسلامی درد کئی کئی طریقوں سے اُن کے شعروں میں اپنی جھلکیں دکھاتا ہے۔ اکبر کی رجائیت شگفتگی اور ظرافت مزاجی سے اُنکا سارا کلام منور

نظر آتا ہے۔ پس ضرورت ہے کہ غالب کے کلام سے بھی اُن کی ذہنیت کا پتہ چلایا جائے "۔

جناب زور کو فقدان پیغام خاص اردو شاعری میں نظر آیا اور تھوڑی ہی دور چلکر میر تقی کا قنوط، حالی کا قومی جذبہ تمام مصنفات میں اقبال کا اسلامی درد اور اکبر کی رجائیت بھی سارے کلام میں پائی جانے لگی کیا یہ اسلامی درد، قومی جذبہ پیغام خاص نہیں ہیں ؟ ہاں اب زور صاحب شاید تاویل یہ فرمائیں کہ فقدان سے فقدان کلی مقصود نہیں ہے۔ ہم اس میں بھی خوش ہیں کہ چلو اردو شاعری کا یہ داغ تو مٹا مگر یہ کہنے سے زور صاحب کا دوسرا پہلو ضعیف ہو گیا کلیہ ٹوٹ گیا۔ اور جب کلیہ ٹوٹ گیا تو یا تو اکثریت رہی یا اقصریت پس اشتباہ رہ گیا ہوا کہ ممکن ہے غالب مرحوم کا کلام بھی ایسا ہو کہ جسمیں پیغام خاص کا فقدان ہو۔ اور ان کی ذہنیت کا پتہ نہ لگ سکے " اسوقت ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں ہے کہ آیا پیغام خاص شاعری کا جز و لازمی ہے یا نہیں۔ اس کا ذکر اپنے موقع پر کیا جائیگا۔ اب موصوف کے دوسرے قول کو لیجئے "تصنیف مصنف کی زندگی کا آئینہ ہے " یہ بھی کلیہ نہیں ہو سکتا واقعات بتاتے ہیں کہ بہت کم ایسے مصنف ہیں جنکی تصانیف سے انکی زندگی کے تین چوتھائی حالات بھی صحیح صحیح دریافت ہوئے ہوں۔ اس قول کی صداقت اور حقیقت تصنیف کی نوعیت سے وابستہ ہے اگر کوئی تصنیف خاص اس غرض سے بھی مصنف نے لکھی ہو تو بھی اس کی صداقت تامہ میں تو کلام ہی رہتا ہے۔ ممکن ہے کہ مصنف نے بہت سی باتوں کا شرم کیوجہ سے یا کسی اور مصلحت سے اخفا کیا ہو بہت کچھ رنگ آمیزی کی ہو۔ ہاں اکثر باتوں کا اس سے پتہ چل جاتا ہے۔ لیکن زندگی کا آئینہ تو وہ بھی نہیں۔ دور کیوں جاؤ، ہندوستانی سلاطین میں سے اکثر نے سوانح اور تزک خود لکھے ہیں کیا ایک نقاد مورخ بجنسہ اُنھیں تسلیم کر سکتا ہے ؟ ہرگز نہیں۔ اگر خارجی تصنیفات سے مصنف کی زندگی کی پتہ لگایا جائے تو اس کے واسطے مصنف کی تصانیف کی کثرت اور ضخامت شرط ہے بہت کچھ رطب یابس کے بعد اور دنوں کی دیدہ ریزی کے آخر میں کہیں ایک نقطۂ مقصود حاصل ہوتا ہے جو کسی خاص بیساختگی کے عالم میں اسکی قلم سے ٹپک پڑتا ہے۔ اور ایک صحیح واقعۂ زندگی معلوم کرنے میں بیحد جانکاہی کرنی پڑتی ہے۔ ہاں اگر تصنیف کوئی ضمیمی تصنیف ہے اور اس کی نوعیت خطوط و مکاتیب وغیرہ سے ہے تو البتہ وہ اُس کے دلی راز کی حامل بوجہ احسن ہو سکتی ہے۔ اب زور صاحب ہی فرمائیں کہ بغیر ان رنگوں کے رشک کی تصویر کسقدر بے رنگ رہتی ہے۔ ستم ہے کہ محض ادعائے شاعرانہ کو واقعیت سے تعبیر کر لیا جائے۔ اگر عود ہندی، اردوے معلیٰ وغیرہ سے اس قسم کا استدلال کیا جاتا تو بیشک بہت کچھ قابل تسلیم ہوتا "۔

"جناب موصوف آگے چلکر فرماتے ہیں" مرزا غالب اگرچہ ایک آزاد شاعر تھے پھر بھی وہ اردو کے شاعر تھے اور وہ جسکی شاعری میں متذکرہ بالا (عاشقانہ) مضامین جز و لاینفک کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی خوددار طبیعت

کبھی گوارا نہ کرتی تھی کہ وہ شاعروں میں اپنے ہم فنوں سے کم رتبہ خیال کئے جائیں اور ان کی شاعری کم از کم اُن کے دوست واحباب کی ستائش بھی اُن کے لئے حاصل نہ کر سکے...... اُنھوں نے بھی ان مضامین میں شعر لکھے اپنے مخصوص طرز ادا کے ذریعے ان میں چار چاند لگائے یہی وہ صنف ہے جس کے اشعار کلام غالب میں کثرت سے پائے جاتے ہیں اور خصوصاً اس کلام میں جو اُن کی ابتدائی شاعری کی پیداوار ہے۔ اور جس کا بہت کچھ حصہ اُنھوں نے "ایں دفتر پارینہ غرق مے ناب اولیٰ کے بہ مصداق اپنے دیوان کا انتخاب کرتے وقت نکال باہر کیا تھا"

بیشک مرزا خود دار شاعر تھے آزاد مرد تھے اور ان کی کیا کسی کی بھی طبیعت گوارا نہیں کرتی کہ وہ شاعروں میں اپنے ہمنفوں سے کم رتبہ خیال کیا جائے، لیکن کلام اس میں ہے کہ جسکو چار چاند لگائے ہوں اُس کو یوں نکال باہر کریں شاعر کے مضامین اس کے فرزندان معنوی ہیں۔ کیونکر کوئی گوارا کریگا کہ اپنے لخت جگر کے گلے پر یوں بیدریغ چھری پھیر دے۔ اپنی توسمجھ میں نہیں آتا کہ جناب کا ماخذ کیا ہے۔ اور اگر صرف وجہ مضامین کا کہنہ ہوجاتا ہے تو کوئی دفتر پارینہ غرق کرنے کے قابل نہیں ہوتا جو وہ تقویم پارینہ خیال کرکے نکال ڈالتے۔ ابتدائی عمر کا کلام تو غالب کا وہ ہے جس کے اوراق کو اُنھوں نے یک قلم باستثنائے معدودے چند اشعار چاک کرڈالا اور اس کے واسطے خود بخیال غالب اگر این دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ کہا جاتا تو بھی بیجا نہیں تھا۔ مرزا عود ہندی میں اپنے ایک شاگرد شاکر کو تحریر فرماتے ہیں "۲۵ برس کی عمر میں دس برس کے عرصے میں ایک بہت بڑا دیوان جمع ہوگیا۔ جب تمیز آئی اس دیوان کو دور کیا اوراق کو یک قلم چاک کیا دس پندرہ شعر واسطے نمونہ کے دیوان حال میں رہنے دئے بیدل کے طرز کے اشعار بھی اسی دفتر بے معنی میں مشمول تھے۔ مصنف۔ کا یہ کہنا اور آنجناب کا یہ کہنا کہ غالب کی دوسری قسم کے اشعار وہ ہیں جن کو اُنھوں نے مرزا بیدل و میر تقی کی شاعری کی تقلید میں اور ان کے خیال کی تشریح کی طور پر لکھا تھا" حیران ہوں کہ کسے تسلیم کروں ؎

کارے عجب افتاد بدین شیفتہ مارا　　　مومن نبود غالبؔ و کافر نتوان گفت

یہ تمام تو محض تمہیدی مضامین تھے۔ اب اصل موضوع کے متعلق بھی چند اقتباسات ملاحظہ ہوں ؎

فروختیم متاع سخن بریں فریاد　　　کہ مژدہ بادشناسندگان کالا را

فرماتے ہیں "غالب کی ذہنیت رشک کی طرف بہت زیادہ مائل تھی، وہ رشک کو اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے۔ اور نہ صرف اپنا بلکہ انکا خیال تھا کہ ہر عاشق مزاج کے لئے رشک لازمی ہے"...... لیکن اسمیں شک نہیں کہ مرزا غالب کے لئے یہ ایک غیر معمولی بات ضرور تھی کہ وہ ذوق کو اس قدر مرتبہ حاصل کرتے ہوئے دیکھتے اسی ذوق کو جو انکے خسر نواب الٰہی بخش خان کے دست کرم کے ممنون منت تھے" صرف یہی نہیں مرزا غالب کا غرور خودداری

مقتضی تھا کہ وہ ذوق کو اپنے سے کم لیاقت اور کم فہم سمجھتے تھے۔ ان کو فخر تھا کہ میں میر کا معتقد اور مقلد ہوں اور
برخلاف اس کے ذوق جبکہ ایک صحبت میں انھوں نے مرزا سے کہا تھا "سودائی ہے" (نقل کفر کفر نباشد ایزدی)
بہت ممکن ہے کہ غالب نے طنزاً اور رشک کے سبب ناسخ کے اس خیال کو اپنا عقیدہ قرار دیا ہو۔ غرض مرزا
غالب شیخ کو کم لیاقت ہی نہیں بلکہ سودا کا معتقد ہونے کی حیثیت سے بزعم خود بدمذاق بھی سمجھتے ہونگے"

ہرزہ مشتاب و پےِ جادہ شناساں بردار

نہ کوئی واقعیت نہ کوئی سند کیونکر باور کرلیا جائے۔ الہام ہو تو ہو مگر الہامی کلام میں بھی اگر تصمم اور استواری نہو تو کون
باور کرے۔ اور پر جناب فرماتے ہیں مرزا کے لئے یہ غیر معمولی بات ضرور تھی کہ وہ ذوق کو اتنا مرتبہ حاصل کرتے ہوئے دیکھتے۔
جناب والا پر واضح ہو کہ نواب الٰہی بخش خاں مرحوم و مغفور کی اور شیخ کی پہلی ملاقات اسوقت ہوئی ہے جبکہ وہ انیس برس
کے تھے ظفر مرحوم کے استاد ہو ہی چکے تھے۔ ملک الشعراء خاقانی ہند کا خطاب اکبر شاہ کے دربار سے مرحمت ہو ہی چکا تھا اور
شہرۂ شاعری بھی اس اثناء میں دور دور پھیل چکا تھا اور ذوق مرحوم کا مرہون منت نواب ہونا کوئی عیب بھی نہ تھا۔
اس حال میں کہ نواب موصوف کے استاد تھے۔ پھر بیچارے غالب کی بنائے رشک یہ تو نہیں ٹھہر سکتی جو آپ نے فرمائی کہ
کہ مرزا سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ع

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

اچھا ایک اور بھی لطف دیکھئے، غالب مرحوم کی اسوقت شادی و نسبت الٰہی بخش مرحوم کے یہاں نہیں ہوئی تھی۔
مرزا آگرے میں تھے اور فقط گیارہ برس کے تھے اُن کی بساط کیا تھی جو اسوقت میں ملک الشعراء خاقانی ہند کے مقابلے میں
آتے اور رشک بھی کرتے جبکہ خود بقول مرزا پندرھویں برس میں جاکر انھوں نے شاعری شروع کی تھی سنداس کلام کی یہ ہو کہ مرزا
۱۲۱۲ھ میں تولد ہوئے اور ذوق ۱۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۹ برس کی عمر میں استاد ظفر ملک الشعراء اور خاقانی ہند
سب کچھ ہو گئے، پس معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کی بنائے رشک ازلی ہی تھی۔ اور رحم مادر ہی میں رشک کرنے لگے تھے، اور الٰہی بخش خان
مرحوم کے یہاں رشتہ بھی عالم ارواح میں ہو گیا تھا۔

دیگر یہ کہ جناب زور صاحب نے یہ لطیفہ تو سن لیا کہ "سودائی تھا" لیکن یہ نہیں دیکھا کہ ناسخ غالب اور میر صاحب جیسا نقاد
خود مرزا سودا کے متعلق کیا رائے رکھتا تھا۔ سودا کے باب میں ناسخ نے کہا ہے ؎

کب ہماری فکر سے ہوتا ہے سودا کا جواب ؎ ہاں تتبع کرتے ہیں ناسخ ہم اس مغفور کا ؎

غالب نے شاہ عالم اور چودھری عبدالغفور کے رقعہ میں جو رائے ظاہر کی ہے وہ آپ عود ہندی میں دیکھ سکتے ہیں

اشارہ کیا ہے ؎

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے — تمھیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے
ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا — وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

بہادر شاہ کے شکریہ میں ؎

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا — وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

ایک جگہ کہتے ہیں ؎

خانہ زاد اور مرید اور مداح — تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار
بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر — نسبتیں ہو گئیں مشخص چار

لیکن اس سے انکی وضعداری پر کوئی حرف نہیں آتا۔ وہ حفظ اعزاز خاندانی پر مرتے تھے سو اس کی نوبت ہی نہیں آئی جو کوئی بدمزگی اور بیگانگی پیدا ہوتی۔ بادشاہ انھیں بقول اُن کے اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے" اور بقول حالی مرحوم، مرحوم بہادر شاہ نے اپنی حیثیت کے موافق انکی خاصی قدر کی" مجھے انکی وضعداری حفظ اعزاز خاندانی اور علو ہمتی میں مطلق کوئی کلام نہیں ہے مگر گفتگو اس میں ہے کہ اشعار" مستانہ طے کروں الخ" "ڈھونڈھے ہے الخ" (ملاحظہ ہو نگار دسمبر صفحہ ۱۵) سے بھی بغیر تاویل کا ثبوت بہم پہنچ سکتا ہے یا نہیں اگر آپ ایسی ہی مبہم اور ذو جہتین اشعار سے اسی طرح استدلال کریں گے تو پھر کسی شاعر کو بھی مستثنیٰ نہیں کر سکتے۔ جناب عزیز فرماتے ہیں کہ" ذوق کے یہاں لمبی لمبی غزلیں ہیں، عامیانہ اور سوقیانہ مضامین ہیں خیالات زبان کے پابند ہیں تراکیب سُست بندشین کمزور اور مضامین نہایت ہی بے نمک ہیں صحت زبان کا ضرور خیال رکھا جاتا ہے مگر اس کی ذرا پروا نہیں کیجاتی کہ خیال کی حیثیت کتنی بلند ہے۔"

دوسری جگہ آپ فرماتے ہیں" بلاشبہ ذوق بدقسمتی سے شاعری کے باب میں کچھ بدمذاق ہی واقع ہوئے تھے۔ وہ عالم ضرور تھے قادر الکلام ضرور تھے۔ بہت بڑے قصیدہ گو تھے لیکن شاعر نہ تھے اور یقیناً نہیں تھے۔ مرزا کا انکے حق میں جو فیصلہ تھا وہ یقیناً درست اور صحیح تھا" فغانی نے خوب کہا ہے۔ ؎

این گواہی بس کہ حاسد میکند انکار من

حیرت کا مقام ہے کہ تراکیب سُست اور بندشین کمزور بھی ہو گئیں اور آگے جاکر ذوق قادر الکلام بھی کہدیے گئے اور اعلیٰ درجے کے قصیدہ گو بھی ہو گئے گویا قصیدہ گوئی شاعری نہیں ہے۔ کیا خاقانی شاعر نہیں تھے ظہیر فاریابی۔ سلمان ساوجی شاعر نہیں تھے۔ انوری۔ عرفی خاقانی شاعر نہیں تھے اور مرزا غالب خود جنھیں سب سے زیادہ اپنے قصائد فارسی

پر ناز تھا اور کہا کرتے تھے کہ جن قصائد پر مجھے ناز ہے وہ کوئی پڑھتا بھی نہیں۔ شاعر نہیں تھے۔ ماشاءاللہ ؎

ایکہ مجموعۂ خوبی چہ نامت خوانم

باستثنائے مرزا غالب یہ تمام شعراء اہل ایران کے مسلم الثبوت قصیدہ گو ہیں اور شاعری کے رکن رکین ہیں (مرزا کی معلوم نہیں کہ اہل ایران قصیدے میں انھیں کیا کہتے ہیں۔ میری ذاتی رائے یہی ہے کہ مرزا کے قصائد پر ان کو ناز بیجا نہیں ہے اور ہم طرح قصائد دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عرفی سے ٹکر کھاتے ہیں) پھر بھلا کیونکر ہوسکتا ہے کہ ذوق جیسے بڑے قصیدہ گو کہے جائیں اور بہت بڑے شاعر نہ مانے جائیں ؎

چو بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست

عزیز صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ مرزا کا فیصلہ اُن کے حق میں یقیناً حق بجانب تھا اور آزاد صاحب نے بھی نہ معلوم اسے کیسے صحیح سمجھا نہ کوئی واقعہ نہ حکایت نہ روایت کوئی گواہ نہیں، کوئی شہادت نہیں ایک استدلال تو یہ مصرع ہے کہ "آنچہ در گفتار فخر تست آن ننگ منست" اور دوسرا ثبوت سہرے کا ایک مقطع "ہم سخن فہم ہیں الخ" پہلے مصرع کے متعلق آزاد اور عالی متفقہ طور سے کلمہ احتمال اور ماضی احتمالی استعمال کرتے ہیں کہ "شیخ ابراہیم ذوق جن کی نسبت مشہور ہے کہ مرزا کو اُن سے چشمک تھی ......" اور بعض اشخاص کا قول ہے ......" اور مقطع کی نسبت کیا آپ غالب کی زبان کا بھی اعتبار نہیں کرتے ان کی نیک نہادی سے اتنی بھی اُمید نہیں۔ میر مہدی کے خط کے اقتباس میں غالب کی رائے، ذوق مرحوم کے متعلق صاف صاف الفاظ میں بغیر تاویل کے لکھدی گئی ہے علاوہ اس کے یہ اشعار فارسی ملاحظہ ہوں:-

فارسی بین تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ منست

راست می گویم من و از راست نتوان سر کشید آنچہ در گفتار فخر تست آن ننگ منست

ہاں من دایزد بنائے شکوہ بر بیہودہ فاست تا نہ پنداری بہ پرخاش تو آہنگ منست

اگر روئے سخن ذوق کی طرف ہو تو بھی اس سے غالب کی معذرت اپنے اردو کلام کے متعلق ظاہر ہے۔ (باقی)

عشرت علی (ایزدی)

کہ آیا وہ اُن کو خوش مزاج خیال کرتے تھے یا بد مذاق تصور فرماتے تھے۔ میر کی راے اس سے بڑھکر اور کیا ہو سکتی ہے ؎

اے میر مجھیو مت مجذوب کو اوروں سا		ہے وہ خلف سودا اور اہل ہنر بھی ہو

علاوہ ازیں اور بھی جا بجا میر صاحب نے مرزا رفیع کی شاعری کا اعتراف کیا ہے۔ پھر مرزا بھی ایسے بد مذاق نہیں تھے جو ذوق کو ناحق بد مذاق کہدیتے۔ ہرگز وہ اُنھیں کم لیاقت نہیں خیال کرتے تھے اس لطیفہ میں محض جودت طبع مرزا کو دکھلانی منظور تھی مزاحاً کہدیا تھا۔ اگر اس مشہور قطعہ کو جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ذوق کی طرف روئے سخن کرکے لکھا گیا تھا ایسا ہی تسلیم کیا جائے تو اس میں بھی آگے چلکر یہ شعر موجود ہے ؎

ہاں من وایزد بنائے شکوہ بر مہر و وفاست		تانہ پنداری بہ پرخاش تو آہنگ منست

شاید اب بھی رفع اشتباہ نہوا ہو تو خود غالب کے الفاظ ملاحظہ ہوں میر مہدی کو لکھتے ہیں۔

"او میاں سید زادہ آزادہ دلی کے عاشق دلدادہ۔ ڈھئے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے حسد سے لکھنؤ کے برا کہنے والے نہ دل میں مہر و آزرم نہ آنکھوں میں حیا و شرم۔ نظام الدین ممنون کہاں، ذوق کہاں، مومن کہاں ایک آزردہ سو خاموش دوسرا غالب سو بیخود و مدہوش نہ سخنوری رہی نہ سخندانی، کس برتے تتا پانی"

گویا بزم سخن کی رونق ہی ان اشخاص کے دم سے سمجھتے تھے

پھر زور صاحب لکھتے ہیں " غالب کی زندگی اور شاعری ان دونوں سے کافی ثبوت ملتا ہے کہ وہ حد درجہ عالی ہمت اور آزاد رو تھے۔ اور چوتھا اور سب سے بڑا سبب جسکے باعث غالب میں رشک کو مستقل حیثیت حاصل ہو گئی انکی خودداری عالی ہمتی اور آزادہ روی ہے اور یہ تینوں رشک کی طرف فطرتاً رہبری کرتے ہیں"

"غالب کی عالی ہمتی اور بلند نظری اور دوسروں پر خود کو ترجیح دینا اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ سوائے اپنے اور خدا کے اور کسی ہستی کا قائل ہونا ہی نہیں چاہتے اور نہ صرف یہی بلکہ آگے چلکر خود اپنی ہستی کو بھی نظر انداز کر جاتے ہیں"

خوشا راہبر چشم بد دور از دو

مجھے تو یہ سبب بہت ضعیف نظر آتا ہے کیونکہ آزادی اور عالی ہمتی کا نتیجہ رشک کبھی نہیں ہو سکتا بیشک ملکات رذیلہ سے ہے اور عالی ہمتی کے ساتھ کیونکر مجتمع ہو سکتا ہے۔ رشک پست ہمتوں کا کام ہے تنگ نظروں کا کام ہے نہ کہ بلند حوصلہ آزادوں کا دوسروں پر خود کو ترجیح دینا بھی کوتاہ بینی ہے اور اپنے کو دور کھینچنا حد درجے کی تنگ نظری۔ دونوں کی انتہا کوتاہ ہمتی ہے نہ کہ علو ہمتی۔ زور صاحب نے غالب کو بر بناء رشک ہمتی سے صرف علم تک پہونچایا ہم تو توقع زیادہ رکھتے تھے۔

اس صوفی ماوراء النہری کو تنگ نظر دہریہ کہتے ہی تھے۔ آپ نے غالب کی علو ہمتی اور اس کے نتیجے رشک کو کیوں محدود کر دیا وحدت کا وجود کا بھی قائل کیوں رکھا۔ خاکم بہ فرق بے تکلف لاموجود الا غالب کہدیتے اور سند میں خود اس کا یہ شعر پیش کر سکتے تھے:۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادہر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

خدا کا شکر ہے کہ یہاں کچھ یونہی سا پتہ تو چلا کہ جناب کی رائے میں مغالطے کا احتمال ہے یعنی رشک کے مضمون محض شاعری کی غرض سے بھی باندھے جاتے ہیں اور ممکن ہے کہ غالب نے بھی اسی وجہ سے باندھے ہوں۔"

اب حضرت عزیز کی رائے بھی ناظرین کے سامنے پیش کیجاتی ہے (ملاحظہ ہو نگار ماہ دسمبر ۱۹۲۶ء) ایجاز کے طور پر چند اقتباس درج کرتا ہوں ع باید ز حرف بعض حریفاں شناختن۔" آپ فرماتے ہیں "اگر غالب مرحوم کی دربار سے بیگانگی کے تحت میں یہ جذبہ (وضعداری) کارفرما ہو تو آپ کو (زور صاحب کو) اس کے تسلیم کرنے میں دقت پیش آتی ہے۔؟"

—— زور صاحب کو اس میں دقت پیش آئے یا نہ آئے مجھے اس میں قطعی کلام ہے۔ اردو شعرا کا اسوۂ حسنہ دیکھکر کیونکر مرزا کے بھی طرز عمل کو اسپر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ کوئی چیز مجبور نہیں کرتی کہ خواہ مخواہ تسلیم کیا جائے۔ کوئی بدیہی امر نہیں کوئی قانون قدرت نہیں کہ شعرائے اردو دربار سے بیگانہ ہی رہیں۔ اگر آپ میر، سودا، آتش و ناسخ کی معدودے چند مثالیں اس باب میں پیش کر سکتے ہیں تو دوسری طرف انشاء، جرأت، مصحفی، ذوق، امیر، داغ وغیرہم کے اسوۂ سیئہ کی نظائر موجود ہیں، میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ غالب کو ان پر قیاس فرمائیں۔ یہاں آپ کو استدلال میں صریح مغالطہ ہوا۔ قیاس پر کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا جس واقعہ سے جناب نے استدلال کرنا چاہا ہے بالکل بے سود ہے، بے محل ہے، بے ضرورت ہے کہاں کالج کا ایک پرنسپل کہاں شاہی دربار۔ ہاتھی مٹ گیا تب بھی ہزار کا ہے۔ بہادر شاہ بہادر شاہ تھے مرزا مسٹر ٹامسن کو محض ایک اہلکار سرکار خیال کرتے تھے۔ خود نواب زادے تھے۔ عمائدین شہر سے تھے، مغربی رسوم سے واقف نہیں تھے چلے گئے۔ اگر ایسی ہی آن بان دربار شاہی میں ہوتی تو کوئی بات بھی تھی۔ میر نے تو آصف الدولہ سے سر بازار کہدیا تھا کہ دربار میں ملونگا بازار میں کھڑے ہوکر، باتیں کرنا شرفا کا دستور نہیں ہے، علاوہ اس کے واقعات سے بھی اُس کی تردید ہوتی ہے۔ اس سے کسے انکار ہے کہ مرزا غالب بڑی آن بان کے آدمی تھے، وہ بڑے وضعدار تھے اور جیسا کہ زور صاحب نے فرمایا ہے بیحد عالی ہمت بھی تھے، مگر زمانے کے آگے سب وضعداریاں دہری رہجاتی ہیں۔

مرزا نے خود ہی دربار میں رسائی چاہی، بیگانگی تو درکنار۔ اُنھوں نے بہ ایمائے حکیم احسان اللہ خان مرحوم مہر نیمروز کا ایک حصہ لکھا اور اسی کے ذریعے سے ۱۸۵۰ء میں باریاب ہوئے اور خدمت تاریخ نویسی پر بمشاہرہ پچاس روپیہ ماہوار بخطاب نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خان غالب بہادر نظام جنگ مامور ہوئے۔ چنانچہ لوگوں کی تعریفوں پر

اشارہ کیا ہے ؎

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے　　تمھیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے
ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا　　وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

بہادر شاہ کے شکریہ میں ؎

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا　　وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

ایک جگہ کہتے ہیں ؎

خانہ زاد اور مرید اور مداح　　تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار
بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر　　نسبتیں ہو گئیں مشخص چار

لیکن اس سے انکی وضعداری پر کوئی حرف نہیں آتا۔ وہ حفظ اعزاز خاندانی پر مرتے تھے سو اس کی نوبت ہی نہیں آئی جو کوئی بدمزگی اور بیگانگی پیدا ہوتی، بادشاہ انھیں بقول اُن کے اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے"۔ اور بقول حالی مرحوم، مرحوم بہادر شاہ نے اپنی حیثیت کے موافق انکی خاصی قدر کی" مجھے انکی وضعداری حفظ اعزاز خاندانی اور علوہمتی میں مطلق کوئی کلام نہیں ہے مگر گفتگو اس میں ہے کہ اشعار" مستانہ طے کروں الخ"۔ "ڈھونڈھے ہے الخ" (ملاحظہ ہو نگار دسمبر صفحہ ۱۵) سے بھی بغیر تاویل سکا ثبوت بہم پہنچ سکتا ہے یا نہیں اگر آپ ایسی ہی مبہم اور ذومعنیین اشعار سے اسی طرح استدلال کریں گے تو پھر کسی شاعر کو بھی مستثنیٰ نہیں کر سکتے۔ جناب عزیز فرماتے ہیں کہ" ذوق کے یہاں لمبی لمبی غزلیں ہیں، عامیانہ اور سوقیانہ مضامین ہیں خیالات زبان کے پابند ہیں تراکیب سُست بندشیں کمزور اور مضامین نہایت ہی بے نمک ہیں صحت زبان کا ضرور خیال رکھاجاتا ہے مگر اس کی ذرا پروا نہیں کیجاتی کہ خیال کی حیثیت کتنی بلند ہے"۔

دوسری جگہ آپ فرماتے ہیں" بلاشبہ ذوق بدقسمتی سے شاعری کے باب میں کچھ بدمذاق ہی واقع ہوئے تھے۔ وہ عالم ضرور تھے قادر الکلام ضرور تھے۔ بہت بڑے قصیدہ گو تھے لیکن شاعر نہ تھے اور یقیناً نہیں تھے، مرزا کا انکے حق میں جو فیصلہ تھا وہ یقیناً درست اور صحیح تھا"۔ فغانی نے خوب کہا ہے۔ ؎

این گواہی بس کہ حاسد میکند انکار من

حیرت کا مقام ہے کہ تراکیب سُست اور بندشیں کمزور بھی ہو گئیں اور آگے جاکر ذوق قادر الکلام بھی کہدئے گئے اور اعلیٰ درجے کے قصیدہ گو بھی ہو گئے گویا قصیدہ گوئی شاعری نہیں ہے۔ کیا خاقانی شاعر نہیں تھے ظہیر فاریابی۔ سلمان ساوجی شاعر نہیں تھے۔ انوری۔ عرفی خاقانی شاعر نہیں تھے اور مرزا غالب خود جنھیں سب سے زیادہ اپنے قصائد فارسی

پر ناز تھا اور کہا کرتے تھے کہ جن قصائد پر مجھے ناز ہے وہ کوئی پڑھتا بھی نہیں۔ شاعر نہیں تھے۔ ماشاءاللہ ع

ایکہ مجموعۂ خوبی چہ نامت خوانم

باستثنائے مرزا غالب یہ تمام شعرائے اہل ایران کے مسلم الثبوت قصیدہ گو ہیں اور شاعری کے رکن رکین ہیں (مرزا کی معلوم نہیں کہ اہل ایران قصیدے میں انھیں کیا کہتے ہیں۔ میری ذاتی رائے یہی ہے کہ مرزا کے قصائد پر اُن کو ناز بیجا نہیں ہے اور ہم طرح قصائد دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عرفی سے ٹکر کھاتے ہیں) پھر بھلا کیونکر ہو سکتا ہے کہ ذوق بہت بڑے قصیدہ گو کہے جائیں اور بہت بڑے شاعر نہ مانے جائیں ؎

چو بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست

عزیز صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ مرزا کا فیصلہ اُن کے حق میں یقیناً حق بجانب تھا اور آزرد صاحب نے بھی نہ معلوم کیسے صحیح سمجھا نہ کوئی واقعہ نہ حکایت نہ روایت، کوئی گواہ نہیں، کوئی شہادت نہیں ایک استدلال تو یہ مصرع ہے کہ "آنچہ در گفتار فخر تست آن ننگ منست" اور دوسرا ثبوت سہرے کا ایک مقطع "ہم سخن فہم ہیں الخ" پہلے مصرع کے متعلق آزاد اور حالی متفقہ طور سے کلمہ احتمال اور ماضی احتمالی استعمال کرتے ہیں کہ "شیخ ابراہیم ذوق جن کی نسبت مشہور ہے کہ مرزا کو اُن سے چشمک تھی۔۔۔۔" اور بعض اشخاص کا قول ہے۔۔۔۔" اور مقطع کی نسبت کیا آپ غالب کی زبان کا بھی اعتبار نہیں کرتے ان کی نیک نہادی سے اتنی بھی اُمید نہیں۔ سیر مہدی کے خط کے اقتباس میں غالب کی رائے، ذوق مرحوم کے متعلق صاف صاف الفاظ میں بغیر تاویل کے لکھدی گئی ہے علاوہ اس کے یہ اشعار فارسی ملاحظہ ہوں:-

فارسی بین تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ بگزر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ منست

راست می گویم من و از راست نتواں سر کشید آنچہ در گفتار فخر تست آن ننگ منست

ہاں من دا یزد بنائے شکوہ بر مہر و وفاست تا نہ پنداری بہ پرخاش تو آہنگ منست

اگر روئے سخن ذوق کی طرف ہو تو بھی اس سے غالب کی معذرت اپنے اردو کلام کے متعلق ظاہر ہے۔ (باقی)

عترت علی (ایزدی)

اے برکاش!

شاداب پہاڑوں میں اک وادیِ رنگیں ہو
دامن میں خرامیدہ اک چشمۂ سیمیں ہو
چھایا ہوا دنیا پہ کیفِ شب زریں ہو
تو جانِ نظارہ ہو،
میں مستِ نظارہ ہوں

اک رنگ جھلکتا ہو شہ کارۂ فطرت سے
اک حسن ٹپکتا ہو نظارۂ فطرت سے
اک کیف برستا ہو ــــ فوارۂ فطرت سے
تو جلوۂ رسوا ہو
میں مستِ نظارہ ہوں

جب وادیِ سینا سے ــــ بدست سحاب اٹھے
مخمور فضاؤں سے ــــ طوفانِ شراب اٹھے
"دوشیزۂ فطرت" کے جلووں سے حجاب اٹھے
تو بیخودِ صہبا ہو
میں مستِ نظارہ ہوں

جب رات کی تاریکی ہر چیز پہ چھا جائے
کوئل ــــ شب اول کے نغمات سنا جائے
ہر بزم کو خاموشی ــــ سنسان بنا جائے
تو کافرِ نغمہ ہو
میں مستِ نظارہ ہوں

جب گوشۂ خلوت سے گردوں پہ قمر آئے
بربط لئے ہاتھوں میں ہر زمزمہ گر آئے
پہلو میں ستاروں کے فردوس نظر آئے
تو حسن کی دنیا ہو
میں مستِ نظارہ ہوں

جب انجمنِ شب ہو کاشانۂ خاموشی
پُرکیف نظارے ہوں میخانۂ خاموشی
ہر بزم میں گرداں ہو پیمانۂ خاموشی
تو زمزمہ آرا ہو
میں مستِ نظارہ ہوں

جب "پریم" کے نغموں سے معمور یہ دنیا ہو
جب بارشِ مستی سے مخمور یہ دنیا ہو
جب رات کے جلووں سے مستور یہ دنیا ہو
تو شمعِ تجلی ہو
میں مستِ نظارہ ہوں

گھنگھور گھٹاؤں سے ــــ جُرعات برستے ہوں
پرشور فضاؤں سے ــــ نغمات برستے ہوں
دلدوز نواؤں سے ــــ جذبات برستے ہوں
تو کیف سراپا ہو
میں مستِ نظارہ ہوں

نغمات کی دنیا ہو رقصیدہ ستاروں میں
فطرت نظر آتی ہو بے پردہ بہاروں میں
ہو شغل مے دینا جب بادہ گساروں میں

تو مستی رسوا ہو
میں مستِ نظارہ ہوں

جب دورِ بہار آئے جب "عیدِ محبت" ہو
"عہدِ گل و بلبل" سے تجدیدِ محبت ہو
جب نغمۂ فطرت سے تائیدِ محبت ہو
تو میری تمنا ہو
میں مستِ نظارہ ہوں

فرزانہ نہو کوئی، دیوانہ نہو کوئی
اس گوشۂ خلوت میں بیگانہ نہو کوئی
اے کاش! ——— سوا میرے مستانہ نہو کوئی
"اک مستِ سراپا ہو"
میں مستِ نظارہ ہوں"

مخمور

چار کتابیں

شعرائے ہند کا اجتماع

زینتِ ہر انجمن ہے شاعرِ رنگیں ادا　　اس کے دل کش زمزموں پر ساری دنیا ہے فدا

ہے بظاہر محفلِ ہستی کا اک بیکار جزو　　ہے حقیقت میں مگر یہ کارفرما جا بجا

گرمیِ محفل کا باعث ہے اسی کا ہر سخن　　ہے اسی کے شعر سے ہر داستاں کی ابتدا

کالعدم جتنی چیزیں ہیں فنا انجام ہیں　　گر بقا ہے تو اسی بیکار شے کو ہے بقا

دیکھتے ہو میر کو اب تک ہے صدرِ انجمن　　ہے وہی کیفیتِ ہنگامۂ آہ و بکا

اس کے شعرِ دردآگیں پڑھتے جاتے ہیں دل　　اس کی اک ضربِ قلم اور سو حسینوں کی جفا

شوکتِ مضموں سے چھا جاتا ہے محفل پر سکوت　　عالمِ وحشت میں جب ہوتا ہے سودا لب کشا

جھومتا ہے ذوق کچھ ہونٹوں میں کہہ کر ادھر　　اور ادھر محفل کی محفل پر سماں ہے وجد کا

کہہ رہا ہے "ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ　　جب تلک بس چل سکے ساغر چلے" صبح و مسا

حضرتِ انشا پہ ہر خورد و کلاں ہے خندہ زن　　ہیں کہیں شاعر کہیں عالم کہیں بہروپیا

آشیانوں میں پھڑک جاتے ہیں مرغانِ چمن　　باغ میں ہوتا ہے جب ناسخ ذرا نغمہ سرا

شعلۂ آتش سے ہے پُر نور فانوسِ سخن　　صورتِ پروانہ قرباں ہیں ثریا و سہا

ذوق کا لطفِ زباں زورِ بیاں سے ہے فزوں　　کر رہا ہے صنعتِ الفاظ سے محشر بپا

کھنچ گئی تصویرِ حسن و عشق ہے دیوار پر　　غالبِ سرشار جب محوِ غزل خوانی ہوا

صحنِ مسجد میں نہیں یہ آہ و زاری بے سبب　　بادۂ الفت کا مومن نے بھی چکھا ہے مزا

ذوالفقارِ حیدریؓ سے کم نہیں کلکِ انیس　　تختۂ محشر زمینِ شعر سے پیدا کیا

کہہ رہے تھے جس زباں کو تنگنائے حسن و عشق　　کر دیا اس نے اسے وسعت میں دشتِ کربلا

ہو گیا حسنِ ستمگر شوخ تر چالاک تر　　داغ نے پہنائی کچھ ایسی محبت کی قبا

بادۂ معنی سے ہے لبریز مینائے امیر　　جس کا اک اک قطرہ ہے قیمت میں گوہر سے سوا

حسن بھی حالی کا گر دیدۂ محبت بھی کنیز　　درد بھی پیدا نہ پیدا دل میں غم بھی آشنا

ایک ساغر میں نظر افروز ہے غالب کی مے
ایک ساغر میں ہے فردوسِ نگہ آبِ بقا

گام فرسا ہیں اسی سے رہ نوردانِ سخن
اس اندھیری رات میں ہے یہ چراغِ رہنما

خامۂ آزادؔ اس گلشن میں مثل عندلیب
کسقدر شیریں زباں ہے کسقدر جادو نوا

صورتِ شمشیرِ شبلی کا قلم ہے آبدار
جسکے فیضِ بیکراں سے قطرہ دریا ہوگیا

کارواں والوں کو دکھلا دیں نئی راہیں کئی
آسمانوں تک پہنچ جاتا ہے جن کا سلسلہ

حسن اکبرؔ کی ترنم ریزیوں سے مست ہے
صحنِ گلشن پہ سماں ہے عالم تصویر کا

ہو رہے ہیں نوجواں رنگِ ظرافت پر نثار
پا رہے ہیں پیرِ دانا دردِ الفت کی دوا

بربطِ اقبالؔ کی ہنگامہ آرائی سے ہے
کارگاہِ دہر میں ذوقِ عمل کی ابتدا

اس نے اس کے کنگرے پہنچا دئے افلاک تک
حالیؔ و شبلیؔ نے ڈالی تھی جس ایواں کی بنا

شعر میں کرتا ہے رازِ ذہنِ فطرت آشکار
کوئی اس کو شاعری کہتا ہے کوئی فلسفہ

روز و شب کی ہے ترنم آفرینی اسقدر
اس چمن کا ذرہ ذرہ نغمہ پیرا ہوگیا

ایک ہل چل پڑگئی فطرت کی جولانگاہ میں
زاغ کی منقار سے پیدا ہے بلبل کی نوا

ہے جو یوں باغِ سخن میں زمزمہ پیرا نظرؔ
یہ بھی اک ادنیٰ سا پر تو ہے اسی کے فیض کا

اصغر حسین خاں نظیرؔ لودھیانہ

مضامین شرر

مولانا شررؔ مرحوم کے مشہور رسالۂ دلگداز کے تمام مضامین اپنی نوعیت کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ مجلدات میں جمع کرائے گئے ہیں اور صفائی کے ساتھ چھاپے گئے ہیں۔ حسب ذیل مجلدات موجود ہیں۔

مضامین شاعرانہ و عاشقانہ جلد اول ۱۲؍ دوم ۱۲؍۔ آغاز و اختتام سال ۱۲؍۔ ادب و تحقیق مسائل ۱۲؍۔ اصلاح قوم و ملت ۱۲؍ تاریخی واقعات پر خیال آرائی ۱۲؍۔ تاریخی و جغرافی مضامین جلد اول ۱۲؍۔ دوم ۱۲؍۔ مشرقی تمدن کا آخری نمونہ یعنی گذشتہ لکھنؤ ۱۲؍ سیر رجال۔ مشہور اکابر کے حالات ۱۲؍۔ نامور خواتین کی سوانحعمریاں جلد اول ۱۲؍ دوم ۱۲؍۔ نظم ڈراما ۱۲؍ ملنے کا پتہ۔

منیجر نگار۔ لکھنؤ

تضمین بر غزل ڈاکٹر سر محمد اقبال

میں ہوں ذرہ کوے نیاز کا تو حریم جلوۂ ناز میں ہو　　کبھی غیریت کا حجاب اٹھا کبھی آ نظر تو نماز میں
نہیں مہر حسن کی شان یہ کہ نہاں ہو پردۂ راز میں　　کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

تو ہے لجۂ یم لامکاں تو محیط جوش و خروش ہو　　تو ہے غنچۂ چمنِ ازل تو چٹک کے زمزمہ گوش ہو
تو ہی جبکہ ساز الست ہے تو یہ ہے ستم کہ خموش ہو　　طرب آشنائے خروش ہو تو نوا ہے محرمِ گوش ہو
وہ سرود کیا جو چھپا ہوا ہو سکوت پردۂ ساز میں

ترا قلب پارۂ سنگ ہے اسے ضرب عشق سے کر فنا　　تو نہ چاہ اس کی سلامتی یہ شکست ہی کیلئے بنا
بنا قاش قلب کا آئینہ تو جو چاہے حق کا معائنہ　　تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

نئی روشنی نیا دور ہے نئے ساز اور نئی انجمن　　مگر اب کسی میں نہ سوز ہے نہ وہ بلبلیں ہیں نہ وہ چمن
یہ سوال شمع تھا کرم سے کہ بدل گیا ترا کیوں چلن　　دم طوف کرمک شمع نے یہ کہا کہ وہ اثر کہن تو
نہ تری حکایت سوز میں نہ مری حدیث گداز میں

ہوے فاش حشر میں راز سب ہر اک عضو کی جو زباں کھلی　　مرے دفتر عمل سیاہ سے خلق لرزہ بجاں ہوئی
پھرا یاس سے جو میں چار سو نہ کسی نے مجھکو پناہ دی　　نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم ہائے سیاہ کو ترے عفو بندہ نواز میں

کبھی تھیں زمانہ میں عشرتیں مہ حسن و عشق تھا ضو فشاں　　کبھی حسن لیلی کی قیس پر تھیں مدام جلوہ طرازیاں
مگر اب وہ عہدِ کہن کہاں نہ کلیم اور نہ تجلیاں　　نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں

میں بنا کے نفس کو رہنما دو جہاں میں کیسا خجل ہوا　　بڑھا ذوق معصیت اسقدر کہ نہ دل میں خوف خدا رہا
جو مکاں تجلی حق کا تھا وہ بتوں کو نذر میں دیدیا تو　　جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

محمود زماں خاں

مسلم کا دور جمود

ہمنشیں کچھ انقلابِ ہستی فانی بھی دیکھ
دیکھ لی بزم طرب، اب اسکی ویرانی بھی دیکھ

بحث دید بیر رسا کی بحثِ طولانی بھی دیکھ
غیر کی فرزانگی اور اپنی نادانی بھی دیکھ

جس کا سینہ تھا امینِ نکہتِ گلزارِ دہر
اس گلِ راحت چشیدہ کی پریشانی بھی دیکھ

عرش مسکن تھا، کبھی جولامکاں پرواز تھا
اس سبک رفتار کی تواب گرانجانی بھی دیکھ

گوشۂ داماں بنا تھا جس کا ستّارِ عیوب
آج اس دِ پاک کی عصمت کی عریانی بھی دیکھ

جسکی ہستی تھی کبھی آئینہ دارِ رمز کن
آج اس ننگِ جہاں کا نورِ ایمانی بھی دیکھ

موج زن برق عمل تھی جسکی رگ رگ میں کبھی
آج اس سیماب پیکر کی تن آسانی بھی دیکھ

چرخ پر چمکا تھا جو بنکر کبھی خورشیدِ علم
تیرگی جہل کی اس میں فراوانی بھی دیکھ

دیدۂ عبرت سے کر افعالِ مسلم پر نگاہ
اور مری انجام بیں نظروں کی حیرانی بھی دیکھ

محمود اسرائیلی

ارتقا

دیکھ کر آشفتگی سمجھو نہ دیوانہ ہوا
دل یہ داغے سے شجر مینا سے میخانہ ہوا

جستجو کے لگ گئے پر فیض سوزِ قلب سے
کرمکِ بے مایہ بیتابی سے پروانہ ہوا

تم سمجھتے ہو کہ دل کا ہوگیا خانہ خراب
میں یہ کہتا ہوں کہ اب آباد ویرانہ ہوا

ہے یہ وہ منزل جہاں کمظرف آکر رہ گئے
کوہکن نے جان دیدی قیس دیوانہ ہوا

آفریں ہمت پہ تیری اے دلِ ندرت پسند!
لامکاں ہستی ہے جو۔ تو اسکا کاشانہ ہوا

اک حقیقت ہے کہ ہستی کی حقیقت کچھ نہیں
ہوگیا معلوم یہ جس کو وہ افسانہ ہوا

ارتقا نے اپنے سر آنکھوں پہ دی اسکو جگہ
اپنی وسعت سے امیں آگاہ جو دانا ہوا

امین حزیں

عاشقِ فرزانہ

اک روز ایک عاشقِ شوریدہ سر ملا — سرمستِ جامِ بادۂ عرفاں کہیں جسے

تھی اُس کے بحرِ شوق میں ہر موجِ آرزو — ایسی حباب پوش کہ عریاں کہیں جسے

رکھتا تھا اپنے سینہ میں اک قلبِ چاک چاک — ہستی کے پیرہن کا گریباں کہیں جسے

سر میں خمارِ نشۂ صہبائے حسن و عشق — دل میں وہ سوز، آتشِ پنہاں کہیں جسے

غم کا چبھا ہوا رگِ جاں میں وہ نیشتر — دشتِ طلب کا خارِ مغیلاں کہیں جسے

آنکھوں میں اشک، ہونٹ پہ آہِ نشاط سوز — چہرے پہ وہ ملال کہ حرماں کہیں جسے

برگشتہ بخت، واژگوں قسمت، الم نصیب — ایسا، ستم رسیدۂ دوراں کہیں جسے

درماندہ پائے سعی و تقاضائے شوق میں — وہ کشمکش کہ زیست کا ساماں کہیں جسے

گاہے نشستہ سر بگریبان و مضمحل — گاہے وہ پُر ز جوش کہ رقصاں کہیں جسے

کہتا تھا فرطِ ذوق سے ہو ہو کے بیقرار — "اے دل! خوشا وہ درد کہ درماں کہیں جسے

جس درد سے تڑپتا ہے پہلوئے کائنات

اس درد کی طلب ہے مرا مقصدِ حیات"

انعام عظیم برنی

غزلیات

آزاد انصاری

کوئی ہر سو بھٹکتا پھر رہا ہے ۔ نہ رہبر ہے نہ کوئی رہنما ہے
زہے طرز نواز شہائے مخصوص ۔ کہ لب پہ شکر ہے دلمیں گلا ہے
بس اب تم کو تغافل ہی مبارک ۔ ہمیں تھوڑا بہت صبر آچلا ہے
ہماری حسرتیں بھی مٹ سکیں گی؟ ۔ ہمارے درد کی بھی کچھ دوا ہے؟
یہاں ہم اور تاب صبر عنقا ۔ وہاں جو بات ہے صبر آزما ہے
کسی کی حسرتوں کی لاج رکھ لے ۔ کسی کو تجھسے اُمید وفا ہے
کہاں تیری توجّہ اور کہاں ہم ۔ بجا ہے بے نیازی ہی بجا ہے
یقیناً آپ کی نا قدردانی ۔ مری خدمات پیہم کا صلا ہے
الٰہی! کامیابی رہنما ہو ۔ کوئی اُمید وارانہ چلا ہے

جسے آزاد کہتا ہے زمانہ
حقیقت میں گرفتار بلا ہے

زورؔ بی اے

دل جب سے ہوا ہے خوگر غم آزار میں لذت پاتا ہوں ۔ گلبانگ مسرت دور رہے، میں اس سے بہت گھبراتا ہوں
جب دل پہ مصیبت پڑتی ہے پاتا نہیں میں غمخوار کوئی ۔ حسرت کی نظر سے دیکھتا ہوں اور دیکھ کے بس رہ جاتا ہوں
وہ ناز و ادا میں سرگرمی سو رنگ سے جب دکھلاتے ہیں ۔ جذبات کو لیکر پہلو میں، میں گرم وفا ہو جاتا ہوں

اے زورؔ نہ کر راحت کی ہوس دنیا ہے یہ سب دھوکہ کی جگہ
چشمہ بھی سراب آتا ہے نظر جب پیاس بجھانے جاتا ہوں

شوق مرادآبادی

بیٹھے ہیں ہم چُنے ہوئے تعمیرِ آرزو
آگے خدا کے ہاتھ ہے تقدیرِ آرزو

وہ میں ہوں جسنے صفحۂ دل پر ازل کے دن
کھینچی ہے عکسِ یار سے تصویرِ آرزو

بیگانگئے دہر نے دیوانہ کر دیا
وارفتگئ شوق ہے تصویرِ آرزو

کیفی چڑیاکوٹی

عقل و خرد میں ہوش کسی کا نہ کیجئے
یعنی جنونِ عشق کو رسوا نہ کیجئے

دل ہے بقدرِ فرصتِ یک لمحۂ خیال
اس کو نگاہِ شوق سے دیکھا نہ کیجئے

ہر چند مرگ، غم سے رہائی کا نام ہے
میرے لئے اسے بھی گوارا نہ کیجئے

یہ فلسفہ ہے راحتِ ایامِ زیست کا
دل بس میں ہو تو کوئی تمنا نہ کیجئے

تا چشم موجِ اشک کو آنے نہ دیجئے
یہ دل کا راز ہے اسے افشانہ کیجئے

ہیں محتسب کی آنکھ سے آنکھیں لڑی ہوئی
یعنی نگاہ، جانبِ صہبا نہ کیجئے

جل جل کے کہہ رہے تھے یہ پروانے شمع سے
احسانِ زیست ہو تو گوارا نہ کیجئے

بتلادوں آج فلسفۂ خواہشِ نمود
اس زندگی کو وقفِ تماشا نہ کیجئے

سرمایۂ نشاط ہے اس ایک بات میں
اچھے بُرے کی دہر میں پروا نہ کیجئے

پردہ جنونِ عشق کا درماندگی میں ہے
اچھا ہے قصد جانبِ صحرا نہ کیجئے

بازارِ حسن و عشق ہے کیفی نظر فریب
ہے نقدِ دل جو پاس تو سودا نہ کیجئے

کیف مرادآبادی

اُسنے جب بزم میں دیکھا مجھکو　　نہ رہا ہوش ہی اپنا مجھکو
نہیں معلوم کہاں لیجائے　　تیرے جلوؤں کی تمنا مجھکو
تو ہو۔ اور گرم نوازش مجھ پر　　دیدیا آنکھ نے دھوکا مجھکو
دیدۂ کور نے دیکھا ہی نہیں　　تو نے کیا کیا نہ دکھایا مجھکو

آج کیوں کیفؔ نظر آتا ہے
ایک عالم تہ و بالا مجھکو

یوسف گجراتی

عین ہستی تھی عدم کی نیستی میری لئے　　موت کا پیغام لائی زندگی میرے لئے
حورِ جنت کی ستائش دین واعظ ہے مگر　　اہل ایماں ہے یہ بزم کافری میرے لئے

حسن والوں نے کیا دامِ محبت میں اسیر
باعثِ عزت ہے اسوہ یوسفی میرے لئے

استفسارات

عیسیٰ علیہ السلام

(حبیب الرحمن الاعظمی مئوناتھ بھنجن)

دسمبر کے نگار میں استفسارات کے ماتحت عزیز صاحب کا ایک استفسار اور آپ کا جواب پڑھنے سے معلوم ہوا کہ آپکو حیات مسیح کے ثبوت میں کلام ہے، بلکہ اس سے پیشتر آپ نے کسی نمبر میں وفات مسیح کے متعدد ثبوت پیش کئے ہیں مجھے افسوس ہے کہ مجھے نگار کا وہ نمبر ابتک دستیاب نہیں ہوسکا اس لئے اس مضمون کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرنے سے معذور ہوں اس نمبر میں عزیز صاحب نے جس آیت کی نسبت استفسار کیا ہے اور آپ نے جواب میں جو تحریر فرمایا ہے سردست اس کی نسبت کچھ گزارش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں پھر اگر خدانے چاہا اور پہلی تحریر بھی ہاتھ لگ گئی تو کوشش کرونگا کہ اس کے متعلق بھی سنجیدگی اور متانت سے کچھ عرض کروں میں نے یہ جرأت اس اعتماد پر کی ہے کہ مجھے آپ کی تحریر نے یہ یقین دلایا ہے کہ آپ کا شمار اُن لوگوں میں نہیں ہے جو اپنی بات یا اپنے تقلیدی یا تحقیقی معتقدات کے خلاف ایک لفظ سننا بھی گوارا نہیں کرسکتے، آپ کے پہلو میں خود بین وخود پسند نہیں بلکہ ایک صداقت پرست وحق پسند دل ہے۔

میں آپ کو اس کا یقین دلاتا ہوں کہ آپ جو کچھ لکھیں گے میں اسکو نہایت ٹھنڈے دل سے پڑھونگا۔ اور جو کچھ خیال میں آئے گا عرض کرونگا۔

اتنا عرض کرنے کے بعد اصل مطلب شروع کرتا ہوں

عزیز صاحب یہ فرماتے ہیں کہ مائدہ کی یہ آیت ۔ لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ہو المسیح ابن مریم قل فمن یملک من اللہ شیئا ان اراد ان یہلک المسیح ابن مریم وامہ ومن فی الارض جمیعا " جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ لوگ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ مسیح ابن مریم خدا ہیں ان سے کہدو کہ کون روک سکتا ہے اللہ کو اگر وہ ارادہ کرے ۔ مسیح ان کی ماں اور تمام ان لوگوں کی ہلاکت کا جو زمین میں پائے جاتے ہیں" بتارہی ہے کہ کم ازکم اس کے نزول کے وقت مسیح ضرور زندہ تھے پس اگر مسیح کو زندہ نہ تسلیم کیا جائے تو آیت کا کیا مفہوم ہوگا آپ نے دو وجہوں سے اس مفہوم کی صحت سے انکار کیا ہے۔ یعنی

(۱) اس مفہوم کی صحت کی بناپر سب سے بڑا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ کلام مجید سے مسیح کے ساتھ ان کی ماں کا بھی زندہ رہنا پایا جاتا ہے ۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں ۔

(۲) اگر یہ مفہوم درست ہو تو پھر خدا نے بطلان الوہیت مسیح کے ثبوت میں ساری دنیا کے ہلاک کر سکنے کی قدرت کا اظہار کیوں کیا جبکہ آپ کے عقیدہ کے مطابق مسیح کے حیات کا مسئلہ دیگر انسانوں کی حیات سے اپنی نوعیت میں بالکل علیحدہ چیز ہے اور جبکہ خدا نے واقعی اس زمانہ کے سارے آدمیوں کو اسیوقت ہلاک کر کے اسکو ثابت بھی نہیں کیا یہ وہ کھلے ہوئے نقائص ہیں جن کی بنا پر آپ کے نزدیک یہ مفہوم صحیح نہیں۔ آپ کے اعتراضات کا حاصل خود آپ کی زبانی یہ ہے کہ اس مفہوم کی بنا پر آیت میں مسیح کی ماں اور من فی الارض کا ذکر بالکل بے کار معلوم ہوتا ہے۔ خیال تھا کہ آیت کا جو مفہوم آپ متعین کریں گے۔ وہ یقیناً ان نقائص سے پاک ہوگا۔ میں نے بہت شوق سے آپ کا بیان کردہ مفہوم پڑھا لیکن افسوس کہ مجھے جس بات کی تلاش تھی وہ اس میں مفقود تھی میں نے ہر چند غور کیا مگر کسی طرح یہ نہیں سمجھ سکا کہ مسیح کی ماں اور من فی الارض کا ذکر مفہوم اول کی بنا پر بالکل بیکار۔ اور آپ کے متعینہ مفہوم کی رو سے برمحل اور کارآمد کیوں ہے۔ آپ نے آیت کا مفہوم یہ قرار دیا ہے "وہ لوگ کافر ہیں جو مسیح کو خدا کہتے ہیں۔ ان سے کہو کہ کون روک سکتا تھا اللہ کو جب اس نے ارادہ کیا اس کی ماں اور ان لوگوں کی ہلاکت کا جو زمین میں تھے یعنی وہ لوگ جو مسیح کو خدا کہتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ وہ ابتک زندہ ہیں اتنا نہیں سمجھتے کہ خدا کو مسیح کے ہلاکت سے کون روک سکتا تھا جب آیت کی مراد بطلان الوہیت مسیح ہے اور آپ کے خیال کی بنا پر اس کی دلیل صرف ان کا مردہ ہونا اور ان کی ہلاکت سے کسی کا خدا کو نہ روک سکنا ہے تو کیا عزیز صاحب کی طرح آپ سے بھی سوال نہیں ہو سکتا کہ خدا نے بطلان الوہیت مسیح کے ثبوت میں ان کی ماں اور ساری دنیا کے ہلاک کرنے کا اظہار کیوں کیا۔ جبکہ الوہیت مسیح کے قائل ان کو دیگر انسانوں کے برابر اور مساوی خیال نہیں کرتے تھے۔ آپ کے دل میں بھی اس اعتراض کا خطرہ گزرا ہے چنانچہ آپ نے اس کے دفعیہ کی یوں کوشش کی ہے مسیح کے بعد امہ اور من فی الارض کے ذکر سے گویا دفات مسیح کو اور یقینی طور پر ثابت کیا گیا ہے یعنی جس طرح تم مسیح کی ماں اور اسوقت کے تمام لوگوں کی ہلاکت سے انکار نہیں کر سکتے اسی طرح مسیح کی دفات کو بھی یقینی سمجھنا چاہیئے لیکن آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ آپ کی توجیہ اعتراض کا دفعیہ کس حد تک کر سکتی ہے آپ کو یہ بتانے کی حاجت نہیں کہ یہاں حیات و ممات مسیح کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ بحث ان کی الوہیت و عبدیت میں تھی، پھر ان کی دفات کا ثبوت پیش کرنے کا یہ کونسا موقع تھا۔

اصل یہ ہے کہ آپ نے اس مفہوم کی بنیاد جس چیز پر قائم کی ہے اسی میں کلام ہے۔ آپ نے یہ خیال فرمایا ہے کہ آیت میں جن لوگوں کے خیال کی تردید کی گئی ہے وہ مسیح کی الوہیت کے ساتھ انکی حیات کے بھی قائل تھے اس سبب سے خدا نے مسیح کی دفات کا ثبوت دیکر ان کی الوہیت کا بطلان ظاہر کر دیا ہے۔ لیکن میں اپنے معلومات کی بنا پر اسے صحیح نہیں سمجھتا۔ اس لئے کہ نصرانیوں کے تین بڑے بڑے فرقوں میں سے کوئی بھی حیات مسیح کا قائل نہیں ہے۔ غالباً تفسیر کبیر کا یہ فقرہ آپ نے پڑھا ہوگا

وذالک لانھم باسرھم متفقون علی ان الیھود قتلوہ (صفحہ ۳۴۱) اس لئے میں نہیں سمجھ سکتا کہ جس بات کا وہ خود اپنے منہ سے اقرار کرتے ہیں اسی بات کو یقینی طور پر ثابت کرنے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے چنانچہ اس کا ذکر بھی عنقریب آئیگا" توجیہ کے متعلق یہ ساری بحثیں اُس تت پیش آئیں گی جبکہ آپ کا بیان کردہ مفہوم قواعد عربیت کی رو سے صحیح مان لیا جائے لیکن مجھے ابھی اس میں بھی تامل ہے اس لئے کہ اس مفہوم کی صحت اسپر موقوف ہے کہ کلام عرب میں۔ اِن۔ اِذا کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے کیا آپ کے پاس اسکا ثبوت ہے۔ اس کا ثبوت دینے کے بعد آپ کو یہ بھی بیان کرنا ہوگا کہ اِذا کو چھوڑ کر اِن کا استعمال کس نکتہ کی رعایت کیلئے اِن لیا گیا۔ آپ اِن (اگر) کو اِذا (جب) ہی کے معنی میں لیجئے" لیکن۔ آپ یملک (مضارع) کو کیا کریں گے اسکو آپ ماضی ناتمام کے معنی میں کیسے لیں گے تعجب ہے کہ آپ نے من یملک کا ترجمہ کون روک سکتا تھا کس بنیاد پر کیا ہے جب تک آپ مضارع کا استعمال ماضی ناتمام کے معنی میں ثابت نہ کر لیں گے اسوقت تک عربیت کی رو سے آپ کا بیان کردہ مفہوم صحیح نہیں مانا جا سکتا بصرف ان کو اِذا کے معنی میں مستعمل ماننے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا" وہ لوگ کافر ہیں جو مسیح کو خدا کہتے ہیں ان سے کہو کہ کون روک سکتا ہے یا روکے گا اللہ کو جب اس نے ارادہ کیا مسیح ان کی ماں اور ان لوگوں کی ہلاکت کا جو زمین میں تھے۔

ان وجوہ کی بنا پر عزیز صاحب کا بیان کیا ہوا مفہوم آپ کے متعینہ مفہوم سے میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے۔

میں اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ یہ مفہوم بھی ظاہر نظر میں خدشات سے پاک نہیں مسیح کے بعد امہ و من فی الارض کے ذکر سے ایک بار ہر شخص کے دل میں اس مفہوم کی صحت کی نسبت اشتباہ پیدا ہو جائیگا، مگر تھوڑے سے تامل کے بعد انشاءاللہ شبہ جاتا رہیگا۔ آیت کا مفہوم ایسے طریقہ سے ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ جو شبہے اس پر وارد ہوتے ہیں انکا دفیعہ ہو جائے۔

لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ھو المسیح ابن مریم قل فمن یملک من اللہ شیئاً ان اراد ان یھلک المسیح ابن مریم وامہ ومن فی الارض جمیعا" اس سے کسی اہل علم کو انکار نہ ہوگا کہ آیت میں مسیح کی الوہیت کا ابطال اور اس فرقہ کے عقیدہ کی تردید منظور ہے جو ان کو خدا سمجھتا ہے۔ بطلان الوہیت کی دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ مسیح میں اتنی سکت نہیں ہے کہ اگر اُن کو خدا ہلاک کرنا چاہے تو وہ اسکو روک دیں اور جسمیں یہ قدرت نہیں ہوگی وہ خدا نہیں بلکہ ایک بندہ عاجز و مسکین ہے"

ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ صرف اتنا مضمون یوں ادا ہو سکتا ہے۔ قل فمن یملک من اللہ شیئاً ان اراد ان یھلکم لیکن خدا نے پہلے یہیں تعمیم کی اور مسیح کے ساتھ دنیا کے تمام لوگوں کو بیچارگی اور بے بسی میں شریک کر دیا اور فرمایا کہ نہ صرف مسیح بلکہ دنیا کے کسی آدمی کو بھی مجھے روکنے کی قدرت حاصل نہیں ہے۔

اس عنوان کو اختیار کرنے میں یہ حکمت بالغہ ہے کہ مدعا مع شئی زائد ثابت ہو جائیگا۔ اور ماسوا ذات باری کے

ہر شے سے الوہیت کی نفی ہو جائیگی جب یہاں صرف حضرت مسیح ہی سے قدرت کی نفی نہیں کی گئی بلکہ عموماً ہر شخص سے اسکی نفی کی گئی تو مابعد میں بھی تعمیم مناسب ہوگی اس لئے کہ اگر صرف اتنا ہی کہا جاتا کہ۔

قل فمن یملک من اللہ ان اراد ان یہلک والمسیح ابن مریم"۔ کون روک سکتا ہے اللہ کو اگر وہ ارادہ کرے مسیح کے ہلاکت کرنے کا یعنی اگر خدا مسیح کی ہلاکت کا ارادہ کرے تو اس کو کوئی نہیں روک سکتا۔ تو دو صورتیں باقی رہ جائیں ایک مسیح کا، اپنی ہلاکت سے خدا کو روک سکنا۔ دوسرے مسیح کو ماسوا کسی دوسرے کی ہلاکت سے خدا کو روک سکنا۔

لہذا ان دونوں صورتوں کے شمول کے لئے۔ وامہ ومن فی الارض کی زیادتی کی گئی۔ اب آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ کسی کو یہ طاقت نہیں کہ خدا کو روک سکے اگر وہ مسیح کو خواہ انکی ماں یا دنیا کے کسی آدمی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرے۔ جب ہر شخص سے اس قدرت کی نفی ہوگئی تو مسیح سے بھی استدلالی طریق سے ہوگئی اور یہی اصل مقصود تھا اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی ثابت ہوگیا کہ مسیح کے علاوہ اور کوئی بھی خدا نہیں ہو سکتا۔ من فی الارض کی زیادتی میں اسکی طرف اشارہ ہے کہ جیسے سب کے سب خدا کے سامنے مقہور و عاجز ہیں اسی طرح مسیح بھی اور جس طرح ان کے ہلاک ہونے میں کسی کو شک نہیں ہے اسی طرح مسیح بھی ہلاک ہونگے اور چونکہ نصاریٰ من فی الارض کے مقہور و عاجز ہونے اور ان کے فنا و ہلاکت کے منکر نہیں تھے بلکہ اسکا سب کو یقین تھا۔ اس لئے اس زمانہ کے سارے آدمیوں کو ہلاک کرکے دکھا دینے کی کوئی ضرورت نہ تھی سیکڑوں آدمیوں کے نہایت بے بسی سے ہلاک ہونیکا روح فرسا نظارہ۔ اور کروڑوں کے فنا ہونیکی خبر متواتر اس دعوے کی تصدیق کے لئے کافی تھی اور امہ کی زیادتی سے مسیح کے مقہور و عاجز ہونے کی تاکید منظور رہے قاعدہ ہے کہ آدمی اپنے خویش و اقارب کو خصوصاً والدین اور اولاد کو ہلاکت سے بچانے کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا اس کی حفاظت میں دنیا بھر کی تدبیریں اور سارا زر صرف کر دیتا ہے۔ مسیح کے اور کوئی نہیں تھا صرف ایک ماں تھیں۔

اگر وہ خدائی میں حصہ دار ہوتے اور ان کو یہ طاقت ہوتی کہ خدا کو اپنی ماں کی ہلاکت سے روک دیں تو ان کی ماں مرنے پاتیں؟ ہرگز نہیں مریم دنیا سے رخصت ہوگئیں اور حضرت مسیح ان کو روک نہ سکے تو جب اپنی ماں کی ہلاکت سے خدا کو نہ روک سکے تو اور کسی کی ہلاکت سے وہ اس کو کب روک سکتے ہیں اسی پر خود ان کے حال کو بھی قیاس کرلو، کہ جب خدا ان کو مارنا چاہیگا تو وہ اس کو روک نہ سکینگے اور غالباً اسی نکتہ کی رعایت سے باوجودیکہ مادر مسیح فوت ہو چکی تھیں ان کا مفروض الہلاکت لوگوں کے سلسلہ میں نام لیا گیا اس کی وجہ سے مضمون کلام کی اور زیادہ تاکید ہوگئی۔ گویا یوں فرمایا گیا کہ خدا کو کوئی نہیں روک سکتا۔ اگر وہ مسیح ان کی ماں اور زمین کے تمام لوگوں کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتا چنانچہ مسیح کی ماں کو ہلاک کر چکا۔ اور کسی نے مسیح ہوں خواہ اور کوئی خدا کو نہ روکا اسی طرح مسیح کو یا اور کسی کو ہلاک کرنیکا

ارادہ کرے گا تو بھی اسکوئی نہ روک سکیگا۔ آیت کے مفہوم کی اس طرح تقریر کیجائے تو اسپر آپ کے مذکورۂ بالا اعتراضات میں سے ایک بھی وارد نہیں ہوتا میں نے جو تقریر کی ہے وہ علامہ ابوالسعود کی تقریر سے ماخوذ ہے۔ علامہ موصوف ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم میں فرماتے ہیں۔

(قل) ای اظہاراً لقول ہم الفاسد (فمن یملک من اللہ شیئا) ای ان کان الامر کما تزعمون فمن یمنع من قدرتہ تعالی وارادتہ شیئا وحقیقتہ فمن یمسک شیئا منہا (ان اراد ان یہلک المسیح ابن مریم وامہ ومن فی الارض جمیعا) ومن حق من یکون الہا ان لا یتعلق بہ لا بشان من شؤنہ بل بشئی من الموجودات قدرت غیرہ لوجہ من الوجوہ فضلاً عن ان یعجز عن دفع شئ منہا عند تعلقہا بہلاکہ فلما کان عجزہ بینا لا ریب فیہ ظہر کونہ بمعزل مما تقولوا فی حقہ ونفی المالکیتہ المذکورۃ بالاستفہام الانکاری عن کل احد مع تحقق الالزام والتبکیت بنفیہا عن المسیح فقط بان یقال ہل یملک شیئا من اللہ ان اراد لتحقیق الحق بنفی الالوہیۃ عن کل ما عداہ سبحانہ واثباۃ المطلوب فی ضمنہ بالطریق البرہانی فان انتفاء المالکیۃ المستلزم لاستحالتہ الوہیتہ متی ظہر بالنسبتہ الی الکل ظہر بالنسبتہ الی المسیح علی ابلغ وجہ اکدہ فیظہر استحالتہ الوہیتہ قطعا وتعمیم ارادۃ الاہلاک للکل مع حصول ما ذکر من التحقیق بقصرہا علیہ بان یقال فمن یملک من اللہ شیئا ان اراد ان یہلک المسیح لتحویل الخطب واظہار کمال العجز ببیان ان الکل تحت قہرہ تعالی وملکوتہ لا یقدر احد علی دفع ما ارید بہ فضلا عن دفع ما ارید بغیرہ وللایذان المسیح اسوۃ لسائر المخلوقات فی کونہ عرضۃ للہلاک کما انہ اسوۃ لہا فیما ذکر من العجز وعدم استحقاق الالوہیتہ وتخصیص امہ بالذکر مع اندراجہا فی ضمن من فی الارض لزیادۃ تاکید عجز المسیح۔ ولعل نظمہا فی سلک من فرض ارادۃ اہلاکہم مع تحقیق ہلاکہا قبل ذلک لتاکید التبکیت وزیادۃ تقریر مضمون الکلام بجعل حالہا انموذجا لحال بقیۃ من فرض اہلاکہ کانہ قیل قل فمن یملک من اللہ شیئا ان اراد ان یہلک المسیح وامہ ومن فی الارض وقد اہلک امہ فہل مانعہ احد فکذا حال من عداہا من الموجودین (صفحہ ۳۸۴ تا ۳۸۵ ج ۳)

اس کے بعد اب میں آپ کی ایک دوسری دلیل کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ آپ نے مائدہ کی اس آیت سے بھی اپنے دعوی کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ما المسیح ابن مریم الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل وامہ صدیقۃ کانا یاکلن الطعام تقریر استدلال یہ ہے اس آیت میں قد خلت من قبلہ الرسل سے نمایاں طور پر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جس طرح اور بہت سے رسول آئے اور فنا ہوگئے اسی طرح مسیح بھی آئے اور اپنی عمر ختم کرکے چلے گئے۔

ورنہ قد خلت من قبلہ الرسل کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ یاکلن الطعام۔ کہکر اس کو اور زیادہ واضح کر دیا گیا ہے کہ جس مسیح کو تم کہتے ہو کہ خدا تھا اور اب تک زندہ ہے اس کا تو یہ حال تھا کہ معمولی آدمیوں کی طرح بقاء حیات کے لئے کھانا کھانے پر بھی

مجبور تھا یعنی چونکہ اس کا طریق زندگی یا وسیلۂ حیات عام انسانوں سے مختلف نہ تھا اس لئے عام انسانوں کی طرح اسکی وفات بھی ہوئی۔ میرے نزدیک اس آیت سے ثبوت وفات مسیح پہلے سے بھی زیادہ تعجب خیز ہے، آپ کا اصل استدلال قدخلت من قبلہ الرسل سے ہے آپ کے خیال میں جب تک مسیح مردہ نہ مان لئے جائیں۔

قدخلت من قبلہ الرسل۔ کہنا بے ضرورت ہے میرے خیال میں آپ نے ذرا جلدبازی کی یہاں تو آپ نے مسیح کو مردہ قرار دیکر۔ قدخلت من قبلہ الرسل کو باموقع اور کارآمد ثابت کر دیا لیکن اس آیت میں کیا کہیں گے وما محمد رسول قدخلت من قبلہ الرسل افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے کئی سال بیشتر غزوہ احد کے موقع پر نازل ہوئی تھی۔ کیا یہاں بھی آپ یہ ہی کہینگے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک رسول تھے جس طرح اور بہت سے رسول آئے اور فنا ہوگئے اسی طرح آپ بھی آئے اور اپنی عمر ختم کرکے چلے گئے۔ کیا آیت کے نزول کے وقت یہ کہنا صحیح تھا۔ اگر صحیح تھا تو یہ آیت اور وہ تمام آیتین جو اس سے نزول میں متاخر ہیں کس پر نازل ہوئیں۔ اور اس آیت کے نزول کے بعد سات برس تک مدینہ منورہ میں فرائض رسالت کی انجام دہی کس نے کی؟ اور اگر آپ یہ کہیں گے کہ یہ اس خیال کی بنا پر فرمایا گیا ہے جو لوگوں نے آپ کی وفات کے متعلق غلط فہمی سے قائم کر لیا تھا تو میں کہوں گا کہ مسیح والی آیت میں بھی یہ ہیں تسلیم ہی فرمایا گیا ہے کہ نصاریٰ مسیح کی وفات کے معتقد تھے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ سرے سے یہی صحیح نہیں کہ جب تک مسیح کو مردہ نہ مانا جائے۔ قدخلت الخ کہنا بے ضرورت ہے آپ تسلیم کرتے ہیں کہ آیت میں الوہیت مسیح کا بطلان ثابت کیا گیا ہے۔ ابطال کی تقریر یہ ہے کہ مسیح ابن مریم خدا نہیں ہیں جیسا کہ نصاریٰ کا خیال ہے وہ تو صرف ایک رسول ہیں' ان کے پہلے بھی بہت سے رسول آچکے ہیں اور ان سے خوارق ومعجزات صادر ہوئے لیکن ان کو خدا نہیں مانا جاتا تو مسیح کو کیوں مانا جاتا ہے' آخر مردہ کو زندہ کر دینا عصا کے سانپ بنا دینے سے زیادہ عجیب نہیں ہے۔ پس جب عصا کا سانپ بن جانا موسیٰ کی خدائی کی دلیل نہیں ہے تو مردہ کا زندہ ہو جانا عیسیٰ کی الوہیت کی دلیل کیوں ہو۔

یا یوں کہا جائے کہ مسیح ابن مریم صرف ایک رسول ہیں ان کے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں اور جس طرح ان کے بیشتر کے رسول گزر گئے اسی طرح مسیح بھی اپنی عمر ختم کرکے چلے جائیں گے یعنی مسیح دوسرے رسولوں کی طرح معرض ہلاکت میں ہیں اور قابل فنا ہونے میں اونکے شریک ہیں اور جو معرض ہلاکت میں ہو اور قابل فنا ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا۔ اور چونکہ بعض نصاریٰ مریم کی الوہیت کے بھی قائل تھے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔ یا عیسیٰ ءانت قلت للناس اتخذونی و امی الٰھین ———— اس لئے۔ آیت زیر بحث کے پہلے اس کے متصل ہی

فرمایا۔ لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ثالث ثلثۃ اور اس اعتقاد کی تردید کے لئے فرمایا۔ وامہ صدیقۃ۔ یعنی جس طرح مسیح خدا نہیں صرف ایک رسول ہیں یونہی ان کی ماں ایک نہایت سچی (اور رسول کی) بڑی ماننے والی (ضد و انکار سے پاک) عورت تھیں۔ کانا یاکلن الطعام۔ ماں بیٹے دونوں کھانا کھاتے تھے یعنی عام انسانوں کی طرح وہ بھی کھاتے پیتے تھے اور اپنی زندگی اپنے قوائے جسمانی کے باقی رکھنے میں وہ اسی طرح محتاج تھے جس طرح دیگر انسان اور جس کا یہ حال ہو کہ وہ اپنے بعض اوصاف میں تمام انسانوں کا شارک ہو اور کھانے پینے کا محتاج ہو اس کی بغیر اسکی بقا ممکن نہ ہو وہ خدا کیونکر ہو سکتا ہے۔ وامہ صدیقۃ۔ میں یہ اشارہ بھی ہے کہ مسیح ماں سے پیدا ہوئے تھے پس وہ عدم سے وجود میں آئے تھے لہذا وہ مخلوق تھے کہ عدم کے بعد موجود ہونیوالی چیز مخلوق ہوتی ہے خدا نہیں ہوتی۔ میں نے آیت کا جو مفہوم ذکر کیا ہے اس کی بنا پر آیت کا ہر فقرہ دوسری آیت سے مربوط رہتا ہے۔ سلسلہ کہیں سے نہیں ٹوٹتا میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ نے یہ کیسے کہدیا کہ اگر یاکلان الطعام کے ذکر سے اس مفہوم کو علیحدہ کر دیا جائے گا تو یہ فقرہ سیاق و سباق سے بالکل بے تعلق ہو جائیگا۔ میں نے جو کچھ ذکر کیا ہے بے تکلف سمجھ میں آتا ہے اس میں کوئی ایچ پیچ نہیں اور بحمد اللہ سلف کی تفسیر کے مطابق ہے چنانچہ امام رازی تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں۔ ما المسیح ابن مریم الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل وامہ صدیقۃ ای ماھو الا رسول من جنس الرسل الذین خلوا من قبلہ جاء بایات من اللہ کما تو باِمثالھا فان کان اللہ ابرا الاکمہ واحیا الموتی علی یدہ فقد احیا العصا وجعلھا حیۃ تسعی وفلق البحر علی ید موسی وان کان خلقہ من غیر ذکر فقد خلق آدم من غیر ذکر و لا انثی۔ وامہ صدیقۃ۔ ای انھا صدقت بایات ربھا وبکل ما اخبر عنہ ولدھا قال تعالی فی صفتھا وصدقت بکلمات ربھا وکتبہ وان المراد بکونھا صدیقۃ غایۃ بعدھا عن المعاصی وشدت جدھا واجتھادھا فی اقامۃ مراسم العبودیۃ فان الکامل فی ہذہ الصفۃ یسمی صدیقاً قال تعالی فاولئک مع الذین انعم اللہ علیھم من النبیین۔ ثم قال تعالی یاکلن الطعام۔ واعلم ان المقصود من ذالک الاستدلال علی فساد قول النصاری وبیانہ من وجوہ الاول ان من کان لہ ام فقد حدث بعد ان لم یکن وکل من کان کذلک کان مخلوقا لا آلھا۔ والثانی انھما کانا محتاجین لانھما کانا محتاجین الی الطعام اشد الحاجۃ والالہ ہو الذی یکون غنیاً عن جمیع الاشیاء فکیف یعقل ان یکون الھا الثالث الالہ۔ ہو القادر علی الخلق والایجاد فلو کان المسیح الھا لقدر علی دفع الم الجوع عن نفسہ بغیر الطعام والشراب فلما لم یقدر علی دفع الضرر عن نفسہ کیف یعقل ان یکون الھا للعالمین صد ۳۶ ج ۴ تا ۳ ۔ ۴۳ ۔ ۳۷

اور علامہ ابو السعود ارشاد العقل السلیم میں فرماتے ہیں۔ ما المسیح بن مریم الا رسول استیناف مسوق لتحقیق الحق الذی لا محید عنہ وبیان حقیقۃ حالہ علیہ السلام وحال امہ بالاشارۃ اولا الی اشرف مالھا من نعوت الکمال ای الرسالۃ

والصدیقة التی بها صار من زمرة اکمل افراد الجنس وآخرا الی الوصف المشترک بینهما وبین جمیع افراد البشر بل الحیوان اثر الالهم بطریق التدریج عن رتبته الاصرار عما تقولوا علیهما وارشادالهم الی التوبة والاستغفار ای ہو مقصور علی الرسالة لا یکاد یتخطاها - وقوله تعالی قد خلت من قبله الرسل) صفة لرسول مبنة عن اتصافه بما ینافی الالوہیة فان خلو الرسول السالفة علیهم السلام منذرخلوه المقتضی لاستحالة الوہیة ای ما ہو الا رسول کالرسل الخالیة من قبله خصه الله تعالی ببعض من الآیات کما خص کلا منهم ببعض آخر منها فان احیا الموتی علی یده فقد احیا العصا فی ید موسی وجعلت حیة تسعی وہو اعجب منه و ان خلق من غیراب فقد خلق آدم من غیراب ولام وہو اعرب منه وکل ذلک من جنابه عز وجل وانما موسی وعیسی مظاہر لشؤونه وافعاله وامه صدیقة ای ما امه ایضا الا کسائر النساء اللاتی یلازمن الصدق والتصدیق ویبالغن به فما رتبتهما الا رتبة بشرین احدهما نبی والآخر صحابی فمن این لکم ان تصفوهما بما لا یوصف به سائر الانبیاء وخواصهم - کانا یاکلان الطعام استیناف مبین لما اشیر له من کونهما کسائر افراد البشر فی الاحتیاج الی ما یحتاج الیه کل فرد من افراده بل من افراد الحیوان صب ج ۲ ص ۲۲ تا ۲۴

تاملات

(Meditations.)

دوسری صدی عیسوی میں، رومتہ الکبریٰ کو جہاں اور بہت سی قابل فخر خصوصیات حاصل ہوئیں وہیں ایک خصوصیت یہ بھی اس کی قسمت میں لکھی تھی کہ مارکس انٹونیس ایسا انسان اس سرزمین میں پیدا ہو اور پھر وہیں کی عنانِ حکومت بھی اپنے ہات میں لے۔

اس بادشاہ کے حالات زندگی جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حاکم ہونے سے زیادہ حکیم فیلسوف تھا، نہایت دلچسپ ہیں، لیکن میرے نزدیک اُن پر اطلاع حاصل کرنے کے لئے اس کی واقعاتِ حیات کا مطالعہ اس قدر ضروری نہیں ہے، جس قدر اس کے مقالات پر غور و تامل کرنے کی ضرورت ہے۔

اس کے اقوال (جو انگریزی میں "Meditations" کے نام سے شایع ہوئے ہیں اور جس کا ترجمہ ہمنے تاملات کیا ہے) مجموعہ ہیں اُن حکیمانہ نکات اور فیلسوفانہ رموز کے جنکا اظہار کم از کم ایک مستبد حکمران کی طرف سے یقیناً بے انتہا حیرت انگیز ہے۔

ہم جناب عبدالکریم خاں صاحب کے ممنون ہیں کہ انھوں نے اس مجموعہ کا ترجمہ نگار میں اشاعت کی غرض سے بھیجا ہے ہم اس کا اقتباس وقتاً فوقتاً نگار میں شائع کرتے رہیں گے ترجمہ بڑی حد تک صاف اور اصل مفہوم پر حاوی ہے۔

جسوقت یہ سلسلہ ختم ہوجائیگا اسوقت ہم مارکس کے فلسفہ سے ایک بسیط بحث کریں گے۔

(اڈیٹر)

"انسان کی حقیقی عظمت" دولت و ثروت، حکومت و سطوت سے متعلق نہیں ہے جیسا کہ عوام سمجھتے ہیں نہ علمی قابلیت و ذہنی برتری سے جیسا کہ بعض کا گمان ہے کیونکہ بسا اوقات ذلیل ترین طبائع میں بھی علم و کمال کا جوہر پایا جاتا ہے اور اعلیٰ طبقہ کی ذلیل خوشامد اور غریب مسکین سے نفرت بعض اہل علم کا نمایاں وصف ہوا کرتا ہے۔

آدمی کی حقیقی عزت اس میں ہے کہ صداقت کے ساتھ زندگی کے اعلیٰ مقاصد کا صحیح احساس رکھتا ہو جو اپنے اور ماحول کے

یقینی اندازہ پر مبنی ہو نیز باقاعدہ محاسبہ زندگی پر روزانہ تبصرہ پیش نظر رہے اور اپنے علم و یقین کے مطابق استواری کیساتھ راستی کو ہر شعبۂ زندگی میں اپنا محکم دستور العمل قرار دے، اور اس امر کی مطلق پروا نہ ہو کہ دوسرے کیا سوچتے کہتے اور کرتے ہیں ہمیں اپنے فرض کے عملی احساس میں سرگرم اور ادائے فرض میں مستعد ہونا لازم ہے دوسروں کے اعمال و احوال سے ہم بے تعلق تو نہیں ہو سکتے اور ہونا بھی نہیں چاہیئے لیکن اسی فکر میں اس قدر غلطاں و پیچاں ہو کر سرگردان و پریشاں رہنا مناسب نہیں کہ اپنی صلاح و فلاح کو بالکل نظر انداز بلکہ فراموش کر دیا جائے۔

علی الصباح بیدار ہوتے ہی یہ یقین کر لو کہ آج مجھے کسی دنی الطبع، مفسد، احسان فراموش، حاسد، خود غرض، شریر و مکار انسان سے واسطہ پڑے گا۔ یہ خصائل رذیلہ دنیا میں زیادہ تر اس وجہ سے ہیں کہ ابن آدم کو نیکی بدی کا کماحقہ واقعی علم نہیں ہے۔ جہل تمام معائب کا سرچشمہ ہے، مگر بفضلہ مجھے اچھائی بُرائی میں تمیز اور فضائل و رذائل کا شعور ہے اور اس کی فطرت سے بھی واقفیت حاصل ہے جو بدی کا مرتکب ہوتا ہے، وہ میرا ہی ہم جنس، گوشت پوست میں شریک، عقل و تمیز میں سہیم ہونے کے علاوہ، نور قلب میں یکساں حصہ دار ہے وہ مجھے کوئی اذیت نہیں دے سکتا کیونکہ وہ مجھے بدی کے لئے مجبور نہیں کر سکتا۔ خطاکار کی حیثیت بھی مجھ پر منکشف ہے، میرا اور اس کا تخم ہستی ایک ہی ہے ایک ہی قدرت نے ہمیں پیدا کیا ہے اور کم و بیش یکساں طور پر حکمت کا جوہر بخشا اور نور الوہیت کا حصہ دیا ہے کوئی فرد بشر مجھ کو ضرر نہیں پہنچا سکتا کیونکہ میرے اندر برائی اور بدی داخل نہیں کر سکتا یہ اپنے ہی قلب کا ظرف ہے جو بدی کی گندگی سے ملوث ہوتا ہے۔ پس کسی سے مجھے نفرت و عداوت ہرگز نہ ہونی چاہیئے، ہم مثل دست و پا، چشم و گوش، دندان و لب ایک دوسرے کی مدد کے لیئے پیدا کیئے گئے ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف ہونا فطرت کا مقابلہ کرنا ہے، باہم دست و گریباں ہونا، خود کو تباہی و بربادی میں ڈالنا ہے۔

میری حقیقت کیا ہے؟ گوشت اور ہڈیوں کا ڈھانچہ، سانس، اور نفس ناطقہ، جو سینہ کے اندر ہے۔ اس کی اصلاح کیئے بغیر، علم بے کار محض ہے نضول موشگافی سے خود کو پریشان کرنا ابلہی ہے جو کسی طرح جائز و پسندیدہ نہیں اس علم کے اشتیاق کو چھوڑو جس کا مقصود، غرور و تکبر کے سوا کچھ نہ ہو۔ مرگ یقینی ہے پھر جو چیز یقینی ہے وہ قریب ہے۔ جسم حقیر ہے کہ وہ صرف خون و استخواں کا مجموعہ اور مفصلات و اعصاب کا جال ہے۔ نفس کیا ہے؟ محض ہوا کی آمد و رفت کا سلسلہ ہر لمحہ تازہ ہوا داخل ہوتی اور ساتھ کے ساتھ خارج ہوتی رہتی ہے جس دم یہ نہ ہو اسی وقت دم ہوا ہو جائے تیسری چیز نفس ناطقہ ہے اسی کی بدولت

آدمیت کا مرتبہ بلند و بالا ہوتا ہے، اسی کی تہذیب و تمیز بخ مستقل ذکر کرنا زیبا ہے۔ اس قدر عمر ہونے آئی، پر تجھے ہنوز عقل و تمیز نہ آئی دیکھ یہ نفس امارہ کا غلام نہ ہونے پائے، ذلیل و رذیل کتے کی مانند تجھے حرص و طمع کی بیہودہ و ناشائستہ حرکات پر برانگیختہ نہ کرے تو اس کی باگ ڈور کو ڈھیلی نہ چھوڑ کہ تجھے جہاں چاہے لے جائے اپنی موجودہ قسمت پر مضطرب نہ ہو نہ مستقبل کی لایعنی فکر میں اپنی جان عزیز کو گھلا، حال سے تو بے حال نہ ہو نہ مستقبل کا غم تجھے کھائے غرض ہر لمحہ نفس ناطقہ کی تہذیب کی فکر تجھ کو دامنگیر ہو۔

قدرت کا ہر ایک عطیہ فضل و کرم کا گنجینہ ہے، تمھارا حصہ بھی نظام فطرت سے جدا نہیں ہے، مشیت الٰہی سے ہر چیز کا آغاز ہوتا ہے اور وہی ہماری ضروریات سے پوری واقفیت رکھ سکتی ہے، یہ نظام تمام کائنات کے لئے مفید ہے جس کا تو بھی ایک جزو ہے۔ جو کل کائنات کے لئے مفید ہے وہ اس سے ہر جزو یعنی تیری ذات کے لئے بھی سودمند ہے مفردات و مرکبات کی تحصیل و تبدیل کے باوجود یہ کائنات محفوظ و موجود ہے، یہ اشارے تیرے لئے بس کرتے ہیں ہمیشہ ان مسلمہ اصولوں کو اپنا رہنما بنانے میں بے نتیجہ مطالعہ کی نمایشی حرص سے باز آ مضر یا مہمل کتاب کے شوق کو الوداع کہہ تا کہ پریشاں حالی میں دنیا کو وداع نہ کہے، تو کف افسوس ملتا ہوا دنیا سے نہ جائے بلکہ تو اطمینان قلب شکر گزاری اور راستبازی کے ساتھ اپنے آخری سفر پر جائے۔

خیال کر غفلت کی نیند میں تو نے اپنی بیش قیمت عمر کا کتنا بے بہا حصہ کھویا، توفیق الٰہی نے ہر چند یاوری کرنا چاہی مگر تجھ بہنبہ در گوش نے کبھی پروا نہ کی بارہا تجھ کو موقع ملے مگر تیری آنکھ نہ کھلی، تجھ کو آج تک ہوش نہ آیا بالآخر اب تو تجھکو کچھ سوچنا چاہئے کہ اس کائنات سے تیرا کیا واسطہ ہے؟ تجھ میں کس کے نور کا ظہور ہے، اس دنیائے فانی میں وقت کا ایک محدود اور غیر معین وقفہ تجھے اسی غرض خاص کے لئے دیا گیا ہے۔

خوب لطف حاصل کر، اور جی بھر کر عیش کے لطف اٹھاؤ لیکن اسی کے ساتھ یاد رکھو کہ آخر کار اس عیش و عشرت میں تمھارا اپنی عزت و منزلت کی توقع سے مایوس ہو جاتا ہے۔ ہر انساں کی زندگی صرف اس کے معوضہ فرائض ہی کے لئے کافی ہو سکتی ہے، مگر افسوس اکثر آدمی اپنی تمام عمر نشۂ غفلت میں گزار دیتے ہیں۔ تو بھی دنیا کے ہزاروں مخمصوں میں گرفتار ہے اور اپنی روح ——— سے بے فکر غافل ہے افسوس!

کیا خارجی اشیا تجھ کو بہت پریشان کرتی ہیں؟ ذرا صبر سے کام لے، تفکرات دنیاسے جدا ہو کر بہ بدید و مفید سرمایہ معلومات بہم پہنچانے کے لئے اپنے عزیز اوقات کا کوئی حصہ کام میں لا، لیکن اس حال میں بھی اعتدال سے باہر نہ جا، کیونکہ وہ لوگ جو اپنے افعال و اعمال میں، خیالات و عادات میں کوئی خاص مدعا پیش نظر نہیں رکھتے وہ اپنی تمام سعی کو جستجوئے سراب میں ضائع کرتے ہیں۔

اپنے فرائض کے انہماک میں دوسروں سے بے تعلق ہونے سے شاذ و نادر ہی کوئی شخص مغموم ہوا ہے، لیکن وہ جو خود فراموشی میں اپنے ہی دل کی حرکات و سکنات سے بے خبر رہتے ہیں ان کا محزون ہونا لازمی ہے۔

ہمیشہ یاد رکھ کہ موجودات میں تیرا کیا رتبہ ہے اور دیگر مخلوقات سے تیرا کیا رشتہ ہے یہ کسی شخص کی مجال نہیں ہے کہ صراط مستقیم پر گامزن ہونے میں مخل ہو سکے قانون فطرت کے موافق تو اپنے ہر ایک قول و فعل میں آزاد و خود مختار ہے۔

ایک حکیم کے قول کے موافق جو جرائم شہوت کی بنا پر وقوع میں آتے ہیں وہ زیادہ تر قابل الزام ہیں بہ نسبت ان کے جو غضب کی بدولت ظہور میں آتے ہیں، جو شخص غصہ سے مشتعل ہوتا ہے وہ غیر محسوس درد و کرب کے ساتھ عقل سے بے بہرہ ہو جاتا ہے لیکن جس پر شہوت غالب ہوتی ہے وہ عارضی حظ نفسانی سے مغلوب ہو جاتا ہے اور اپنے خطا کارانہ طرز عمل میں زیادہ غیر معتدل نظر آتا ہے اور نسوانی کمزوری دکھلاتا ہے پس صحیح اور حکیمانہ قول یہی ہے کہ شہوانی جرائم زیادہ مکروہ اور قابل ملامت ہیں ایک شخص ایسا ہے جو تکلیف سے مجبور ہو کر غضب میں آتا ہے اور دوسرا وہ بالارادہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے اور خود کو دیدہ و دانستہ گمراہی میں مبتلا کرتا ہے۔ باقی.............باقی

عبدالکریم خاں

سلسلۂ استفسارات ماہ گزشتہ

ماہ مارچ کے سلسلۂ استفسارات میں جناب مولوی عبدالحمید صاحب نعمانی کا اعتراض مسئلہ ولادت دوفات مسیح پر بالکل نامکمل شائع ہوا اور اخیر کا ایک ورق تحریر سے رہگیا۔ اس لئے اب باقی حصہ شایع کیا جاتا ہے۔

ماہ گزشتہ کے رسالہ صفحہ ۸۰ کی اخری سطر الفاظ ولادت ہی سے متعلق" پر ختم ہوئی ہے۔ اس کے بعد ذیل کی عبارت کو ملاکر پڑھا جائے۔

(اڈیٹر)

ہیں، اور باقی اگرچہ ان کی ولادت سے متعلق نہیں لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہاں کن فیکون کا یوں ہی ستعمال کر دیا گیا اور وہ کچھ اہمیت طلب یا غیر معمولی نہیں۔

(۵) آپ فرماتے ہیں کہ حضرت علیٰ جب اپنی قوم کے پاس لائے گئے تو بچہ نہ تھے اور نہ مریم پر لوگوں نے ناجائز مولود پیدا کرنے کا الزام لگایا تھا"

اگر وہ بچہ نہ تھے تو کیف نکلم کی جگہ و مالنا ان نکلم ہونا چاہیے جس سے مسیح کی تحقیر کا منشا پورا ہو جاتا۔ ورنہ کیف نکلم کا مفہوم تو یہ ہے کہ گفتگو ممکن نہیں ظاہر ہے کہ گفتگا کی حقیقت طرفین کا وہ کلام ہے جس میں اسناد صحیح ہو اور بصورت تسلیم عہد حقیقی یہ ممکن نہیں اسی لئے لوگوں نے کیف نکلم کہا۔

اگر مریم بدکاری کی ملزم نہ تھیں اور اگر الزام کی نوعیت یہود کی تحقیر و تذلیل تھی، تو اس منشار کی تکمیل امراۃ سوء اور ما بغیاً سے کیونکر ہو سکتی ہے، حالانکہ ادبی (لغوی) نقطۂ نظر سے لفظ سوء مرد کی اخلاقی کمزوری اور بغی عورت کی بدعصمتی کا دوسرا نام ہے۔

(۶) آپ فرماتے ہیں "اسی لئے انھوں نے لفظ فریّا استعمال کیا جس کے معنی شخص کے ہیں جو عجیب و غریب باتیں کرے یا دکھائے"

اگر یہی مفہوم صحیح ہے تو حیثت بفری ہونا چاہیے اور پھر فریّ کے مفہوم میں استعجاب و غرابت غیر ملحوظ ہے، اگر نئی رو شنی

میں دیکھنا چاہیں تو منجد کا مصنف لکھتا ہے ۔ الفری ۔ الامر المختلق المصنوع ۔ ترجمہ بناوٹی بات اور اگر "قدیم وضع کی طرف رجوع کرنا چاہیں تو مولانا اشرف علی مدظلہ العالی بیان القرآن میں لکھتے ہیں ۔ القطع علی وجہ الاصلاح او لا فساد ثم شاع استعمالہ فی العظیم من الامر خیرا وصلاحا کان او شرا وفسادا قولا کان او فعلاً ۔ ترجمہ ۔ ایک بڑی چیز خواہ وہ اچھی ہو یا بری ۔

(۷) آپ فرماتے ہیں "اسکے جواب میں جو کچھ عیسیٰ نے کہا وہ قطعی ثبوت اس کا ہے کہ لوگوں نے مریمؑ پر زنا کی تہمت نہیں لگائی اور نہ حضرت عیسیٰ بن باپ کے پیدا ہوئے" واقعی ثبوت تو بالکل قطعی ہوتا اگر اک شبہ کی گنجایش نہ ہوتی جو یہ ہے ۔ حضرت علیسیٰ خواہ عہد طفلی میں قوم کے پاس آئے ہوں یا بڑی عمر میں بہرحال ان کے جواب کی بنا پر مریم کا تہمت سے محفوظ رہنا غیر ضروری ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ تہمت سے متعلق جوابات وسوالات کو مجادلہ ومناظرہ کی حد تک پہنچانے کی بجائے ایسا رنگ جمائیں جسکے تسلیم کے بعد اس قسم کی سطحی اور پست بحثوں کا خاتمہ ہی ہوجائے

ظاہر ہے کہ انی عبداللہ اتانی الکتاب وغیرہ حقائق کی تسلیم کے بعد مریم کی تہمت کا مسئلہ تار عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہوجاتا ہے حضرت عیسیٰ نے جو کچھ جواب دیا حقیقت یہ ہے کہ اس کے ایک ایک جملے میں مریم کی عصمت مضمر تھی ۔ حضرت مسیح نے قوم کے سامنے جو کچھ کہا تھا اس کا ایک جملہ بر ابوالدتی بھی ہے معلوم نہیں حضرت مسیح جیسے رحیم پیغمبر نیک سلوک اور خیر خواہی کا جذبہ اپنی والدہ کے لئے ہی کیوں رکھتے ہیں باپ کو اس بہتی ہوئی گنگا سے کیوں ہاتھ دھونے نہیں دیتے ۔ کیا اس میں بھی کوئی لطیف اشارہ ہے کہ حضرت مسیح بلا باپ ہیں ۔

ان کل شکوک کے بعد ایک اور خسک بھی قرآن مجید کی ایک آیت کی بنا پر کیا جا سکتا ہے جو سب سے زیادہ وقیع معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے ان مثل عیسی عند اللہ کمثل ادم خلقہ من تراب ثم قال لہ کن فیکون (آل عمران)

ترجمہ ۔ عیسیٰ کی مثال خدا کے نزدیک حضرت آدم جیسی ہے ان کو مٹی سے پیدا کیا اور کہا ہوجا بس ہوگئے ۔ حضرت مسیح کی ولادت کن معنوں میں جناب آدم کی ولادت سے مماثل اور مشابہ ہے ، کہیں اس کا یہ منشا تو نہیں ہے کہ ابوالبشر کی تخلیق میں جس خدا کو صرف کن فیکون کہنے کی ضرورت ہوئی ہے وہ نہایت آسانی سے مسیح کی ولادت بلا باپ کے کرسکتا ہے اگر یہی منشا ہے تو آپ کو اس کا جواب بھی دینا چاہیئے ۔

میں دوبارہ امید کرتا ہوں کہ آپ میرے ان شبہات کو دور فرمائیں گے ۔

معلومات

سکوت و سکون کی انتہا

مغرب میں تعلیمی اہتمام و اہمیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ وہاں قوم کے اندھے، بہرے اور گونگے بچوں کے لئے بھی خاص طور پر تعلیم کا انتظام کیا جارہا ہے اور مختلف طریقوں سے اس بات کی جانچ کیجاتی ہے کہ ایک بچہ میں فطری نقائص کس حد تک پائے جاتے ہیں چنانچہ حال ہی میں لندن کے ایک امیر نے پچاس ہزار پونڈ کا عطیہ ایسے بچوں کی تعلیم کے لئے دیا تھا جس سے کانوں کے اسپتال میں ایک "خانۂ سکوت" طیار کیا گیا ہے تاکہ وہاں بہرے لڑکوں کے بہرے پن کا صحیح اندازہ کیا جاسکے۔

اس کمرے میں اس قدر سکوت و سکون ہے کہ اگر کوئی شخص پلک جھپکائے تو اس کی آواز فوراً سنی جاسکتی ہے۔ اس کمرے کی دیواریں، چھت، فرش کچھ ایسے اصول سے طیار کئے گئے ہیں کہ باہر کی کوئی آواز خواہ وہ کیسی ہی بڑی ہو اندر آہی نہیں سکتی۔

انگریزی میں فرطِ سکوت ظاہر کرنے کے لئے اسوقت تک یہ محاورہ رائج تھا کہ "آلپین گرنے کی آواز بھی سن لیگی" لیکن اس کمرہ کے ہوتے ہوئے اب شاید آلپین کے گرنے کو شور قیامت سے تعبیر کیا جائے گا۔

دماغی کام کرنیوالی مشینیں

اس وقت بہت سی ایسی مشینیں رائج ہیں جو انسانی دماغ کی سی خدمات انجام دیتی ہیں۔ حال ہی میں کاروبار کی ایک نمائش میں اس قسم کی مشینیں رکھی گئی تھیں جنمیں سے خاص خاص یہ ہیں

(۱) برقی ٹائپ رائٹر جس کے حروف بال کمانی کی سی روانی کیساتھ کام دیتے ہیں اور ۳۶۰ قسم کے ٹائپ اسمیں موجود ہیں

(۲) ٹکٹ لگانے کی مشین۔ یہ مشین خطوں پر ٹکٹ لگاتی ہے، ٹکٹوں کا شمار کرتی ہے، لفافوں کو ترکر کے چپکاتی ہے اور بحساب ۲۵۰ فی منٹ مُہر لگاتی ہے۔

(۳) سکہ شمار کرنے والی مشین۔ یہ مشین پچاس ہزار فی گھنٹہ ملے جلے سکوں کو شمار کرتی ہے، مختلف قیمت کے سکوں کو علحدہ کرتی ہے اور ان کا پیکٹ طیار کرتی ہے

(۴) حساب رکھنے والی مشین۔ جو کھاتے مرتب کرتی ہے اور جمع خرچ کا اندراج نہایت صحت سے کرتی ہے۔

(۵) چک لکھنے والی مشین۔ یہ مشین نہایت تیزی سے چک لکھتی ہے اور اس کی تحریر میں کوئی جعلسازی نہیں ہوسکتی۔

(۶) حساب لگانے والی مشین۔ یہ مشین دس سکنڈ کے اندر ریاضی کے چھوٹے چھوٹے سوال حل کردیتی ہے مثلاً یہ سوال:-

اگر ۹۶۸۴۲ چیزوں کی قیمت ۹۹۸ پونڈ دس شلنگ، سات پنس ہے تو ایک پورے کی قیمت کیا ہوگی۔ یا ۶۹۸ پونڈ پندرہ شلنگ، نو پنس کا سود ساڑھے چھ سال کا ۲ ½ فی صدی کی حساب سے کیا ہوگا۔

اس مشین میں ایک ایسا آلہ لگا ہوا ہے کہ اگر مشین پر کام کرنے والا کسی جگہ غلطی کرے تو وہ فوراً مشین کو روک دیتا ہے اور بتا دیتا ہے کہ کس جگہ حساب میں غلطی ہوئی ہے۔

چاند کا سفر فلکیات کی ترقی کے سلسلہ میں سب سے زیادہ دلچسپ موضوع چاند کا سفر ہے اور یہ خیال اب مغرب کے فلکی انجینیروں میں اسقدر مقبول ہوتا جاتا ہے کہ شاید وہ دن دور نہ ہو جب چاند کا سفر عمل میں آئے اور "سیاحت ماہتاب" کے واقعی حالات کتابی صورت میں شائع ہو سکیں۔

اس مسئلہ پر یوروپ و امریکہ دونوں جگہ توجہ کی جا رہی ہے اور کوشش جاری ہے کہ ایک ملک دوسرے پر سبقت لیجائے۔ وائنا کے دو پروفیسر ہرمن اور فرانز پانچ ٹن وزن کی ہوائی طیاری کر رہے ہیں جسے ازروے حساب دو دن میں چاند تک پہونچنا چاہئے اس کا امتحان چھوٹی چھوٹی ہوائیوں سے شروع ہوا ہے اور اس حد تک کامیابی ہوگئی ہے کہ کئی میل کی بلندی پر پہونچنے کے بعد اسپر جانے والے غبارہ کے ذریعہ سے پھر زمین تک آ گئے۔ میکس ویلیر ایک نوجوان فلکی بھی انھیں اصول پر کوشش کر رہے ہیں۔ اصول یہ ہے کہ ایک جہاز سگار کی شکل کا طیار کیا جائے جس کے پیچھے کے حصہ میں تین خانے ہوں، ایک خانہ الکحل کے لئے باقی دو رقیق ہائڈروجن کے لئے۔ اندازہ ہے کہ یہ جہاز سات میل فی سکنڈ کے حساب سے سفر کریگا۔

جسوقت یہ جہاز زمین کی حد کشش سے باہر ہو جائے گا اس وقت جہاز کے مسافر فضا میں اڑنے لگیں گے چنانچہ اس کے روکنے کے لئے تسمے یا فیتے جہاز کے دیواروں میں ہونگے جنسے مسافر اپنے آپ کو باندھ لیں گے۔

رہا یہ امر کہ جہاز کیونکر محفوظ طور پر چاند کی سطح پر اتر سکیگا اور وہاں سے واپس کیونکر ہوگی اس کا فیصلہ ابھی نہیں ہو سکا۔ ڈاکٹر ہوف نے ایک طریقہ ایسا ایجاد کیا ہے جس سے جہاز ادھر ادھر نہ بہک سکیگا۔

حال ہی میں بمقام وائنا فلکی انجنیروں کی ایک جماعت نے فیصلہ کیا ہے کہ پہلے اس قسم کا جہاز طیار کر کے خالی روانہ کیا جائے اور پھر دوربین کے ذریعہ سے دیکھا جائے کہ اس کا سفر کہاں اور کیونکر ختم ہوتا ہے۔

تبدیل جنس ڈوسٹولوسکی کے ایک ڈاکٹر نے جس کا نام گولانیٹسکی ہے دعویٰ کیا ہے کہ غدود کی تبدیلی سے ایک مرد نہایت آسانی سے عورت بن سکتا ہے اور اسی طرح ایک عورت مرد ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے سنہ ۱۹۲۶ء میں چھ انسانوں پر یہ عمل کیا اور اب ایک علمی سوسائٹی اس کے نتائج کے متعلق تحقیق کر رہی ہے۔

۱۹ سال کی ایک لڑکی جس کا نام اینا تھا، وہ مرد بننا چاہتی تھی، کیونکہ اس کے اعضا کی ساخت اور نفسیاتی میلان کا

اقتضا یہی تھا چنانچہ ڈاکٹر مذکور نے ۹ مرتبہ عمل جراحی کرکے تمام غدود بدل دئے۔ اور اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بالکل مرد ہو گئی اور اب اس کا نام وکٹر ہے۔

اس طرح ایک مدرسہ کے معلم پر جس کی عمر ۲۶ سال کی تھی عمل جراحی کیا گیا اور وہ عورت ہو گیا چنانچہ اب اس کی شادی ایک مرد سے ہو گئی ہے۔

ایک اور عورت ۲۳ سال کی تھی جو یوں تو ہر لحاظ سے عورت تھی لیکن دل کے لحاظ سے وہ مرد تھی اس نے خواہش کی کہ اس کے دیگر اعضا بھی بدلکر خصوصیات قلب کی طرح مردانہ ہو جائیں، چنانچہ اسپر بھی عمل جراحی کامیاب ثابت ہوا اور اب وہ سوویٹ فوج میں عمدہ سپاہی کی طرح خدمات انجام دے رہی ہے۔

ڈاکٹر موصوف کا بیان ہے کہ اس نوع کے عمل سے صرف انھیں ہستیوں میں کامیابی ہو سکتی ہے جن کے دماغی یا اعضائی حالات کا اختلاف اس کا مقتضی ہو سکتا ہے۔ ہر شخص پر یہ عمل کامیاب نہیں ہو سکتا۔

۱۹۲۶ء کے مطبوعات

بلاد انگلستان میں مختلف علوم کی کتابیں ۱۹۲۶ء کے دوران میں ۱۲۷۹۹ شائع ہوئی ہیں جنمیں سے ۶۶۰ علمی ہیں ۶۲۹ صنعتی، ۳۹۹ طب کی اور ۱۸۴ زراعت پر۔ اگر یہ کتابیں موضوع وار تقسیم کی جائیں تو ان کی بارہ تقسیمیں ہو سکتی ہیں لیکن ان میں پہلا نمبر قصے کہانیوں کا ہوگا اور چھٹا نمبر علمی کتابوں کا۔

جدید حیوانی لغت

پروشیا کی اکاڈیمی نے ایک لغت جانوروں کی جنس، قسم اور ان کے ناموں کا طیار کرنا شروع کیا ہے جس کی پانچ جلدیں ہونگی۔ ہر جلد میں ۸۰۰ صفحہ ہوں گے اور ہر صفحہ میں پچاس نام۔ گویا دو لاکھ سے زیادہ جانوروں کی اسم نویسی ہوگی، ظاہر ہے کہ اس لغت کی طیاری میں اُن کو ہزاروں نام وضع کرنے پڑیں گے اور ملک والے اکاڈیمی کی اس جسارت کو بغیر چون و چرا تسلیم کر لیں گے۔ برخلاف اس کے ہندوستان کو ملاحظہ کیجئے کہ اول تو یہاں کوئی ایسی جماعت موجود ہی نہیں جو اسماء و اصطلاحات کو انجام دے اور اگر ہو۔ بھی تو اس نے اس وقت تک کوئی ایسی ذمہ دارانہ حیثیت پیدا نہیں کی جو ملک سے اپنے اصطلاحات کو تسلیم کرا لے۔

تعمیر کی بلندی

ہرم مصر کی بلندی کسی وقت ضرب المثل تھی حالانکہ وہ ۴۸۱ فٹ سے زیادہ بلند نہیں ہے اب یورپ و امریکہ میں اس سے کہیں زیادہ بلند عمارتیں پائی جاتی ہیں، چنانچہ جرمنی میں کلیسائے اُلم فرانس میں کلیسۂ رواں، برج ایفل (جس کی بلندی ۹۸۵ فٹ ہے) اس سے کہیں زیادہ بلند ہے

ڈیٹرائٹ (امریکہ) میں ایک عمارت ہے جو ۸۰۰ فٹ اونچی ہے اور نیویارک میں ایک عمارت اور طیار ہو رہی ہے جسکی بلندی ۱۲۰۰ فٹ ہوگی۔

ایک عجیب و غریب میز امریکہ کے ایک شخص نے آٹھ ہزار دو سو ٹکڑے مختلف قسم کی لکڑیوں کے تمام دنیا سے فراہم کر کے ان کی ایک میز طیار کی ہے۔ اور اس لحاظ سے کہ اس کے کوئی لکڑی دوسری سے نہیں ملتی پہلی صنعتِ انسانی اپنی قسم کی کہلائی جا سکتی ہے۔

مختلف مقامات کی راتیں ذیل کے نقشے سے معلوم ہوگا کہ مختلف مقامات میں طویل سے طویل رات کتنے گھنٹوں کی ہوتی ہے:-

	گھنٹے	منٹ			گھنٹے	منٹ	
کایان	۱۲	۱۶	منٹ	اراس	۱۶	۱۲	منٹ
پانڈیچری	۱۲	۳۴	″	ڈبلن	۱۶	۴۶	″
ہیٹی	۱۳	۱۶	″	کوپن ہگن	۱۸	۱۵	″
چیھواہوا	۱۳	۴۹	″	ریگا	۱۸	۴۶	″
صفہان	۱۴	۱۴	″	اسٹاکھوم	۱۸	۱۵	″
الیکانٹی	۱۴	۴۳	″	آبو	۱۸	۴۴	″
کرکاسون	۱۵	۱۵	″	درونتھیم	۲۰	——	
دیجون	۱۵	۴۶	″	ارکانگل	۲۰	۴۷	″
پیرس	۵	۵۰	″	اولیا	۲۱	۱۵	″

اینونکیس میں مسلسل ۴۵ دن تک رات رہتی ہے۔ ور دہوس میں مسلسل ۶۶ دن تک روس شمالی میں ۷۴ دن کی رات ہوتی ہے اور جزیرہ ملفیل میں ۱۰۲ دن کی

بعض عجیب و غریب درخت کلیفورنیا میں ایک درخت ہوتا ہے جس کی بلندی ۵۰ فٹ ہوتی ہے جس کا پھل آخروٹ کی طرح ہوتا ہے اور چھلکے سے صابون کا کام لیا جاتا ہے۔ وسط امریکہ میں ایک درخت ہے جس کے پھل گول زرد رنگ کا ہوتا ہے اور اس کا مزہ تازہ روٹی کا سا ہوتا ہے۔

وادی امیزن میں ایک درخت کا عرق بالکل گائے کے دودھ کی طرح ہوتا ہے اس کا رنگ اور مزہ سب دودھ کی مانند ہوتا ہے۔

مولانا شہری مرحوم

حیات انیس عگ
ایشیائی شاعری عہ
نورجہان بیگم ۸ر
ٹیپو سلطان عہ
حیدر علی سلطان عہ

مولانا حالی مرحوم

یادگار غالب سےر
حیات سعدی رح عہ
مقدمہ شعر و شاعری عہ
حیات جاوید عہ
دیوان حالی عہ
مسدس حالی عہر ۸ر
مجموعہ نظم حالی عہ
بیوہ کی مناجات ۲ر
شکوہ ہند ۲ر

امیر مینائی مرحوم

امیر اللغات (نامکمل)
صنم خانۂ عشق عگ
مرأۃ الغیب عہ
محامد خاتم النبیینؐ ۸ر
مینائے سخن عہ
مکاتیب امیر مینائی عہ

جلال مرحوم

سرمایۂ زبان اردو عگ
مضمون ہائے دلکش عہ
نظم نگارین عہ
رسالۂ تذکیر و تانیث ۸ر
اعادۂ تاریخ عہ

قواعد المنتخب ۱۲ر

پنڈت رتن ناتھ سرشار

فسانۂ آزاد ۴ جلد
سیر کہسار ۸ر
خدائی فوجدار عگ
جام سرشار عگ
الف لیلیٰ بطرز ناول للعہ
کامنی عہ
بچھڑی دلہن ۲ر
سوانح عمر و عیار ۲ر

منشی سجاد حسین مرحوم

احمق الذین عہ
حاجی بغلول ۸ر
پیاری دنیا ۸ر
کایا پلٹ ۸ر
میٹھی چھری ۲ر
طرحدار لونڈی عہ
طلسمی فانوس ۱۲ر

منشی جوالا پرشاد

مرنالنی ۱۲ر
مار آستین ۱۲ر
بنگالی دلہن ۱۲ر
معشوقۂ فرنگ ۱۲ر
پرتاب ۱۲ر
روہنی ۱۰ر

مولوی محمد حلیم انصاری

تمدن اسلام للعہ
فتح اندلس عگ
ابو مسلم خراسانی عگ

تاریخ عرب عہ

پریم چند

پریم بتیسی عہ
بازار حسن عگ

شوق قدوائی مرحوم

ترانۂ شوق عہ
قاسم و زہرہ عہ
نیرنگ جمال ۱۲ر
گنجینہ ۱۲ر
میکبتھ اردو ۲ر

خواجہ عبدالرؤف عشرت

زبان دانی ۲ر
اصلاح زبان اردو ۲ر
قواعد میر ۲ر
اصول اردو ۸ر
جان اردو ۲ر
شاعری کی پہلی کتاب ۸ر
دوسری کتاب ر
تیسری کتاب ر
لغات اردو سے

منشی محمد احسن وحشی

مخمس کنشت عہ
جام زہر عہ

مولانا حکیم عبدالحی مرحوم

یاد ایام عہ
تذکرۂ گل رعنا صہ

مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی

سیرۃ الصدیق عہ
علمائے سلف عہ

تذکرۃ الشعراء (میر حسن) عہ

منشی سید محمد مارہروی

آثار اکبری عہ
حیات خسرو عہ
امرائے ہنود عگ

مولوی عزیز مرزا مرحوم

خیالات عزیز عگ
بزم اردو عہ

مولانا حسرت موہانی

شرح دیوان غالب عہ
کل دیوان حسرت عگ

سید سجاد حیدر بی اے

خیالستان عہ
ثالث بالخیر ۸ر
زہرا ۱۳ر
جلال الدین خوارزم شاہ

مسٹر ظفر عمر بی اے

چوروں کا کلب ۸ر
نیلی چھتری عہ
بہرام کی گرفتاری عہ
مستقبل اسلام عہ

مولوی عبدالماجد بی اے

فلسفۂ جذبات عگ
مکالمات برکلے عہ
پیام امن عہ
تصوف اسلام عہ
فلسفیانہ مضامین عہ
زود پشیمان ۸ر
....

مولوی سید سلیمان ندوی

ارض القرآن للعہ
سیرۃ عائشہؓ عہ
حیات امام مالک عہ
خلافت عثمانیہ اور اسلام عہ
خلافت اور ہندوستان ۸ر

مولوی عبدالسلام ندوی

اسوۂ صحابہ ۲ جلد سے
سیرۃ عمر بن عبدالعزیز عہ
انقلاب الامم عگ
تاریخ الحرمین الشریفین عگ
فقرائے اسلام عہ
فطرت نسوانی عہ
شعر الہند ۲ جلد سے

مولوی عبدالباری ندوی

مبادی علم انسانی عہ
برکلے کا فلسفہ عہ

مولوی سعید انصاری

سیر الصحابہ جلد اول صہ
سیر انصار ۲ جلد سے
سیر الصحابیات عگ

مولوی عبدالرزاق ندوی

اسوۂ حسنہ عگ
کتاب الوسیلہ عگ
ٹرکی اور یورپ عہ

منشی عبدالمجید سالک بی اے

راہ و رسم منزلہا ۸ر
چپا و دیگر افسانے عہ
چترا (ٹیگور) ۱۲ر

مرتبہ

نیاز فتحپوری

ہر فرمائش کیساتھ چوتھائی

"نگار" بک ایجنسی لکھنؤ

قیمت آنا ضروری ہے

مولانا شبلی مرحوم

- سیرۃ النبی مجلد حصہ ۱ معہ
- 〃 〃 ۲ ہے
- 〃 〃 ۳ ۵عہ
- الغزالی عہ
- سوانح مولانا روم ۶ر
- دیوان شبلی فارسی عہ
- کلیات شبلی ۶ر
- مکاتیب شبلی حصہ ۱ ۶ر
- 〃 حصہ ۲ ۶ر
- مثنوی صبح امید ۴ر
- اسلامی مدارس ۴ر
- الفاروق قسم اول ہے
- 〃 قسم دوم ۶ر
- شعر العجم حصہ ۱ ہے و ۶ر ۱۲ر
- 〃 حصہ ۲ ۶ر و ۶ر ۴ر
- 〃 حصہ ۳ ۶ر و ۶ر ۴ر
- 〃 حصہ ۴ ۶ر و ۶ر ۴ر
- 〃 حصہ ۵ ۶ر عہ ۱۲ر
- علم الکلام عہ
- الکلام ۶ر و عہ
- مقالات شبلی عہ
- رسائل شبلی عہ
- المامون عہ
- سیرۃ النعمان عہ
- مضامین عالمگیر اول عہ
- مضامین عالمگیر دوم ۸ر
- مجموعہ کلام شبلی ۱۲ر
- 〃 〃 〃 ۸ر
- مسلمانوں کی تعلیم ۱۰ر
- آغاز اسلام ۱۲ر
- بیان خسرو ۱۰ر
- موازنہ انیس و دبیر ۶ر
- برگ گل ۴ر
- دستۂ گل ۴ر
- حیات جامی ۸ر
- حیات حافظ ۸ر

مولینا شرر لکھنوی مرحوم

- امام شافعی ۴ر
- ابوبکر شبلی عہ
- جنید بغدادی عہ
- خواجہ معین الدین ۲ر
- سکینہ بنت حسین ۲ر
- ملکہ زنوبیہ ۳ر
- قرۃ العین ۳ر
- شیریں ملکہ عجم ۴ر
- مخدرات عہر
- مخدرات تیموریہ ۶ر
- صد پارۂ دل حصہ ۱ عہر
- 〃 حصہ ۲ عہر
- جویائے حق کامل ملعہ
- لعبت چین عہ
- عزیزہ مصر پہر
- فاتح مفتوح عہر
- بابک خرمی کامل عہ
- الفانسو ۱۲ر
- ایام عرب کامل ۶ر
- فتح اندلس ۶ر
- ماہ ملک ۶ر
- قیس و لبنیٰ عہر
- یوسف و نجمہ کامل عہ
- زوال بغداد عہ
- درگیش نندنی ۸ر
- طاہر عہر
- مینا بازار عہ
- مقدس نازنین عہ
- روضۃ الکبریٰ عہ
- فلپانا عہ
- شوقین ملکہ عہ
- فلورا فلورنڈا عہ
- منصور موہنا ۸ر
- حسن انجلینا ۸ر
- ملک العزیز ورجنا ۱۲ر
- فردوس بریں ۸ر
- شہید وفا ۸ر
- حسن بن صباح ۴ر
- اسیری بابل ۴ر
- ہندوستان کی موسیقی ۴ر
- حسن کا ڈاکو عہ
- دربار حرامپور ۱۰ر
- آغا صادق کی شادی ۱۰ر
- غیب دان دلہن عہ
- دلچسپ کامل ۱۲ر
- دلکش عہ
- میوۂ تلخ ۸ر
- بدر النساء کی مصیبت ۳ر
- خوفناک محبت عہر
- نیکی کا پھل نیا ناول عہ
- معتزلہ ۱۲ر
- ذی النورین ۱۰ر
- ابو الحسنین ۸ر
- ثانی اثنین ۲ر

مرزا غالب مرحوم

- اردوئے معلیٰ ۶ر
- عود ہندی عہ
- دیوان غالب خاص ہے
- مکمل دیوان غالب صہ

مولانا آزاد مرحوم

- آب حیات ہے
- دربار اکبری صہر
- سخندان فارس ہے
- نگارستان فارس ہے
- نیرنگ خیال عہر
- سیر ایران عہر
- ڈرامہ اکبر عہر
- مجموعہ مکتوبات آزاد عہر
- مجموعہ نظم آزاد ۱۲ر
- نصیحت کا کرن پھول ۸ر
- جانورستان ۱۰ر
- بیاض آزاد عہ
- تذکرۂ علماء ۵ر
- لغت آزاد عہر
- دیوان ذوق مرتبہ آزاد ۶ر

پروفیسر شہباز مرحوم

- زندگانی بے نظیر ۶ر
- خیالات شہباز عہ

مولانا نذیر احمد مرحوم

- حمائل شریف مترجم صہر
- الحقوق والفرائض سکر
- بنات النعش ۹ر
- مراۃ العروس ۱۰ر
- توبۃ النصوح ۱۲ر
- موعظۂ حسنہ عہر
- رویائے صادقہ عہر
- ایامیٰ عہر
- فسانۂ مبتلا عہر
- ابن الوقت عہر
- مصائب غدر ۱۰ر
- مجموعہ نظم بے نظیر عہر
- مکمل مجموعہ لکچر صہر
- منتخب الحکایات ۲ر
- چند پند ۲ر
- مبادی الحکمۃ عہ

رجسٹرڈ نمبر ۱۱۰۴
جلد ۱۱ شمارہ ۵

لکھنؤ سے ہر ماہ کی پندرہ کو شایع ہوتا ہے۔ چندہ سالانہ ہندوستان میں پانچ روپیہ ہندوستان سے باہر سات روپیہ

فہرست مضامین مئی ۱۹۲۷ء

نگار مشین پریس نظیر آباد لکھنؤ میں چھپا

بسم اللہ

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

جلد ۱۱	مئی ۱۹۲۷ء	شمارہ ۵

ملاحظات

جرائد و رسائل کی سنت دیرینہ ہے کہ ہر ماہ اپنی سعی و کاوش کا ذکر کرتے ہوے، ملک سے توسیع اشاعت کے لئے ایک دردناک اپیل بھی کیا کرتے ہیں میں نہیں کہتا کہ ادارۂ نگار کی طرف سے اس باب میں ہمیشہ اسی خودداری و ضبط نفس کا اظہار رہا ہے جسے میں نگار کی خصوصیت خاصہ دیکھنا چاہتا ہوں، لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہوسکتا، کہ اس نے اسوقت تک اس لجاجت و تضرع، اس گدایانہ التماس و ابتہال سے کبھی کام نہیں لیا، جو ممکن ہے اوروں کے لئے "باعث فخر" ہو، مگر میرے لئے یقیناً ننگ و عار ہے۔

لکھنؤ آنے کے بعد یہ چوتھا نمبر نگار کا شایع ہو رہا ہے اور یہ زمانہ شاید کافی ثابت ہوتا، اگر میں اس دوران میں ایک لمحہ کے لئے بھی اطمینان کی سانس لے سکتا — لیکن باوجود اس کے کہ پریشانیاں کثیر ہیں اور افکار کا ہجوم مغلوب کن، لیکن اس خیال سے کہ مبادا میرے سکوت کی کوئی غلط تعبیر کی جائے، بغیر اس فرصت کا انتظار کئے ہوئے جب میں تفصیل و تشریح

سے کام نے سکوں گا، اس قدر عرض کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ :-

دگر مگو کہ چو من در جہاں ہزار انند

سلسلۂ استفسارات میں، حضرت عیسیٰ کے مسئلہ کو میں نے اس مہینے میں اس لئے ملتوی کر دیا ہے کہ لوگ ایک ہی بحث سے گھبرا نہ جائیں اور علاوہ اس کے جن حضرات کے استفسار پڑے ہوئے ہیں وہ بھی رفتہ رفتہ ختم ہو جائیں۔ اس مہینے کا استفسار خاص اہمیت رکھتا ہے اور یقین ہے کہ دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائیگا۔ ارادہ ہے کہ آئندہ مہینے میں تمام اہم استفسارات کا جواب دیکر اس بار سے سبکدوش ہو جاؤں اگر خدا فرصت و اطمینان نصیب کرے۔

اس ماہ کے مضامین میں "سرخ گلاب" ایک فسانہ ہے جس کے متعلق جناب فراق گورکھپوری نے لکھا ہے کہ بنگلہ زبان سے انھوں نے ترجمہ کیا ہے اور جس کو وہ بنگالی زبان کا شاہکار سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ ترجمہ و اقتباس ہے آسکر وائلڈ کے فسانہ "گل و بلبل" کا۔ اس میں شک نہیں کہ فسانہ جذبات کے لحاظ سے نہایت بلند ہے اور سلوب بیاں کا بہترین نمونہ۔ دوسرا افسانہ "قربانیاں" اس خصوصیت کے لحاظ سے کہ اس میں ہماری بعض معاشرتی نقایص کو نہایت خوبی سے دکھایا گیا ہے قابل داد ہے، افسانہ نگار کا قلم بہت "الم پسند" واقع ہوا ہے اور افسانہ کے اندر ایسے مواقع پر اس نے نہایت موثر تصریحات و جزئیات سے کام لیا ہے

مضمون دین مسیحی اس مہینے میں ختم ہوتا ہے، اور اگر حضرت عیسیٰ کے مسئلہ ولادت و وفات کو پیش نظر رکھ کر پورے مضمون کا مطالعہ کیا جائے تو بہت سے پوشیدہ راز بے نقاب ہو سکتے ہیں۔ لیکن جن نگاہوں پر اعجوبہ پرستی کے پردے پڑے ہوئے ہیں ان کا اس طرف توجہ کرنا معلوم۔ ہم مولوی خلیل الرحمٰن صاحب کے بہت ممنون ہیں کہ انھوں نے ایسا بیش بہا مضمون نگار کو عطا فرمایا۔

فراست الید کا مضمون بہت دلچسپی کے ساتھ پڑھا جا رہا ہے آئندہ مہینے سے ہات کی لکیروں کا ذکر کیا جائیگا کہ اصل چیز وہی ہے۔ یقین ہے کہ یہ سلسلہ سال کے اندر ختم ہو کر ایک رسالہ کی صورت اختیار کر سکیگا۔

غالب کے ذوق فارسی کے متعلق جناب ع۔ ع۔ یز نے مضمون بھیجکر ایک ایسی بحث کا افتتاح کیا ہے، جو عرصہ سے میرے پیش نظر تھا۔ یہ مضمون آئندہ ماہ میں ختم ہو جائیگا اور اس کے بعد میں خود ذرا تفصیل کے ساتھ غالب کے اس ذوق کے متعلق لکھونگا۔

اس مہینے کے مضامین میں حافظ اور ابن یمین کے متعلق جو مقالہ درج ہوا ہے خصوصیت کے ساتھ مطالعہ کے قابل ہے میں بہت ممنون ہونگا اگر کوئی صاحب اس مسئلہ پر موافقت یا مخالفت میں اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔

قسطاس مستقیم کو بھی میں نے بہت سے محذوفات کے بعد اس مہینے میں ختم کر ہی دیا، ہرچند مضمون نگار نے اسے بہت محنت سے مرتب کیا تھا، لیکن تنقید صحیح کے حدود سے پھر بھی دور تھا۔

انشاء اللہ خاں کا ایک غیر مطبوعہ رسالہ فارسی زبان میں لطایف السعادت کے نام سے مجھے دستیاب ہوا ہے جسمیں انھوں نے نواب سعادت علی خاں کی فرمائش سے لکھنؤ اور دہلی کی زبان پر گفتگو کر کے ان کا باہمی فرق دیکھا ہے۔ گو رسالہ مختصر اور ناکافی ہے لیکن اس کی یہ خصوصیت کہ انشاء نے اسے لکھا اور اسوقت تک کہیں شائع نہیں ہوا ضرور قابل لحاظ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسکو ایڈٹ کر کے ملک کے سامنے پیش کر دوں۔ اس لئے التماس ہے کہ اگر کسی اور صاحب کے پاس اس کا نسخہ موجود ہو تو مطلع فرمائیں تاکہ میں خود اسے آکر دیکھ لوں اور مقابلہ کر کے صحت کر لوں۔

آئندہ مہینوں میں جو مخصوص مضامین شائع ہونے والے ہیں، ان میں سے ایک طنزیات (Satire) پر ہے اس مضمون میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ اردو زبان کے طعن تشنیع، بولی ٹھولی، چلی کٹی، پھبتی، ضلع جگت، آوازہ، تضحیک، تمسخر اور لطایف و ظرایف وغیرہ پر ناقدانہ بحث کی گئی ہے اور شعراء، اساتذہ، مصنفین و مولفین، و دیگر ماہرین فن کے واقعات مع شگفتہ مثالوں کے بیان کئے گئے ہیں۔ اردو میں اس موضوع پر یہ پہلا مضمون ہے جو آئندہ مہینے سے شائع ہونا شروع ہوگا۔

دوسرا مضمون مرزا رجب علی بیگ سرور کی مشہور کتاب فسانۂ عجایب سے متعلق ہے جس میں یہ حیرت انگیز انکشاف نظر آئے گا کہ سرور کا یہ کارنامہ حقیقتاً ان کا کارنامہ نہیں ہے بلکہ اس کا سررشتہ جس ہاتھ میں تھا وہ کوئی اور تھا، بعض ایسے دلچسپ تاریخی فسانے بھی شائع کئے جائیں گے جن کی طرف تاریخ نے توجہ نہیں کی اور اب تک وہ پردۂ خفا میں تھے۔

بعض مضامین انشائے لطیف اور تنقید عالیہ کے بھی پیش کئے جائیں گے۔

نیاز فتحپوری

غالب کا ذوقِ فارسی

فارسی بیں تا بدانی کاندر اقلیمِ خیال
مانی و ارژنگم و آں نسخہ ارتنگ من است (غالب)

مرزا کی اردو شاعری جس طرح محلِ نزاع رہی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ان کی فارسی شاعری کے باب میں یہ ہنگامے بپا نہیں ہوئے دنیائے صحافت میں مرزا کی اردو شاعری کے متعلق وقتاً فوقتاً جو معرکے ہوتے رہے، اور آخر دونوں جماعتوں سے نہ کوئی ہارا نہ کوئی جیتا، اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ہر ایک اپنے مفید مطلب اشعار ڈھونڈھ ڈھونڈھ لاتا تھا۔ اور فریقِ مخالف کے اعتراض پر ایک لمحہ کے لئے بھی ٹھنڈے دل سے غور نہ کیا جاتا تھا۔ ورنہ اگر ہر دو فریق متانت اور سنجیدگی سے اصل بحث پر طبع آزمائی کرتے اور اس اصول پر کاربند رہتے کہ ہر انسان میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور نقائص بھی، تو مرزا کی چند خوبیاں مان لینے اور چند نقائص تسلیم کر لینے کے بعد بحث میں محاکمہ کی شان پیدا ہو جاتی اور یہ تمام شور و شغب بے فائدہ نہ ٹھہرتا۔ مگر مناظرہ نے مکابرہ کی صورت اختیار کر لی اور دونوں فریق اس قدر قطعِ مسافت کے بعد بھی وہیں دیکھے گئے۔ جہاں سے چلے تھے۔

میرا یہ خیال تھا کہ اس ناروا داری اور جانب داری کا شاید اب خاتمہ ہو چکا ہوگا اور اس قسم کے یکطرفہ دلائل و براہین کے مظاہرے اب دیکھنے میں نہ آئیں گے۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ ناجائز تعصب و بلاوجہ ناروا داری کے مناظرے سے دنیائے ادب کو ابھی کچھ اور رنج اندوز ہونا ہے۔ نومبر کے النّاظر (لکھنؤ) میں جناب امیر بدایونی صاحب کا ایک "انعامی مضمون" بہترین غزل گو کے عنوان سے دیکھا گیا۔ اس میں وہ تمام باتیں موجود تھیں جو اس بحث پر اس سے پہلے مختلف اشخاص فرداً فرداً لکھ چکے ہیں۔ یکطرفہ دلائل اسقدر نحیف اور رکیک ہیں کہ ایسے انشا پرداز سے اتنی ناانصافی کی کسی حالت میں بھی توقع نہ ہو سکتی تھی۔ چونکہ میرا موضوعِ سخن یہ نہیں ہے اس لئے اس کے متعلق کوئی آئندہ صحبت میں کچھ ضروری اور مناسب باتیں گوشگزار کی جائیں گی۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہندوستان کا یہ عظیم الشان شاعر دوست و دشمن کے ہاں فارسی کا ایک بلند پایہ شاعر مانا جاتا ہے لیکن موافق فریق بھی مرزا کی شاعری سے اتنا ہی ناواقف ہے۔ جتنا کہ مخالف فریق۔ آخر الذکر جماعت تو محض اس لئے مرزا کی شاعری سے ناواقف ہے کہ وہ اس کے کلام کو درخورِ اعتنا نہیں خیال کرتی لیکن پھر وہ اسے ایک بلند پایہ شاعر اس لئے تسلیم کرتے ہیں کہ ایسا مان لینے کے بعد بھی ان کے مسلمات پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ بلکہ انھیں اپنے مفید مطلب ایک اور دلیل

ہاتھ آجاتی ہے، کہ چونکہ مرزا کا رجحانِ طبیعت ہمیشہ فارسی کی طرف رہا ہے اس لئے ان کے اردو اشعار میں بھی فارسی کی وہ جھلک پائی جاتی ہے، جس نے ان کے کلام کو ادق کر دیا ہے اور اس لئے وہ ناقابلِ توجہ ہے

فریقِ موافق اسی کو اپنی بڑی کامیابی خیال کرتا ہے۔ کہ ان کا ممدوح کم از کم فارسی کا شاعر تو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ چونکہ کوئی ضرورت دائمی نہیں ہوتی۔ اس لئے مدت العمر مرزا کا فارسی کلام دیکھنے کی نوبت نہیں آتی۔ اور پھر فارسی کی کساد بازاری نے اور بھی اس متاع کی قیمت کم کر دی ہے۔

غرض موافق و مخالف دونوں تاریکی میں ہیں اور مرزا کے اس زبردست کارنامے کا بھی حقیقی معنوں میں کوئی قدردان نہیں۔

گو یہ ضروری ہے۔ اور میں اس سے بالکل متفق ہوں، کہ ہم غیر ملکی زبانوں سے فائدہ اٹھائیں اور اپنی زبان کے ادبی ذخیروں کو وسیع کریں۔ لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ہم اپنے بزرگوں کے کارناموں سے یکقلم دل برداشتہ ہو جائیں اور صرف اسی فقرے کو دہرا دہرا کر خوش ہوا کریں، کہ وہ ایک رفیع الشان انسان تھا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے ملک اور اہلِ ملک سے بددلی اور افسردگی محسوس کرنے لگتا ہے۔ اور گو وہ زبان سے کہتا ہے کہ اس کا ملک بھی اس باب میں مفلس نہیں "لیکن غیر ملکی" دل اسکے قول کی تکذیب کرتا ہے اور اس کے دل میں ملکی بزرگوں کی حقیقی عزت باقی نہیں رہتی

جدید تعلیم یافتہ طبقہ سب سے زیادہ اس لاعلاج مرض کا شکار ہو رہا ہے اکثر تو کالجوں اور اسکولوں سے ایسے کور مذاق ہو کر نکلتے ہیں کہ انھیں لٹریچر اور علم ادب سے مس ہی نہیں ہوتا اور جو سلیم الفطرت ہوتے ہیں وہ اپنی تمام توجہ ورڈسورتھ، ملٹن۔ اور شیکسپیر وغیرہ پر مبذول رکھتے ہیں یا انگریزی کے اخلاق سوز اور عریاں ناول ان کے زیر مطالعہ رہتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج کوئی حالی، شبلی، سرشار اور شرر نہیں پیدا ہوتا۔ اس جمود کی زیادہ تر ذمہ داری اس غفلت کے سر ہے، جو ملکی علم ادب سے برتی جا رہی ہے مرزا کی تمام شاعری پر اس لاپروائی کی تاریک گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں گو ان کے اردو کلام کی طرف جدید تعلیم یافتہ جماعت کی کسی قدر توجہ مبذول ہوئی ہے۔ لیکن مرزا کا فارسی کلام ابتک بالکل کس مپرسی کی حالت میں ہے۔

مرزا کی طبیعت کو فارسی سے فطری لگاؤ تھا۔ انھوں نے فارسی میں بہت کچھ لکھا۔ اس پر انھیں ناز تھا۔ اور بجا طور پر ناز تھا مرزا کے کلام کے باقاعدہ مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ فارسی میں بھی انھوں نے بیدل کا تتبع کرنا شروع کیا تھا۔ مگر بہت جلد وہ اس طرز سے دست کش ہو گئے۔ ہم مرزا کو اس باب میں ملامت نہیں کر سکتے، اور نہ ہمیں نکتہ چینی کا کوئی حق ہے مرزا کی دشوار پسند اور اعجوبہ پرست فطرت یہ گوارا ہی نہیں کر سکتی تھی کہ وہ اس شاہراہ پر گام زن ہوتی جس پر ہر خاص و عام طبع آزمائی کر رہا ہے۔ انھوں نے اپنے لئے ایک ہی شاہراہِ عمل تجویز کی۔ اور اپنی سلیم فطرت کی رہنمائی میں اس میں جائز اور مناسب ترمیمیں کیں۔ اور آخر اپنی خاص لے میں اس زور سے نغمے الاپے کہ کائناتِ عالم کا ہر ہر ذرہ رقصاں نظر آنے لگا اور اس صداے پرکیف سے

زمین و آسمان گونج اُٹھے۔

ایسی حالت میں جب قدما کی تقلید ابنائے دہر کے رگ و پے میں ساری ہو چکی ہو۔ یہ مرزا ایسے زبردست انسان سے ہی ممکن تھا کہ وہ اپنے لئے ایک نیا میدانِ عمل تجویز کریں قدامت پسندوں نے بہت کچھ دے دے کی۔ اور اب بھی لکیر کے فقیر، مرزا کی اس جدت و ابداع کو غیر مستحسن نگاہوں سے دیکھتے ہوئے انھیں لغو گو کہنے سے نہیں شرماتے۔ لیکن عنقریب اور زیادہ واضح ہو جائیگا کہ مرزا کے معترض کسقدر غلطی کا شکار رہے ہیں۔

فارسی میں شعر و سخن کے تمام اصناف میں مرزا نے طبع آزمائی کی ہے۔ متاخرین میں نظیری، عرفی، اور ظہوری غزل کے استاد مانے گئے ہیں۔ قصیدہ میں عرفی اور انوری کے پایہ کا کوئی شخص نہیں ہوا، رباعیات میں حکیم عمر خیام لاثانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ جامی، نظامی اور امیر خسرو کی مثنویاں بہت بلند پایہ خیال کی جاتی ہیں۔ لیکن کیا اس خدائے سخن نے بھی ان اصناف شاعری میں جو کچھ کیا۔ وہ کسی سے کم نہیں کیا۔

نظیری، عرفی، خیام، نظامی، امیر خسرو وغیرہ کی شہرت اور شاعرانہ کمال زیادہ تران سرپرستوں کا شرمندۂ احسان ہے جنھوں نے اپنے اپنے وقت میں ان لوگوں کی ہمت افزائی کی، اور ان کے جوہر طبع کو اور چمکا دیا۔ لیکن غالب کی شاعری نے بالکل مختلف اور ناموافق حالات میں نشو و نما پائی۔ وہ ہمیشہ گوناگوں مصائب اور حوادث میں مبتلا رہے۔ حکومت یا پبلک کی طرف سے کبھی ان کی قدر افزائی نہ ہوئی۔ شاعروں میں نہ کوئی ان کی سنتا اور نہ سمجھتا، وجہ معاش کے ہاتھوں وہ آخری دم تک جاں بلب رہے حالات کی اس قدر ناسازگاری کے باوجود مرزا کی شاعری کا اس درجہ کمال تک پہنچنا اگر معجزہ نہیں تو معجزے سے کم بھی نہیں آج ہمارے ذوق پرست دوست مرحوم بجنوری کے اس فقرے پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔

"ہندوستان میں دو الہامی کتابیں ہیں، وید مقدس، اور دیوان غالب"

کیا ایسے ناموافق حالات میں ایسی کتاب کا لکھا جانا حیرت آفریں نہیں ہے؟ کیا اس کے یہی معنے نہیں ہیں؟ کہ مرزا کی تخلیق سے فطرت کا اقتضا ہی یہ تھا کہ وہ شاعر ہوں اور کیا ایسے فطری شاعر کے کلام کو الہام کہنا موزوں نہیں؟ اگر مرزا خانخاناں کے زمانے میں ہوتے، یا خانخاناں مرزا کے زمانے میں ہوتے اور قدر افزائی کا معیار بھی وہی ہوتا کہ ایک ایک شعر کہنے پر سونے اور موتیوں سے تولے جاتے۔ کوئی ہے جو اسکا اندازہ لگا سکے کہ مرزا کے مرغ تخیل کی پرواز کی کیا رفتار ہوتی؟ اور آج ہماری زبان میں علم و ادب کا اتنا بہترین ذخیرہ موجود ہوتا کہ اس وقت انسانی دماغ اس کا قیاس بھی نہیں کر سکتے۔

فارسی حکومت کی زبان تھی۔ اور یہ حکومت کی ہی نوازشیں تھیں کہ نظیری اور عرفی جیسے بلند پایہ شاعر اس سرزمین کو نصیب ہوئے۔ ہر ملک اور ہر حکومت کا تمدن علیحدہ ہوا کرتا ہے۔ مغلوں کا تمدن اسوقت تک عروج پر رہا جب تک حکومت

زوال آشنا نہ ہوئی۔ حکومت پر زوال آنا تھا کہ مغلیہ تہذیب و تمدن کا سورج فوراً غروب ہوگیا، تمدن اور شاعری کا دامن چولی کا ساتھ ہے جب مرزا کی شاعری کا آغاز ہوا تو بہادر شاہ انگریزوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی تھے اور پھر جس محفل میں ذوق کو ملک الشعراء اور خاقانیِ ہند کے خطابات مل چکے تھے، وہاں مرزا کی حقیقت ایک "لغوگو اور مہمل تراش" سے زیادہ ہو ہی کیا سکتی تھی۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد رہی سہی آس بھی جاتی رہی ایسے حالات میں مرزا سے ایسی بلند پایہ شاعری کسی حالت میں بھی الہام، سے کم نہیں ہوسکتی عرفی اور نظیری کی شاعری کو حسب قاعدہ روز افزوں تمدن کے ساتھ ساتھ بڑھنا چاہئے تھا چنانچہ وہ بڑھی لیکن زوال پذیر تمدن کے ساتھ مرزا کی شاعری کو زوال آشنا ہونا چاہئے تھا۔ لیکن اس کے برعکس وہ اس زمانے کی شاعری کا ایسا دلاویز و دلربا نمونہ چھوڑ گئے کہ عرفی اور نظیری کی شاعری بھی اس کی نظیر نہیں پیش کرسکتی

اگر کوئی بناوٹی یا مصنوعی شاعر ہوتا تو حالات کی ناسازگاری اور خصوصاً پبلک کی ناقدر شناسی سے دق ہوکر اس بیکار مشغلہ شاعری سے توبہ کر لیتا۔ لیکن مرزا چٹان کی طرح اپنے ارادوں پر جمے رہے، وہ کسی چیز سے بھی بددل نہ ہوئے اور بددل ہوتے بھی کیسے جبکہ اُن کی تخلیق کا منشا یہی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے بعد ایک ایسی زندہ جاوید یادگار چھوڑی کہ آج دنیا اسکو سرآنکھوں پہ لیتی ہے

چونکہ مجھے مرزا کے فارسی کلام کے متعلق چند عنوان قائم کر کے تفصیلاً عرض کرنا ہے، اس لئے سردست میں مرزا کی مثنویات سے بحث کرنا چاہتا ہوں۔

تمام اصناف شاعری سے مثنوی زیادہ وسیع اور زیادہ مفید خیال کی جاتی ہے، غزل اور قصیدہ کی نسبت اسمیں شاعرانہ پابندیاں بہت کم ہوتی ہیں اس کا ہر شعر علیحدہ قافیہ اور علیحدہ ردیف لئے ہوتا ہے اور ایک مضمون کو مسلسل اور واضح طور پر بیان کرنے کے بہت کچھ امکان ہوتے ہیں جذبات و واردات قلب کا اظہار جیسا یہاں ہوتا ہے اور کہیں نہیں ہوسکتا چھوٹے چھوٹے واقعات اور معمولی معمولی حالات جو ایک واقعہ کی تمام کڑیوں کو ملا دیتے ہیں نہایت اچھی طرح نبھائے جاسکتے ہیں۔ غرض مثنوی شاعری کی ایک نہایت مفید نوع ہے۔

مرزا نے کم و بیش گیارہ مثنویاں لکھی ہیں لیکن تمام کی تمام نہایت ہی مختصر ہیں۔ فارسی میں مثنوی کی جو کثرت ہے اور پھر وہ جسقدر ضخیم ہیں اس لحاظ سے مرزا کی مثنویاں نہایت کم پایہ اور ناقابلِ اعتنا معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن چونکہ اس وقت بحث کا پہلو یہ ہے کہ ان میں لفظی و معنوی خوبیاں کسقدر پائی جاتی ہیں اور چونکہ مرزا کا کلام اس باب میں کبھی بھی مفلس نہیں ہوا اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان پر مفصل تبصرہ کیا جائے

مرزا کی ان مثنویات کے پڑھنے سے ہم اس امر کا اندازہ نہیں لگا سکتے کہ واقعہ نگاری اور معاملہ بندی میں انھیں

کسقدر کمال حاصل تھا کیونکہ ان کی کوئی مثنوی ایسی نہیں جسمیں کوئی واقعہ بیان کیا گیا ہو غالباً اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ چونکہ مرزا کی تخئیل بہت ہی زبردست واقع ہوئی تھی وہ قدم قدم پر مرزا کے سمندِ قلم کو بے لگام کردیتی ہوگی جس سے واقعات اور حالات کا تسلسل قائم نہ رہ سکتا ہوگا اور واقعہ کی شکل مسخ ہوجاتی ہوگی۔ اس لئے مرزا نے اس بربے رونے سے نہ رونا ہی اچھا خیال کیا۔ لیکن اس سے مرزا کی شاعری پر حرف نہیں آسکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ فارسی کے سعدی نہیں تھے بلکہ حافظ تھے۔ ان کا عرش سیر تخئیل بھلا کب گوارا کرسکتا تھا۔ کہ واقعات نگاری کے چکر میں اپنی سرعتِ خیال اور بلند پروازی کو خیرباد کہہ بیٹھتے علاوہ ازیں مرزا کے ہاں لفظی و معنوی صنعتوں کا نہایت زبردست التزام ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ معاملہ نگاری کی صورت میں ان چیزوں کا التزام قائم نہیں رکھا جاسکتا۔ اور مرزا اس باب میں اتنے عالی واقع ہوئے تھے کہ وہ لفظی و معنوی صنعتوں کے اسی التزام کو روحِ شاعری کہا کرتے تھے۔

مرزا نے ان مثنویات میں بھی خوب جدت اور اختراع سے کام لیا ہے چنانچہ بعض مثنویات کے نام بھی انھوں نے نہایت عجیب اور چسپت رکھے ہیں۔ مثنوی معنوی کے پہلے شعر پر جو مثنوی لکھی گئی ہے۔ اس کا نام سرمۂ بینش تجویز کیا ہے اسی طرح بعض سے کے، دردوداغ، چراغِ دیر، اور ابرِ گہربار وغیرہ نام ہیں۔ کلکتہ کا وہ ہنگامہ جس کو مرزا کی زندگی کے حالات میں خاص خصوصیت حاصل ہے، مدعیانِ علم کے نام جو مثنوی کہہ کر روانہ کی تھی اس کا نام مرزا نے بادِ مخالف تجویز کیا ہے۔ ہرچند لوگوں نے بادِ مخالف کو بہت مکروہ معنی پہنائے، اور احباب نے مشورہ بھی دیا کہ اس کا نام بدل ڈالئے۔ مگر مرزا تھے کہ باقاعدہ اپنی بات پر اڑے رہے اور نام بدلنے کا خیال تک بھی نہ آیا۔

گو اس وقت مجھے صرف مرزا کے شاعرانہ کمال سے بحث کرنی ہے۔ لیکن اس ضمن میں اگر میں چند اور ضروری امور کی طرف بھی آپ کی توجہ کو منعطف کروں تو مجھے معذور خیال فرمایا جائے۔

شیدایانِ مرزا میں یہ اختلاف چلا آتا ہے۔ کہ مرزا سنی تھے یا شیعہ، مولانا حالی نے ان کو مائل بہ تشیع اور تفضیلیت علیؑ کا قائل ظاہر کیا ہے مگر بعض میرے شیعہ دوست مرزا کو شیعی المذہب بیان کرتے ہیں۔ ابھی ابھی چند دن ہوئے کسی صاحب نے مرزا کو شیعہ قرار دیا تھا اور اسپر چند ایک دلائل بھی پیش کی تھیں۔ بعد میں کسی صاحب نے جواب بھی لکھا، اور مرزا کے خطوط بطور استشہاد پیش کئے کہ مرزا سنی المذہب تھے۔ لیکن میرے خیال میں ان ہر دو حضرات سے کسی کی نظر بھی مرزا کی مثنویات پر نہ تھی۔ ورنہ لکھنے والے کو لکھنے کی دقت اٹھانی پڑتی

مرزا کی مثنویات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنی المذہب تھے۔ اور انھیں اہل سنت سے کمال محبت تھی۔ اور غالباً مولینا حالی نے یہیں سے استنباط کیا ہے کہ مرزا تفضیلت علی علیہ السلام کے قائل تھے۔ مرزا استمداد بالاولیاء کے بھی قائل ہیں۔

چنانچہ اسپر اُنھوں نے نہایت شد و مد سے بحث کی ہے ہمیں کسی کے عقائد پر نکتہ چینی کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ لیکن اگر مرزا کی دلائل کو درست تسلیم کر لیا جائے تو وہی دلائل اسوقت اور زور سے ایک بت پرست کے مفید مطلب ہو سکتی ہیں جس طرح ایک مومنِ موحد کی اس میں شک نہیں کہ مرزا جیسے فلسفی شاعر کی نیت اور طریقۂ استمداد ضرور ایک عامی اور جاہل کی نیت اور طریقہ سے مختلف ہوگا۔ لیکن اکبر اعظم کے سجدۂ تعظیم کے اسوقت یہی معنی مراد لئے جاتے ہیں جو اسوقت استمداد بالقبور و الاولیا کو قرار جائز دینے والے حضرات مراد لیتے ہیں۔

مرزا نبوت اور ولایت کو الوہیت کا پرتو خیال کرتے ہیں۔ اور استمداد بالاولیا کو حقیقتاً استمداد باللہ ہی خیال فرماتے ہیں اور یہی وہ عقیدہ ہے جس سے ہمہ اوست، کا مشہور عالم مذہب پیدا ہو گیا ہے۔

اول ما خلق اللہ نوری کی تفسیر یوں بیان فرما کر۔

جلوۂ اول کہ حق برخویش کرد مشعل از نورِ محمد پیش کرد

فرماتے ہیں۔ کہ محمد رسول اللہ کے نور سے عالم کائنات میں تمام چیزیں جلوہ گر ہو گئیں۔ اس کی مثال اس طرح ہے کہ جب سورج نمودار ہوتا ہے تو بے انتہا ذرات جو اس سے پہلے بھی اس عالم میں موجود ہوتے ہیں دکھائی دینے لگتے ہیں۔

پھر وہی نورِ الوہیت انبیاء کی وساطت سے اولیاء میں تجلی ریز ہوتا ہے۔ جیسے سورج کی روشنی سے چاند اکتسابِ نور کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح نبی سے ولی کتساب کمال کرتا ہے۔ بنابریں نبی یا ولی سے استمداد کرنا ناجائز نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ گو یہ درست ہے کہ بغیر بادشاہ کی اجازت کے کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ لیکن خاصانِ شاہ کو اپنے خاص تعلقات کی بنا پر یہ حق حاصل ہوتا ہے۔ کہ بالواسطہ وہ اس کام کے فاعل کہے جائیں۔ چنانچہ دریا سے گلاس میں پانی پینا دریا ہی کا پانی پینا ہے۔ لیکن جام کی وساطت سے انسان اپنی پیاس بجھانے میں بہت اچھی طرح کامیاب رہتا ہے

شد عیاں زاں نور در بزمِ ظہور ہر چہ پنہاں بود از نزدیک و دور

ہمچو آں ذرات کاندر تاب مہر از نقابِ غیب بنمایند چہر

مہر بر ذرات پرتو افگن است عالم از تابِ یک اختر روشن است

ہر ولی پرتو پذیر است از ولی چوں مہ از خورشید مستنیر است از نبی

از ولی و از نبی خواہی مدد تا نہ پنداری کہ ناجائز بود

بر نیاید کارے بے فرمانِ شاہ لیک آئینہ ست باخاصانِ شاہ

ہر کہ ادرا نورِ حق نیر دفزاست ہر چہ از روئے خواستی ہم از خداست
بر لبِ دریا گر آبے خوردۂ آب از موجے بجام آوردۂ
آب از موج آمداند رجام تو لیک از دریا بود آشام تو

اس کے بعد یہ لکھتے ہیں "کہ اگر کوئی کسی صاحب کے وقت یا محمد، یا علی، یا معین الدینؒ، یا عبدالعزیزؒ، رفیع الدین، کلیم اللہ، یا فخر الدین کہہ دے۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ پیروں اور اولیا اللہ سے استمداد کر رہا ہے بلکہ فی الحقیقت وہ خدا سے مدد طلب کر رہا ہے۔ لیکن ان برگزیدگان کردگار کو اس کے دربار میں بطور شفیع پیش کر رہا ہے"

تا نہ پنداری زپیران خواستیم حاجتِ خود را زیزداں خواستیم
لیک در پوزش بدرگاہِ رفیع ما ہمے آریم پیراں را شفیع

پھر مثال کے طور پر فرماتے ہیں "کہ مصر سے یوسف علیہ السلام کے پیراہن سے یعقوب علیہ السلام کی آنکھیں پھر منور ہو جاتی ہیں، مجنون سگِ کوئے لیلیٰ کے پاؤں چوما کرتا تھا۔ کیا تم اس وساطت سے انکار کر سکتے ہو؟"

بوئے پیراہن ز مصر آرد صبا دیدۂ یعقوب زد یا بد جلا
در عرب بود ست منعم زادۂ قیس نامی دل بہ لیلے دادۂ
بر سگے کز کوچۂ لیلی ستے قیس از خویش فرد نستر خواستے
ے توانی گفت ہاں ای تن پرست پیر کنعاں بود پیراہن پرست
یا توان گفتن کہ خود چوں بودہ است سگ پرستی کیشِ مجنوں بودہ است
عشق گر با پیرہن در بار ماست نیست بہر جامہ از بہر خداست

آگے چلکر لکھتے ہیں۔ کہ انبیا اور اولیا کی مثال اس طرح ہے جیسے محمل اور جلوۂ حق، لیلے پردہ نشین ہے اب گو مجنوں اور محمل سے کوئی سروکار نہیں لیکن یہ بھی تو نہیں ہو سکتا کہ محمل کو بالکل بے کار خیال کیا جائے"

حق پرستاں را بہ باطل کار نیست محوِ لیلے را بہ محمل کار نیست
گر نہ از لیلے بود دیدار جوئے کے بہ محمل آورد دیوانہ روئے
گرچہ با لیلے است حرف از جان زدن لیک بر محمل لکد نتواں زدن
آن ولے دریا دحق مستغرق است عین حق گر نیست خود محو حق است

مرزا کی اس مثنوی سے اس امر کا پتہ بھی چلتا ہے۔ کہ ان دونوں علما میں مذہبی بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ مولانا فضلِ حق خیر آبادی

مشہور فلسفی بہ قید حیات تھے۔ اور غالباً مولانا محمد قاسم مرحوم نانوتوی سے امکان و امتناعِ نظیر پر ہنگامہ کارزار گرم تھا۔ مولینا فضلِ حق مرحوم امتناع نظیر کے قائل تھے۔ مرزا سے ان کے نہایت خوشگوار تعلقات تھے اس بنا پر اُن سے فرمایش کی کہ وہ اس باب میں اپنے خیالات نظم کریں۔ مولانا مرزا کی پروازِ تخیل سے واقف تھے ان کا خیال تھا کہ جو کچھ ان کے قلم سے نکل جائیگا وہ علاوہ دلائل و براہین کی قوت کے اسلوب بیان، اور خاص طرز ادا کے باعث بہت ہی دلچسپ اور دلفریب ہوگا اور پھر جب اسے شعر کا لباس پہنا یا جائیگا تو اور زیادہ جاذب توجہ ثابت ہوگا۔ حسب فرمائش مرزا نے اس خیال کو نظم کیا۔ گو مرزا کو ان مباحثات سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ اسلیئے انہیں غور و خوض کے مواقع بھی بہت کم ملے ہونگے۔ لیکن اس باب میں بھی ان کی فطرت سلیمہ نے رہبری کی۔ اور انھوں نے اصل مسئلہ نہایت واضح طور پر یوں بیان فرمایا۔

"اے لوگو تم جو نظیر کے امکان کے قائل ہو۔ بیشک خدائے ذوالجلال پر یہ امر مشکل اور دشوار نہیں لیکن تم اپنے اس انکار کی ایک عمدہ اور مناسب توجیہ کر سکتے ہو کہ جب اس عالم میں ایک چاند اور ایک سورج ہے۔ تو یہ موزوں نہیں معلوم ہوتا کہ خاتم ایک سے زیادہ ہو۔ ہاں جس طرح اور بے شمار عالم ہو سکتے ہیں اور پھر بے شمار چاند اور سورج ہو سکتے ہیں اسی طرح ان بے شمار دنیاؤں کے لئے بے شمار خاتم ہو سکتے ہیں۔ ہاں یہ ذرا اچھا نہیں کہ ایک عالم کے لئے دو خاتم فرض کرلئے جائیں۔ چونکہ خدائے تعالےٰ ہر ذرے سے ایک نیا عالم پیدا کر سکتا ہے۔ اس لئے ہر عالم کے ہم ایک خاتم تسلیم کرتے ہیں"

وین کہ گوئی تواند کرد کار	چون محمدؐ دیگرے آرد بکار
یا خداوند دو گیتی آفرین	ممتنع بود ظہورے این چنین
صورت آرائش عالم نگر	یک مہ و یک مہر و یک خاتم نگر
آنکہ مہر و ماہ و اختر آفرید	میتواند مہر دیگر آفرید
حق دو مہر از سوے خاور آورد	کور باد آن کو نہ باور آورد
لیک در یک عالم از روے یقین	خود نگنجد دو ختم المرسلین
ہر کجا ہنگامۂ عالم بود	رحمتہ للعالمینے ہم بود
کثرت ابداعِ عالم خوب تر	یا بیک عالم دو خاتم خوبتر
در یکے عالم دو تا خاتم مجو	صد ہزاراں عالم و خاتم بگو

جب مرزا نے مولانا کو یہ اشعار سنائے تو وہ بہت ناراض ہوئے اور فرمانے لگے کہ "یہ تم نے کیا بکا ہے" چنانچہ

مرزا نے محض مولانا کی رضامندی کی خاطر چند شعر اور زائد کئے جبمیں لکھا کہ رسول اللہ کی نظیر ناممکن ہے۔ آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مرزا کی نظرت مسلمہ کج روی سے کسقدر کتراتی تھی اور وہ علمی مسائل جو صرف علماء کا حصہ تھا ہمارے فلسفی شاعر نے انکی گتھی کو کس آسانی سے سلجھا دیا۔ فرماتے ہیں۔

"جب تم محمد رسول اللہ کو ختم المرسلین کہتے ہو۔ تو ضرور ہے کہ المرسلین کا لام استغراق کے لئے ہوگا۔ اور تمام افراد پر حاوی ہوگا۔ اس لئے اگر ہزار دن عالم ہوں جب بھی اس قاعدہ کے رو سے خاتم صرف ایک ہی ہوگا جب تم اس کے قائل ہو کہ اول ماخلق اللہ نوری درست ہے تو ضرور ہے کہ تمام عالم اُس کے نور کا پر تو اور ظہور ہو۔ اگر ہر عالم کے لئے ایک علیحدہ خاتم تسلیم کیا جائے تو رسول اللہ کی اولیت قائم نہیں رکھی اگر جوہر کل (خدا) ناقابل انقسام ہے تو محمد رسول اللہ جو ہر کل کا حقیقی اور اولین ظہور ہے کس طرح انقسام پذیر ہو سکتا ہے تم امکان کی لفظی وسعت سے غلط فہمی میں مبتلا نظر آتے ہو لیکن در اصل میرا امکان اس وسعت کی اجازت نہیں دیتا جب خدائے ذوالجلال کو یہ منظور نہ تھا کہ محمد رسول اللہ کا سایہ ہو۔ تو یہ اسے کب منظور ہو سکتا ہے کہ اس کی مثل کا خواہ کسی عالم میں ہی سہی وجود ہو"

اے کہ ختم المرسلینش خواندهٔ　　دانم از روئے یقینش خواندهٔ
این الف لامے کہ استغراق راست　　حکم ناطق معنی اطلاق راست
نشاء ایجاد ہر عالم یکے است　　گر دو صد عالم بود خاتم یکے است
خود ہمی گوئی کہ نورش اول است　　از ہمہ عالم ظہورش اول است
اولیت را بود شانے تمام　　کے بہر فردے پذیر انقسام
جوہر کل بر نتابد تثنیہ　　در محمد رہ نیابد تثنیہ
ور نوزی اندر امکاں ریو و رنگ　　حیز امکاں بود بر مثل تنگ
ہر کرا با سایہ نہ پسندد خدا　　ہمچو اوئی نقش کے بندد خدا
ہم گہر مہر منیرش کے بود　　سایہ چوں نبود نظیرش چوں بود
منفرد اندر کمال ذاتیست　　لاجرم مثلش محال ذاتی است

عذر کے بعد جب بہادر شاہ کو نظر بند کرکے رنگون بھیج دیا گیا اور مغلیہ خاندان کا یہ آخری ٹمٹماتا چراغ باد صرصر کے جھونکوں سے فنا آشنا ہوگیا۔ تو جہان آباد میں مغلیہ تہذیب اور تمدن یک لخت فنا کی نیند سو گئے۔ نئی حکومت قائم ہوگئی اور نہ

نئے آئین و قوانین رائج ہو گئے۔ دنیا ظاہر پرست ہوا ہی کرتی ہے مغربی تہذیب کی روشنی سے ان کی آنکھیں چندھیانے لگیں۔ دل غیر ملکی ہونے لگے اور اسلاف کی عزت دلوں سے رخصت ہونا شروع ہوئی۔ قوم کا سب سے بڑا نباض فلسفی الوقت یہ قید حیات تھا۔ اس سے قوم کی یہ بے راہ روی دیکھی نہ گئی اور چاہا کہ غافل قوم کو اپنے بزرگوں کے کارناموں سے پھر روشناس کرائے۔ چنانچہ اسی غرض سے آئین اکبری کی تصحیح فرما کر طبع کرائی تاکہ قوم ذرا مڑ کر دیکھے تو سہی کہ جو کچھ ان کے بزرگوں نے کر دکھایا۔ اسوقت تک دنیا اتنی ترقی کر چکنے کے بعد بھی وہاں نہیں پہونچی۔ مرزا سے فرمائش کی کہ وہ اسپر تقریظ لکھیں مرزا تہذیب نو کے ہمہ تن پرستار ہو چکے تھے۔ یہ نمود و نمایش بھلا ترکوں میں کہاں تھی تمدن کی نیرنگیوں نے انھیں فریفتہ کر لیا تھا اس لئے بجائے تعریف کے سرسید کی اس جانفشانی کی تنقیص کر دی۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

"سید نے بیشک بڑا کام کیا کہ انھوں نے آئین اکبری کی تصحیح کی تکلیف گوارا کی اب وہ مجھسے فرمائش کرتے ہیں۔ کہ میں ان کی اس باب میں مدح سرائی کروں لیکن چونکہ میں راست گو ہوں سچ کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسوقت اس متاع کا کوئی خریدار نہیں مجھے حیرت ہے کہ سید نے کیوں اس مصیبت کو اپنے سر لیا۔ اگر آئین و قوانین کی خوبیوں سے آپ کو دلچسپی ہے تو انگریزی قانون کی خوبیاں عالم آشکار ہیں آپ ان سے لطف اٹھائیں۔ سائنس کی ایجادیں اور کرشمے کچھ کم مسرت انگیز نہیں دخانی جہازوں اور کشتیوں کی خود سری، گراموفون کی نغمہ سرائی، اور بجلی کی روشنی کس قدر عبرت خیز ہے اگر اس سے زیادہ اور کسی چیز کے دیکھنے کی تمنا ہے تو جائیے اور لندن کی سیر کیجئے اور علوم و فنون کی روشنی سے ضیا اندوز ہوجئے۔ آپ کو پرانے مردے اکھیڑنے میں کیا لطف آتا ہے۔ ہاں اگر آپ آئین اکبری کی طرز تحریر کے فریفتہ ہیں تو اس سے اور بہتر کتابیں مہیا ہو سکتی ہیں۔ اس میں کیا سرخاب کے پر لگے ہیں"

من کہ آئینِ زبان را دشمنم | در دفا اندازه دانِ خودمنم
کس مخر باشد بگیتی ایں متاع | خواجہ را چہ بود امیدِ انتفاع
گر ز آئیں مے رود با ما سخن | چشم بکشا واندر ایں دیر کہن
صاحبانِ انگلستاں را نگر | شیوه و اندازِ اینان را نگر
از دخان زورق بر فتار آمده | باد و موج ایں ہر دو بے کار آمده
نغمہ ہائے زخمہ از ساز آورند | حرف چوں طائر بپرواز آورند
رو بہ لندن کاندراں رخشندہ باغ | شہر روشن گشتہ در شب بے چراغ

بیش ایں آئیں کہ داند روزگار　　　گشتہ آئینِ دگر تقویم پار
طرزِ تحریرش اگر گوئی خوش است　　　نے فزوں از ہرچہ می جوئی خوش است
ہر خوشے را خوشترے ہم بودہ است　　　گر سرے ہست افسرے ہم بودہ است
مردہ پرور دن مبارک کار نیست　　　خود بگو کان نیز جز گفتار نیست

آپ ان اشعار سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ قوم کے فلسفی اور فلسفی شاعر میں کتنا نمایاں فرق ہے اور ہمارا فلسفی شاعر سیاسیاتِ عالم سے کسقدر ناآشنا واقع ہوا ہے۔

باقی ــــــــــــ باقی

عزیز

دینِ مسیحی یا آفتاب پرستی

(گزشتہ سے پیوستہ)

یسوع کا تکالیف اٹھانا

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ تمام جگہ سورج دیوتا مرتے ہیں[۵۱] اور مرتے بھی ہیں سخت ظلم کی موت سے، بہت بُری طرح۔ ان کی موت بھی ان کی پیدایش کی طرح مافوق العادت ہوتی ہے۔

اڈونس سیر وشکار کر رہا تھا کہ اس کو جنگلی سور نے مار ڈالا۔ بیکچس کو اُس کے دشمنوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اسی بیکچس کے فرستادہ، (پیغمبر) اور فیوس، کو عورتوں نے قتل کر دیا۔ ادسی ریس کو اُس کے بھائی ٹائیفون نے دھوکا دیکر مار ڈالا۔[۵۲]

دوسری طرف یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ یسوع یہودی حاکموں کے حکم سے مار ڈالے گئے انھوں نے حکام کے عیوب ظاہر کئے تھے لہذا حکام نے ان کا خاتمہ کر دیا۔ مگر کس طرح ؟ سو اس کے متعلق جو روایات ہم تک پہونچی ہیں وہ ایسی نہیں ہیں کہ ہم یقین کے ساتھ کچھ راے قایم کر سکیں۔ لیکن یہ دیکھنا چاہئے کہ قدیم زمانہ کے لوگ ہر سال موسم سرما کے آخر میں اس مجرم کو جسکے لئے حکم تقصاص جاری ہو چکا ہوتا قتل کر ڈالتے تھے اور اُس کو سورج دیوتا کا مجسمہ سمجھتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ جس شخص کو مارا جاتا تھا اس کو دیوتا یعنی بادشاہوں کے سے کپڑے پہنایا کرتے تھے تخت پر بٹھلاتے تھے پھر اس کے کپڑے اُتار لیتے چابک لگاتے اور صلیب پر چڑھا دیتے تھے۔[۵۳]

ہمیں یہ تبلایا جاتا ہے کہ یسوع کو جب حکم موت سنا دیا گیا تو اُن کو سُرخ کپڑے پہنائے گئے یہودی حاکم کے سپاہیوں نے ان کے سر پر کانٹوں کا، تاج رکھا اور اُن کے ہاتھ میں ایک سرکنڈہ بجاے شاہی تلوار کے دیا، ان کے سامنے مزاحاً اسی طرح سلام کیا جیسے بادشاہوں کو کرتے ہیں، جب یہ سب کچھ کر چکے تو انھیں صلیب پر چڑھا دیا۔

اگر مفصلۂ بالا واقعات تاریخی ہیں، اگر یسوع کو تکالیف دینے کا واقعہ واقعی اسی طرح ہوا تھا جس طرح انجیل میں لکھا ہے

---

۵۱ بابل کے سورج دیوتا بیل کی قبر وہیں تھی۔ مصر کے سورج دیوتا ادسی رس کی قبر وہیں بنی ہوئی تھی۔ جزیرہ کریٹ میں وہاں کے سورج دیوتا زیوس کی قبر تھی۔

۵۲ سیمسن کو ڈیلائیلا نے بہکایا تھا۔ ہرکیولیس کو دیانیرا نے یسوع کو ان کے ایک حواری نے۔ اصل یہ ہے کہ سورج دیوتا دھوکے ہی سے مرتا ہے۔

۵۳ روم میں اس تہوار کو سے ٹرنیلیا کہتے تھے (سیٹرن ان کی کاشتکاری کا دیوتا تھا) اور مغربی ممالک میں وہ کارنیول کہلاتا تھا۔ اب اس کی جگہ ایک تصویر بناتے ہیں اسکو بادشاہ کے سے کپڑے پہناتے ہیں اور پھر اس کو جلا ڈالتے ہیں۔

تو یقیناً یہ تمام واقعہ یسوعؑ کے افسانہ بنانے میں بہت کچھ اثر ڈالتا ہے اور اُن کو خدائی طاقتیں عطا کرنے میں بہت زیادہ مدد دیتا ہے مگر اُن کو خدا بھی بنایا ہے تو شمسی خدا۔ اگر اس کے برعکس صرف افسانہ ہی افسانہ ہے تو اس سے یسوع اور سورج دیوتا کا ایک ہونا یقیناً ثابت ہوتا ہے۔

صلیب کی علامت

سوال یہ ہے کہ جو شخص کہ سال کے آخر میں سورج دیوتا پر بھینٹ چڑھایا جاتا تھا اس کو صلیب پر چڑھانے کی مصیبت اور تکلیف میں کیوں ڈالا جاتا تھا؟ اس موقعہ پر سزائے موت کیلئے صلیب کی صورت کیوں ہوتی تھی؟[۵۱]

اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ایشیا میں صلیب صرف ایک نشان تھا، نشان بھی کاہے کا؟ سورج کا۔ سورج کی صورت کو اس طرح بناتے ہیں ⊕ اس کے اندر جو چوپارہ نشان ہے وہ شعاع آفتاب اور گرمی کا قائم مقام ہے جسے وہ دنیا کے چاروں کونوں پر پہونچاتا ہے۔

چونکہ "مکان" کا تعلق "زمان"[۵۲] سے بہت زیادہ ہے اس لئے شمسی صلیب کی چار شعاعیں "ابدیت"[۵۳] کی قائم مقام ہیں بابل والوں کی زبان میں "ابد" کو "لبارم" کہتے تھے۔ شاہ قسطنطین نے اپنے اس پرچم کا نام "لبارم" رکھا تھا جس کو اُس نے اپنی مشہور و معروف فتح کے وقت استعمال کیا تھا۔ اس فتح کے متعلق اُس کا خیال تھا کہ عیسا کے خدا کی مدد سے حاصل ہوئی تھی۔ اس پرچم پر جو صلیب بنی ہوئی تھی اُس کی شکل یہ تھی۔ ⊕ یہ اسی چیز سے مماثل تھی جسکو اہل بابل "لبارم" کہتے تھے

یسوعؑ آفتاب صداقت ہیں

روایات متداولہ کے موافق جس صلیب پر کہ یسوعؑ چڑہائے گئے تھے وہ اس وقت اس طرح رکھی گئی تھی کہ یسوع کا منھ مغرب کی طرف رہے اور پشت یروشلم کی طرف وجہ یہ تھی کہ یہ کہا گیا تھا کہ آفتاب صداقت اس مقدس شہر پر اب نہیں چمکیگا بلکہ اس کی جگہ یروشلم جدید یعنی روم پر چمکیگا۔ آفتاب صداقت کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ آفتاب صرف جان آفرین ہی نہیں ہے، بلکہ کم از کم بہت سے لوگوں کے نزدیک وہ خدائی روشنی کا نشان بھی ہے، جو انسان کے دلوں اور عقلوں پر منعکس ہوتا ہے[۵۴]۔ لیکن یہ خیال اور خیالوں کی طرح صرف عیسائیوں ہی کا نہ تھا؛ عیسائیت کے شیوع سے پانچ ہزار سال پیشتر

---

۵۱ ایشیا کے ممالک میں صلیب صرف ایک طرح کی سُولی ہوتی تھی جس کی صورت یہ تھی۔ T۔ کفار اور یہودی عام طور پر یسوع کو پھانسی دیا جانا بتلاتے ہیں، نہ کہ صلیب پر چڑھایا جانا۔

۵۲ یہ الفاظ فلسفی اصطلاح میں استعمال کئے گئے ہیں۔ لغوی معنی نہیں لینے چاہئیں (مترجم)

۵۳ یہ بھی یہاں درج کردینا چاہئے کہ یونانی زبان میں لفظ کرایسٹ (یسوع) کا پہلا لفظ اس شکل کا ہے × جو خود ایک صلیب کی صورت رکھتا ہے۔ اس حرف کے بعد حرف P تھا یہ دونوں ملکر نجومیوں کی اصطلاحی تصویر ہوجاتی ہیں جو مصریوں کی اصطلاح میں "عمر ابد" بنجاتی ہے۔

۵۴ اس صورت میں یہ "خدا کا کلام" ہوگیا جیسا کہ آگے چلکر معلوم ہوگا۔

علماء بابل ایک "آفتاب انصاف و صداقت" کا نام لیتے[1] چلے آتے تھے

یسوع آفتاب ہی ہیں

اگر بعض فلسفیوں کے نزدیک یسوع آفتاب صداقت تھے، تو زیادہ تعداد عیسائیوں کی اُن کو آفتاب ہی سمجھتی تھی اس امر کو نہیں بھولنا چاہئے کہ ابتدا زمانہ کے عیسائی ہمیشہ مشرق کی طرف منہ کرکے نماز پڑھتے تھے۔ چنانچہ تمام گرجاؤں کا رُخ کفار قدیم کے معبدوں کی طرح مشرق ہی کی طرف ہوتا تھا تاکہ اُن کا منہ آفتاب کی طرف ہے ہفتہ کے پہلے دن کا نام "خدا کا دن" تھا اور وہ آفتاب کا دن بھی کہلاتا تھا

اس کے علاوہ ہم کو یہ بتلایا جاتا ہے کہ یسوعؑ کی صورت ان کی زندگی ہی میں بدل گئی تھی۔ چنانچہ متی ۱۷- ا مرقس ۱-۹، ۱۱ لوقا ۹ - ۲۸ میں کہا گیا ہے کہ جب وہ ایک پہاڑ پر اپنے خاص شاگردوں میں کھڑے ہوئے تھے تو ان کا چہرہ آفتاب کی طرح چمکنے لگا اور اُن کا لباس روشن ہوگیا[2]۔

یسوع زندگی کے پھل ہیں

اس سوال کے جواب میں کہ یسوع کی صلیب کس لکڑی کی تھی جواب یہ دیا جاتا ہے کہ فرشتۂ مقرب میکائیل نے آدم وحوا کے بیٹے شیث کو بہشت کے ایک درخت کی شاخ دیکر کہا تھا کہ اُس کو آدم کی قبر پر گاڑ دے جب یہ شاخ پھل دیگی تو سمجھ لینا کہ آدم کا گناہ معاف کر دیا گیا۔ شیث نے میکائیل کے کہنے کے موافق کیا اور وہ شاخ درخت بن گئی، مگر اس نے چالیس صدیوں سے پیشتر پھل نہیں دیا۔ خدا کی یہ مرضی تھی کہ یسوع کی صلیب اسی لکڑی کی بنے جو پھل کہ یہ شاخ دے وہ نجات دہندہ کا جسم ہو۔

قرون وسطے کے بہت سے شعراء نے اس افسانہ کو لے کر اپنے اشعار میں پُل باندھ دئے ہیں۔ زمانۂ حال کے بعض شعراء نے بھی اس پر طبع آزمائیاں کی ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک افسانہ یا ایک روایت ہے اور اس کو کوئی اصول دین مسیحی نہیں کہا جاسکتا۔ انجیل یہ نہیں بتلاتی کہ یسوع کی صلیب اسی درخت کی تھی جس کا پھل حوا نے کھایا تھا[3]۔

میں نہیں کہتا کہ عیسائیوں کے تمام اصول انجیل میں موجود ہیں یا یہ کہ اُن کا ماخذ اناجیل میں ہے مثلاً کسی انجیل میں یہ نہیں لکھا کہ یسوع کو دوزخ میں جانا پڑا۔ باوجود اس کے یہ افسانہ بھی اصول دین مسیحی بن گیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ دوزخ میں

---

[1] ملاحظہ ہو نکلر زمرن

[2] روشنی کے دیوتا کا پسندیدہ لباس سفید ہی تھا۔ رومیوں کے مقتدایان مذہبی مراسم مذہبی ادا کرتے ہوئے سفید کپڑے پہنتے تھے۔

[3] مسیح علیہ السلام کی صلیب کے قصے راقم کی کتاب "اخبار الاندلس" میں قابل ملاحظہ ہیں بیچارے بھولے بھالے عیسائیوں نے تو اصلی صلیب کا ٹکڑا حضرت مریم کے دودھ کے قطرے، مسیحؑ کے بدن کے اجزا تک پیدا کر دئے ہیں۔

جانے کی روایت ان لوگوں نے بیان کی تھی جو متبرک آبا رکلیسا تھے، اور وہ برابر اسی اعتقاد کے معتقد رہے۔

سوال یہ ہے کہ آبا رکلیسا نے "میوۂ زندگی" کو بھی نشان کیوں نہیں بنایا؟ یسوعؑ نے برکت دیتے ہوئے روٹی کا کیوں نام لیا اور میوہ کا نام کیوں نہیں لیا؟ آسان سا جواب تو یہ ہے کہ روٹی ہی انسان کی خوراک میں سب سے بڑی چیز ہے، لیکن صحیح جواب علم آلہیات کے موافق تو صرف ابار کلیسا ہی کو معلوم ہوگا اور وہ یقیناً اس سے بالکل مختلف ہوگا۔

یسوعؑ کو تکلیفیں کیوں اٹھانا پڑیں

آدم کے بہشت سے نکالے جانے سے پہلے وہ صرف میوے کھاتے تھے، یا ترکاریاں بھی دونوں چیزیں ان کو بلا مشقت مل سکتی تھیں۔ مگر جب اپنی نافرمانی کیوجہ سے وہ زمین پر آئے تو خدا نے کہا کہ "تو اپنی پیشانی کا پسینہ بہا کر روٹی کھائیگا"، لیکن تعجب کی بات ہے کہ صرف انسان ہی خدا کے اس فقرہ کے موافق مصیبت میں مبتلا نہیں ہوا، بلکہ خود خدا پر اس کا اثر پڑا۔ مگر "باپ خدا" پر نہیں، بلکہ "بیٹے خدا" پر کیونکہ اُسی کو انسان کی سب سے زیادہ محبت ہے۔ وہی اس بات پر تل گیا کہ تمام انسانوں کی نجات کے لئے وہ اپنے آپ کو قربان کر دیگا، ہاں! یہ ضروری تھا کہ یسوعؑ تکلیف اٹھائے۔ ان کو بھی اسی طرح مرنا چاہیئے تھا، جس طرح زمانۂ قدیم کے وہ تمام دیوتا مرے ہیں جو نسل انسان سے محبت رکھتے تھے ان کی موت اور زیادہ تکلیف پاکر ہوئی؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کو نسل انسانی سے بہت زیادہ محبت تھی۔ مگر جب وہ قبر سے جی اُٹھے تو ان کی کامیابی پر جتنی بھی خوشی کی جائے تھوڑی ہے، ان کی وجہ سے جو نئی زندگی ملی اُس سے بڑھ کر کیا خوشی ہو سکتی ہے۔

عشق و محبت

زمانۂ قدیمہ میں ملک شام کی عورتیں سات دن (مقدس ہفتہ) اپنے خدا اڈونس[1] پر روتی تھیں۔ پھر اس کے بعد اس کے جسم کو غسل دیتی تھیں (وہ جسم کیا ہوتا تھا؟ ایک لکڑی کا منقش بت) اور پھر اس پر خوشبودار تیل ملتی تھیں، جیسے کہ اسٹارٹے[2] نے کیا تھا۔ جب یہ سب کچھ کر چکتیں تو پھر اپنے خدا کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر بڑی احتیاط سے قبر میں رکھ دیتیں۔

ان غریب ایشیا کی عورتوں کو، جن کی زندگی ایک ہی حالت میں گزرتی تھی، اس سے کیا غرض تھی کہ اڈونس آفتاب اور نیچر کا مجسمہ ہے جیسا کہ شعراء کا خیال تھا، یا آزادی کا جیسا کہ فلسفیوں کا خیال تھا ان عورتوں کے نزدیک تو یہ ایک نوجوان دیوتا کے مرنے اور جی اٹھنے کا تہوار صرف اس غرض سے تھا کہ وہ ایک ہی وقت اور موقعہ پر اپنا انتہائی رنج اور انتہائی خوشی ظاہر کریں۔ یہ عورتیں بے طرح اڈونس کی عاشق تھیں اور اسی واسطے وہ اس کے لئے یوں آنسو بہاتی تھیں اور ان کی زبان سے

---

[1] لفظ اڈونس کے معنی ہی "خدا" ہیں۔

[2] مریم مگدلینی نے بھی یسوعؑ کے جسم پر دفن ہونے سے پہلے تیل وغیرہ ملا تھا۔ (متی ۲۶-۱۲)

س دیوتا کی جوانی اور خوبصورتی کے گیت بے اختیار نکلتے تھے

آج ہی نہ صرف ایشیا میں، بلکہ یونان، سسلی اور کلیریا میں گڈ فرائڈے کے دن پادری صاحبان نہایت حسن اعتقاد کے ساتھ یسوع کو ایک منقش لکڑی کے بت کی صورت میں اُسی احتیاط اور انھیں مراسم کے ساتھ دفن کر دیتے ہیں، جس طرح کسی زمانہ میں خاص مراسم کے ساتھ عورتیں اڈونس کو دفن کیا کرتی تھیں[۵]، بلکہ اُن ہی مراسم کے ساتھ اناجیل کی مقدس عورتیں اپنے خدا کو دفن کیا کرتی تھیں"۔

ہم مجبور ہیں کہ چیشو برانڈ کے بعض بیانات سے اختلاف کریں، کیا ان کا یہ کہنا صحیح ہے کہ کفار کے افسانوں میں نہ معقول باتیں ہیں نہ قرین قیاس۔ ان میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ صرف دل خوش کن باتیں ہیں، برعکس اس کے مذہب مسیحی میں نہایت پاک خیالات اور عقائد ہیں! اس کی جتنی تصویریں ہیں وہ روح کی بالیدگی اور پاکیزگی کے لئے ہیں۔ پھر کیا یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ "مسیحی ایماندار کی آنکھ کے ایک آنسو میں وہ خوبصورتی ہے، جو خرافات الاصنام کی تمام بیہودہ غلطیوں اور غلط کاریوں میں نہیں" ہمارے پاس تو نہ وہ ترازو ہیں نہ وہ باٹ، ہم تو صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ دونوں ہی بیہودہ ہیں، دونوں ہی بیحد غلطیوں اور غلط کاریوں پر مبنی ہیں۔ ہم سے تو یہ نہیں ہو سکتا، اور نہ کسی اور سے ہو سکتا ہے کہ شام کی ان عورتوں کے فعل کو عبث بتلائیں جو اڈونس کا جسم اپنے آنسوؤں سے دھوتی تھیں، یا سینٹ تھیریسا، سینٹ کیتھراین اور میری الکوک کے اس فعل کو لغو کہیں جو خون سے بھرے ہوئے، صلیب پر لٹکے ہوئے جسم کو یا اس کی نقل کو چومتی تھیں[۵۳]

۵[۱] یا موم کا بت (ملاحظہ ہو فریزر کی کتاب موسومہ اڈونس، ایٹس، اوسی رس صفحہ ۱۴۴)

۵[۲] شہنشاہ ایڈریان کے زمانہ تک بیت اللحم کے پاس ایک مقدس لکڑی موجود تھی جو اڈونس کا تبرک سمجھی جاتی یہی سینٹ جیروم کو جنھوں نے اس کا ذکر کیا ہے، اس خیال سے بہت رنج ہوا کہ اڈونس کا ٹھیک اسی مقام پر کفار ماتم کرتے اور روتے تھے جہاں کہ یسوع نے بچپن میں اپنے پہلے آنسو بہائے تھے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ خیال تھا کہ اڈونس کا یہ باغ اسجگہ دانستہ اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس مقدس مقام کو ناپاک کریں لیکن اس کے برخلاف ظن اغلب یہ ہے کہ بیت اللحم کو یسوع کی پیدائش کا مقام انتخاب کرنے میں مصلحت ہی یہ تھی کہ وہاں پہلے ہی اڈونس کی یادگار موجود تھی اور اس وجہ سے وہ مقام متبرک تھا۔

۵[۳] آدھی رات کے وقت جو نماز ہوتی ہے اس میں کتنے ایماندار عیسائی ایسے ہوتے ہونگے جو یسوع کے جسم میں خدا کے حلول کرنے کا راز سمجھتے ہیں۔ یقیناً بہت کم۔ لیکن ایک حساس دل بلاشبہہ اس بچے پر شفقت کرتا ہے جو عام کس مپرسی میں پیدا ہوا، اگرچہ باوجود اس کے وہ اتنی شان رکھتا تھا کہ بادشاہ اس کے قدم چومنے کی آرزو رکھتے تھے۔

یسوع کی موت کے بعد دنیا بھر میں اندھیرا ہو گیا یسوع آفتاب کے ساتھ پیدا ہوئے تھے۔ جب انھوں نے اس دنیا کو چھوڑا تو آفتاب ہی کو سیاہ ہو جانا چاہئے۔ اسی لئے متی ۲۷-۲۵ مرقس ۱۵-۳۳، اور لوقا ۲۳-۴۴ میں لکھا گیا ہے جیسے ہی یسوع کا انتقال ہوا اسی دم تمام دنیا میں اندھیرا ہو گیا۔

زمانۂ قدیم کے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال جاگزین تھا کہ نیچر اور نسل انسانی ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اسی لئے انسانوں کے ہموم وغموم کا اثر نیچر پر جا کر پڑتا ہے۔ اس موقعہ سے سات سو برس پہلے رومولوس بانی شہر روم کے مرنے کے وقت بھی دنیا میں اندھیرا ہو گیا تھا۔ ہندوستان میں جب مہاتما بدھ کا انتقال ہوا ہے تو سورج چاند اور ستارے تاریک ہو گئے تھے، تمام قسم کی روشنیاں شان وشوکت اور خوشی وخرمی یک قلم جاتی رہی تھی جس طرح یسوع کے انتقال کے وقت ہوا تھا۔ سیزر کے مرنے پر طلوع آفتاب کے چھ گھنٹہ کے اندر ہی آفتاب غروب ہو گیا تھا، یعنی دن کے بارہ بجے[1]۔ قرون متوسطہ میں آفتاب و ماہتاب تاریک ہو گئے تھے، اس سے لوگوں نے یہ پیشینگوئی کی تھی کہ سارے مین مر جائیگا، اور یہی ہوا۔ آج بھی اکثر ملکوں میں یہ اعتقاد جاری وساری ہے کہ کسی آدمی کے پیدا ہونے پر ایک نیا ستارہ آسمان پر نکل آتا ہے اور جب وہ مر جاتا ہے تو وہ ستارہ بھی غائب ہو جاتا ہے[2]

جب یہ خیالات دنیا میں پھیلے ہوئے تھے تو یہ بتلایا جانا کہ یسوع کے مرنے کے وقت دنیا میں تاریکی ہو گئی تھی کچھ تعجب انگیز نہیں رہ جاتا۔ بلکہ معجزہ (اگر ہم اس لفظ کو استعمال کر سکتے ہیں) تو اُس وقت ہوتا کہ یسوع اسوقت مرتے کہ جب آفتاب نکلا ہوا ہوتا۔

یسوع بھیڑ کا بچہ تئیس صدیاں گزریں کہ عین سال کے پہلے دن یہ معلوم ہوتا تھا کہ سورج برج ثور میں داخل ہوا، اس زمانہ سورج دیوتا خاص کر موسم بہار کے دیوتا کو ثور (بیل) سے مماثلت دیجاتی تھی۔

لیکن بیس صدیاں گزریں کہ ایک خاص دن آفتاب برج جدی (بھیڑ)[3] میں گیا اسیوجہ سے یسوع کو اکثر بھیڑ یا بھیڑ کا بچہ کہا جاتا ہے۔ پُرانے زمانہ کی زبان میں یہ دونوں جانور ایک دوسرے سے خلط ملط کر دئے جاتے تھے۔ اگر بھیڑ کے بچہ کو نشان بجا بھیڑ کے قرار دیا گیا تو یقیناً وہ یہودیوں کی ایک رسم کے موافق ہوا ہوگا جس کو یہ لوگ (یہودی) ایک خاص مذہبی رسم میں بھیڑ کا بچہ کہتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ یسوع کو وہ "بھیڑ کا بچہ" قرار دیا گیا "جو خدا نے بھیجا تھا" اور یہی بھیڑ کا

[1] اس معجزے کا عین نصف النہار ہونا اور بھی تعجب خیز ہے۔

[2] سسلی میں یہ نظریہ خوب متداول ہے۔ شہاب ثاقب کی یہی وجہ بتلائی جاتی ہے۔

[3] ہیئت کے ایک مقررہ قانون کے موافق ہر بائیسویں صدی میں آفتاب بُرج سے دوسرے میں جاتا ہے۔

بچہ" انسانوں کی نجات کے لئے قربان کیا جانے والا تھا۔

اصول عیسویت کے موافق "خدا کا بھیجا ہوا بھیڑ کا بچہ" دنیا بھر کے گناہوں کا بوجھ اپنے اوپر لے لیتا ہے، جس طرح کہ بنو اسرائیل کا گناہ ایک بکرا اپنے ذمہ لے لیتا ہے۔ بابل میں بھی بھیڑ، یا سور، تمام بابل والوں کا گناہ اپنے ذمہ لے لیتا[۱] ہے اس زمانہ کے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ جادوگروں میں یہ طاقت ہے کہ ایک شخص کی بیماری کسی دوسرے گنہگار[۲] کے یا کسی جانور کے جسم میں پہونچا دیں اگر جانور ہوتا تھا تو اس کو شہر سے باہر نکال دیتے تھے یا مار ڈالتے تھے۔ اعتقاد یہ تھا کہ وہ ناپاک روح، جس سے بیماری پیدا ہوتی تھی، اس جانور کے مار ڈالنے سے مرجاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح یسوعؑ یعنی خدا کے فرستادہ بھیڑ کے بچے نے دنیا بھر کے گناہ اپنے کندھے پر لے لئے تھے اس لئے ان کو تکلیفیں دے کر مار ڈالا گیا۔ یسوعؑ کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا وہ ٹھیک اسی قاعدے کے موافق ہوا جس پر جادوگر عمل کرتے تھے۔

ایک روایت کے موافق جب یسوعؑ کی صلیب (درخت نجات) زمین میں گاڑی گئی تو وہ سب سے پہلے انسان کی قبر میں گڑی[۳] "نجات دہندہ بھیڑ کے بچے" کا خون جب مقدس لکڑی پر گرا تو وہاں سے آدم کی کھوپڑی پر پہونچا۔ آدم ہی سب سے پہلے مجرم تھے کہ جن کی نجات از بس ضروری تھی۔ کفار جب کسی بیل یا سانڈ کو سورج دیوتا پر قربان کرتے تھے تو سانڈ کو ایک سوراخ دار تختہ پر لٹاتے تھے جو کسی گڑھے پر رکھا جاتا تھا۔ گڑھے کے اندر خوش اعتقاد لوگ کھڑے ہوجاتے تھے کہ قربانی کا خون اُنکے سروں پر گرے اور ان کے گناہ دُھل جائیں۔

مسیح کے صلیب پر چڑھنے سے دنیا کے پچھلے گناہ تو معاف ہوگئے آئندہ گناہوں کے متعلق ابھی غور کرنا باقی تھا یہی ٹیڑھا سوال تھا۔ آخر عیسائی اس نتیجہ پر پہونچے کہ اس موت کی یادگار اور بار بار کی قربانی (نماز کی قربانی) کا یہ اثر ہوگا کہ آدمی شیطان کے شر سے محفوظ رہیگا، گناہ اُس سے سرزد نہوں گے، اور اگر گناہ کریں گے بھی تو وہ معاف ہوجائینگے۔

بیکچس کی عبادت کرنے والے یونان میں اور مہر کی عبادت کرنے والے ایران میں ہر سال کے مقررہ اوقات میں ایک محفل منعقد کرتے تھے اور اس میں سانڈ کا گوشت کھاتے اور اس کا خون پیتے تھے۔ ایسا کرنے سے ان کا اعتقاد تھا کہ وہ اپنے دیوتا سے جا ملتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح عیسائی بھیڑ کے بچے کا گوشت کھاتے اور اس کا خون پیتے ہیں "جو شخص کہ میرا گوشت کھائیگا اور میرا خون پیئے گا وہ مجھ میں رہیگا اور میں اس میں" (یوحنا ۶-۵۶)

---

[۱] دیکھئے فوسی کی کتاب موسومہ "مجوسیان اسیریا" صفحہ ۸۵

[۲] بیماری کسی گناہ کی سزا سمجھی جاتی تھی۔

[۳] مسیحیوں کی روایت کے موافق آدم یروشلم میں ٹھیک اسی مقام پر دفن ہوئے تھے کہ جہاں یسوعؑ کو صلیب دی گئی

پیڑ کا ایک سبز پتا بولا "ہائے بیچارہ روتا کیوں ہے"
اُسی طرف سے ایک تیتلی جا رہی تھی۔ اُس نے بھی کہا "ہاں سچ مچ بیچارہ کیوں روتا ہے پاس ہی ایک گیندے کا پھول تھا اُس نے بھی ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے کہا "یہ کیوں روتا ہے اسے کچھ تکلیف ہے"
بُلبُل بولی یہ ایک سُرخ گلاب چاہتے ہیں۔
سب ایک ساتھ بول اُٹھے "تعجب ہے کہ ایک سُرخ گلاب کے لئے اتنا رونا" اسپر سب پھول کھلکھلا کر ہنس پڑے اور پتوں میں چپکے چپکے سرگوشیاں ہونے لگیں۔
صرف ایک بلبل نے راجکمار کی تکلیف کو جانا۔ اس نے سوچا "اتنے دنوں تک جو میں نے نغمۂ محبت گایا ہے اسی سے راجکمار کے دل میں درد اٹھا ہے" پھر ایک گلاب کے پھول کے پاس بیٹھ کر محبت کا یہ راز سوچنے لگی۔ یکایک اپنے چھوٹے چھوٹے پروں کو ہوا میں پھرپھراتی ہوئی اس کنج سے سایہ کی طرح اڑ گئی۔

۳

باغ کے بیچ میں گلاب کا ایک خوبصورت پیڑ تھا۔ اُسی کی ایک ڈال پر بُلبُل جا کر بیٹھی۔ وہ بولی "بھائی تم مجھے ایک لال گلاب دوگے؟ میں تمھیں اپنا سب سے اچھا گانا سناؤنگی"
پیڑ سر ہلا کر بولا "میرا پھول سمندر کے پھین سے بھی بڑھکر سفید ہے اس کے لے جانے سے تمھارا کوئی کام نہیں نکل سکتا۔ وہ جو پرانا پیڑ دکھتی ہو اُسی کے پاس میرا بھائی ہے۔ اس سے شاید تمھیں کوئی لال گلاب مل سکے"
بلبل اڑتی ہوئی دوسرے گلاب کے پاس پہونچی اور بولی "بھائی ایک لال گلاب دو۔ میں تمھیں اپنا سب سے اچھا گانا سناؤنگی"
پیڑ نے سر ہلا کر کہا۔ میرا پھول کیسر سے بھی بڑھکر پیلا ہے۔ لیکن راجکمار کا جو وہ مکان دکھائی پڑتا ہے اُس کے پورب کیطرف جو کھڑکی ہے اُسکے پاس میرا ایک بھائی رہتا ہے۔ وہاں جانے سے شاید تمھیں لال گلاب مل سکتا ہے" بلبل اڑتی اڑتی کھڑکی کے پاس والے گلاب کے پیڑ کے پاس آئی اور بولی "بھائی ایک لال گلاب دے دو میں تمھیں اپنا سب سے اچھا گانا سناؤنگی"
پیڑ سر ہلا کر بولا "میرا پھول خون سے بھی بڑھکر سرخ ہے لیکن بہن اولوں کی وجہ سے میری رگ رگ سکڑ گئی ہے۔ کُہرے نے میری تمام کلیوں کا ناس کر دیا۔ آندھیوں نے میری تمام ڈالیوں کو جھکول ڈالا ہے۔ اس سال مجھ میں ایک بھی پھول نہیں آیا۔ یہ کہکر پیڑ رونے لگا۔
بلبل بولی "روتے کیوں ہو؟ رونے سے کیا کھوئی ہوئی چیز مل سکتی ہے؟ دیکھو بھائی کوشش کرنے سے اگر ایک بھی پھول مل جائے تو میرا کام چل جائیگا"

پیڑ بہت دیر تک چپ رہا۔ پھر بولا "ایک طریقہ ہے۔ لیکن وہ اتنا کٹھن ہے کہ مجھے تمھارے سامنے اُسے کہنے کی ہمت نہیں ہوتی"

بلبل بولی "کہو کہو مجھے کچھ بھی ڈر نہیں"

پیڑ بولا "اگر لال گلاب چاہتی ہو تو چاندنی رات میں گانا گا کر اُسے پیدا کرنا ہوگا۔ اسے تمھیں اپنے دل کے خون سے لال کرنا ہوگا"

بلبل بولی "وہ کیسے"

پیڑ بولا "سنو بتلاتا ہوں۔ پہلے تمھیں میرے کانٹوں سے اپنا دل چھلنی کرنا ہوگا۔ ساری رات اس طرح تن من بھول کر گانا ہوگا کہ میرے کانٹے تمھارے بدن کو چھید ڈالیں لیکن تمھیں معلوم نہ ہو تمھارے دل کا خون میری رگوں میں جانے سے سرخ گلاب کی خلقت ہوگی"

بلبل پہلے چونک اٹھی۔ پھر وہ دھیرے دھیرے بولی "لال گلاب کے لئے اگر مرنا بھی ہو تو وہ بھی مجھے قبول ہے کیونکہ یہ تو سمجھوں گی کہ اپنے ایک بھائی کا میں نے دل رکھا" یہ کہتے کہتے بلبل کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ مشکل سے اپنی آواز سنبھالتے ہوئے بولی "زندگی کتنی پیاری چیز ہے" اور پھر اپنے چھوٹے چھوٹے پروں کو ہوا میں پھڑپھڑاتی ہوئی اوپر کو اڑ گئی۔

---۴---

راجکمار ابھی اسی جگہ گھاس پہ لیٹا ہوا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے آنسو ابتک نہیں سوکھے تھے۔

بلبل پاس آکر بولی "بھائی مت روؤ۔ میں تمھیں لال گلاب لا دونگی۔ چاندکی روشنی میں اُسے پیدا کرونگی۔ دل کے خون سے اسے لال کروں گی"

راجکمار اُٹھ بیٹھا۔ لیکن یہ نہ سمجھا کہ بلبل کہتی کیا ہے۔ مولسری کے پیڑ نے بھی سنا۔ اُس کے دل کو بڑی چوٹ لگی بلبل اسی کی ڈالوں پہ گھونسلہ بنا کر رہتی تھی۔ رات کو اُس کا گانا سنکر مولسری کے پیڑ نے کتنی راتیں بے نیند کے کاٹی تھیں۔

مولسری بولی "اے بلبل تمھارا جانا میری ساری خوشیوں کا چلا جانا ہے تمھارے چلے جانے پر میں کیسے رہونگی"

پیڑ کے ہرے پتے کانپ اُٹھے اور گھبرا کر کہنے لگے "بلبل تم نے دل میں یہ کیا ٹھانی ہے"

تیتلی کچھ دیر کے لئے اپنے پر سمیٹ کر بیٹھی رہ گئی پھر یہ کہتی ہوئی "یہ باتیں ہماری سمجھ کے باہر ہیں" اُڑ کر دور جا بیٹھی۔

گیندا بولا "دوسرے کی بپت دور کرنے کے لئے خود مٹ جانا یہ کیا بات ہے" پھول پھر کھلکھلا کر ہنس پڑے سب نے ملکر کہا۔

"بلبل تم جاتی ہو اپنا آخری گانا ہمیں سناتی جاؤ"

بلبل گانے لگی۔ اس کی درد بھری آواز چاروں طرف پھیل گئی۔ سننے والوں پر سناٹا چھا گیا۔ یہ ہوش بھی نہ رہا کہ گانا کب بند ہوا۔

۵

چاند نکل آیا۔ بلبل نے گلاب کے پیڑ پر جاکر اُس کے کانٹوں سے اپنا جسم بندھ لیا۔ گانا شروع کیا جسکے تیکھے درد کو دیکھکر چاند اچنبھے میں رہگیا۔ بلبل جتنی بڑھتی ہوئی اُمنگ سے گانا گاتی تھی اتنا ہی اس کا بدن کانٹوں میں بندھتا جاتا تھا۔

پہلے اُس نے عشق کی پیدائش کا گیت گایا۔ پیڑ کی ڈالی پر ایک عجیب وغریب پھول کھل اُٹھا گیتوں کا ایک تار بندھ گیا۔ ادھر پنکھڑی پر پنکھڑی کھلتی جاتی تھی رات بیتی جاتی تھی۔ پیڑ نے متردد ہوکر کہا "بلبل میرے کانٹوں پر اپنا دل دبائے رہو نہیں تو پھول کے پوری طرح کھلنے کے پہلے ہی سویرا ہو جائے گا"

بلبل نے ایسا ہی کیا۔ اُس کی آواز اور بھی تیز ہوتی گئی۔ اُس نے اب عشق کے شباب کا گانا گایا۔ یکایک گلاب کی پنکھڑیوں سے سرخی جھلکنے لگی۔ کانٹا ابتک بلبل کے دل تک نہیں پہونچا تھا گلاب کے اندر بھی ابھی کچھ سفیدی باقی رہ گئی تھی۔

پیڑ چلا کر بولا "بلبل جلد اپنا دل میرے کانٹوں میں پوری طرح بندھ لو نہیں تو پھول پورا کھلنے کے پہلے ہی سویرا ہو جائیگا"

بلبل نے ایسا ہی کیا۔ ایک نہایت دردبھری آواز نہ اُٹھی چاروں طرف وہ دکھ بھری آواز گونج اٹھی کانٹوں نے اُسکے دل کو چھلنی کردیا۔ اسیوقت گلاب کا پھول ایک پل میں ڈوبتے ہوئے سورج کی طرح لال ہوگیا۔

بلبل کی آواز دھیمی ہوتی گئی۔ وہ درد کے مارے تلملا اٹھی۔ آنکھیں مند گئیں آواز دھیمی ہوتے ہوتے بند ہوگئی

پیڑ بولا "بلبل دیکھو سرخ گلاب پورا کھل گیا" بلبل نے کچھ بھی جواب نہیں دیا۔ کلیجے میں کانٹا بندھ گیا تھا اور وہ اسوقت پیڑ کے نیچے مری پڑی تھی۔

۶

سویرا ہوا۔ راجکمار نے کھڑکی کھولی۔ سامنے ہی انھیں وہ پھول دکھائی دیا۔ خوشی سے متوالا ہوکر وہ نیچے آیا اور ہاتھ بڑھا کر اسے توڑ لیا۔ زمین کی طرف نظر ڈال کر اتنا دیکھنے کا بھی موقع نہیں ملا کہ کسی جان کے بدلے میں اسے یہ انمول چیز ملی تھی

راجکمار پھول پاتے ہی راجکماری کے پاس گیا اور کہنے لگا "یہ لو تمھارا سرخ گلاب میں لے آیا۔ ایسا لال پھول زمین کے پردے میں کبھی نہیں کھلا ہوگا"

یہ سن کر راجکماری نے اپنا منھ پھیر لیا۔ وہ اپنی جیمال شام ہی کو توڑ چکی تھی۔

بولی "راجکمار اُسے لے جاؤ۔ اب مجھے اس کی ضرورت نہیں"

راجکمار نے غصے میں پھول کو راہ میں پھینک دیا۔ ایک گاڑی ادھر سے آتی تھی اُس کا پہیا پھول کو کچلتا ہوا نکل گیا۔
راجکماری نے کہا "راجکمار تم نکمے اور احسان فراموش ہو۔ تم محسن کش ہو۔"
یہ کہکر راجکماری وہاں سے چلی گئی۔

فراق (گورکھپوری)

ہمایوں شہنشاہ ہندوستان

(بہ سلسلۂ ماسبق)

شاہزادہ کامران ترشرو اور سنگدل تھا اگرچہ بہادر اور من چلا ضرور تھا وہ اپنے عہدہ داروں کے دلوں میں اپنی کوئی پایدار محبت نہ پیدا کر سکا بلکہ بظاہر کسی سے بھی اس کو خلوص نہ تھا بجز اپنی بدنصیب بی بی کے جو جلاوطنی میں بھی اسکی رفیق رہی - وہ اپنے باپ سے کہتی ہے "تم نے مجھے شوہر کے حوالہ اسوقت کر دیا جبکہ وہ بادشاہ تھا اور اسے ہر قسم کی شادمانی حاصل تھی اور اب اس سے علٰحدہ کرنا چاہتے ہو جبکہ اس کا زمانہ بگڑ گیا ہے، آنکھوں سے معذور اور مصیبت زدہ ہوگیا ہے نہیں میں وفاداری کے ساتھ وہ جہاں بھی جائے اُس کی خدمت گذاری کرونگی"

محاصرہ کابل کے وقت اس نے ہمایوں کے ایک افسر کے تین جوان بیٹوں کو قتل کر دیا اور مقتولین کے جسم کا قیمہ کرکے دیوار پر سے محاصرہ کرنے والوں میں پھنکوا دیا - اور اسی افسر کی بی بی کو ہجوم کے حوالہ کر دیا کہ بے عزت کیجائے اس قسم کی حرکات نہ صرف خود ہی سخت بے دردانہ اور مذموم تھیں بلکہ وہ کلیتاً جنگ کے رواج کے بھی خلاف تھیں -

اس میں کوئی کلام نہیں ہے کہ بادشاہ باوجود بیشمار سازشوں اور بغاوتوں کے کامران اور اپنے جملہ بھائیوں کیساتھ خالص محبت رکھتا تھا -

کامران جسنے کئی بار اطاعت کا اظہار کیا ایک مرتبہ جب وہ اس غرض سے تخت شاہی کے سامنے خود حاضر ہوا تو نہایت عاجزانہ طور پر گردن میں ایک تازیانہ لٹکا کر آیا بادشاہ نے فرمایا حیف حیف! "اسکی کوئی ضرورت نہیں ہے - اُسے پھینکدو" اور جیوں ہی کہ قدمبوسی کی رسم ادا ہوگئی بادشاہ نے بآواز بلند فرمایا "آنچہ گزشت گزشت" یہاں تک تو رسم کی پابندی تھی - آؤ اب ہم بھائیوں کی طرح ملیں"

آبدیدہ ہو کر بھائی کو بغلگیر کیا اور اپنے قریب عزت اور احترام کیساتھ بٹھایا اور پھر تھوڑی دیر میں اس سے ترکی زبان میں (تیموری دو نسلوں تک خانگی زبان تھی) کہا آؤ "میرے قریب بیٹھو" گویا وہ پھر چھوٹے بچے بن گئے -

جب شاہزادہ ہندال، افغانوں کے ساتھ سے جو کامران کے زیر فرمان تھے مارا گیا بادشاہ کا خیمہ ہندال کے خیمہ سے اوپر ایک پہاڑی پر تھا - لڑائی ختم ہو جانے کے بعد ہمایوں نے اپنے بھائی کا حال دریافت کیا لیکن کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ اس سے کہے کہ وہ ہلاک ہوگیا - بادشاہ نے خود اس چھوٹی پہاڑی پر تاریکی میں کھڑے ہو کر زور سے ہندال

کو آواز دی اور وہ مختلف قاصد اس کی تلاش میں روانہ کئے اور جب نتیجہ کار اُسے بھائی کی قسمت کا فیصلہ سنایا گیا تو اسپر کوہ الم ٹوٹ گیا اور خیمہ میں جاکر تنہا پڑ رہا۔ ایک معزز امیر نے اسے روتا پاکر وجہ دریافت کی تو کہا "کیا تم نے میرزا ہندال[1] کی شہادت کا واقعہ نہیں سنا؟ اس امیر نے نہایت بے باکی سے معقول جواب دیا "حضور روالا تو خود اپنے ہی نفع پر غمزدہ ہیں۔ آپ کا ایک دشمن اور کم ہوگیا" اور یہ فی الحقیقت سچ تھا۔

شاہزادہ کامران کی اس آخری بغاوت اور محاصرہ کابل کیوقت اسکے تکلیف دہ طرز عمل نے یہ بات ثابت کردی کہ اب وہ کسی قسم کے رحم کا مستحق نہیں ہے۔ اور یہ کہ سلطنت کی سلامتی اس امر کی مقتضی ہے کہ وہ قتل کردیا جائے۔ بادشاہ کے جملہ مشیروں نے یک زبان ہوکر یہی رائے دی اور باقاعدہ ایک محضر لکھ کر جسمیں اسکی شکایات درج تھیں پیش کیا اور دادخواہی کی التجا کی شہنشاہ کچھ تو اپنے مفسد اور دغاباز بھائی کی محبت کیوجہ سے اور کچھ اس وعدہ کے یاد آجانے سے جو اس نے اپنے باپ سے

[1] میرزا ہندال ۹۲۴ھ کو تولد ہوا تاریخ ولادت یہ ہے ؎ چیست دانی سال تاریخ شہ فرخندہ فال + کوکب برج شہنشاہی بود تاریخ سال۔ یہ واقعہ موضع خیبر میں ہوا تھا جو کابل کے ماتحت تھا۔ تاریخ وفات یہ ہے ؎ ہندال محمد شہ فرخندہ لقب + ناگہ زقضا شہید شد در دل شب + شبخوں بشہادتش چو کردند سبب تاریخ شہادتش زشبخون بطلب۔ مولانا میرزا امانی نے بطور تعمیہ یہ تاریخ لکھی ہے ؎ شاہ ہندال سرو گلشن ناز + چون ازین بوستان دولت رفت + عالمی رابیاد سرو قدش + بر فلک دود آہ حسرت رفت + گفت تاریخ قمری نالان + سروے از بوستان دولت رفت۔ (بوستان کا الف دور کرنے سے تاریخ نکلتی ہے)۔ الفنسٹن صاحب نے اس واقعہ کو ہمایوں کی سرگزشتوں کے مصنف کے حوالہ سے بالتفصیل لکھتے وقت یہ رائے لکھی ہے غالب یہ ہے کہ واقعۂ مذکورہ کے واقع ہونے سے انشراح خاطر کے نسبت انقباض اسکو زیادہ حاصل ہوا ہوگا اور جن صورتوں میں یہ کام اس سے صادر ہوا ان خاص صورتوں کے لحاظ و حیثیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام اس نے طبیعت کی خواہش سے نہیں کیا بلکہ خاص صورتوں کی ضرورت سے وہ اُسکا مرتکب ہوا اور کوئی بات اسکو اسکے سوا نہ سوجھی کہ وہ بھائی کو اندھا کرے اور اُسکے کھٹکوں سے ہمیشہ کے لئے مطمئن ہوکر بیٹھے اس لئے کہ وہ حقیقت میں ستمگار اور ناخداترس نہ تھا بلکہ اگر وہ یورپ کا ایسا بادشاہ ہوتا جسکے اختیار بالکل محدود و معین ہوتے ہیں تو چارلس ثانی شاہ انگلستان سے زیادہ سفاک و خونریز اور مکار و فریب انگیز نہ ہوتا۔ گلبدن بیگم اپنی کتاب ہمایوں نامہ کے صفحہ، ۷ میں لکھتی ہیں "عاقبت الامر جمیع خوانان و سلاطین و وضیع و شریف و صغیر و کبیر و سپاہی و رعیت وغیرہ که از دست میرزا کامران واغما داشتند دران مجلس متفق شده بعرض حضرت پادشاه رسانیدند که بادشاهی و تحکم رسم برادری منظور نمی باشد۔ اگر خاطر برادری خواهید ترک پادشاهی بکنید و اگر پادشاهی میخواهید ترک برادری بکنید واین همایون میرزا کامران است از سبب او در دشت قبچاق بسر مبارک ایشان چه نوع زخم رسیده بود و به افغان بکرو فریب داده یکی شد و متفق شده میرزا هندال بگذشت واکثر چغتائی از سبب میرزا نابود شده واهل و عیال مردم به بند رفت و بے ناموس شد۔ دیگرها بر جنهم جان و مال و اهل وعیال مایان همه تصدق یکتار موی حضرت این برادر نیست این دشمن حضرت است سخن مختصر که همه جمع شده به اتفاق بجد شده بعرض رسانیدند که ؎ رخنه گر ملک سرافگنده به؛ حضرت پادشاه در جواب فرمودند که اگر این سخنان شمایان خاطر نشان من می کنند اما دل من نمی شود۔ همه فریاد برآوردند و گفتند که آنچه بعرض رسانیده شده است عین مصلحت است۔ آخر الامر حضرت فرمودند که اگر مصلحت و رضامندی همه شمایان درین است۔ پس همه شمایان جمع شوید محضری نویسید۔ (یہاں پر کتاب ختم ہوجاتی ہے) مترجم

مرتے وقت کیا تھا راضی نہ ہوتا تھا۔ کامران سخت قید میں رکھا گیا۔ اور دوسرے دن صبح کو حکم دیا گیا کہ اس کی آنکھوں میں سلائی پھیر دیجائے تاکہ وہ آنکھوں سے اندھا ہو جائے لیکن اس کی جان کو نقصان نہ پہونچے۔ صرف اسی طور پر وہ ایذا رسانی سے باز رہ سکا۔ یہ واقعہ ۱۵۵۳ء کا ہے جس سے قبل کامران کم و بیش متواتر بغاوتوں میں ۲۳ برس تک مصروف رہ چکا تھا بادشاہ کا حکم صادر ہوتے ہی تعمیل کی گئی۔ کچھ دنوں کے بعد کامران نے ملاقات کی درخواست کی "آدھی رات کو شہنشاہ شمع کی روشنی میں پانچ یا چھ معزز آدمیوں کو ساتھ لئے کامران کے خیمہ میں داخل ہوا"۔ ہمایوں بیٹھ گیا اور جیوں ہی کہ نابینا میرزا کو اندر لائے بادشاہ بآواز زردیا اس نے خدا کو شاہد گردان کر کہا کہ میری خواہش کے مطابق کس قدر کم واقعات پیش آئے اور کس طرح پر صدق دل سے میں اپنے بھائی کی تکالیف کو محسوس کر رہا ہوں۔ میرزا نے دریافت کیا کہ اور کون کون خیمہ میں ہے۔ کہا گیا کہ میر تردی بیگ، منعم بیگ، بابوس بیگ (جنکے بیٹوں کو اسنے قتل کیا تھا) اور چند دیگر امرا اسپر اُسنے ان سبھوں کو مخاطب کیا اور کہا، تم سب گواہ رہو کہ جو کچھ مجھپر گزرا یہ سب میری ہی بداعمالی و گناہوں کا نتیجہ ہے۔ ہمایوں کے دل پر اس کا بہت بڑا اثر پڑا اور اس منظر کا خاتمہ کرنا چاہا اور رنج و غم کی وجہ سے رکتی ہوئی آواز اور کانپتے ہوئے لہجہ میں کہا:۔

اب ہم کو فاتحہ پڑھنا چاہئے[5] اُسکے بعد میرزا نے نہایت لجاجت سے بادشاہ سے اپنے لڑکوں کو خاص نگرانی میں رکھنے کی سفارش کی بادشاہ نے کہا آپ اس سے مطمئن رہئے وہ خاص میرے بچے ہیں[5]"

بادشاہ کے لئے عہد حکومت کے آغاز ہی میں ممکن تھا کہ وہ اپنے خاص بھائیوں کے دغا سے بیخوف ہو کر میدان جنگ میں مقابلہ پر آتا۔ غیر ملک کے مورخین اسکے ابتدائی ناکامیابی کا سبب اس کی تلون مزاجی اور طبیعت کی کمزوری قرار دیتے ہیں مورخین کے بیانات سے یہ بات میرے نزدیک صاف ہو جاتی ہے کہ اگر وہ اپنے باپ کی اس نصیحت پر کاربند نہ ہوتا کہ اپنے رقیب بھائیوں کیساتھ شفقت کا برتاؤ کرے۔ اگر ویسا ہی کرتا جیسا کہ اس کے جانشینوں نے کیا۔ اگر وہ ان کو فوراً قتل کروادیتا تو وہ شاید ایک کامیاب فرمانروا کہلایا جاتا۔

اگرچہ اس طور پر وہ بھائیوں کے حق میں شاید بیرحم سمجھا جاتا لیکن اور باقی دنیا کے حق میں ضرور رحمدل ثابت ہوتا وہ اکثر مہربانی کی حد سے بھی گزر کر بلند خیال اور کشادہ دل ثابت ہوا ہے۔

---

[5] قرآن کی سورۂ اول۔ دعا جس کے الفاظ یہ ہیں:۔ الحمد للہ رب العالمین۔ سب تعریف اللہ کو ہے جو صاحب سارے جہان کا۔ الرحمٰن الرحیم بہت مہربان نہایت رحم والا۔ مالک یوم الدین۔ مالک انصاف کے دن کا۔ ایاک نعبد و ایاک نستعین۔ تجھ ہی کو ہم بندگی کریں اور تجھ ہی سے ہم مدد چاہیں۔ اہدنا الصراط المستقیم۔ چلا ہم کو سیدھی راہ۔ صراط الذین انعمت علیہم۔ راہ اُنکی جنپر تو نے فضل کیا۔ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین نہ جنپر غصہ ہوا اور نہ بھکنے والے۔ (مصنف)

[5] ارسکین صاحب کی تاریخ ہمایوں باب سوم جلد پنجم کا خلاصہ۔ (مصنف)

سیف خاں ایک مرتبہ آدھے دن تک ہمایوں کی کل فوج کو روکے رہا جبکہ اس کا آقا شیر خاں پہاڑ کی تنگ راہ سے چھپ کر بھاگ رہا تھا آخر کار اسے گرفتار کرکے شہنشاہ کے سامنے لائے اس کے جسم میں تین جگہ زخم لگے تھے جنسے خون جاری تھا اور موت کا انتظار کر رہا تھا شہنشاہ نے کہا "ایک سپاہی کے لئے یہی شایاں ہے جسکو اپنے آقا کی خیر خواہی میں اپنی جان تک نثار کر دینی چاہیئے - میں تم کو آزاد کرتا ہوں جہاں تمھارا جی چاہے چلے جاؤ - سیف خان نے عرض کیا "میرا خاندان شیر خاں کے ہمراہ ہے میں اسی کے پاس جانا چاہتا ہوں"

شیر خاں اسوقت مغلوں کے حق میں ایک کانٹا تھا - لیکن ہمایوں نے کچھ بھی پس و پیش نہیں کیا اور کہا "میں نے تمھاری جان بخشی کی ہے - جیسا چاہو کرو"

ہمایوں کی عادات میں ان مشہور افسانوں کا بھی شعبہ پایا جاتا تھا جو خلفا کے جانب منسوب کئے جاتے ہیں جو کہ شعرا کو ان کے کلام کے صلہ میں اور مطربوں کو اُن کے گانے کے عوض مورد عنایت کرتے اور ان سے کہتے "مانگو کیا چاہتے ہو"

ذیل کا واقعہ جو اس کے باپ کے زمانہ میں پیش آیا ایک عمدہ مثال قدر دانی علم اور ایسی باتوں کی طرف میلان کا ہے جو افسانوں میں مذکور ہوتی ہیں اور یہ ایشیائی طبیعت کا جزو ہیں - ایک شہر پر قبضہ کرکے سپاہیوں نے ہر جگہ سونا چاندی اور مال غنیمت تلاش کیا - مولانا سعد اللہ فرماتے ہیں کہ "تین شخص میرے مکان میں گھس آئے اور میرے باپ کو پکڑا (جنھنے علوم کی تحصیل اور تعلیم میں ۶۵ برس صرف کئے تھے اور بڑھاپے میں نابینا ہو گئے تھے) اور قید کر لیا - اور لوگ آئے اُنھوں نے مجھے باندھ لیا اور میرزا (شاہ حسین) کی خدمت میں بطور تحفہ کے بھیجدیا - وزیر ایک چبوترہ پر بیٹھا ہوا تھا جب میں اس کے مکان پر پہونچا اُسنے ایک زنجیر میں باندھے جانے کا حکم دیا جس کا ایک سرا چبوترہ پر بندھا ہوا تھا - مجھے اپنے لیئے کچھ رنج و افسوس نہ معلوم ہوتا تھا لیکن اپنے باپ کی اس تکلیف وہ حالت پر زار زار رو رہا تھا" وزیر نے قلم دوات منگایا اور اپنا قلم بنایا کہ کچھ لکھے اتنے میں اسے کسی نے بلا لیا - اب وہاں سوا سعد اللہ قیدی کے اور کوئی نہ رہگیا - وہ کہتے ہیں میں چبوترہ کے قریب گیا اور جس کاغذ پر وزیر لکھنا چاہتا تھا اسی پر میں نے یہ اشعار لکھدیئے ۔ مطلب "کیا آپ کی آنکھیں نہیں دیکھتی ہیں کہ میں رو رہا ہوں اور باوجود اسکے بھی آپ ہرگز نہیں فرماتے "اب نہ روؤ" - اور کیا آپ کا دل آپ کو کبھی یہ اشارہ نہیں کرتا کہ آپ مجھپر ترس کھائیں ؟

وزیر نے آکر اس قطعہ کو پڑھا اور شاعر کو آزاد کر دیا اور خود اپنی پوشاک اُسے پہنادی اور میرزا کے پاس لیجا کر اسکی تقریب ملاقات کی جسنے سعد اللہ کے باپ کو چھوڑ دیا - دونوں قیدیوں کا اسباب انھیں واپس دیکر بہت عزت و احترام کے ساتھ رخصت کیا -

موجودہ صورت میں ہر بات ہندوستان کے دوبارہ فتحیابی کے لئے مفید تھی ۱۵۵۵ء میں بادشاہ کابل سے پندرہ ہزار سواروں کی جماعت لیکر روانہ ہوا۔ پنجاب پر حملہ کرکے افغانوں کے ہاتھ سے لاہور چھین لیا۔ اور دہلی و آگرہ پر قبضہ کر لیا۔ ان فتوحات نے جسمیں کہ شاہزادہ اکبر کی کوششوں کا حصہ بھی شامل تھا ہندوستان کے قبضہ کو مستحکم بنا دیا۔

دہلی میں داخل ہونے کے چھ ماہ بعد ۱۵۵۶ء میں وہ زینہ پر سے گرکر راہی ملک بقا ہوا۔ اور اکبر (جسکی عمر اسوقت تیرہ برس کی تھی) اسکے بجائے تخت پر بیٹھا۔

اس آخری حملہ میں ہمایوں نے عہد کیا تھا کہ اگر خدا نے ہندوستان کی سلطنت پھر اسے واپس دی تو وہ ہرگز کسی مسلمان کو غلام نہ بنائے گا۔ وہ افغانوں کے خلاف جو مسلمان تھے لڑ رہا تھا اور تیمور تاتاری کے طریقہ پر ان کے سروں کا مینار بنانے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کرتا تھا۔ لیکن انھیں غلام نہیں بنایا۔ سینٹ بارتھولومو کے قتل سے سترہ برس قبل یہ آخری مینار انسانی سروں کا چنا گیا۔

ہمایوں قلعہ دین پناہ میں کتاب خانہ کی چھت پر چڑھ رہا تھا اترتے وقت اذان کی آواز آئی۔ ہمایوں اذان کی تنظیم کیلئے وہیں بیٹھ گیا۔ اُٹھتے وقت عصا پھسلا اس کے سبب سے وہ کئی زینوں کی سیڑھیوں پر لڑکھڑاتا ہوا زمین پر گرا۔ جب کچھ آرام ہوا تو شیخ چولی کی پیشکش کے واسطے شاہزادہ اکبر کے پاس پنجاب میں نذر بھیجی اور حقیقت حال سے مطلع کیا آخر پندرہویں تاریخ کو اس عالم فانی سے انتقال کیا۔ اسکے مرنے کی تاریخ ہے ؎ چو گشت از رحمت حق ساکن اندر روضۂ رضوان + بہشت آمد مقام پاک او تاریخ ازان باشد اور مولانا قاسم نے یہ تاریخ لکھی ہے ؎ ہمایوں بادشاہ ملک معنی + ندارد کس چو او شاہنشہی یاد + زبام قصر خود افتاد ناگہ + ازاں عمر عزیزش رفت بر باد + پئے تاریخ او کاہی رقم زد + ہمایوں بادشاہ از بام افتاد + اور ایک تاریخ یہ ہے ؎ مشو غافل از سال فوتش ببین ہمایوں کجا رفت و اقبال او - اور ایک تاریخ یہ ہے۔ ع۔ اے آہ بادشاہ من از بام افتاد + مولانا قاسم کاہی نے یہ ایک اور تاریخ وفات لکھی ہے اگرچہ ایک عدد اسمیں کم آتا ہے لیکن تاریخ خوب ہے ؎ ہمایوں بادشاہ آن شاہ عادل + کہ فیضش خاص او بر عام افتاد + بنای دولتش چون یافت رفعت + اساس عمرش از انجام افتاد + چو خورشید جہان تاب از بلندی + بپایان در نماز شام افتاد جہان تاریک شد در چشم مردم خلل در کار خاص و عام افتاد + قضا از بہر تاریخش رقم زد + ہمایون بادشاہ از بام افتاد + مسعود حصاری نے یہ مصرعہ کہا ہے۔ ع۔ واصل حق شد ہمایوں بادشاہ۔ میر عبد الحئی کا یہ مصرع ہے گویا بادشاہ من ز بام افتاد۔

۵۲ چارلس نہم اور اُسکی ماں کیتھرائن دی میڈسی کے فرانسیسی پروٹسٹنٹوں کا قتل عام جو پیرس میں سینٹ مارتھولو کی شہادت کی تاریخ کو ۱۵۷۲ء میں شروع ہوا اور تمام فرانس میں جاری ہوگیا اور خاص خاص صوبوں میں تیس روز تک برابر قائم رہا تیس ہزار پروٹسٹنٹ قتل کئے گئے تھے۔

تیمور کے جملہ جانشین ذاتی شجاعت، دل کی مضبوطی، کی وجہ سے ممتاز سمجھے جاتے تھے اور ان میں سے بعض نے اپنے مورث اعظم کی وہ بہت ترکہ میں پائی تھی جس سے کہ وہ ایک قائم شدہ راے پر ہمیشہ مستقل مزاجی اور ثابت قدمی کے ساتھ پابند تھے لیکن ہمایوں نے ان اوصاف کو ترکہ میں نہ پایا تھا اسمیں جرأت ضرور تھی لیکن استقلال کی کمی تھی۔ ارسکن صاحب نے جو ہمایوں کی سوانحمری لکھی ہے اس میں اسکی عادات وخصائل کی بابتہ جداگانہ راے ظاہر کی ہے جسکا انتخاب ہم اسجگہ درج کرتے ہیں:۔

"اس کا ذہن تیز تھا لیکن وہ متلون طبع، بیفکر اور غیر مستقل تھا۔ قدرتی طور پر وہ فیاض، ملنسار اور محبت کرنے والا تھا" اسکے عادات شائستہ بے تکلف اور دلکش تھے اس کی فیاضی آخر کار اسراف کے درجہ تک پہونچگئی تھی اور اسکی شفقت کمزوری کی حد تک بڑھ گئی تھی اور اسی لئے مرتے وقت تک وہ خوشامدیوں اور ان لوگوں کا جو اس کے منظور رہتے شکار بنا رہا۔ وہ علم کا شایق تھا، اور علما کی صحبت سے خوش ہوتا تھا۔ وہ شاعر بھی تھا اور یہ کہا جاتا ہے کہ اُس نے ریاضی اور علم ہئیت میں بہت دستگاہ حاصل کرلی تھی۔ انتقال کرنے سے پہلے وہ ایک رصدگاہ تعمیر کرنے والا تھا اور اس کے آخری آلات مہیا کر چکا تھا۔ وہ ایک خاصہ مسلمان، صدیم صلوۃ اور ارکان شرع کی پابندی میں سخت تھا" اور اگرچہ وہ دلیر، نیکمزاج، فیاض

ھ۱ ہمایوں کے کلام کا انتخاب:۔ گزشت از دل سرگشتہ ناوک ستمش + بماند برمن دلدادہ لذت المش + بقصد کشتن عشاق گر کند میلے + عجب نیاشد از غلاص وشیوہ کرمش + کرامت زہرہ قرب حریم حرمت او + کہ جبرئیل امین نیست محرم حرمش + اگر بہ پرسش عشاق می نہد قدمے + ہزار جان گرامی فدائے بر قدمش + ولہ۔ خوش آنکہ باخیالت عمر نشستہ بودم + وز شوق سرو قامت از جائے جستہ بودم + عیبم مکن کہ گفتم موے ترا پریشان + در شرح جعد زلفت چوں دل شکستہ بودم + وز شرح غنچہ او ہر گز نگفتہ حرفے + لب را در اں حکایت پیوستہ بستہ بودم + حقا کہ چون ہمایوں در حال وصل بیخود + با دوست در حکایت از خویش رستہ بودم + ولہ۔ داغ عشق تو بر جبین منست + خاتم لعل تو نگین منست + تا نشستم چو خاک بر در تو + پشت بام فلک زمین منست + ہر کجا شہر وشہر یارے تو + این زماں بندۂ کمین منست + خط مشکیں بغنچہ گلفام + آیت رحمت مبین منست + ولہ۔ من اشک روان چو گنج قارون دارم + گلگونہ دروں کیسہ ز افیون دارم +

ھ۲ ہمایوں کا علم ہئیت میں کامل دستگاہ رکھنا محض فسانہ نہیں ہے، جیسا کہ ارسکن صاحب کی تنقید سے ترشح ہوتا ہے بلکہ یہ واقعہ ہے۔ لوگ دور دراز سفر طے کرکے اُس سے اس فن کی تعلیم حاصل کرنے آتے تھے چنانچہ نور الدین سیفد دی ہئیت سیکھنے کیلئے اسکی خدمتمیں ہندوستان آئے ہمایوں خود علامہ الیاس ردیلی کا شاگرد تھا اسکو اس فن سے اس حد تک شغف تھا کہ یہی شوق اُسکے وفات کا سبب ہوا۔ اپنے کتبخانہ کی چھت پر شام کو طلوع مریخ کا مشاہدہ کرنے گیا تھا اور جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے اذان کی آواز سنکر چھت سے اترتے وقت زینہ سے پھسلا اور گرا تو جانبر نہ ہوسکا۔ اُسنے کرہ ارض، کرات عناصر، افلاک وکواکب مجسم صورت کے مختلف رنگوں سے بنائے تھے۔ سات سیاروں کے لحاظ سے سات کمرے بنوائے جو اصول منجم کے لحاظ سے ہر ایک خاص رنگ کے تھے ہفتہ کے ہر دن وہ باسلسلہ ترتیب کسی ایک کمرہ میں بیٹھا کرتا تھا اور اس روز اسی کمرہ کے رنگ کے مطابق خود لباس زیب تن کرتا تھا اور اسی طرح اسکے مصاحبین بھی کرتے تھے۔ ہندوستان میں اصطرلاب کا رواج اسی کا دیا ہوا ہے اسنے ایک خاص اصطرلاب ایجاد کیا جسکو اصطرلاب ہمایونی کہتے ہیں۔ یہ لفظ یونانی زبان کا ہے جسکے معنی میزان الشمس کے ہیں اصطر ستارہ کو کہتے ہیں اور اسٹرانومی یعنی علم ہئیت اسی اصطر سے مشتق ہے، دار العلوم ندوہ میں ایک اصطرلاب پر یہ عبارت کندہ ہے "عمل ضیاء الدین

اور علم دوست تھا مگر اسکی نیکیاں حد سے گزر کر عیوب میں شمار ہونے لگیں اور ان سے بہت کم مفید نتیجہ پیدا ہوا "۔

اس کے باپ بابر نے بھی اسکے متعلق اپنا فیصلہ ہمارے لئے چھوڑا ہے۔ ہمایوں بہت عرصہ تک دربار میں رہا اور سلطنت کے ہر جزوی معاملات میں حصہ لیتا رہا اور بادشاہ کا ایسا معین تھا کہ ایک لمحہ کو بھی اس سے جدا نہ ہوتا تھا۔ بابر ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ ہمایوں ایک رفیق ہونے کی حیثیت سے تمامی آباد حصہ دنیا میں اپنا نظیر نہیں رکھتا وہ گلگزار انسانیت و خوش اخلاق تھا۔ باپ سے اسکی محبت خالص اور سچی تھی - اپنی عمر کے چھبیسویں برس میں اسنے بابر کے سوانح کا اپنے ہاتھ سے ترجمہ لکھا اور اس میں جا بجا اپنے حواشی اضافہ کئے - وہ اپنے متوسلین پر یکساں مہربانی کرتا اور ان کا خیال رکھتا۔ اپنے بیٹے اکبر - اپنے رفقا اور اپنے شریر بھائیوں سے ایکساہی طرح پر ہمیشہ سرگرمی کے ساتھ محبت رکھتا تھا اس کی سلطنت میں خرابیاں زیادہ تر اس لئے پیدا ہوگئی تھیں کہ اس سے ان لوگوں کے ساتھ سخت برتاؤ کرنے میں بڑی کوتاہی ہوئی لیکن ہم باوجود ان متواتر مصائب کے خیال کے اسکی قدر و منزلت اس وجہ سے کرنے پر مجبور ہیں کہ یہ سب کچھ اس وعدہ کی ایفا کی غرض سے تھا جو اس نے اپنے باپ سے اسکے مرتے وقت کیا تھا۔ اس کی عادات کے وہی نقایص جنھوں نے اسکو مختلف قوموں کے کامیاب فرمانروا ہونے کی حیثیت سے کسیقدر کم تعریف کا مستحق باقی رکھا ہم کو اسکا بہت زیادہ گرویدہ بحیثیت اسکے انسان ہونے کے بنا لیتے ہیں۔ اسکی شہرت کو اسلئے نقصان پہونچا ہے کہ اس کا عہد حکومت بابر کی بارونق فتوحات اور فیاض و مدبر اکبر کی حکومت کا درمیانی زمانہ تھا لیکن وہ بابر کا بیٹا اور اکبر کا باپ ہونے کا سزاوار تھا۔

سید عبد السبحان ناظر

چار کتابیں

قربانیاں

(افسانہ)

شیخ عبدالرحیم ان قدیم روش کے لوگوں میں سے تھے جو باوجود زمانہ کا سرد و گرم دیکھنے کے اپنا طریق عمل بدلنا پسند نہیں کرتے ایک چھوٹے سے خاندان کی حکومت ان کے ہاتھ میں تھی اور وہ تمام سپید و سیاہ کے مالک تھے وہ اپنے اختیارات کے کام لانے میں اسی قدر پس و پیش کرتے تھے جتنا کہ تیرہویں چودہویں صدی کے خود مختار بادشاہ۔ جو بات بری یا بھلی سیدھی یا الٹی وہ اپنی جگہ پر طے کر لیتے وہ گھر بھر کو ماننی پڑتی۔ کسی کو دم مارنے کی اجازت نہ تھی۔ سب سے زیادہ مُسن ہونے کی وجہ سے انھیں اسکا کافی موقع مل گیا تھا کہ وہ خاندان کے ہر شخص کی قوت ارادی کو کمزور بنا کر مطیع کر لیں جب ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی تو انکی بیوی نے دو ایک مرتبہ غرور حسن و شباب سے حکم عدولی کی تھی جسکا نتیجہ دو مرتبہ طلاق کی صورت میں ظاہر ہوا اور اب اس بیچاری کو ہر وقت یہی ڈر لگا رہتا تھا کہ ذرا سے انحراف سے کہیں تیسری طلاق کی باری نہ آجائے لیکن شیخ صاحب کی یہ حالت تھی کہ وہ انھیں اپنے بس میں دیکھکر بجائے مستحق رعایت سمجھنے کے ہر وقت جبر و سختی کا نشانہ بنائے رکھتے تھے اس افراط کا نتیجہ طرح طرح کی مصیبتوں میں ظاہر ہوتا۔ لیکن ان کے مستقل ارادوں کو ذرا سی بھی تو جنبش نہ ہوتی اور نہ وہ کسی وقت اپنی قائم کی ہوئی رائے سے ٹلتے۔ خواہ میاں بیوی کے تعلقات کیسے ہی کشیدہ اور تلخ ہو جائیں۔ جب بچے ہونے لگے تو انکا دائرۂ حکومت اور بھی وسیع ہوا۔ اگر وہ پہلے بادشاہ تھے تو اب شہنشاہی کے مراتب حاصل ہوئے۔ اس لئے جبروت اور بھی بڑھا۔ اختیارات میں اور بھی توسیع ہوئی۔ زچہ خانہ ہی سے حکومتیں شروع ہونے لگیں۔ بچے کو رونے نہ دیا جائے کانوں کو برا معلوم ہوتا ہے۔ دایہ کی ایک ہفتہ سے زاید ضرورت نہیں اصراف محض ہے۔ زچہ اپنے ہاتھ سے کام کاج کرے جسم میں قوت آئیگی۔ دفعتاً بچہ پر ام الصبیان کا دورہ پڑا۔ گاؤں کے حکیم صاحب بلائے گئے۔ انھوں نے یونہی معمولی اردو فارسی کچھ پڑھی تھی اور ان کی سب سے بڑی تعریف یہ کہی جا سکتی ہے کہ وہ شیخ جی سے ضدی مریض کو بھی عدم آباد جلد سے جلد پہونچا دینے میں خاص سلیقہ رکھتے تھے۔ ماں چیخا پیٹا کی کہ شہر سے سول سرجن۔ لیڈی ڈاکٹر یا کوئی تجربہ کار حکیم بلوا دو لیکن شیخ صاحب کی ہٹ اور حکیم صاحب کے کمال کے آگے اسکی کچھ نہ چلی اور بچہ تین دن کی علالت میں پیوند خاک ہو ہی گیا۔ گو اس روز سے شیخ جی سے انکی بیوی بہت زیادہ کشیدہ خاطر ہو گئی تھیں۔ لیکن فطرت نے اپنا کام پھر کیا اور ان کے بطن سے پھر ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ یہ ماں کی طرح سخت جان

اور باپ کی طرح ضدی بھی اس لئے کہ گو شیخ جی کی افراط خود پرستی نے بڑی جدوجہد کی لیکن اُسنے مرنے کا نام نہ لیا گھٹنوں چلی تتلی زبان میں بولی - پڑھنا شروع کیا قرآن ختم کیا شیخ سعدی کی پوری تصنیفات پڑھیں اور بالآخر ایک سرو قد نازک اندام روشن خیال ماہ جبین بنکر رہی اور شیخ جی کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ انوری واقعی گھر کا اُجالا ہے

خواجہ عبد اللطیف انسپکٹر پولیس شیخ صاحب کے دور کے عزیز بھی تھے اس لئے جب کبھی وہ تفتیش میں آتے تو شیخ صاحب ہی کے مہمان ہوتے - انسپکٹر صاحب کوئی ستائیس اٹھائیس برس کے جوان تھے اور اس قدر جلد ترقی کا راز محض ان کی دیانت - سچائی - اور بہادری تھی -

ایک دن انسپکٹر صاحب کو تفتیش میں اتنی زیادہ دیر ہوئی کہ آفتاب غروب ہوگیا برسات کا موسم کالی رات تھی شیخ صاحب نے اصرار کیا - ان کے ہاں مقیم ہوگئے - شب کو کھانا کھانے کے بعد جب پلنگ پر لیٹے حقہ پی رہے تھے اور ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی کسیکو نہایت درد بھری لیکن دلکش اور سریلی آواز میں ڈاکٹر اقبال کی مشہور نظم "فاطمہ بنت عبداللہ" پڑھتے سنا اور جب پڑھنیوالا اس مصرع پر پہونچا کہ :-

"ایسی چنگاری بھی یا رب اپنی خاکستر میں تھی!"

تو بے اختیار انکی آنکھوں سے آنسو نکل آئے - اُٹھکر ٹہلنے لگے اور دیر تک اس سے لطف اٹھاتے رہے - پھر پلنگ پر آکر ٹیٹھ اور کروٹیں بدل بدل کر بالآخر سو گئے -

تھوڑی ہی دیر سوئے ہونگے کہ دماغ عجیب طرح کی بو سے پراگندہ ہوگیا اور دم گھٹنے لگا - گھبراکر آنکھ جو کھولی تو دیکھا کہ تمام کمرہ میں دھواں بھرا ہے اور مکان کے زنانے حصہ سے عورتوں کی چیخ پکار کے ساتھ "ہائے آگ لگی! آگ لگی!" کی آواز آرہی ہے فوراً پلنگ سے اٹھے اور کمرے کے باہر آکر ڈیوڑھی سے شیخ صاحب کو آواز دی - کئی مرتبہ پکارنے کے بعد کوئی بولا "ارے بھیا اندر چلے آؤ - وہ اپنے حواس میں نہیں!"

عبد اللطیف کچھ رکتے جھجھکتے اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ مکان کے ایک حصے میں آگ اچھی طرح لگ چکی ہے شعلے بھڑک رہے ہیں شیخ صاحب صحن میں ایک پلنگ پر بیہوش پڑے ہیں اور عورتیں گرد پروانہ کی طرح جمع ہیں اور نہ کسی کو پردہ کا خیال ہے نہ کسی اجنبی کے آنے کا ایک معمر عورت کو لوگ پکڑے ہیں اور وہ چیخ رہی ہے "ہائے مجھے چھوڑ دو میں اپنے بچے کے ساتھ جل مرونگی!" انسپکٹر صاحب کو دیکھکر بولیں "بھیا مجھے ان سے چھڑا دو میری بچی کوٹھے پر جل رہی ہے - خدا کے لئے تم ہی بچاؤ!"

انسپکٹر نے چلتے ہوئے دالان میں زینہ دیکھا اور پھرتی سے اچک کر اُسپر ہو رہے اور جلدی جلدی قدم رکھتے ہوئے کوٹھے پر

پہونچے اور ایک چھوٹے سے کمرے میں جہاں شعلے حصار بنائے ہوئے تھے داخل ہوئے سامنے ہی ایک نیم سوختہ مجسمہ دکھائی دیا۔ انھوں نے سرعت سے اُسے اپنی گود میں اُٹھایا اور تیزی سے لوٹے شعلے جلو میں تھے کبھی ان کے صدقے ہوتے کبھی اُس چاند سے ٹکڑے کی بلائیں لیتے جو ان کے سینہ سے لگا تھا۔ لیکن وہ دھن کا پکا سیکڑوں چرکے کھاتا دالان سے ہوتا ہوا صحن میں پہونچا اور شیخ صاحب کے قریب اس دوشیزہ کو لٹاکر ایک مرتبہ جھوما اور سیدھا زمین پر لیٹ گیا!

سخت سے سخت دل کو احسان نرم کر دیتا ہے چنانچہ شیخ صاحب سے سنگدل کی بھی یہ حالت ہوئی کہ وہ انسپکٹر کا کلمہ پڑھنے لگے اور اسکے معاوضہ کی صورتیں سوچنے لگے۔ خلاف اصول بیوی سے شب کو مشورہ کیا وہ بولیں "جسکی جان بچائی اسے انکی کنیزی میں دیدیجئے!" بات عقل کی تھی سمجھ میں آگئی۔ اور ایک صاحب کے ذریعہ سے انسپکٹر تک پیغام پہونچا یا دہاں انکا یہ حال کہ انوری کو آگ سے نکال تو لائے تھے۔ لیکن خود دوسری آگ میں جلنے لگے تھے۔ بھڑکتے ہوئے شعلوں کے حلقہ میں اسکا دمکتا ہوا چہرا اسکے پریشان و آشفتہ بال اُس کا نرم نرم جسم جسے وہ اپنی گود میں اُٹھاکر بچا لائے تھے اور پھر وہ فطری تعلق اور وہ کشش جو بچانے والے اور بچائے جانے والے میں پیدا ہو جاتی ہے ان سب کے علاوہ اسکے محاسن اور خوبیوں کا دوسروں کی زباں سے بیان الغرض ان تمام باتوں نے ان کے حواس کو مختل کر رکھا تھا کہ سونے میں سہاگا یہ ہوا کہ انوری نے ایکدن ایک ما ما کے ہاتھ ایک خط لکھ بھیجا۔ مضمون یہ تھا:-

میرے محسن!

گو رسم ہندوستان کے سراسر خلاف ہے لیکن میں آپ کا شکریہ بغیر ادا کئے نہیں رہسکتی آپ نے جس طرح اپنی قیمتی جان خطرے میں ڈال کر مجھے بچایا میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں اسپر اپنی شکر گزاری کا اظہار کر سکوں۔ "انوری"

انسپکٹر صاحب نے جب سے یہ خط پایا تھا اسوقت سے اپنے کو اس کا غلام تصور کرنے لگے تھے۔ چنانچہ جب ان کے پاس شیخ صاحب کا یہ پیغام پہونچا تو وہ سجدۂ شکر میں جھک گئے اور مارے مسرت کے انکی آنکھوں سے آنسو نکل آئے!

الغرض بات پکی ہوگئی۔ تحفے تحائف آئے گئے۔ منگنی بھی ہوگئی اور عقد کی تاریخ طے ہونے لگی کہ شیخ صاحب کو انکی افراط خود پرستی کی سزا اور انوری کو اس کے افراط ایثار کا بدلہ دینے کے لئے فطرت نے نیا سامان کیا۔

انسپکٹر صاحب پھر تفتیش کے سلسلے میں آئے اور ہونیوالی سسرال میں آکر مقیم ہوئے۔ کوٹ اتار کر کھونٹی میں لٹکایا اور وضو کرکے نماز پڑھی اور پھر کوٹ پہنکر باہر کہیں تفتیش کے لئے چلے گئے۔ ان بیچارے کو کیا خبر کہ ان کا وہ خط جسے وہ ہر وقت اپنے

دل کے قریب رکھتے تھے وہیں شیخ جی کے کمرے کے فرش پر گر پڑا تھا۔ ان کے جانے کے بعد شیخ جی نے جو ایک خط پڑا ہوا دیکھا اور رسم خط انوری سے ملتا ہوا پایا تو اُسے کھول کر پڑھنے لگے۔ وہی الفاظ جنھوں نے انسپکٹر صاحب کے دل میں جذبات کا طوفان برپا کر دیا تھا ان کے لئے زہر آلود نشتر بن گئے تھے حکومت وجبروت کی عادی فطرت مراسم ہندوستان کی پابند طبیعت نے انوری کے اس فعل کو حد درجہ حقارت کی نگاہوں سے دیکھا اور اظہار احسانمندی کو بیغیرتی اور بے حمیتی کے کریہ الفاظ سے یاد کیا۔ مارے غصہ کے اپنی بوٹیاں نوچنے لگے اور وہ خط ہاتھ میں لئے لال لال دیدے نکالے اندر پہونچے اور بیوی کے سامنے پھینک کر بولے "دیکھئے یہ آپ کی صاحبزادی کے کرتوت ہیں۔!"

انھوں نے سہم کر خط اٹھا لیا اور شروع سے آخر تک پڑھ گئیں کچھ سمجھیں کچھ نہ سمجھیں۔ لیکن مصالحت کرنے والے لہجے میں بولیں "ہاں ہے تو بات شرم کی لیکن اب تو دو چار دن میں شادی ہی ہوئی جاتی ہے!"

شیخ صاحب چیخکر بولے "شادی! شادی کیسی؟ اب تو وہ مر بھی جائے تو میں اس لونڈے سے ہرگز نہ کروں! میں اس چھوکری کا اپنے ہاتھ سے گلا گھونٹ دونگا لیکن اب لطیف کی تو اسے بیوی نہ ہونے دونگا چپکے چپکے نامہ وپیام ہوتے ہیں! ....مردود!"

اور دانت پیستے آستین چڑھائے پیر پٹختے باہر چلے آئے۔ یہاں گھر بھر میں سناٹا ہو گیا ہر شخص کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں اور جب ناکردہ گناہ مجرم کو خبر لگی تو وہ ڈر اور صدمے سے سہم گئی۔ غرضکہ انوری کے اظہار تشکر نے اور شیخ صاحب کے اظہار تنفر نے اور پھر دونوں کی جلد بازی نے اس بنے بنائے کھیل کو بگاڑ دیا اور دو محبت کرنے والے دلوں کے درمیان ایک لوہے کی دیوار حائل ہو گئی!

ماں نے ہاتھ جوڑے بچی کی بے مرادی دکھائی۔ اس کی معصومیت اور بھولے پن کی قسمیں کھائیں۔ عزیزوں نے سمجھایا دوست احباب نے راہ راست پر لانے کی کوششیں کیں لیکن سب بے سود شیخ صاحب کی ضد۔ پچاسوں برس کی منجھی ہوئی ضد کے آگے کسی کی پیش نہ گئی۔ اور یہ ہو کیونکر سکتا ہے؟ ان کی سالہا سال کی ریاضت برباد جاتی۔ انکی حکومت میں خلل آجاتا۔ ان کو ماننا پڑتا کہ لڑکے لڑکی بھی شخصیت رکھتے ہیں ان کو بھی اپنی زندگی کے اہم ترین معاملے میں "ہاں" "نہیں" کہنے کا اختیار ہے۔ ناممکن خلاف عقل! قطعی محال! جب بوڑھا اس طرح کا بچپنا کرے تو کون سمجھائے۔

انسپکٹر صاحب نے یہ تمہاری حکم سُنا۔ دل تڑپا آنکھوں سے آنسو نکلے اور داڑھی کو تر کرتے ہوئے دامن پر گر کے بکھر گئے اور لوگوں کے ذریعہ سے شیخ صاحب کی خوشامد کرائی روپیہ کا لالچ دیا۔ لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔ اس بندۂ خدا نے نہیں سے ہاں

نہ کہنا تھا نہ کہا بلکہ اپنے ایک جاہل نصف سے زائد پاگل بھتیجے سے بات ٹھہرائی اور ابتدائی رسمیں کرکے عقد کی تاریخ مقرر کردی انوری نے لاکھ دل پر جبر کیا لیکن اس طرح زندگی کا خون ہوا اور چہرے مہرے سے ظاہر نہ ہو اپنا پڑا یا ہر شخص دیکھتا تھا اور سمجھتا تھا کہ اسے یہ شادی قطعی نامنظور ہے۔ لیکن اس ہندی بشریٰ نے جو ایک زبان بند کی تو پھر رسمیں ہوئیں انکار و اقرار ہوا کیا شکر رنجیاں بھی ہوئیں۔ مسرتیں بھی ہوئیں۔ لیکن وہ نہ منھ سے بولی نہ سر سے کھیلی! اور بولتی کیسے! بیٹی ذات۔ اپنی شادی بیاہ کی بات! سب ہی تو دیدہ دلیر بنانے لگتے۔ لیکن اس سکوت کے یہ معنی نہ تھے کہ اسکے دل پر کچھ گزرتی ہی نہ تھی۔ جو کچھ ہوتا تھا وہ سب استقلال سے جھیل رہی تھی اور نباہے لئے جا رہی تھی اس لئے کہ وہ بھی اپنے باپ کی بیٹی تھی اور اول دن سے کوئی بات دل میں طے کئے بیٹھی تھی۔

آخر وہ بھی دن آ ہی گیا جسکی شام کو بارات آنے والی تھی۔ انوری نے منھ اندھیرے اٹھکر نماز پڑھی تلاوت قرآن کی اسکے بعد دو خط لکھکر لفافوں میں بند کئے اوپر پتے لکھے اور انھیں اپنے تکیہ کے نیچے رکھکر وہاں گئی جہاں تھکی ماندی ماں پڑی سو رہی تھی اور آہستہ آہستہ پانوں دبانے لگی۔ وہ کسل سے چور تھوڑی دیر بیہوش بنی رہیں پھر انھوں نے جب آنکھ کھولکر دیکھا کہ ان کی نور دیدہ ہے تو دعائیں دیتی اٹھ بیٹھیں اور دیر تک کلیجہ سے لگائے رہیں اور ماں بیٹی کے آنسو انھیں کی طرح ایک دوسرے کے آغوش میں سما گئے۔

پھر انوری وہاں سے لوٹی اور اس گوشہ میں چلی گئی جو اس کے لئے مخصوص تھا اور اس نے پہلے تو ادھر اُدھر دیکھا اُسکے بعد دیر تک ہاتھ جوڑے چھت کی جانب دیکھا کی اور اسکے ہونٹ ہلتے رہے پھر اُس نے اپنے ہاتھ کی اس انگوٹھی کی طرف دیکھا جس میں ہیرے کی کنی چمک رہی تھی اور جو انھیں رسموں میں اُسے پہنائی گئی تھی۔ اور ایک مرتبہ بسم اللہ کہکر کنی چبا گئی! اور پھر مسکراتی ہوئی چپکی لیٹ رہی!

دوپہر کو شادیانے بج رہے تھے شہنائی والا اپنی نے نوازیاں دکھا رہا تھا زنانہ مکان سے دفعتاً " ہائے ہائے " کی صدا بلند ہوئی۔ شیخ صاحب ننگے پانوں دوڑتے ہوئے اندر پہونچے۔ دیکھا تو سارا گھر خالی ہے اور تمام بیویاں اس گوشہ میں جمع ہیں جہاں انوری کو ہفتوں سے محبوس کیا گیا تھا اور ہر شخص سر و سینہ کوٹ رہا ہے۔ انھوں نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا " ارے لوگو یہ کیا ہے؟" یہ سنتے ہی ان کی بیوی ان کی طرف مجمع کو چیرتی یہ کہتی بڑھیں:۔

"بی بو ذرا انھیں دیکھنے دو ...... ہٹ جاؤ! علیحدہ کھڑی ہو جاؤ۔ آج وہ اپنے کرتوت دیکھیں گے!"

شیخ صاحب نے اپنی عادت کے موافق ڈانٹکر "کیا ہے کیا؟" تو ضرور کہا لیکن اب جو بیوی کے چہرے پر نظر کی تو عجب طرح کا فرق پایا اس عورت کی آنکھوں سے جس نے کبھی آنکھ ملاکر ان سے بات نہیں کی، آج شعلے نکل رہے تھے اور ان

قسطاسِ مُستقیم

(سلسلۂ ماسبق)

دوسری جگہ آپ فرماتے ہیں کہ :-

ذوق کا کلام سہل الفہم ضرور ہے لیکن اس میں وہ شگفتگی اور رنگینی نہیں ہے جو ایک عامی اور عالم کے یہاں مابہ الامتیاز ہے"

حضرت غزل میں عالمانہ الفاظ لکھنا فن سخنوری میں جائز نہیں ہے۔ روزمرہ کی صفائی اور سلاست الفاظ اور ملائم تشبیہیں غزل گوئی کی روح ہیں میر تقی مرحوم کا شعر ہے ؎

یوں پکارے ہیں مجھے کوچۂ جاناں والے ادھر آبے ابے او چاک گریباں والے

الفاظ سوقیانہ ہیں لیکن درد بھر دیا ہے اور موقع کی تصویر کھینچ دی ہے۔ حالانکہ ذوق مرحوم کے یہاں ایسے الفاظ نام کو بھی نہیں ہیں۔ میں تو ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں مان سکتا کہ ان کا سوقیانہ انداز ہے ان کی زبان اردوے معلے ہے۔ وہ خاص قلعہ کی زبان ہے وہ زبان ہے جسکے واسطے مصحفی لوگوں کو از راہ طنز کہا کرتے تھے کہ جن لوگوں کو جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھنا نصیب ہی نہیں ہوا وہ ریختہ کیا جانیں گے۔ یہ وہ زبان ہے جسکی انھوں نے ایک دہلوی ماں کی آغوش میں ابتدائی اور جس کو امراکی صحبت میں نشو نما دی۔ ۵۰ برس مشق سخن کی تھی بیسیوں کو صاحب دیوان کر دیا۔ نواب الہی بخش خان مرحوم کے استاد رہے۔ ان کو صاحب دیوان معروف کر دیا۔ ہمہ داں ہمہ گیر کاملین دہلی کی آنکھیں دیکھیں۔ ایک شخص محمد حسین نامی کو آغوش تربیت میں لیا۔ جو بڑا ہو کر یہ پروان چڑھا کہ اردوے معلے کا شار بعدیل ہو گیا۔ پھر کسی کو کوئی حق نہیں کہ ذوق کی زبان پر اعتراض کرے جناب اس زبان کو اسی زمانے کے اہل کمال کے نقطۂ نظر سے دیکھئے۔ ان کے مویدین اہل فضل کے نقطۂ نظر سے دیکھئے آزردہ مرزا حالی اور فضل حق مرحوم کی نظر سے دیکھئے آپ اس زبان کا مقابلہ ستر برس بعد کی زبان سے نہ کیجئے رہا یہ کہ سوقیانہ مضامین ہیں۔ کم از کم کچھ مثالیں تو اس سوقیانہ شاعری کی پیش کرتے۔ عزیز صاحب اگر ٹھنڈے دل سے ذوق کا مطالعہ کرتے تو یہ نوبت نہ آتی آپ نے تو ذوق کے دیوان کا مطالعہ ہی نہیں کیا اور اس پر رائے زنی شروع کر دی۔ زور صاحب فرماتے ہیں :-

وہ عام رجحان اور شغف کی جو تعلیمیافتہ جماعت میں پیدا ہو رہا ہے اور جس سے غالب کا دیوان روز بروز اس کی نگاہوں میں قابل توجہ ہوتا جا رہا ہے اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ ان کا کلام بہت ادق بلکہ مہمل ہے

اس لئے ایک غیر معمولی وقعت حاصل ہوگئی "

غالب کے بیسیوں ایڈیشن نکل چکے ہیں متعدد شرحیں لکھی جا چکی ہیں شاید ہی کوئی ایسا پڑھا لکھا ہوگا جسے غالب کے متعدد اشعار یاد نہ ہوں۔ بچارے ذوق کا دیوان ہے کہ صرف ان لوگوں کے ساتھ اس کا وجود باقی ہے جو اس کے ہوا خواہ ہیں .... آخر آپ اتنا تو خیال فرمائیں کہ غالب کے کلام میں غیر ضروری کوئی ایسی بات موجود ہے جو باوجود ادق ہونے کے طلبا کی دلچسپی کو قائم رکھتی ہے۔ کسی چیز کا صرف ادق ہونا ہی جاذب توجہ ہو تو کم از کم میرے لئے حساب الجبر اور علم العروض والقافیہ نہایت ہی دلچسپی کا باعث ہوں "

اسمیں شک نہین کہ موجودہ طریق تعلیم اور اس کے معائب کو دیکھتے ہوے تو مجھے بھی جناب زور کے خیال سے اتفاق کرنا پڑتا ہے لیکن میں غالب کے کسی شعر کو اسکا لئیں بھی مہمل کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ جو شخص، اتنا بڑا عالی دماغ ہو اسکے اشعا اگر ہماری سمجھ میں نہ آئیں تو ہماری فہم کا قصور ہے۔ ممکن ہے کہ وہ ہماری فہم سے بالا تر ہوں " اسمیں شک نہیں کہ غالب کا کلام اردو مجموعی طور پر فارسی سے کہیں مشکل ہے گو آزاد ذوق کے شاگرد ہونے کی وجہ سے غالب کے متعلق راے دینے میں اعتبار سے گر گئے ہیں لیکن مجھے اس موقع پر ان کی یہ راے جو نیرنگ خیال میں انھوں نے ایک فرضی خواب "شہرت عام اور بقاے دوام کے پیرائے میں ظاہر کی بڑا مزا دیتی ہے کہ " غالب اگرچہ سب سے پیچھے تھے پر کسی سے نیچے نہ تھے بڑی دھوم دھام سے آئے اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گنگ ہوگئے کوئی سمجھا کوئی نہ سمجھا مگر واہ واہ اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے " ایسے تو ہزاروں ہی سخن فہم غالب کے اسوقت بھی موجود تھے۔ دہلی سے دکن اور کلکتہ تک تھے۔ لیکن ایسے حضرات سے ان کو جیتے جی ہی جب تسکین نہ ہوئی تو اب تو اور بھی ان کی روح کو صدمہ پہنچتا ہوگا۔ وہ خود فرماتے ہیں :۔ اکثر صاحب اطراف و جوانب سے ماہ نیم ماہ کے بھیجنے کا حکم بھیجتے ہیں اور میں جی میں کہتا ہوں کہ مہر نیمروز کی عبارت کو نہیں سمجھتے تو ماہ نیم ماہ کو لیکر کیا کریں گے" صاحب یادگار غالب نے لکھا ہے کہ اکثر غالب کہا کرتے تھے کہ یہ لوگ میرے اردو فارسی دیوانوں کو دیکھتے ہیں اور جن تصنیفوں پر مجھکو ناز ہے انہیں کوئی سمجھتا بھی نہیں ۔

اسمیں شک نہیں کہ شارحین دیوان غالب نے اسکی مشکل پسندی کافی داد دینے کی کوشش کی۔ لیکن کامیابی اگر ہوئی تو اسقدر کہ اپنی کم فہمی کو خوب نمایاں کر دیا۔ کئی جگہ اپنی نافہمی سے غالب پر مہمل گوئی کا الزام عاید کیا گیا ہے اسمیں بیجا اعتراضات بے نمک توجیہیں نازیبا تاویلیں ہیں اکثر جگہ جہاں ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے وہاں کئی کئی مطالب لکھدئے ہیں خلاف محاورہ اہل زبان اردو فارسی کے لفظوں کے معانی گڑھ لئے ہیں یا ایسے پیچ در پیچ معانی لکھے ہیں کہ خود انکی تشریح شعر سے بھی زیادہ دشوار ہے کہتے ہیں کہ ژند کی تفسیر استا لکھی گئی وہ کسی اللہ کے بندے نے ژند سے بھی زیادہ عسیر الفہم تھی مجبوراً موخر الذکر کی بھی تفسیر لکھنا پڑی اور ژند نام رکھا گیا اور تبرکاً استا کو چاک نہیں کیا، نام خدا یہی حال ان تشریحات کا ہے سن لیا کہ غالب تصوف کے اور فلسفہ کے مضامین بہت لکھتے تھے لہذا ہر جگہ حقیقت اور مجاز میں دوڑنے لگے ہر شعر رسالۂ شفا ہو گیا

ہر مصرعہ کتاب النفس ہوگیا۔ ہر لفظ کو میخانۂ فلسفہ اور ہر نقطے کو ساغر حقائق بنا دیا۔ غرض قلم ہاتھ میں تھا جو چاہا جہاں لکھدیا معنی شعر سے مستنبط نہیں کرتے بلکہ خود معانی گڑھ لیتے ہیں اور بعدہٗ اسکو خود ہی لفظی جامہ پہنا کر مطلب کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

غالب کے سخن کی تیور پہچاننے والے خدا کے فضل و کرم سے ایسے ایسے ہیں کہ اس شعر کو غالب سے منسوب کرتے ہیں اور اپنی تیور شناسی پر ناز کرتے ہیں ؎

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط — بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

الفاظ ملاحظہ ہوں "تیور تو یہی کہہ رہے ہیں کہ وہ مرزا غالب جیسے قادر الکلام کے قلم سے نکلا ہے"۔ عزیز صاحب فرماتے ہیں:۔

سلاطین مغلیہ کا فوری زوال بہت سی بلاؤں اور تاریکیوں کا پیش خیمہ تھا۔ ملک کے اطراف و جوانب میں علم کے تذکرے خاموش ہوگئے۔ ہندوستان بھر کے آسمان پر جہالت کی گھٹائیں چھا گئیں ...... ذوق سلیم کا فقدان ہوگیا علامہ کی بن آئی ..... ذوق نے ذوق عامہ کا اتباع کیا مشاعروں میں ان کو واہ واہ بھی نصیب ہوئی ملک الشعراء و خاقانی ہند کے خطاب سے بھی سرفراز کیا گیا۔"

بے اختیار وہ زمانہ یاد آتا ہے جبکہ یاس عظیم آبادی نے صفحات مخزن مرحوم پر غالب کے خلاف ایک محشر بپا کر رکھا تھا..... وہ سب غوغا اور ہنگامے ہائے بے تمیزی صدا بصحرا ثابت ہوئے۔ آج چار دانگ ہند میں منادی کرا دیجئے اور دیکھئے کہ آپ کے اور یاس کے کتنے ہمنوا پیدا ہوتے ہیں۔"

"وہ وقت آئے گا کہ متقدمین سے شاید سوائے غالب اور میر کے دیوانوں کے باقی سب دفتر گاؤ خورد ہو جائیں۔ جب لکھنؤ اور دلی کی قیود سے اردو شاعری آزاد ہوئی تو نہ آتش کی آتش بیانی کام آئی اور نہ ذوق کی سادگی۔ دونوں اس معیار پر کھوٹے نکلے اور زمانہ نے بیکار سمجھکر ردی کی ٹوکری میں ڈالدیا غالب کے کلام کا وہ مجموعہ جسے زمانے کی ناقدر شناسی نے گلدستہ طاق نسیاں بنا دیا تھا تلاش کرکے مارکیٹ میں لایا گیا۔"

جناب عزیز جو کچھ زوال مغلیہ کے نتائج اور ادبیات پر انکے اثر کے باب میں فرماتے ہیں واقعات اس باب میں کچھ اور ہی بتلاتے ہیں فوری زوال مغلیہ کا بہت سی تاریکیوں کا پیش خیمہ ہونا مسلم لیکن ادبیات کا اس سے متاثر ہونا مستثنیٰ۔ ادھر سلطنت کا زوال ہو رہا تھا۔ ادھر اردو کی بنیاد قائم ہو رہی تھی جو سلطنت کے واسطے خزاں تھی وہ اس کی بہار تھی۔ سلطنت ہبوط میں تھی اور اردو عروج میں، علمی تذکرے عام ہوگئے تھے۔ پہلے صرف محمد شاہ کے دربار میں رنگ لیاں تھیں اب ہر امیر کے یہاں خود شاہی محافل گرم ہونے لگیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں بیدل پیدا ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں قتیل۔ واقف خان آرزو وارستہ اور ان کے بیسیوں

تلامذہ پیدا ہوئے - یہ وہ زمانہ ہے جسمیں میر و میرزا - انشا اور مصحفی جیسے کاملین فن پیدا ہوے - یہ وہ زمانہ ہے جسمیں اردو کے تمام بڑے بڑے شعرا پیدا ہوے یہ وہ زمانہ ہے جسمیں ناسخ موجد طرز جدید ہوئے - یہ وہ زمانہ ہے جسمیں آتش نے آتش بیانی کی - یہ وہ زمانہ ہے جسمیں ذوق - مومن - غالب - ممنون - نصیر - شیفتہ وغیرہ ہوے - اسی زمانے میں اردو ادبیات کے سرمایۂ ناز مرزا دبیر اور میر انیس پیدا ہوئے یہ وہ زمانہ ہے جسمیں دہلی سے کلکتہ تک اہل علم سے بھر گیا یہ وہ زمانہ ہے جسکے متعلق حالی نے یادگار غالب میں لکھا ہے کہ دہلی میں ایسے افراد جمع ہوگئے تھے جن کا وجود عہد اکبری کے بزم آرایان سخن کی یاد کو تازہ کرتا تھا یہ وہ زمانہ ہے جسمیں بقول غالب صہبائی دبیر و مومن و حسرتی و آزردہ فارسی کے استاد ہوئے ؎

هند را خوش نفسانند سخنور که بود — باد در خلوت شان مشک فشان از دم شان

مومن و نیر و صهبائی و علوی آنگاه — حسرتی اشرف و آزرده بود اعظم شان

یہ وہی زمانہ ہے جسکی ابتدا (ع) این دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ" سے ہوئی - محافل عیش و مجالس سخن ایسی گرم ہوئیں کہ آخرکار سلطنت کو آگ لگادی ؎

جو ہوا غرقۂ مے بخت رسا رکھتا ہے — سر سے گزرے پہ بھی ہے بال ہما موج شراب

آپ ایسے فرخ زمانے کو جہالت اور بد مذاقی کے زمانے سے تعبیر کرتے ہیں حیرت ہے -

جناب مالک رام صاحب نے نگار کی اشاعت دسمبر میں جس سلامت روی کے ساتھ مضمون بعنوان غالب و ذوق لکھا ہے وہ قابل داد ہے حقیقتاً و تصدیقاً میں نے بھی اپنے ایک دوست سے دیوان غالب طبع نیم مطبوعہ نظامی پریس بدایوں لیکر دیکھا واقعی مقدمہ میں ڈاکٹر محمود صاحب نے عجیب و غریب خیالات کا اظہار فرمایا ہے - خوش اعتقادی کی تعریف کی جاسکتی ہے - لیکن نفس مضمون اور تاویلات کی نہیں - ع راست میگویم من و از راست سر نتواں کشید - مالک رام صاحب کا انتخاب بھی اچھا ہے مضمون میں دو باتیں کھٹکتی ہیں اول تو مصادر فارسی کے استعمال پر رائے اور دوسرے سہروں کا موازنہ اول الذکر کے باب میں گزارش ہے کہ اگر موصوف اسوقت کی زبان کی حالت کو دیکھیں گے تو مصادر کا استعمال عام پائیں گے حتیٰ کہ ذوق مرحوم کے یہاں بھی ذوق تپیدن، بشکستہ وغیرہ نظر آئیں گے - ذوق کا مصرعہ ہے - تامل کیجیو ذوق تپیدن دیکھئے کیا ہو - سہروں کا موازنہ اس وجہ سے نہیں کیا جاسکتا کہ الفضل للمتقدم اس کا سہرا غالب مرحوم ہی کے سر رہا -

میں نے شعر الہند سے کچھ ذوق کے متعلق استصواب کیا - ذوق اور غالب کے تذکروں میں ورق گردانی کی - لیکن دونوں بیغائدہ ع این شیوہ عیان ساخت عیار دگراں را - خیال کرتے تھے کہ دار المصنفین اعظم گڑھ کی تصنیف ہے شعر العجم سے مشابہ بھی ہے کتاب اچھی ہوگی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ پہلا حصہ اردو ادب میں محض ایک اضافہ غیر ضروری ہے شعر العجم جیسی ہوتی

تو بھی صبر ہو جاتا ——— مانا کہ اُردو شاعری اب دہلی اور لکھنؤ کے قیود سے آزاد ہو گئی ہے لیکن اس سے یہ مطلب نہیں ہے کہ زبان میں بھی مولوی صاحبان قیاس سے کام لیں ۔

شعر الہند صفحہ ۲۴۲ میں ذوق کے تذکرے میں ہے " ذوق بھی اکثر ناسخ کے رنگ میں کہتے ہیں لیکن بایں ہمہ وہ شاہ نصیر سے دو باتوں میں ممتاز ہیں ایک تو یہ کہ دلی کی آب و ہوا کے اثر سے ان کے کلام میں جا بجا جذبات اور روحانیات کی آمیزش بھی موجود ہے اس لئے ان کا کلام صحرائے بے آب و گیاہ کی طرح بالکل خشک اور بنجر نہیں معلوم ہوتا بلکہ خس و خاشاک کے ڈھیر میں کہیں کہیں دو چار پھول بھی نظر آ جاتے ہیں "

دوسرے یہ کہ محاورات کو اس برجستگی کے ساتھ باندھ جاتے ہیں کہ طبیعت کو نہایت لطف و انبساط حاصل ہوتا ہے "
عجیب و غریب طرز استدلال ہے عجب مجہول سبب ذوق کے شاہ نصیر پر اختصاص کا تبلاتے ہیں ۔ کیا دلی کی آب و ہوا ذوق ہی پر اثر کرتی تھی اور شاہ نصیر پر نہیں ؟

اب راقم بطور خود عرض کرتا ہے کہ مرزا نے جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے شاعری کی ابتدا پندرہ برس کی عمر سے کی دس برس تک مضامین خیالی جلال و اسیر و بیدل کے رنگ میں لکھتے رہے ۔ اور پھر تمیز آنے پر دیوان مذکور کو محو کیا اور چند اشعار دیوان حال میں رہنے دیئے اگر اس حال میں لوگ ان کی شاعری پر آوازے کستے تھے تو کونسی تعجب کی بات تھی ۔ جیسا کہ حالی نے لکھا ہے مرزا کے حقیں میر تقی میر نے جو پیشین گوئی تھی وہ بالکل پوری ہوئی ۔ ظاہر ہے کہ مرزا اول اول ایسے رستے پر گئے تھے کہ اگر استقامت طبع اور سلامت ذہن اور بعض صحیح المذاق دوستوں کی روک ٹوک اور نکتہ چینی ہمعصروں کی خورده گیری اور طعن و تعریض سدّ راہ نہ ہوتی تو وہ شدہ شدہ منزل مقصود سے بہت دور جا پڑتے اس حال میں بھلا نافہمی کا الزام جیسا کہ اکثر اسد اللہ خان غالب کے نُصیری ان کے ہمعصروں پر لگاتے ہیں کہاں تک درست ہو سکتا ہے ۔

مرزا نے ۱۲۴۵ھ میں اسد تخلص ترک کر کے غالب تخلص اختیار کیا ۔ یعنی ۱۴ برس تک اسد تخلص لکھتے رہے بھلا اسوقت کے مشاعروں میں ایسے شعر ؎

اسد ہر اشک ہے یک حلقہ بر زنجیر افزودن　　بہ بند گریہ ہے نقش بر آب امید رہا

سن سنکر لوگ بر داشتہ خاطر کیوں نہ ہوتے مرزا کی زبان کچھ اور ہی تھی ۔ اسوقت نہ وہ اردو تھی نہ فارسی ۔ غالب جب کسی قابل ہوئے تو زمانے نے خود بخود ان کی قدر کی ۔ بقول حالی مرحوم ان کا تمام کلام اردو فارسی نظم و نثر ان کے جیتے جی اطراف ہندوستان میں پھیل گیا ۔ ان کے پاس مکاتیب میں جا بجا سے اردو غزلوں کی مانگ آتی تھی ۔ ان کے خطوط دیکھو گے تو اکثر جگہ ان کا تذکرہ پاؤ گے " انھوں نے موجودہ دیوان کا انتخاب بھی کوئی عمولی لوگوں کی تحریک سے نہیں کیا تھا ۔ بلکہ مولوی فضل حق

خیرآبادی جیسے وحید العصر بھی شامل تھے۔ یہ وہ انتخاب ہے جسکے متعلق آزاد مرحوم لکھتے ہیں "یہ وہی دیوان ہے جوکہ آج ہم عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں"۔

مرزا کے اس خاص طرز کی اہل فہم جہاں تک تعریف کریں بجا ہے۔ غالباً اس باب میں خود ان کی رائے سے بہتر کوئی رائے نہیں ہوسکتی فرماتے ہیں ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے　　کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

حالی مرحوم نے کس سنجیدگی کے ساتھ لکھا ہے۔ "یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ شاعر اور اسکے کلام کا اندازہ اسکے کلام کی قلت اور کثرت سے نہیں ہوتا بلکہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اسکے منتخب اور برگزیدہ اشعار کس درجے کے ہیں۔ میر کی قدر لوگ اسلئے نہیں کرتے کہ انہوں نے متعدد ضخیم دیوان چھوڑے ہیں بلکہ صرف اسکے منتخب اشعار نے جو تعداد میں قلیل ہیں (بقول عامہ بہتر نشتر ہیں) اس کو تمام ریختہ گو شاعروں کا سرتاج بنا دیا۔

یہ بھی معلوم رہے کہ تمام شعرا کا کلام ایک ہی معیار سے نہیں جانچا جاتا ورنہ فردوسی۔ نظامی دونوں مثنوی میں اور انوری وخاقانی دونوں قصیدے میں مسلم الثبوت نہیں ٹھہر سکتے کیونکہ انوری کا قصیدہ اور فردوسی کی مثنوی بہ اعتبار سادگی اور صفائی وعام فہم ہونے کے خاقانی کے قصیدے اور نظامی کی مثنوی سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے۔ حالانکہ چاروں شخص

فارسی کے رکن رکین مانے جاتے ہیں پس لازم ہے کہ جدا جدا معیاروں سے جانچے جائیں"

اب اگر ہم یہ کہیں کہ جو بات غالب کے یہاں ہے وہ ذوق کے یہاں بافراط نہیں ہے اور جو چیز ذوق کے یہاں ہے اسکی غالب کے یہاں بہتات نہیں ہے تو اُمید ہے کہ اہل انصاف ہمکو یہ کہنے کی اجازت دینگے کہ ——— "ذوق کی زبان مومن خاں کی نازک خیالی اور غالب کی بندش" یہ بالکل بجائے خود صحیح ہے لیکن اس یہ کہیں نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ بقیہ دو ہر ایک کے یہاں مفقود ہیں۔ نہیں بلکہ مجموعی طور پر دوسری دو چیزیں تیسرے کے یہاں کمی کیساتھ ہیں اور یہی ان کی خصوصیت ہے جو انفرادی حیثیت سے ایک دوسرے کو ممتاز کرتی ہے۔

عزت علی (ایزدی)

ابن یمین کے گمشدہ نایاب دیوان کی دستیابی

حافظ کی شاعری کے متعلق ایک جدید انکشاف

اور

تاریخ ادب فارسی میں حیرت انگیز اضافہ

اگر ایک طرف یہ امر مسلم ہے کہ بزم تغزل میں حافظ اپنے لئے بجا طور پر مسند صدارت حاصل کر چکے ہیں تو دوسری طرف اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ حافظ کی شاعری کا کوئی مخصوص رنگ نہیں ہے اگر اسوقت وہ ایک صوفی با صفا ہیں تو دوسرے وقت ایک رندلا ابالی اگر ابھی انکی تسبیح و تہلیل کے نعروں سے خانقاہ گونج رہی ہے تو کبھی ان کی ہو حق سے میخانہ میں ہنگامہ برپا نظر آتا ہے۔ کسی جگہ نکات تصوف بیان ہو رہے ہیں کہیں فلسفیانہ معمے حل کئے جاتے ہیں اور کہیں نہ تصوف ہے نہ حکمت، نہ شریعت ہے نہ طریقت، ایک ہمال ہے ناقابل تاویل، ایک بے راہ روی ہے منزل سے کوسوں دور۔ یہ اعتراض زمانۂ حال ہی میں ابھر وارد نہیں ہوا بلکہ خود انکے زمانہ میں بھی لوگوں نے اس کو محسوس کر لیا تھا چنانچہ شاہ شجاع جب خواجہ حافظ سے کشیدہ خاطر ہو گیا تو اس نے خواجہ حافظ کو بلا کر کہا کہ آپ کی کوئی غزل ایسی نہیں جو ہموار ہو اور ایک رنگ پر قائم۔ ایک شعر میں صوفیانہ نکات ہیں۔ تو دوسرے میں الہوی کے جذبات۔ تیسرے میں مشائخ پر طعن و تشنیع، چوتھے میں فلسفہ، اس کا کیا سبب ہے، حافظ نے جواب دیا کہ ہاں یہ سب درست ہے مگر باوجود ان تمام برائیوں کے بھی میری غزلیں میری زبان سے نکلتے ہی تمام دنیا میں پھیل جاتی ہیں اور بچہ بچہ کی زبان پر ہوتی ہیں اسی طرح اور لوگوں نے بھی حافظ کے اس انداز پر اعتراضات کئے ہیں اور آج بھی نقاد نگاہیں اُن کی شاعری کے اس نقص کو نظر انداز نہیں کر سکتیں۔ مگر لوگوں نے بہت کم اس امر پر غور کیا کہ یہ نقص اُن کی شاعری میں کیوں پیدا ہوا اور اسکے اسباب کیا ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ حافظ کی ابتدائے زندگی کے حالات میں سے بڑی حد تک ان کے شاعرانہ حسیات کو متاثر ہونا چاہئے تھا تاریک ہیں اور اسقدر تاریک ہیں کہ وہاں سے سراغ لگانا آسان کام نہیں، لیکن پھر بھی اگر کوئی شخص ان کے شاعرانہ تلون کا راز دریافت کرنا چاہے تو وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ اسی تاریک زمانہ کی طرف جائے اور اسی وقت کے واقعات سے اس معمہ کا حل چاہے۔

سب سے پہلے ہم کو دیکھنا ہے کہ ان کی ابتدائی تعلیم کیونکر ہوئی۔ اس کے متعلق اہل تذکرہ لکھتے ہیں کہ حافظ کے والد

بہاء الدین کا جب انتقال ہوا تو انھوں نے کثیر دولت چھوڑی اور ان کے تین لڑکے اس دولت کے وارث قرار پائے جنمیں سے ایک حافظ بھی تھے ۔ چونکہ حافظ کے دونوں بھائی سن شعور کو پہونچ چکے تھے اور حافظ ابھی ناسمجھ بچے تھے اس لئے ان کو اس دولت سے جو ان کے باپ نے چھوڑی تھی بہت کم حصہ ملا اور اُن کے دونوں بڑے بھائیوں نے چند روز میں اس دولت کو جو باپ سے ترکہ میں ملی تھی برباد کر دیا اور حافظ اپنی والدہ کے ساتھ نہایت عُسرت اور تنگدستی سے بسر کرتے رہے ان کی والدہ نے مجبور ہو کر ان کو کسی آدمی کے سپرد کیا کہ جو جا ہو اس سے خدمت لو مگر اسکے کھانے کپڑے کی کفالت کرو اتفاق سے وہ شخص نہایت اوباش نکلا اور حافظ سے نہ نبھ سکی آخر کار اپنے گھر آگئے اور خمیر بنانے کا پیشہ اختیار کیا ان کے گھر کے قریب کوئی مکتب تھا جہاں بچے معمولی تعلیم پاتے تھے ان کو بھی کچھ پڑھنے کا شوق ہوا اور وہیں پڑھنے لگے اور جو کچھ پڑھا وہیں پڑھا ۔

ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں تعلیم معمولی ہوئی ہوگی ۔ خود ناسمجھ تھے مکتب معمولی تھا اور یوں بھی استاد ایسے لاوارث بچوں کی طرف کم توجہ کرتے ہیں، لہذا پہلا سبب تو ان کی تعلیمی خامی ہے جس نے عمر بھر ان کو کوئی ایک راہ اختیار نہ کرنے دی ۔ دوسرا سبب غالباً یہ ہوا ہوگا کہ ان کے محلہ میں کوئی موزوں طبع بزاز رہا کرتا تھا جسے خود بھی شعر و سخن کا شوق تھا اور دوسرے شعراء بھی اس کے یہاں جمع رہا کرتے تھے ۔ حافظ صاحب ادھر سے گزرتے تو ان کی طبیعت میں بھی ایک قسم کی گدگدی پیدا ہوتی یہانتک کہ انھوں نے بھی شاعری شروع کر دی ۔ لیکن اور لوگوں کے واسطے سامان تفریح سے زائد نہ تھی شہر بھر میں ان کی اس حالت کا چرچا ہوا اور مجالس و محافل میں اس بہانے سے ان کا گزر ہونے لگا جہاں لوگ ان کو بناتے تھے ۔ اس رنگ میں ان کو دو سال گزر گئے لیکن انھوں نے فکر سخن کو نہ چھوڑا اور دو تین سال کے بعد طبیعت میں ایک خاص مناسبت پیدا ہو چلی اور آخر کار مشق سے موزوں کہنے لگے ۔ چونکہ بزاز کی دوکان پر مختلف باکمالوں کا مجمع رہتا تھا اس لئے ان کو جو [illegible] معلوم ہوتا ہوگا اسی طرف توجہ کرتے ہوں گے ۔ شاعری کی ابتدا طبیعت میں ذاتی جوہر قابلیت مفقود، استاد کوئی نہیں مختلف رنگوں کا ان پر اثر ہونا ضروری تھا ۔ کچی لکڑی تھے جدھر جو چاہتا تھا موڑ دیتا تھا ۔ الغرض یہیں سے ان کی شاعرانہ کجروی کا آغاز ہوا جو رفتہ رفتہ ترقی کرتا رہا خوش عقیدہ حضرات نے ان کی موزوں گوئی کا ایک عجیب لطیفہ بیان کیا ہے کہ جب یہ ہر جگہ بنائے جانے لگے تو ایک روز ان کو نہایت رنج ہوا اور یہ بابا کوہی کے مزار پر جا کر بہت روئے اسی عالم میں وہیں سو گئے ۔ سوتے ہی حسب معمول ایک بزرگ آ پہونچے اور کچھ آذوقہ بھی اپنے ساتھ لائے ۔ اور مہربانیوں کے ساتھ ایک یہ مہربانی بھی کی کہ اپنے ہاتھ سے ان کے منھ میں لقمے دینے لگے اور یہ بھی فرماتے رہے کہ جا اب تمام علوم کے دروازے تجھ پر کھولدئے ۔ انھوں نے نام دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ حضرت علیؓ ہیں ۔ اب جو یہ صبح کو اٹھے تو یہ غزل کہی ؎

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند　　وندراں ظلمت شب آبحیاتم دادند

لوگوں کو بڑا تعجب ہوا کہ یہ کیا قصہ ہے۔ آخر سمجھنے والوں نے یہ سمجھا کہ غزل ان کی نہیں ہے اور دوسری طرح دی، اس امتحان میں بھی پورے اترے تو ان کی غزل گوئی کی شہرت ہوئی اور خوب ہوئی۔ یہ واقعہ تذکرۂ میخانہ میں درج ہے اور مولانا شبلی نے بھی یہیں سے نقل کیا ہے مگر یہ لطیفہ صرف خوش عقیدہ لوگوں کے واسطے ہے اور رستم وسہراب کی داستان سے کم نہیں کہ رستم نے دعا مانگی کہ الٰہی میرا پہلا زور واپس آجائے، صبح کو اس کا یہ اثر ہوا کہ گھٹنوں تک زمین میں دھنسنے لگا

حافظ کے متعلق مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ انھوں نے سلمان ساوجی۔ سعدی شیرازی۔ اور خواجو کرمانی کی غزلوں کو دیکھ دیکھکر غزلیں کہیں ہم اس سے بالکل متفق ہیں مگر وہ اصل میں اس شاعر سے بیخبر تھے جسکا فیض سخن حافظ کو پہنچا اور جس نے ان کو تصوف کا راستہ بتایا۔ یا بہ الفاظ دیگر جسکے صوفیانہ رنگ کو دیکھکر وہ بھی رموز تصوف بیان کرنے لگے اور کہیں کامیاب ہوئے اور کہیں ناکام رہے۔ حافظ کی ابتدائی زندگی نہایت آزادی، سیر وسیاحت رندمشربی میں گزری اور وہ مدتوں تک ادھر ادھر پھرا کئے۔ چنانچہ ان کے دیوان کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "مدتے بجدود اقالیم خراسان وترکستان وہندوستان رسیدہ"۔ تذکرہ نویسوں نے اس بحث سے بالکل قطع نظر کر لی ہے کہ خراسان کب گئے کیوں گئے اور وہاں ان کی شاعری کا رنگ کیا تھا۔

چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کا زمانہ شعراء متصوفین کے لئے اس قدر سعید زمانہ تھا کہ فارس کے مایۂ ناز صوفی شعراء سعدی۔ اوحدی۔ عطار۔ مولانا روم۔ سنائی۔ میر حسینی وغیرہ وغیرہ اسی زمانہ میں پیدا ہوئے اور تصوف واخلاق کی مایۂ ناز تصانیف اسی عہد میں ہر جگہ مرتب ہوئیں مگر خراسان خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے جہاں کا گوشہ گوشہ امیر یمین الدین کے مایۂ ناز فرزند ابن یمین کے کمالات شاعری سے گونج رہا تھا۔

آج ابن یمین کو لوگ صرف اس کے قطعات سے پہچانتے ہیں اس لئے ذرا تفصیل کے ساتھ یہ بتانا ضروری ہے کہ ابن یمین کا مرتبہ غزل گوئی میں کیا تھا اور صوفیانہ رنگ سخن میں وہ کس امتیاز کا مالک تھا۔

ان کا نام محمود تھا تخلص اور کنیت ابن یمین تھی۔ اصل میں ترک تھے مگر کچھ اسباب ایسے پیدا ہوئے تھے کہ اُن کے والد اپنا اصلی وطن چھوڑ کر نواح ترکستان کے ایک قصبہ فریومد میں آرہے تھے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی یہانتک کہ وہ دولتمند اور صاحب اموال واملاک شمار کئے جانے لگے۔

ابن یمین؟ فریومد میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی چنانچہ سب تذکرہ نویس اس بات پر متفق ہیں کہ وہ ایک جید فاضل تھے۔ وہ شعر وشاعری کا بھی کافی ذوق رکھتے تھے اور ابتدا میں اصلاح اپنے والد سے لیتے تھے۔ ان کے والد امیر یمین الدین جن طرحوں میں خود غزلیں کہتے تھے انھیں میں ابن یمین سے بھی لکھواتے یہانتک کہ امیر یمین الدین کا انتقال ہوگیا، اور ان کی شہرت بھی وراثتاً ابن یمین کو ملی۔ لوگ ان کے قطعات اور غزلوں کو بازاروں میں گاتے تھے اور سوزو

سرور کی مجلسوں میں ابن یمین کی غزلیں خاص عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھی جاتی تھیں۔ چونکہ وہ فاضل شخص تھے اور ان کی شاعری نے امیر یمین الدین ایسے صحیح الذوق کی نگرانی میں نشو و نما پائی تھی لہذا ابتدا ہی سے ان کی شاعری نے اخلاقی رنگ اختیار کر لیا تھا جو رفتہ رفتہ تصوف کی حدود میں جا پہونچا۔ اسمیں شک نہیں کہ اسوقت ملک کے تمام مشاہیر اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے مگر ابن یمین خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ کیونکہ وہ شخص جس نے سب سے پہلے کیفیات حقیقی کو جذبات غیر حقیقی سے جدا کیا اور حقیقت و اسرار حقیقت کو غیر معصوم جذبات کی آمیزش سے بچایا وہ ابن یمین ہے۔ انھوں نے جہاں جہاں فضائے قدس میں پر پرواز کھولے ہیں، اسقدر بلند چلے گئے ہیں کہ کسی دوسرے خیال کی رسائی ہو ہی نہیں سکتی

ابن یمین کا یہ رنگ بھی ہے کہ کبھی کبھی خانقاہ سے اٹھکر میخانہ کی طرف بھی چلے جاتے ہیں۔ مگر وہ یہاں بھی صوفی قایم رہتے ہیں نہ کبھی رندلا ابالی کی طرح کسی کی پگڑی اچھالتے ہیں نہ ان کا خرقہ و سجادہ کبھی رہن مے ہوتا ہے، اور نہ وہ دین و دنیا کو ساقی کی نیم نگاہی پر قربان کر دیتے ہیں۔

ان دو خصوصیتوں کے ماسوا اور بھی خصوصیات ان میں موجود ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔ البتہ زبان کے متعلق یہ کہنا ضرور ہے کہ ان کی زبان اس قدر صاف و شستہ ہے کہ معاصرین میں کسی کے یہاں سوائے حافظ کے موجود نہیں ہے ہمارے پاس اسبات کی شہادت میں کہ حافظ خراسان گئے" وہ الفاظ کافی ہیں جو انکے دیوان کے دیباچہ میں موجود ہیں اور جن کو ہم ابھی نقل کر چکے ہیں۔ اب رہا یہ امر کہ وہ خراسان ہوکر ابن یمین سے ملے یا نہیں۔ سو اس کے لئے خود ابن یمین کی شہادت سے زیادہ معتبر گواہی کس کی ہوتی ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے ۔

چہ غم از طعنۂ اغیار ترا ابن یمین   کہ چو حافظ بجہان یار دلنگاری داری

اس شعر سے نہ صرف اسبات پر قطعی استدلال کیا جا سکتا ہے کہ ابن یمین حافظ سے ملے بلکہ اس سے ان تعلقات پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے جنکی بنا پر انھوں نے حافظ کو یار دلنگار لکھا ہے یعنی نہ صرف حافظ کی محبوبیت اور ابن یمین کی دلدادگی اس سے ثابت ہوتی ہے۔ بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپس کی یہ محبت کافی بدنام ہو چکی تھی۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ حافظ کے متعلق قریب قریب سب تذکرہ نویسوں نے اسبات سے لاعلمی ظاہر کی ہے کہ وہ کسی کے مرید تھے مگر مصنف مرآت آفتاب نما۔ لب التواریخ کے مصنف کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ آنجناب مرید شیخ محمود عطار خلیفہ روزبہان است مگر شیخ محمود عطار کوئی مشہور و معروف بزرگ نہیں۔ اس سے بھی زیادہ تعجب آمیز قول مصنف مذکور کا یہ ہے کہ "در مصلائے شیراز درجنب پیر خود مدفون گردیدہ"

دنیا جانتی ہے کہ حافظ کا مصلائے شیراز میں مدفن ہے، مگر کوئی یہ نہیں لکھتا کہ وہ اپنے پیر کے پہلو میں مدفون ہیں ہیں سے

یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ابن یمین کے جنکا نام محمود ہے حافظ کسی وقت میں مرید ہوے اور پھر نام کے التباس کیوجہ سے یہ غلط ملط واقع ہو
قیاس کی بنا پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حافظ ترک نژاد تھے - اور ابن یمین بھی خاندان ترک سے تعلق رکھتے تھے۔ ممکن ہے
کہ امیر یمین الدین اور حافظ کے والد بہاء الدین کے تعلقات اچھے رہے ہوں اور اسی بنا پر ان کے سلسلۂ محبت نے ابن یمین کے ساتھ
مضبوطی پیدا کی ہو اگرچہ اس قیاس کے غلط ہونے کا بھی احتمال ہے مگر صحت کا قرینہ بھی کچھ کمزور نہیں ہے غرض یہ کہ حافظ یقیناً
اپنی ابتدائی شاعری میں خراسان گئے اور اس کے مشہور و معروف قصبہ فریومد میں پہونچے - ابن یمین ایک مشہور ادیب اور
...... نہایت مشہور مہماں نواز تھے - حافظ ابن یمین کے یہاں پہونچے اور ابن یمین نے اپنی عادت جاریہ کے موافق ان کی پزیرائی
کی اور پھر یہ وہاں مدتوں ایک محبوب مہمان کے حیثیت سے مقیم رہے اس کے بعد بحث طلب یہ امر رہجاتا ہے کہ حافظ کی شاعری
اسوقت کس پایہ کی تھی مگر یہ سوال ایسا ہے جو جواب بھی اپنے ساتھ لاتا ہے - حافظ کا سنہ ولادت معلوم نہیں ہے لیکن
اتفاق اسی پر ہے کہ ان کی پیدایش ۷۳۱ھ سے پہلے نہیں ہوئی - ابن یمین کا انتقال ۷۴۵ھ میں ہوا (معلوم نہیں مولانا شبلی
نے سنہ وفات ۷۶۹ھ کیسے درج کیا ہے) اس لئے ظاہر ہے کہ ابن یمین کے انتقال کے وقت حافظ کی عمر زیادہ سے زیادہ ۲۴
سال کی رہی ہوگی - پھر یہ بھی کوئی ضروری بات نہیں ہے کہ انتقال ابن یمین تک حافظ ابن یمین ہی کے پاس رہے ہوں اسلئے
پہلے یہ امر غور طلب ہے کہ انکی شاعری کب شروع ہوئی ابھی ہم لکھ چکے ہیں کہ مکتب سے نکلتے ہی حافظ کی طبیعت شاعری کی طرف
مائل ہوئی اور مکتب چھوڑنے کے وقت ان کی عمر زیادہ سے زیادہ پندرہ سولہ برس کی رہی ہوگی - دو تین برس تک یہ یونہی تک بندی
کرتے رہے اوسی کے بعد شاید خراسان کا سفر کیا - لہذا نتیجہ یہ نکلتا ہی کہ ابن یمین سے ملنے کے وقت ان کی عمر زیادہ سے زیادہ
سترہ اٹھارہ اور ان کی شاعری کی عمر زیادہ سے زیادہ تین چار برس کی ہوگی -

یہ زمانہ ابن یمین کی شاعری کا آخری زمانہ تھا - وہ نکات تصوف کو شاعرانہ پیرایہ میں ادا کرکے داد حاصل کر رہے تھے
کہ حافظ پہونچے - یہ پہلے ہی ظاہر ہو چکا ہے کہ حافظ سے ان کو بہت محبت تھی اس لئے نتیجہ یہی ہونا تھا کہ ابن یمین خود ان کو
اپنے رنگ میں رنگ لیتے - یا خود حافظ ان کی نقل و پیروی کرنے لگتے - بہرصورت حافظ کی صوفیانہ شاعری ان کی ذاتی شاعری
نہیں کہی جا سکتی وہ کسی صورت سے بھی ہو صرف ابن یمین کی تقلید و نقل ہے

ابن یمین کا دیوان تقریباً نایاب ہے اور اس کا کہیں پایا جانا اسقدر مستبعد سمجھا جاتا ہے کہ باوجود اس کے کہ صاحب
ید بیضا ایک نسخہ اس کے دیوان کا دال کی ردیف تک دیکھنا بیان کرتے ہیں - لیکن مولانا شبلی کو اعتبار نہیں آتا اور وہ فرماتے ہیں
کہ یہ بھی غالب قطعات کا دیوان ہوگا - یہ بالکل صحیح ہے کہ سربداروں کے ہنگامہ میں ابن یمین کی غزلیات کا دیوان گم ہو گیا - لیکن
اس کے متعلق ایسا شدید جمود و انکار کہ اگر کوئی اس کا دیکھنا بیان کرے تو بھی اس کے تکذیب کر دیجائے - کم از کم شبلی ایسے تذکرہ نویس

تو مناسب نہ تھا۔ ممکن ہے کہ مولانا شبلی کی جستجو اس باب میں ناکام رہی ہو، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ابن یمین کا دیوان غزلیات کسی جگہ موجود ہی نہ ہو۔ چنانچہ اس کے دیوان کا نہایت قدیم نسخہ میری نگاہ سے گزرا ہے، اور اسی کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ حافظ کی صوفیانہ شاعری یکسر ابن یمین کے دیوان سے ماخوذ ہے۔ یہ امر بالکل ثابت ہے کہ ابن یمین کا دیوان اس کی وفات سے چند سال پیشتر گم ہوا اور یہ وہ زمانہ تھا جب حافظ، ابن یمین کے یار دلدار بنے ہوئے ہر وقت ان کے ساتھ رہا کرتے تھے پھر اگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ممکن ہے یہ گمشدہ کلام حافظ کے ہات لگا ہو اور اسمیں ردو بدل کر کے حافظ نے "اپنا لیا" ہو (علی الخصوص اسوقت جبکہ ان کی غزل گوئی کا شہرہ ہی اس واقعہ کے بعد ہوا ہے) تو یہ ماننا ہی پڑے گا کہ حافظ کا متصوفانہ رنگ یکسر ابن یمین سے ماخوذ ہے اور ان کی غزلوں کو سامنے رکھ رکھکر طبع آزمائی کی گئی ہے

ابن یمین کی ایک غزل ہے:۔

ساقی بریز جرعۂ وصلت بجام ما	کز شربت فراق تو تلخست کام ما
اے باد اگر بہ کوئے نگارم گذر کنی	زنہار عرضہ دہ بہ سگانش سلام ما
مستیم جاودان ز لب لعل آن نگار	زاہد خبر نیافت ز عیش مدام ما
شاید برابری نکنند در دم حساب	نان حلال زاہد و آب حرام ما

حافظ کی غزل اسی زمین میں یہ ہے:۔

ساقی بنور بادہ برافروز جام ما	مطرب بگو کہ کار جہاں شد بکام ما
اے باد اگر بہ گلشن احباب بگذری	زنہار عرضہ دہ بر جانان پیام ما
ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم	اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما
ترسم کہ صرفہ نبرد روز باز خواست	نان حلال شیخ ز آب حرام ما

دونوں کے مطلع تقریباً ایک ہیں دوسرے شعر میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ابن یمین کا چونکہ خاص رنگ یہ ہے کہ وہ آداب عشق کا بہت لحاظ رکھتے ہیں اسلئے انھوں نے (بہ سگانش سلام ما) کہا، مگر حافظ نے "بر جانان پیام ما" کہہ دیا۔ حالانکہ یہ کسی طرح اس ٹکڑے سے اچھا نہیں جو ابن یمین نے رکھا تھا۔ ابن یمین نے آداب عشق کو ملحوظ رکھا ہے "یعنی ہم اس قابل تو نہیں ہیں کہ براہ راست اس کو کوئی پیام بھیجکر اپنے آپ کو اس کا مخاطب صحیح قرار دیں مگر اے باد صبا ہمارا سلام سگان کوے جاناں سے کہدینا" حافظ کی شوخ مزاجی نے شعر کے مفہوم کو گرا دیا تیسرے شعر میں گو حافظ کا شعر حسین معلوم ہوتا ہے مگر دراصل جس قدر لطیف خیال ابن یمین نے ظاہر کیا ہے وہ حافظ کے تصرف سے برباد ہو گیا۔ ابن یمین کہتا ہے کہ۔ اسکے لب لعلیں کی یاد میں ہم ہمیشہ مست رہتے ہیں اور زاہد کو صرف یہ

معلوم ہے کہ ہم شراب پیتے ہیں اسواسطے وہ ہم کو برا جانتا ہے۔ کاش ان کو معلوم ہو جائے کہ ہم کس چیز سے مست ہیں تو وہ شراب نوشی کو برا نہ سمجھے۔ بمقابلہ اسکے حافظ صرف اتنا کہتے ہیں کہ "اے ہماری شراب نوشی پر معترض ہونے والے تو ہماری لذت شراب مدام سے بیخبر ہے ہم نے پیالہ میں عکس رُخ یار دیکھا ہے"۔ پیالہ میں عکس رُخ یار دیکھنا ایک دور کی بات ہے۔ اگرچہ یہ مضمون بھی ابن یمین ہی کا ہے جو آگے چلکر کہیں آئیگا چوتھا شعر بالکل ایک ہے۔ مصرع اولے کے الفاظ بھی تقریباً برابر ہیں دوسرے مصرع میں ابن یمین کے یہاں مآل ہے اور حافظ کے یہاں نان۔ ممکن ہے کہ کاتبوں کی تحریف سے نان کا لفظ مآل بن گیا ہو۔

حافظ — ابن یمین

جان بجاناں سپرد و دیدہ بدیدار داشت — ای خوشا صاحبدلی کز بخت برخوردار داشت — خرم آن کز نازنیناں بخت برخوردار داشت — در نمیگیرد نیاز عجز ما با حسن دوست

ان دونوں شعروں کا مفہوم ایک ہے اور ابن یمین کا پہلا اور حافظ کا دوسرا مصرع بالکل یکساں ہے۔

بگو بغمزہ چشمت کہ مست خون مباح — بیا بہ سوئیم اگر قصد کشتنم داری — صلاح ما ہمہ آنست کان ترا است صلاح — اگر بمذہب تو خون عاشق است مباح

نمود طلعت ساقی درون این قدح — زلالہ زار جہاں یک پیالہ چون خوریم — بخون تشرب شرابکد اک لا قداح — پیالہ چیست کہ بر یاد تو کشیم مدام

دونوں کی غزلوں کے مقطع بھی تقریباً ہم مضمون ہیں۔

بہ بین ہلال محرم بخواہ ساغر راح — گذشت توبہ و تقوی و رفت زہد و صلاح

کہ ماہ امن و امان است و سال صلح و صلاح — بہار یاد کہ در جام بادہ است صلاح

چونکہ مضمون ابھی بہت باقی ہے اس لئے ہر ایک کی تشریح کو ناظرین کے ذوق صحیح پر چھوڑتے ہیں اور بعض ایسے اشعار درج کرتے ہیں جنسے ثابت ہوتا ہے کہ حافظ نے ابن یمین کے مضامین سے کس قدر فائدہ اٹھایا ہے۔ یہ اشعار صرف وہ ہیں جو ایک نگاہ پر ہم کو دستیاب ہو گئے ہیں اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کوشش کیجائے تو سیکڑوں اشعار دونوں کے بالکل ایک ہی مضمون کے دستیاب ہو سکتے ہیں۔

حافظ کا یہ شعر بہت ہی مایۂ ناز شعر شمار کیا جاتا ہے اور زبان زد ہو کر ضرب المثل کے درجہ تک پہونچگیا ہے حالانکہ فی الحقیقت یہ ابن یمین کا خیال تھا جس کو حافظ نے اپنا بنا لیا۔

حافظ کا شعر ہے:—

آسماں بار امانت نتوانست کشید — قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

ابن یمین کہتا ہے:— روز اول کہ بنام ہمہ کس قرعہ زدند — قرعۂ عشق بنام من مسکیں افتاد

حافظ نے اگرچہ چستی بندش سے شعر کو بہت کچھ آراستہ کیا ہے مگر اسمیں طلسم بندی الفاظ کے سوا اور کچھ نہیں ہے پہلے مصرع سے واقعہ کے اوپر کوئی روشنی نہیں پڑتی کہ یہ کب ہوا اور نہ قرعۂ فال سے کوئی خاص مفہوم پیدا ہوتا ہے تیسرے یہ کہ حافظ نے جس لفظ کو بدل کر دیوانہ رکھا ہے وہ بظاہر بہت چست ہے مگر اسقدر اسمیں نقص ہے کہ دیوانہ کو کسی امر کا ذمہ دار نہیں بنایا جاتا اور وہ غیر مکلف ہوتا ہے جس شخص کے ذہن میں آیت انا عرضنا الامانۃ الخ نہ ہو اس کا ذہن اس واقعہ کی طرف منتقل ہونا غیر ممکن ہے ——— برعکس اسکے ابن یمین نے پہلے واقعہ کا وقت بتایا۔ حالات کا اظہار کیا کہ اسوقت سب موجود تھے پھر مسکین کے لفظ سے لفظ انسان کی بموجب آیۂ ظلوماً جھولا پوری پوری تفسیر کر دی۔ حافظ کے یہاں یہ کچھ بھی نہیں ہے

ابن یمین کو غالباً یہ مضمون بہت ہی پسند تھا اونہوں نے متعدد جگہ یہ مضمون لکھا ہے اور نہایت ہی خوبی سے لکھا ہے ——
ملاحظہ فرمائیے یہ وہ شعر ہیں جو سرسری جستجو سے دستیاب ہو گئے ہیں۔

روز اول ز حوادث کہ قضا غم زدہ بود　　　قرعۂ عاشق بیدل ہمہ بر غم زدہ بود

پہلے مصرع کو جس بلاغت کے ساتھ ادا کیا گیا ہے وہ ارباب ذوق سے مخفی نہیں۔ ایک اور شعر اسی مضمون کا ملاحظہ ہو:۔

برائے قتل اسیراں کہ قرعہ افگندند　　　بنام ہیچمدان بے گناہ بیدل شد

اسمیں بھی مصرع ادلے میں جس حسن سے اس قصہ کو قتل اسیران بلا سے تشبیہ دی گئی ہے وہ تعریف کی حدود سے مستغنی ہے
ابن یمین پھر اسی مضمون کو کہتا ہے۔

با نام کسے فال بر بندی نہ برآید　　　این قرعہ بنام من بیباک توان زد

اتنے شعروں کے لکھنے کے بعد یہ کہنا ایک فضول اور دور از کار بات ہے کہ یہ مضمون صرف ابن یمین کے دماغ سے نکل سکتا تھا اور حافظ نے اسکو لیا بھی تو اس صورت سے ادا نہ کر سکے جیسا کہ چاہئے تھا

حافظ کا یہ شعر ؎

ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم　　　اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما

دیوان ابن یمین میں بہت سی جگہ مختلف صورتوں سے ملتا ہے جسکی ایک مثال پہلے آچکی ہے اسیطرح اور بھی مختلف ہم مضمون شعر موجود ہیں مثلاً:۔

ابن یمین　　پنہاں کنم تو انم اگر سوز و درد را　　　یا رب چہ چارہ کنم این روئے زرد را

حافظ　　سر سودائے تو در سینہ بماندی پنہاں　　　چشم تر دامن اگر فاش نکردی رازم

ابن یمین　　گر بچیزے بخزد بہ درد کس مارا　　　بندۂ آن سر کوئیم ہمیں بس مارا

حافظ	اگرچہ دوست بچیزے نمیخرد ما را	بعالمے نفروشیم موی از سر دوست
ابن یمین	دردا کہ برد از من بیدل بیک نگاہ	ماہ دو ہفتہ حاصل ہفتاد سالہ را
حافظ	بالابلند عشوہ گر سرو ناز من	کوتاہ کرد قصہ زہد دراز من
ابن یمین	سوز درون ز اشک جگر رنگ باز گشت	بیرون فتاد عاقبت کار راز ما
حافظ	از آب دیدہ بر سر آتش نشستہ ایم	گو فاش کرد در ہمہ آفاق راز ما
ابن یمین	ما دیدہ ایم در رخ خوبان جمال حق	یعنی کہ ہست عین حقیقت مجاز ما
حافظ	ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم	اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما
ابن یمین	عمریست تا کہ حسن رخ یار دیدہ ایم	حیران اوست دیدہ معشوقہ باز ما
حافظ	دیدی دلا کہ آخر پیری و زہد و عمر	با من چہ کرد دیدۂ معشوقہ باز من
ابن یمین	ما جاں بزلف یار سپردیم روز و شب	کوتاہ گشت قصہ دور و دراز ما
حافظ	بالابلند عشوہ گر سرو ناز من	کوتاہ کرد قصہ زہد دراز من
ابن یمین	بعد صد سال اگر بر سر خاکم گزرد	با دل سوختہ و سینۂ بریاں خیزم
حافظ	بعد صد سال اگر بر سر خاکم گزری	سر برآرد ز گلم رقص کناں عظم رمیم

قصۂ زہد دراز - اور دیدۂ معشوقہ باز - جو نہایت ہی عمدہ اور منجھی ہوئی تشبیہیں ہیں - یہ دونوں ابن یمین ہی کی اختراع ہیں جو آج حافظ کے لئے مایۂ نازش بنی ہوئی ہیں -

ابن یمین	ابن یمین ز عشق بتاں منع کے تواں	چون گشتہ است عین حقیقت مجاز ما
حافظ	نقشے بر آب میزنم از گریہ حالیا	تا کے شود قرین حقیقت مجاز ما
ابن یمین	چند روزی بوصال تو چہ خوشدل بودم	باز انداخت فلک جامۂ غم در بر ما
حافظ	فلک آوازہ بہر سو کندم میدانی	رشک مے آیدش از صحبت جاں پرور ما
ابن یمین	دردمندیم خبر میدہد از سوز درون	دہن خشک و لب تشنہ و چشم تر ما
حافظ	دل غم پرور ما ز آتش ہجراں میسوخت	کہ بآب نمیریخت ز چشم تر ما

حافظ کا مندرجہ ذیل شعر نہایت مشہور ہے -

من از آن حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم کہ عشق از پردۂ عصمت برون آرد زلیخا را

اسی مضمون کو ابن یمین نے اس طرح ادا کیا ہے :-

حسن زیبائے تو آندم کہ تجلی میکرد سروسامان مراعشق تو برہم زدہ بود

ابن یمین —— بنوش بادہ کہ وقت بہار می گزرد پیالہ گیر دلا لالہ زار میگزرد

حافظ —— بنوش بادہ کہ ایام غم نخواہد ماند چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند

ابن یمین —— من زدریائے محیطم بوطن باز روم چون ادیس قرنی سوئے قرن باز روم

سوئے صحرائے جہاں نکہت آن زلف آرد پے آن آہوے مشکیں بختن باز روم

حافظ —— خرم آنروز کزین منزل ویران بروم راحت جان طلبم در پے جاناں بروم

گرچہ دانم کہ بجائے نبرد راہ غریب من ببوی خوش آن زلف پریشاں بروم

اس قدر اشعار کے توازن و تقابل کے بعد ایک شخص یقیناً یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کیا واقعی حافظ نے جو رنگ اختیار کیا وہ سراسر ابن یمین ہی کے تتبع کا نتیجہ تھا کیا ان کی زبان کی پاکیزگی لطافت و شیرینی بالکل وہی نہیں ہے جو ابن یمین کے یہاں پائی جاتی ہے اور کیا اگر کسی کو مصنف کا نام نہ معلوم ہو تو حافظ اور ابن یمین کے کلام میں فرق کر سکتا ہے اب ہم اور چند ہمطرح غزلیں پیش کرتے ہیں -

ابن یمین —— تا کہ من چہرۂ آں ماہ بقامی بینم نا مسلمانم اگر جز بخدا می بینم

ہر کجا می شنوم بوے ترا می شنوم ہر طرف می نگرم بوے ترا می بینم

ہیچکس نیست کہ از زلف تو بوئی آورد مگر این خاصیت از باد صبا می بینم

مشکل ہست ایدل من جان بسلا بردن من کہ آنچشم سیہ از زمین بلا می بینم

پرستے کردغمش ابن یمین جان مرا طرفہ شاہے کہ در احسان گدا می بینم

حافظ —— در خرابات مغاں نور خدا می بینم وین عجب بین کہ چہ نورے ز کجا می بینم

جلوہ بر من مفروش ای ملک الحاج کہ تو خانہ می بینی و من خانہ خدا می بینم

سوز دل اشک رواں آہ سحر نالۂ شب اینہمہ از اثر لطف شما می بینم

خواہم از زلف بتاں نافہ کشائی کردن فکر دور است ہمانا کہ خطا می بینم

کس ندیدست ز مشک ختن و نافۂ چین	آنچہ من ہر سحر از باد صبا می بینم

ایک اور غزل ملاحظہ فرمائیے :-

ابن یمین

عاشقانرا بسر کوی تو جاں خواہد بود	دایما نعرۂ و فریاد و فغاں خواہد بود
عاشق زار کہ مشتاق جمال تو بود	تا قیامت بجمالت نگراں خواہد بود
گرمرا از سر کوی تو بجنت بسر ند	دل سرگشتۂ زدہ ام بے تو چہ ساں خواہد بود
گر حجاب رخت از پیش نظر برخیزد	ہمہ جا چہرۂ مقصود عیاں خواہد بود
تیر دلدوز تو در سینۂ من کرد گذر	ہر چہ از سوی تو آید گذراں خواہد بود

حافظ

تا ز میخانہ و مے نام و نشان خواہد بود	سر ما خاک رہ پیر مغاں خواہد بود
چشم آندم کہ ز شوق تو نہد سر بہ لحد	تا دم صبح قیامت نگراں خواہد بود
عیب مستاں مکن ای خواجہ کزین رباط	کس ندانست کہ رحلت بچہ ساں خواہد بود
بردۂ زاہد خود بیں کہ بچشم من و تو	راز ایں پردہ نہانست و نہاں خواہد بود
بر سر تربت ما چوں گذری ہمت خواہ	کہ زیارتگہ رندان جہاں خواہد بود

اس غزل میں دو تین شعر حافظ کے یہاں نہایت ہی چست ہیں - مگر اس واقعہ سے انکار محال ہے کہ دونوں کے رنگ میں ذرا بھی تغیر نہیں - اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ حافظ کے پس پردہ ابن یمین بول رہے ہیں۔

حافظ کا تصوف چونکہ بالکل ابن یمین کا تصوف ہے اسلئے دوچار شعر نہیں اسکو لکھکر دکھانا ایک بیکار بات ہے - اسے ابن یمین کے مستقل مضمون میں لکھا جائیگا جو آیندہ نمبر میں شایع ہوگا - اگر کوئی فرق ہے تو صرف اتنا کہ ابن یمین تصوف کو تصوف کے حدود میں رکھتے ہیں اور حافظ چونکہ وہ قدرت نہیں رکھتے اس لئے ان کے یہاں حقیقت و مجاز اور پارسائی و رندی دونوں مخلوط ہو گئے ہیں - ابن یمین جس مسئلہ کو بیان کرتے ہیں وہ عین حقیقت کے مطابق ہوتا ہے اور شاعرانہ خصوصیت بھی ہاتھ سے نہیں جاتی - حافظ کہیں ان کی نقل میں کامیاب ہوتے ہیں اور کہیں محض لطف شاعری رہجاتا ہے اور اصل مسئلہ میں کوئی جان باقی نہیں رہتی - الغرض حافظ کا تصوف صرف ابن یمین کی نقل ہے، جو بعض جگہ مطابق اصل ہوتی ہے اور بعض جگہ نہیں اور یہی ہونا بھی چاہیئے تھا کیونکہ حافظ کو تصوف سے صرف مقالاتی نسبت تھی - جیساکہ صاحب تذکرۂ مراۃ الخیال لکھتے ہیں کہ "ہر چند معلوم نیست کہ دست بہ یکے از اہل تصوف نسبت ارادت درست کردہ باشد اما سخنانش اکثر آں بر مشرب ایں طایفہ واقع شدہ است کہ ہیچکس را اتفاق نیفتادہ"

ابن یمین کے دیوان میں صوفیانہ رنگ کے ساتھ انبساطی اور خمریاتی شاعری بھی پائی جاتی ہے، مگر یہ بات کسقدر عجیب ہے

کہ وہ خراباتی ہونے کے بعد بھی اپنی دلق پارسائی کی ایسی حفاظت کرتے ہیں کہ ایک چھینٹ بھی اس پر نہیں پڑ سکتی۔ حافظ نے یہ رنگ بھی انہیں کی شاعری سے اخذ کیا مگر وہ بہک گئے اور ان کی شاعری ان کی رندانہ دمیخوارانہ زندگی کا آئینہ ہو کر رہ گئی ان کا فلسفۂ شعر صرف شراب نوشی تک محدود ہو کر رہ گیا اور ان کی نصیحتیں صرف کلوا واشربوا تک پہنچکر رہ گئیں۔

حافظ جب شراب کی مدح کرتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے جو کچھ کہا ہے اسیوقت کہا ہے جب وہ سرشار تھے لیکن خوش عقیدہ حافظ پرستوں نے ان کے ہر شعر کو حقیقت کی حدود میں داخل کر دیا ہے۔ حالانکہ ان کا ساغر وہی کلوار کی دوکان کا کوزہ ہے اور ان کی شراب وہی معمولی تلخ و بدبودار باقی، برعکس اس کے جب ابن یمین اس رنگ میں کہتا ہے تو اس کی شان ہی دوسری ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو:-

اگر مستی کنم عیبم مگوئید — کہ شب تا صبح در میخانہ بودم
ہر کسے مخمور ایں مے بودہ باشد گوئیا — بادہ ارزاں گشت چوں ما ساقی دوراں شدیم
با حریفاں گرچہ در بزم طرب مے می دہند — آنچنیں مے را ولے با ہر کسے کم میدہند
کسے کو جام مے بر عاشقاں مست میگیرد — کرمہا میکند افتادہ را دست میگیرد
از دست یار ساغر وحدت کشیدہ ایم — در بزم لامکاں زمکین و مکاں جدا
گفتم بہ کار بر طرف باغ لالہ را — دیدم کہ نیست بادہ شکستم پیالہ را
بادۂ رندان ما در ساغر و پیمانہ نیست — مستی ایں مے پرستاں از خم و خمخانہ نیست
ز چشم مست تو عشاق مے پرست شدند — ہمہ سبوکش بزم مے الست شدند
زیادہ ہائے فرح بخش و غمزۂ ساقی — بہ نیم جرعہ حریفاں تمام مست شدند
بیا و لعل لبت زاہدان صد سالہ — نشستہ بر در میخانہ باز دست شدند
دوش در سلسلۂ بادہ پرستاں دیدیم — از مے عشق ہمہ بیخود و مستاں بودیم
حریفے کو شراب عشق نوشد — دو عالم را بہ یک جرعہ فروشد
کسے کو قطرۂ زیں بحر خوردا شت — چو دریا ہم بجوشد ہم خروشد
گر نمی نوشم مے از جام وصالش دمبدم — ہردم از خود رفتن و با خود خروشیدن چرا

غرضکہ ابن یمین کے یہاں یہ رنگ تمام دیوان میں موجود ہے جو اس کی پختگی اور قادر الکلامی کا کامیاب نمونہ ہے اور جسے حافظ نباہ نہ سکے۔

مندرجۂ بالا دو رنگوں کے علاوہ جو رنگ حافظ کے یہاں پائے جاتے ہیں وہ دوسرے لوگوں کا فیض ہیں ابن یمین اور حافظ کی یکجائی کا زمانہ چھ سات سال سے زیادہ نہیں ٹھہرتا حافظ ابن یمین کے سامنے یا اون کے انتقال کے بعد شیراز پھر واپس آئے ہوں گے۔ چونکہ اب ابن یمین موجود نہ تھے اور اُن کو اسی زور و شور کے ساتھ شاعری کرنا تھی، اور اب غالباً ان کی کافی شہرت ہو چکی تھی لہذا انھوں نے سعدی اور خواجو سلمان ساوجی کے کلام کو اپنا رہبر بنایا اور اسی رنگ میں کہنے لگے ہم اسبات کے باور کرنے کی کافی وجوہ رکھتے ہیں کہ حافظ کے کلام میں جو کہیں اخلاق اور سوز و گداز ہے وہ زیادہ تر سعدی کے اتباع کا نتیجہ ہے ابتدا میں انھوں نے سعدی کی شاعری کو سامنے رکھکر شعر کہنا شروع کیا چنانچہ ان کی اکثر ہمطرح غزلیں موجود ہیں متعدد جگہ بجنسہ وہی مصرعے پائے جاتے ہیں۔ اور سیکڑوں جگہ اِن کے اور سعدی کے خیالات یکساں ہو جاتے ہیں مولانا شبلی نے شعر العجم میں لکھا ہے کہ "شیخ سعدی کے جواب میں بھی گو اکثر غزلیں ہیں لیکن درحقیقت دونوں کے راستے الگ الگ ہیں۔ اسلئے موازنہ نہیں ہو سکتا۔ تاہم متعدد مضمون خواجہ صاحب نے شیخ سعدی سے لئے ہیں۔ لیکن ان کے اسلوب کو اس طرح بدلدیا ہے کہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ موتی انھیں قطروں سے بنے ہیں"

میں مولانا شبلی مرحوم کی تحقیقات میں اتنا ہی اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے سب جگہ نہیں بدلا ہے کہیں بدلا ہے اور کہیں وہی مضمون وہی ترکیب وہی تشبیہ بلکہ وہی مصرع موجود ہے۔ مثلاً سعدی کہتے ہیں ؎

مردہ از خاک لحد رقص کناں برخیزد گر تو بالائے عظامش گزری عظم رمیم

حافظ ——— بعد صد سال اگر بر سر خاکم گزری سر برآرد ز گلم رقص کناں عظم رمیم

سعدی ——— یا مرو با یار ازرق پیرہن یا بکش بر خانماں انگشت نیل

یا مکن با پیلباناں دوستی یا بنا کن خانۂ درخورد پیل

یہ دونوں شعر گلستاں میں موجود ہیں اور ظاہر ہے کہ گلستاں میں سعدی نے دوسرے کسی شاعر کا کوئی شعر نہیں لیا ہے اور حافظ کا شعر لینا تو ایک ناممکن بات تھی اس لئے کہ حافظ کا اسوقت وجود بھی نہ تھا۔ مگر دوسرا شعر بجنسہ اور پہلا شعر تھوڑی تبدیلی کے ساتھ اُن کے یہاں موجود ہے۔

یا مکش بر چہرہ نیل عاشقی یا فرو بر جامۂ تقوی بہ نیل

اس قسم کے اور بہت سے نمونے مل سکتے ہیں۔ حافظ کی عاشقانہ شاعری میں بھی سعدی کا رنگ ملا ہوا ہے چنانچہ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

سعدی ——— اے بلبل اگر نالی من با تو ہم آوازم تو عشق گلے داری من عشق گل اندامے

سعدی ——— تو گرچہ امیر و ما فقیریم — دلداری دوستان صواب است

اے گنج نوشدارو با خستگان نظر کن — مرہم بدست و ما را مجروح می گزاری

کنار سعدی ازاں روز کز تو دور فتاد — از آب دیدہ تو گوئی کنار جیحونست

حافظ ——— بنال بلبل اگر با منت سر یاریست — کہ ما دو عاشق زاریم و کار ما زاریست

در راہ عشق فرق غنی و فقیر نیست — اے بادشاہ عشق سخن با گدا بہ گو

چہ عذر از بخت خود گویم کہ آن عیار شہر آشوب — بہ تلخی کشت حافظ را و شکر در دہان دارد

ازاں زماں کہ ز دستم برفت یار عزیز — کنار دیدۂ من ہمچو رود جیحونست

مگر یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بعض مستثنیات کو چھوڑ کر حافظ کے وہی شعر سعدی کے اشعار سے ملتے ہیں جنہیں کوئی رمز اخلاق ہوتا ہے۔ ورنہ بقول مولانا شبلی کے راستہ دونوں کا الگ الگ ہے۔ تیسرا نمبر سلمان ساوجی کا ہے جنکی حافظ نے پیروی کی ہے۔ سلمان ساوجی حافظ کا ہمعصر تھا اور خواجہ صاحب نے ان کا کلام خوب دیکھا تھا۔ سلمان مضمون آفرینی اور قصیدہ گوئی کا بادشاہ بلکہ ظہیر فاریابی کا ہم پلہ سمجھا جاتا ہے۔ صفائی مضمون بھی اسکے یہاں بہت ہے مگر اسمیں وہ حافظ سے سبقت نہیں لیجاتا۔ پھر بھی حافظ نے جہاں کہیں مضمون آفرینی کی ہے وہ سب سلمان کا رنگ ہے مثلاً۔

سلمان ساوجی ما ئیم بستہ دل از در لعل دلکشایت — آن لب بخندہ بکشا تا دل شود کشادہ

حافظ زین زہد و پارسائی بگرفت خاطر من — ساقی پیالہ دہ تا دل شود کشادہ

دونوں مضمونوں میں تھوڑا سا ربط ہے باقی علیحدہ علیحدہ ہیں

سلمان رندی و عاشقی و قلاشی — ہیچ شک نیست کہ در ما ہمہ ہست

درون صافی از اہل صلاح و زہد مجوئے — کہ این نشانۂ رندان دردی آشام است

مکن ملامت رندان دگر بہ بدنامی — کہ ہر چہ پیش تو ننگ است نزد ما نام است

نہ جوئی از کعبہ و بتخانہ تو نئی سلمان را — چکنم خانۂ بجا نہ خدا باید رفت

من ازاں روز کہ در بند توام آزادم — بادشاہم چو بدست تو اسیر افتادم

شاہد آن نیست کہ دارد خط سبز و لب لعل — شاہد آن ست کہ این دارد و آنے دارد

حافظ عاشق و رند و نظر بازم و میگویم فاش — تا بدانی کہ بچندین ہنر آراستہ ام

راز درون پردہ ز رندان مست پرس — کیں حال نیست صوفی عالی مقام را

گرچہ بدنامی ہست نزد عاقلاں　　ما نمی خواہیم ننگ و نام را
جلوہ بر من مفروش ای ملک الحاج کہ تو　　خانہ می بینی و من خانہ خدا می بینم
فاش میگویم واز گفتۂ خود دلشادم　　بندۂ عشقم و از ہر دو جہاں آزادم
شاہد آں نیست کہ موئی و میانے دارد　　بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ حافظ خود اعلیٰ مضامین کے کہنے پر قادر نہ تھے نہیں بلکہ بحث صرف اتباع سے ہے کبھی وہ خود بھی اچھے مضامین کہہ جاتے ہیں اور کبھی سلمان کے کلام سے فائدہ اٹھا کر مضمون پیدا کرتے ہیں - چوتھا شخص خواجو کرمانی ہے جسکے اکثر شعروں کا حافظ نے اتباع اور اس کا اعتراف بھی کیا - چنانچہ حافظ لکھتے ہیں :-

استاد سخن سعدی است نزد ہمہ کس اما　　دارد غزل حافظ طرز و روش خواجو

خواجو میں چند شاعرانہ معمولی خوبیاں ہیں مثال کے طریق پر چند مثالیں شعر العجم سے لیکر درج کرتا ہوں ان کے لئے زیادہ لکھنا اسواسطے بیکار ہے کہ حافظ خود ہی اُن کے اتباع کے مقر ہیں -

خواجو کرمانی

خرقہ رہن خانہ خمار دارد پیر ما　　اے ہمہ رنداں مرید پیر ساغر گیر ما
گر شدیم از بادہ بدنام جہاں تدبیر چیست　　ہمچنیں رفت است در روز ازل تقدیر ما
تا دل دیوانہ در زنجیر الفت بستہ ایم　　اے بسا عاقل کہ شد دیوانۂ زنجیر ما
از خدنگ آہ عالم سوز ما غافل مشو　　کز کمان نرم زخمش سخت باشد تیر ما

حافظ

دوش از مسجد سوئے میخانہ آمد پیر ما　　چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما
در خرابات مغاں ما نیز ہمدستاں شویم　　کاینچنیں رفت است در روز ازل تقدیر ما
عقل اگر داند کہ دل در بند زلفش چوں خوش است　　عاقلاں دیوانہ گردند از پے زنجیر ما
تیر آہ ما ز گردوں بگذرد حافظ خموش　　رحم کن بر جان خود پرہیز کن از تیر ما

اگر تلاش کیجائے تو حافظ کی بہت سی غزلیں خواجو کے مضامین سے بھری ہوئی ملیں گی - الغرض خواجہ حافظ کی شاعری ایک معجون مرکب ہے اور اسکو ایسا ہونا چاہیے تھا کیونکہ اُن کی شاعری یکسر ابن یمین، سعدی شیرازی - سلمان ساوجی - خواجو کرمانی کا تتبع تھی جس میں عنصر غالب کی حیثیت ابن یمین کے رنگ کو حاصل ہے -

آر گس

نوٹ :- آیندہ اشاعت میں ابن یمین کے کلام پر بسیط تبصرہ درج ہوگا جس سے اس مضمون کے سمجھنے میں اور زیادہ مدد ملیگی

لارڈ رپن کا عہد حکومت

(بسلسلۂ ما سبق)

بمبئی

۱۴ فروری — ۱۱ بجے بمبئی پہنچے۔ مصر کے متعلق یہ خبر آئی ہے کہ سنقط پر مہدی نے قبضہ کر لیا ہے۔ آئندہ یہ خبر آئیگی کہ خرطوم پر بھی مہدی قابض ہو گیا ہے اور یہ کہ جنرل گارڈن قتل کر دیا گیا ہے اس کے بعد باقاعدہ سوڈانی مہم کا آغاز ہو جائیگا۔ میں ہندوستانی افواج کے میدان جنگ میں بھیجنے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرونگا

۱۸ فروری — گارڈن خرطوم میں پہنچ گئے ہیں اور انھوں نے اعلان شائع کیا ہے کہ آئندہ سے غلاموں کی تجارت آزادانہ کھلی رہیگی۔ میری ہمیشہ سے یہ رائے رہی کہ اسوآن تک مصر کی سرحد محدود کر دی جائے اور جنوبی مصر میں غلامی کا سدباب کر دیا جائے اور یہ کہ دوسرے مقامات میں غلامی کو بند کرنے کی کوشش کیجائے "غلاموں کی تجارت کو روکنے والی انجمن" غلامی کا سدباب کرنا نہیں چاہتی۔ ان کی روزی کا تمامتر انحصار اسی پر ہے

۱۹ فروری — سر جیمس فرگوسن (گورنر بمبئی) کے ساتھ ریل میں کھانا کھایا۔ میری اُن سے پرانی ملاقات ہے وہ قدیم خیال کے اچھے آدمی ہیں اور سمجھتے ہیں کہ دنیا ترقی کر رہی ہے۔ وہ سختی کے ساتھ اس عقیدہ پر جمے ہوئے ہیں کہ ہندوستان میں انگریزی نظم و نسق بہترین ہے اور یہ کہ افسران دیسی باشندوں کی بھلائی کے سوائے اور کوئی خواہش نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ کسان لوگ ہماری حکومت کو پسند کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ سات سال پیشتر ایک مرتبہ برہمن نے بغاوت پھیلانے کی کوشش کی تھی لیکن لوگوں نے اسکے وعظ پر کان نہیں دھرا اس کی بناپر ان کا خیال ہے کہ انقلاب کا کوئی خطرہ موجود نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مہدی کے ساتھ جنگ کرنے کو لوگ بالعموم پسند کریں گے۔ جہاں تک بمبئی کا تعلق ہے یہ خیال صحیح ہے اسلئے کہ جنگ کے زمانہ میں ملازمتیں اور ٹھیکے مل سکیں گے۔ میں نے اپنے جذبات کا صاف صاف اظہار کر دیا ہے انھوں نے چند دن تک گورنمنٹ ہاؤس میں ٹھہرنے کی دعوت دی ہے۔

۲۰ فروری — شاہزادہ آغاخاں سے ملنے کے لئے گئے۔ وہاں ایک ایرانی مولوی سے مہدی کے متعلق گفتگو رہی وہ کہتے ہیں کہ وہ مہدی نہیں ہے کیونکہ اسکے لئے شیعہ ہونا ضروری ہے، بہرحال وہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ اسکی حکومت انگریزی حکومت سے بدرجہا بہتر ہوگی۔ آغاخاں کی قطعی رائے میں حاصل نہیں کر سکا۔ ان کے والد ایران میں ایک فرقہ کے سرگروہ تھے جہاں سے وہ چند ہزار مریدوں کے ساتھ بمبئی آئے اور آج تک انھیں تقدس کی نظر سے دیکھا جاتا ہے ان کے بیٹے میں باپ کی بہت کچھ خوبیاں موجود ہیں لیکن وہ دنیا کی جانب زیادہ راغب معلوم ہوتے ہیں۔

محمد علی رودگھے اور ترکی قونصل علی بک نے ہمارے ساتھ

کھانا کھایا۔ ہم نے ٹرکی کے معاملات پر بحث کی۔ علی بابا کا خیال ہے کہ اسلام کا مستقبل سلطنتِ عثمانیہ کے قیام کے ساتھ مضمر ہے لیکن میری رائے یہ ہے کہ انتظام سلطنت میں تبدیلی کیجائے اسلئے کہ اسلامی آبادی دن بدن کم ہو رہی ہے وہ چاہتے ہیں کہ سلطان المعظم کے اختیارات میں کمی کردیجائے اور حکومت کی باگ کونسل کے ہاتھ میں ہو۔ سرکاری زبان ترکی کے بجائے عربی میں ہو اور یہ کہ صوبجات کی آمدنی صوبجات ہی کی بہتری میں صرف کیجائے

۲۲-فروری ـــــ گھوڑوں کے بیوپاری عبدالرحمن سے مسلمانانِ بمبئی کے حالت کی نسبت بات چیت رہی۔ رونگھٹے کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ اس نے دو زبردست غلطیاں کی ہیں:- ایک تو یہ کہ وہ سید احمد کے مقلد ہیں اور دوسرے یہ کہ سیاسیات سے دلچسپی رکھتے ہیں اس اختلاف رائے کے باوجود دونوں دوست ہیں عبدالرحمن مقامی انجمن اسلام کے وائس چیرمین ہیں مگر سچے عرب کی طرح ان کا دل گھوڑوں میں لگا رہتا ہے۔

۲۳ - فروری ـــــ سالار جنگ کا موعودہ خط مل گیا اس میں وہ اطلاع دیتے ہیں کہ نظام حیدرآباد میں یونیورسٹی قائم کرنا چاہتے ہیں، یہ کہ وائسرائے نے مہر پسندیدگی ثبت کردی ہے اور کام کی تکمیل کی غرض سے مجھے حیدرآباد بلایا ہے مگر میں اب انگلستان واپس جانے کی فکر میں ہوں۔ غلام محمد منشی ملنے کے لئے آئے وہ سرسید کے مقلد ہیں اور انجمن اسلام کے بانیوں میں سے ہیں۔ انھوں نے بمبئی کے مسلمانوں کے چند حالات بھی بتائے ہیں۔ آغاخان کے ۲۰ ہزار مرید ہیں جو خود کو شیعہ کہتے ہیں مگر وہ نام ہی کے مسلمان ہیں اسلئے کہ وہ نہ تو نماز پڑھتے ہیں نہ روزہ رکھتے ہیں اور نہ قرآن شریف کی تلاوت کرتے ہیں یہ لوگ خوجے کہلاتے ہیں ان کی ابتدا کچھ سے شروع ہوئی۔ آغاخان مرحوم نے انہیں سختی سے مدارس میں تعلیم پانے سے روکا۔ بمبئی کے قدیم مسلمان کوکنی کہلاتے ہیں۔ وہ شافعی ہیں اسلئے کہ انہیں عربوں نے مسلمان بنایا تھا۔ انھوں نے کہا کہ مولوی تعلیم کے سخت مخالف ہیں لیکن وہ ہر جمعہ کو انجمن کے جلسہ میں ضرور شریک ہوجاتے ہیں گونے (Gonne) کے یہاں کھانا کھایا۔ وہیں سر ولیم ویڈر برن (Sir William Wedderburn) سے بات چیت رہی بلاشبہ بہت اعلیٰ درجہ کے آدمی ہیں زراعتی مسائل پر گفتگو رہی۔ وہ لارڈ رپن کی لوکل سلف گورنمنٹ اسکیم کے بیحد مداح ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس سے بہت فائدہ پہنچیگا محض زراعت کے بل پر ہندوستان کے لوگ زندہ نہیں رہ سکتے۔ قدیم زمانہ میں اسے زائد پیشہ کے طور پر کیا جاتا تھا لیکن اب سارا دارومدار اسی پر ہے پہلے زمانہ میں لوگ جلاہے ہنرمند مزدور اور کسان ہوا کرتے تھے اور اب چونکہ یہ تمام تجارتیں بند ہوگئی ہیں اس لئے وہ محض زمین کی پیداوار پر گزارہ نہیں کر سکتے انھوں نے تمام صوبوں میں دوامی بندوبست اراضی کی ضرورت پر مجھ سے اتفاق رائے کیا۔ کل پھر گفتگو ہوگی۔

۲۴- فروری ـــ مسٹر جمشید جی جیجی بھائی ملاقات کو آئے اور برنج خوشان کھانے کے لئے مدعو کیا۔ یہ بہت سادہ مزاج نوجوان ہیں اور بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملکی معاملات میں ایمانداری برتنے کے خوگر ہیں لیکن سیاسیات سے محترز رہتے ہیں۔ اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ پارسی اینگلو انڈین حضرات اور ہندوستانیوں کے باہمی جھگڑے میں موخرالذکر کا ساتھ نہیں دینگے۔ راست کے ایڈیٹر نے مجھ سے اس مسئلہ پر بہت طویل گفتگو کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بارہ سو سال ہوئے کہ پارسی ایران سے آئے تھے ہندوؤں نے انہیں اپنے ملک میں رہنے کی اجازت دی لیکن چند شرائط کے ساتھ۔ ایک تو یہ کہ گائے کا گوشت نہ کھائیں اور دوسرے یہ کہ شادی بیاہ کے مواقع پر ہندو رسوم برتیں ہم پر طرح طرح کے مظالم ہوئے اور ہماری ہر تحریک کو سختی کے ساتھ دبایا گیا۔ جبتک انگریز بمبئی میں نہیں آئے ہمیں ہر وقت یہ خدشہ لگا رہتا تھا کہ کہیں ہماری نسل منقطع نہ ہوجائے اسی وجہ سے ہم انگریزی راج کی حمایت کرتے ہیں۔ یہاں ہم بہت مالدار اور خوشحال ہوگئے اور تعلیم نے

ہمارے دل میں یہ خواہش پیدا کی کہ ہم سیاسیات میں حصہ لینا شروع کر دیں ہوم رول کے لئے جو تحریک ہندو شروع کر رہے تھے اسمیں ہم ان کے ہم آہنگ ہیں ہم کسی حالت میں انگلستان سے اپنا تعلق منقطع کرنا نہیں چاہتے کیونکہ یہ ہمارے لئے مفید ہے۔ میں نے ان کے دستوروں کے متعلق سوال کیا تو کہنے لگے کہ وہ بہت جاہل ہوتے ہیں ہماری تمام رسوم ژندہیں ادا کیجاتی ہیں جسے بہت کم پارسی سمجھ سکتے ہیں۔ مالدار پارسیوں نے سرکاری تعلیم سے پورا فائدہ اٹھایا ہے اگرچہ انہیں بھی مسلمانوں کی طرح مذہبی تعلیم کی کمی کی شکایت ہے۔ میرا خیال ہو کہ انگلستان میں جا کر تعلیم پانے کی تجویز پارسیوں کے لئے مضر ہے اگرچہ میں نے خود سول سروس کے امتحان کے لئے اپنے بیٹے کو بھیج رکھا ہے وجہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ بگڑ کر آتے ہیں پارسی کا واقعہ یہ ہے کہ اس نے اپنی پھوپھی سے شادی کر لی میں نے مصری اور سوڈانی معاملات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے اپنے اخبار میں ہندوستانی افواج کے بھیجنے کے خلاف سلسلۂ مضامین لکھنا شروع کر دیا ہے۔

۴ بجے سر ولیم ویڈربرن آئے ان سے طویل گفتگو رہی وہ حسب ذیل اصلاحات کو ضروری خیال کرتے ہیں:۔ (۱) سول سروس کے لئے مقررہ رقم کا تعین کیا جائے تاکہ دفاتر میں بیشی کرنا ناممکن ہو جائے موجودہ حالت یہ ہے کہ ممبران کونسل کے بیٹوں، بھتیجوں اور بھانجوں کو سول سروس میں ڈھکیل دیا جاتا ہے۔ انہیں دو سو تین سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے اور چونکہ اس سے گذارہ نہیں ہوتا اسلئے وہ اپنا کام بُری طرح کرتے ہیں۔ دو سو تین سو روپے کے عہدے سول سروس کے ہندوستانی افسروں کے لئے مخصوص خیال کئے جائیں گے سر ولیم کا یہ خیال ہے کہ انگریز سولینوں کی تعداد کم ہونی چاہئے مگر ان کی تنخواہ اچھی ہونی چاہئے۔ فی الحال بلا ضرورت اسمیں اضافہ کیا جا رہا ہے (۲) لندن میں انڈیا کونسل کا خاتمہ کر دینا چاہئے چونکہ اس کے سب ممبر سول سروس کے آدمی ہوتے ہیں اس لئے ان سے یہ توقع رکھنا عبث ہے کہ وہ غیر جانبدار ہو کر فیصلہ دیں گے۔ (۳) وہ تمام صوبوں میں بندوبست دوامی کے موافق ہیں لگان کی مقدار اخراجات وضع کر دینے کے بعد منافع کا ۱/۲ حصہ ہونی چاہئے۔ (۴) اس امر کا اختیار ہونا چاہئے کہ خواہ لگان زر کی صورت میں دیا جائے یا جنس کی صورت میں۔ (۵) زراعتی بنک کھولے جائیں۔

انھوں نے لارڈ لٹن کے عہد حکومت کی آخری حالت کا نقشہ کھینچا اور بتایا کہ مسلح گروہ ہر جگہ پھرتے نظر آتے تھے۔ لوگوں کو ان سے ہمدردی تھی صوبہ بمبئی میں سر رچرڈ ٹمپل اس حالت کے پیدا کرنے کے بہت زیادہ ذمہ دار تھے ٹمپل بے اصول آدمی تھے وہ انیگلو انڈین باشندوں کی آہ و بکا میں ساتھ دینے کے عادی تھے چنانچہ قحط کے زمانہ میں جب صدا بلند کی گئی کہ ہر امکانی طریقہ سے انسانی زندگی کو بچایا جائے تو اسوقت انھوں نے ہر اسٹیشن پر اناج کا بہت سا ذخیرہ جمع کرا دیا جسکا بہت سا حصہ ضائع گیا اور انھوں نے یہ حکم بھی دیا تھا کہ روزانہ دو پونڈ اناج دیا جائے اور جب اس تقسیم سے ملک میں ورزیادہ تباہی پیدا ہونے لگی تو انھوں نے یہ حکم نافذ کیا کہ ایک پونڈ کافی ہے نکلز بنگلات کے تحت قوانین کی ذمہ داری بھی انہی کے سر ہے۔ چونکہ اسوقت یہ صدا بلند کی گئی تھی کہ شہتیر کو بچایا جائے اس لئے انھوں نے ایک حکم کے ذریعہ تمام اضلاع کے شہتیر کو ضبط کر لیا۔

سر فرینک ساوٹر (Sir Frank Souter) کے ساتھ کھانا کھایا عبدالرحمٰن اور قمر الدین طیب جی اور دو پارسی بھی موجود تھے سر فرینک کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ ہندوستانیوں کے ہمدرد نہیں اور اگرچہ وہ نہایت شریفانہ دل رکھتے ہیں تاہم ان کے ہر لفظ سے ہندوستانیوں کی بےعزتی کا اظہار ہوتا ہے۔ اینگلو انڈین اور ہندوستانی جب کبھی جمع ہو جاتے ہیں تو پھر ان کے جلسہ میں رونق نہیں ہونے پاتی گفتگو بھی صداقت سے خالی ہوتی ہے کیونکہ کوئی فریق دلی جذبات کا اظہار نہیں کرتا۔ میرا خیال ہے

اگر صورت حالات کو ٹھیک طریقہ سے بیان کیا جائے تو وہ حسب ذیل ہوگی۔

ساؤتھ:۔ "تمہارے آنے سے مجھے خوشی ہوتی ہے اور تم میرے معزز مہمان ہو اس لیے کہ میں شریف انگریز ہوں اور میں اسے مناسب خیال کرتا ہوں کہ ہندوستانیوں سے شائستہ سلوک روا رکھا جائے لیکن مجھے اس کا علم ہے کہ ابھی تک تم لوگ نیم وحشی ہو اور اس لئے امید ہے کہ تم گستاخ نہ بنوگے۔"

ہندوستانی مہمان "ہم آپ کے ساتھ کھانا کھانے آئے ہیں کیونکہ حکام سے مراسم رکھنا اچھی بات ہے لیکن آپ لوگ شراب کا چھوٹا گلاس پینے کے بعد ذرا وحشی بن جاتے ہیں۔"

یہ دیکھنا حیرت انگیز ہے کہ ہندوستان میں کسقدر شراب استعمال کیجاتی ہے

۲۵-فروری — مالا باری سے اپنی تجاویز کے متعلق طویل گفتگو رہی۔ انھوں نے پوری امداد کا وعدہ کیا ہے۔ سٹرل کے ساتھ یاٹ کلب (Yacht Club) میں لنچ کھایا۔ یہ صاحب طویل القامت اور خشک مزاج ہیں اور ہائی کورٹ کے جج ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ افغانستان کو الحق کر لیا جائے اور وہاں مجھے جج بنا کر بھیجدیا جائے۔ ان کے ہمراہ جنرل ہل تھے۔ انھوں نے اپنے چپراسیوں کی رائے بیان کی اور کہا کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ مسلمانان ہندوستان مہدی کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

ڈاکٹر بلین (Dr Blane) کے ساتھ کھانا کھایا۔ لیڈی ٹس اور مس ٹس بھی موجود تھیں۔ قبل الذکر نے شکایت کی کہ گورنمنٹ اینگلو انڈین افسروں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتی اور یہ کہ انہیں ہندوستان سے اسقدر نفرت ہے کہ ہندوستان میں ٹھہرانے کی خاطر انہیں معقول معاوضہ ملنا چاہئے۔ ہندوستان ان کے بغیر کیا کر سکتا ہے اور انگلستان کی ہندوستان کے بغیر کیا حالت ہوگی؟ انگلستان ہندوستانی افواج کے بغیر کس طرح افغانستان کو فتح کر سکتا ہے؟ وہ مصر کو کیونکر فتح کر سکتا تھا؟ بہرحال یہ ایک مخلص عورت ہے مس ٹس چاہتی ہیں کہ ہندوستانی کسانوں کی زراعتی حالت کو اس طرح سے ترقی دی جائے کہ انھیں میوہ دار درخت لگانے اور میوے فروخت کرنے کی غرض سے باغ رکھنے کی ترغیب دی جائے وہ چار مہینے سے ہندوستان میں ہیں لیکن بمبئی سے آگے ان کا قدم ابھی تک نہیں بڑھا۔

۲۶-فروری — کولہاپور کے دیوان ملنے کے لیے آئے۔ انھوں نے مسر رچرڈ ٹمپل کے متعلق سر ولیم ویڈربرن کی رائے کی تصدیق کی اور کہا کہ گورنروں میں وہ سب سے زیادہ معلومات رکھتے ہیں۔ انھوں نے ناواقفیت کی بنا پر کبھی غلطی نہیں کی بلکہ اس وجہ سے کہ وہ ہمیشہ ابھی ہی ترقی کو پیش نظر رکھتے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ ویڈربرن کسانوں کے بہت بڑے ہمدرد ہیں، لیکن بنکوں کے بارے میں ان کی اسکیم کی کامیابی پر اپنا شک ظاہر کیا۔ وہ فرگوسن کو پسند کرتے ہیں لیکن کہتے ہیں کہ انھیں نئے واقعات کی کچھ خبر نہیں۔ حیدرآباد سے فوٹو آگئے ہیں جسمیں میں گاڑی کے برابر اور وزراء کے پیچھے کھڑا ہوا ہوں اس فوٹو میں مذاق کا پہلو مضمر ہے اور اس لئے میں اپنے مختلف دوستوں کو تجویز یونیورسٹی کی کامیابی کی یادگار میں اس فوٹو کی نقول بھیجونگا اس سے ان کی ہمت بڑھیگی

۲۷-فروری — بمبئی گزٹ میں یونیورسٹی کی نسبت ایک مضمون شائع ہوا ہے یہ مضمون ہمارے موافق ہے اور طرز تحریر بھی شائستہ ہے صبح کے کھانے کے وقت میں نے سر جیمس فرگوسن سے کہا کہ میں ہندوؤں اور پارسیوں کے جلسہ میں جانیوالا ہوں اور اس لئے مجھے گاڑی کی ضرورت ہے۔ انھوں نے مجھ سے بلا تامل کہدیا ہے کہ میں تمہارا جانا پسند نہیں کرتا۔ لیکن جب میں نے یہ تشریح کی کہ جلسہ عام نہیں ہے اور یہ کہ اُسکے صدر کاشی ناتھ تلنگ ہیں جو بمبئی کی کونسل کے ممبر ہیں تو جانے پر اظہار رضامندی کر دیا لیکن انھوں نے مجھ سے نہایت سنجیدگی اور زور سے اس خطرہ کا ذکر کیا جو ہندوستانی

شکایات کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتے اور ان کے دلوں میں جوش پیدا کرنے سے رونما ہوسکتا ہے۔ اُن کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ میں انگریز ہونے کی حیثیت سے کس طرح ایسی کارروائی کا مرتکب ہوسکتا ہوں۔ حکومت ہند مطلق العنان تو ہے مگر ساتھ ہی ماں باپ کی محبت کا عنصر بھی اس میں موجود ہے گورنمنٹ رات دن لوگوں کی فلاح و بہبودی کے کام میں مصروف رہتی ہے اور اگر ایجیٹیشن ہوئی تو ہمارے اس کام میں رکاوٹ پیدا ہوجائیگی۔ بلاشبہ ایسے بھی ہندوستانی موجود ہیں جو گورنمنٹ کی خلاف شکایات کا طومار باندھ کر ذاتی مقاصد کو پورا کرنا چاہتے ہیں لیکن اُنکی داستانیں سب کی سب جھوٹ ہیں۔ خود میرا ذاتی تجربہ ہے کہ سرکاری افسر ہر وقت فلاح و بہبود کے کام میں سچائی کے ساتھ مصروف رہتے ہیں اور لوگ بھی انہیں ظلم کے خلاف اپنا محافظ قرار دیتے ہیں۔ میرا یقین ہے کہ اس گورنمنٹ سے بہتر کوئی اور گورنمنٹ صفحۂ دنیا پر موجود نہیں یا کم سے کم کوئی اور حکومت ایسی نہیں جسکا اس قدر احترام کیا جاتا ہو" اتنا کہنے کے بعد انھوں نے پوچھا کہ تم کن کن مسائل پر بحث کروگے اور یہ توقع ظاہر کی کہ سیاسیات پر تقریر نہ کیجائیگی۔ کوئی شخص سر جیمس کی نیت اور وفاداری پر شبہ نہیں کرتا۔ لیکن وہ کون لوگ ہیں جو ان کی آنکھیں، ہاتھ اور کان بنے ہوئے ہیں؟ ان کا چپراسی ان سے کہتا ہے کہ مسلمانان ہندوستان مہدی کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، سر فرینک ساؤٹر جو انھیں پولس کے افسر اعلیٰ اور ہندوستان کے بہی خواہ کی حیثیت سے یہ اطلاع دیتے ہیں کہ ہندوستانیوں کی باتوں پر اعتماد نہ کرنا چاہئے، مسٹر ل جو اپنی عدالت کی حدود کو افغانستان تک وسیع کرنا چاہتے ہیں اور کمانڈر انچیف وغیرہ میں نے ان سے کہا کہ میں یہ وعدہ تو نہیں کرسکتا کہ سیاسیات کو ہاتھ نہیں لگاؤنگا لیکن میں جوش دلانے والی کوئی بات جلسہ میں بیان نہیں کرونگا اور ساتھ ہی ساتھ مجھے اس کا یقین ہے کہ میری ہمدردی سے ان میں اُس سے زیادہ بےچینی نہیں بڑھیگی جتنی کہ اب پائی جاتی ہے۔ انھوں نے پوچھا کہ ان کی شکایات کیا ہیں اور میں نے بطور مثال یہ بیان کیا کہ حقیقی معنوں میں کوئی ایسی عدالت موجود نہیں جہاں ان کی شکایات رفع ہوسکتی ہوں۔ اس پر انہیں طیش آگیا اور کہا کہ اس سے زیادہ جھوٹ بات کوئی نہیں ہوسکتی۔ مجھ سے روزانہ اپیلیں کیجاتی ہیں اور اعلیٰ حکام اور میں خود ماتحت افسروں کے فیصلوں کو بدلتا رہتا ہوں۔ ہم سب یہی چاہتے ہیں کہ غربا کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ چند روز کا واقعہ ہے کہ مجھے ایک افسر کو اس بنا پر ڈانٹنا پڑا کہ اس نے نہایت سخت الفاظ میں شکایت کی تھی۔ اس نے یہ لکھا تھا کہ گورنمنٹ باشندوں کو تباہ کر رہی ہے اور یہ کہ ان سے کہیں بھی ہمدردی کا اظہار نہیں کیا جاتا میں نے کہا کہ آپ نے اسے ڈانٹا تو سہی کہنے لگے کہ اُس نے سخت الفاظ استعمال کئے تھے میں سر جیمس کو اس بنا پر پسند کرتا ہوں کہ وہ کھرے آدمی ہیں اور جو بات دل میں ہوتی ہے اسکو صاف صاف بیان کر دیتے ہیں۔ لیکن لاسبارڈی کے آسٹریا کے حکام مساوی طور سے یہ یقین نہیں رکھتے تھے کہ ہماری حکومت دنیا میں بہترین ہے، اور وہاں کے باشندوں نے ان کے خلاف بغاوت نہیں کی اور انہیں نکال باہر نہیں کیا؟ بدنیتی اور دشمنی سے جو شے زیادہ خطرناک ہے وہ جہالت ہے۔

"وہ جلسہ میں گیا میں نے اپنی تقریر میں زراعت اور مالیات سے بحث کی۔ مقامی مالیات کے متعلق جلسہ کی یہ رائے تھی کہ وہ اطمینان بخش نہیں ہے لگان آراضی کی زیادتی کی شکایت کی گئی۔ ایک مقرر نے کہا کہ قدیم زمانہ سے ہم اپنی زمین کو بہت بڑا سرمایہ خیال کرتے تھے لیکن اب ہم اس

اجتناب کرتے ہیں۔ اگر بندوبست آراضی دوامی کر دیا جائے تو ہم بھی بنگال والوں کی طرح اپنا روپیہ اس میں لگانا شروع کر دیں گے۔ اس طریقہ سے ساری زمین سرمایہ داروں کے ہاتھ میں آجائیگی۔ لیکن گورنمنٹ کی تمامتر پالیسی یہ رہی ہے کہ بیچ کے آدمیوں کو کم کرے جنھیں وہ نکھٹو خیال کرتی ہے اور سمجھتی ہے کہ وہ شہد کے مناسب حصہ کو اس تک پہنچنے میں مانع ہیں۔ یہ کفایت شعاری کا قدرتی قانون ہے جسمیں ملک کا قانون نقصان پہنچائے بغیر دخل اندازی نہیں کر سکتا! جلسہ دوامی بندوبست آراضی کی تائید میں تھا اور اسکی یہ رائے تھی کہ یہی حل ساری زراعتی مشکلات کا خاتمہ کر سکتا ہے میں نے لگان کی مقدار کے متعلق دریافت کیا تو تھوڑی بحث کے بعد یہ بات ظاہر کی گئی کہ بمبئی کے لئے مجموعی پیداوار کا تہائی حصہ غیر مناسب نہ ہوگا۔ گجرات نہایت زرخیز مقام ہے مگر وہاں بہت زیادہ لگان لیا جاتا ہے۔ کوؤں پر ٹیکس لگایا جاتا ہے اور اس کے باعث سے لوگ نئے کوئیں کھودنے میں تامل کرتے ہیں میں نے سر جیمس کا یہ قول سنایا کہ "کوئی ظلم ایسا نہیں جسے رفع نہ کر دیا گیا ہو" اسپر قہقہہ بلند کیا گیا۔ راؤ شنکر[1] نے جو گورنمنٹ بمبئی کے اورینٹل ٹرانسلیٹر ہیں اور جنپر سر جیمس فرگوسن کو سب سے زیادہ اعتماد ہے، یہاں تک بیان کیا کہ مجھے یاد نہیں کہ لگان کے خلاف کوئی اپیل کی گئی ہو اور اس کا جواب باصواب ملا ہو۔ حاضرین نمک کے محصول کے خلاف تھے۔

میں نے ان سے پوچھا کہ چونکہ ٹیکس بڑھانے کی ضرورت ہے اس لئے آپ لوگ اسے کس طرح بڑھائیں گے انھوں نے کہا کہ مال درآمد کے ذریعہ ہم ان سب پر محصول بڑھا دینے کے خواہشمند ہیں اسلئے کہ صرف مالدار اشخاص پر اسکا اثر پڑیگا۔ میں نے انکم ٹیکس کے متعلق سوال کیا

[1] ان کا پورا نام ونایک راؤ واسدیو نولکر تھا۔ مترجم

ملنگ۔ اس کی تائید میں تھے مگر مسٹر فرید وجی۔ سی۔ آئی۔ ای سخت خلاف تھے انھیں کچھ شبہ نہیں کہ ہندوستان والے اس ٹیکس سے خوش نہیں ہیں۔ ۵۰۰ روپیہ سالانہ کی آمدنی والے اس سے مستثنیٰ ہیں جب میں نے یہ بیان کیا کہ سر جیمس کو اندیشہ ہے کہ کہیں میں اپنی تقریر سے آپ لوگوں کے خیالات کو متاثر نہ کروں، تو وہ بہت مسکرائے یہ سب لوگ کونسل و کارپوریشن کے ممبر ہیں اور بعض بڑے بڑے افسر ہیں۔ آخر سر جیمس کو کہاں سے اطلاعیں ملتی ہیں؟ وہ کونسے ہندوستانی ہیں جو مطمئن ہیں؟ جب سے میں ہندوستان میں آیا ہوں مجھے ایک شخص بھی ایسا نہیں ملا۔ ہم نے براہ راست سیاسیات پر گفتگو نہیں کی۔

محمد علی رو گھے کے یہاں کھانا کھایا۔ مہدی، ترکی سلطنت اور یونیورسٹی کے بارے میں طویل گفتگو رہی سب چاہتے ہیں کہ مہدی کامیاب ہو۔

۲۸۔ فروری ـــــ ناشتہ کے بعد سر جیمس سے بہت دیر تک گفتگو کی انھوں نے نمک اور محکمۂ جنگلات کے ٹیکس کی خرابی کو تسلیم کیا اور کہا کہ موخر الذکر کی خرابی کو رفع کیا جائے۔ ڈنر کے موقع پر میں مسٹر ویسٹ کے پاس بیٹھا وہ بہت ہشیار آدمی ہیں اور کسی وقت تمکنت اور غرور کے لباس کو نہیں اتارتے بردباری تام کو نہیں وہ یہاں کی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں انھوں نے اسلامی یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز پر سختی سے حملے کئے ان کی رائے میں مسلمان متعصب اور تقدیر کے قائل ہوتے ہیں اور اس لئے انہیں کوئی اصلاح کامیاب نہیں ہو سکتی انھوں نے اسکندریہ کی یونیورسٹی جلائی تھی۔ ان کا مذہب زمانہ کے مطابق چلنے کا حکم نہیں دیتا۔ روما میں پاپائی حکومت کے ماتحت مسلموں کی قوم کیا کریگی؟ مساجد کے بغیر اس کا گذارہ کس طرح ہوگا؟

۲۹-فروری — فرگوسن اب بہت اخلاق سے ملتے ہیں۔ کئی امور میں ہمارا ان کا اتفاق رائے ہوگیا ہے مثلاً یہ کہ وہ مال درآمد کے محصول کو بڑھا دینے کے موید ہیں اور نمک کے محصول میں کمی ہو جانے کے خواہشمند ہیں۔ بندوبست دوامی کے بھی وہ کچھ زیادہ خلاف نہیں رہے ہم متفق تھے کہ دیسی ریاستوں کو بھی غیر مسلح کر دیا جائے میرا خیال تھا کہ وہ اس پر رضامند ہو جائینگے، مگر وہ کہتے ہیں کہ ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ میرا یقین ہے کہ وہ نرم دل مستبد ہیں۔ مگر وہ اپنے حکام کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں۔

"مالاباری سے ملکر ہم نے یہ انتظام کیا ہے کہ وہ اپنے اخبار کے ذریعہ یونیورسٹی کی تجویز کی تائید کریں گے حامد بک کے یہاں کھانے کے لئے گئے۔ رد گھے، بدرالدین طیب جی اور دوسرے لوگ بھی مدعو تھے اس کے بعد انجمن اسلام کے جلسہ میں گئے جہاں ۵۰۰ آدمی تھے۔ انھوں نے مجھے ایڈریس دیا اور میں نے اپنے خیالات تفصیل کے ساتھ ظاہر کئے آج کی رات آسمان کا نظارہ بہت ہی دل لبھانے والا تھا۔ ہلال اور ستارہ دونوں قریب قریب تھے یہ شگون ہے اس بات کا کہ مہدی کو یا تو سواکن میں فتح حاصل ہوئی ہے اور یا خرطوم نے ہتھیار ڈالدیئے ہیں میں نے اس سے پیشتر چاند اور ستارے کو اسقدر قریب کبھی نہیں دیکھا تھا۔

۱-مارچ — ہندوستان سے روانہ ہوگئے ٹکٹ سوئز تک لئے گئے ہیں لیکن میں وہاں اترنا نہیں چاہتا تھا اسلئے کہ گورنمنٹ کو میری گرفتاری سے فتح نصیب ہو جائیگی اور میں اپنے معتدل رویہ سے اسکے خلاف ضرب کاری لگانا چاہتا ہوں۔ گورنمنٹ ہاؤس سے رخصت ہو رہے تھے کہ اتنے میں پروفیسر مونیر ولیمز (آپہنچے۔ انھوں نے مجھے اکسفورڈ آنے اور مسلمانوں کی تعلیم پر لکچر دینے کے لئے مدعو کر لیا ہے۔ ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت ہمیں یہ دیکھکر اطمینان ہوتا ہے کہ ہمنے کچھ نہ کچھ کام تو بالضرور کر ہی لیا ہے اور یہ کہ وہ کام پورا ابھی ہو چکا ہے۔" (باقی)

ض-ا-ب

امید

ثاقب کان پوری

اے امید قلبِ مضطر، اے نوید جانفزا — غم کی راتوں میں سناتی ہے تو لحنِ دلنواز
تو مٹا دیتی ہے اگر یاس کا زنگِ جمود — تو گھٹا دیتی ہے بیتابی کی شبہائے دراز

تیری ہر ہر سانس سے پیدا ہے سامانِ نشاط — تیرے نغموں نے دیا ثاقب کو پیغامِ عمل
تیرے چہرے سے عیاں ہے روح کی اک تازگی — تیرے سازِ نطق میں پنہاں ہے الہامِ عمل

تو ہی بیوہ کے لئے سرمایۂ صبر و سکوں — تو سلا دیتی ہے اسکو بیکسی کی رات میں
تو دلِ مایوس کو دیتی ہے اک تازہ حیات — کونسا جلوہ ہے اے امید تیری ذات میں

وہ مسافر منزلِ غربت میں جو [illegible]ماندہ ہیں — یاس نے جنکے دلوں کو کر دیا ہے پاش پاش
بس یہی امید ہے تنہا جو ہے ان کی رفیق — کہہ رہی ہے تم بڑھاؤ حوصلوں کو اپنے کاش

تو کبھی بنجاتی ہے بیمارِ غم کی [illegible]گی — کھینچ دیتی ہے نظر کے سامنے تصویرِ عیش
تو شکستہ دل کو دیتی ہے پیامِ خوشگوار — تو بتا دیتی ہے مفلس کو کبھی تدبیرِ عیش

حریم روح

امین حزیں

۱

قریبِ آرزو نہیں! — طلسمِ رنگ و بو نہیں!
نگاہ سو بسو نہیں! — تلاش و جستجو نہیں!
بشر کی گفتگو نہیں! — خیال ما و تو نہیں!
حریفِ ناؤ نوش ہوں — خموش سا خموش ہوں!!

۲

خودی نہیں گماں نہیں! — چنیں نہیں چناں نہیں!
زمین و آسماں نہیں! — نمود این و آں نہیں!
زماں نہیں مکاں نہیں! — حجاب درمیاں نہیں!
حضور ہی حضور ہے! — سرور سا سرور ہے!!

۳

فروغِ حسن برملا! — تجلیات کی صلا!
ادھر ضیا ادھر ضیا! — عجیب ہے یہ ماجرا!
بیاں میں کروں تو کیا! — حریمِ روح کی فضا!
جمال ہی جمال ہے! — کمال سا کمال ہے!!

حسیّات

اصغر حسین خاں نظیر لودھیانہ

راحت کی جستجو ہے جہانِ خراب میں | حق تو یہ ہے کہ صاحبِ دولت ہیں خواب میں

....

ہے رشک میرے حال پہ اہلِ بہشت کو | ڈالا ہے تیرے غم نے مجھے کس عذاب میں
گردوں کو آفتاب پہ ناحق غرور ہے | اس آفتابِ حسن کو دیکھو عتاب میں

....

اکدن تو دیکھ چشمِ حقیقت نگر سے تو | آنسو بھی کم نہیں دُرِ یکتا سے آب میں
اس دل کی کچھ خبر ہی نہیں لطفِ زیست کی | پایا نہ جس نے سوزِ محبت شباب میں
منبر پہ جانِ زہد ہے خلوت میں شمعِ کفر | کچھ پوچھئے نہ حضرتِ واعظ کے باب میں
پیتے تھے انکے ساتھ تو بیشک حرام تھی | اب تو وہ کیفیت ہی نہیں ہے شراب میں

دریائے عشق پردہ سکوں نے فسوں کیا
اب موج بھی نظیر نہیں پیچ وتاب میں

راز ہستی

محمود اسرائیلی

نسیمِ صبح کی نکہت فشانیاں دیکھیں | تو آہ بھر کے کہا غنچۂ گلستاں نے
کیا تھا جمع جو سرمایۂ شمیم اب تک | ہزار حیف نہ کی قدر اسکی داماں نے
لٹا دیا اُسے گلشن میں جان کر بے سود | چھپا لیا اُسے آغوش میں بیاباں نے
زمینِ دشت کے کانٹے مرے نصیب میں تھے | جواب بھی دامنِ صد چاک میں نمایاں ہیں
یہی سبب ہے کہ گلزار ہو گئے تاراج | اور آج رشکِ گلستاں بہت بیاباں ہیں

بکھر گیا ہے جو شیرازۂ حیات اپنا
فنا کے خوف سے اوراق سب پریشاں ہیں

رات ۔ گنگا کے کنارے

حامد اللہ افسر

۱

رات آئی ہے کس شان سے گنگا کے کنارے | بکھرے ہوئے ہر چار طرف نور کے پارے
اوپر بھی ہیں تارے
نیچے بھی ہیں تارے
گنگا کے کنارے

۲

ہنستا ہوا اک چاند فلک پر ہے نمایاں | اک دل میں ہے گنگا کے بصد کیف درخشاں
دونوں ہیں برابر
ہوتے ہیں اشارے
گنگا کے کنارے

۳

آواز سکوں ریز کا لہروں پہ مچلنا | موسیقی کا رہ رہ کے خموشی سے نکلنا
ہیں نغمے ہی نغمے
میدان میں سارے
گنگا کے کنارے

۴

موجوں کا یہ رقص اور یہ دلدوز تبسم | ہو جاتی ہے دل جس کے نظر جنمیں کہیں گم
کر دیتے ہیں جادو
دل پر یہ نظارے
گنگا کے کنارے

رباعیات آسی

عبد الباری آسی

موجود ہوں ورکھو گیا ہوں گویا — بیدار ہوں اور سو گیا ہوں گویا
اتنا ہے غبارِ رنج دل میں آسی — زندہ تہِ خاک ہو گیا ہوں گویا

کتنی یہ عمرِ بے بقا نکلی ہے — کیا اسکو سمجھ رہا تھا کیا نکلی ہے
آئینہ کو دیکھکر یہ سمجھا ہوں میں — ہستی میری عدم میں جا نکلی ہے

اسدل میں کبھی خوشی کا عنواں دیکھا — اسدل میں کبھی غموں کا ساماں دیکھا
القصہ اسی میں عمر گزری آسی — اک بحر میں سو طرح کا طوفاں دیکھا

وصلت کا کوئی اثر نہ دیکھا میں نے — دیدار کا کچھ ثمر نہ دیکھا میں نے
میں آئینۂ جمال دلبر نکلا — اس نے دیکھا مگر نہ دیکھا میں نے

ہمت جو ذرا قدم اٹھائے تو چلیں — یہ دردِ یہ اضطراب جائے تو چلیں
ہستی ہے فقط غبارِ راہِ جاناں — دم بھر یہ غبار بیٹھ جائے تو چلیں

غزلیات

فرخ بنارسی

جذب ہو کر رہ گئیں اٹھیں جو نظریں سوئے دوست — کسقدر نظارہ پرور ہے جمالِ روئے دوست
بے نیازی ہو گئی خود مائلِ عرضِ نیاز — میری آشفتہ مزاجی نے بدل دی خوئے دوست
اسکی مرگِ نامرادی پر فدا ہو زندگی — جسکے ماتم میں پریشاں ہو گئے گیسوئے دوست
کسکو یہ امید تھی قربان ایسی موت کے — وقتِ آخر میرا سر اور تکیۂ زانوئے دوست
ہوش اپنا ہی نہیں پھر دوسرا کیا خیال — بے نیازِ ما سوا ہی محوِ حسنِ روئے دوست
کعبۂ نو کی بنا ڈالی جبینِ شوق نے — کر دیا آباد سجدوں سے حریمِ کوئے دوست

روح پرور ہی بہارِ جلوۂ رنگِ چمن
فرخ ایک اک پھول سے آتی ہے مجھکو بوئے دوست

آزاد انصاری

جہانتک ہو مذاقِ آرزوئے یار پیدا کر — جہانتک ہو خیالِ ماسوا سے عار پیدا کر
یہ مانا الفتِ دلدار کے جذبات سب صادق — مگر پہلو میں دل تو قابلِ دلدار پیدا کر
نگاہِ لطف کیجائیگی اسکی فکر لاحاصل — مگر حالت نگاہِ لطف کی حقدار پیدا کر
زباں تک شکوۂ محرومیِ دیدار آنا تھا — خطاب آیا کہ جا اور طاقتِ دیدار پیدا کر
نہ کچھ دنیا سے ربط اچھا نہ کچھ عقبیٰ کا خبط اچھا — نہ وہ آزار پیدا کر نہ یہ آزار پیدا کر
اگر دنیا میں خود کو زندہ ثابت کر دکھانا ہے — تو اٹھ اور زیست کے کامل ترین آثار پیدا کر
مثالِ جسمِ بیجاں زندگی کاٹی تو کیا کاٹی — ثبوتِ زندگی ناقابلِ انکار پیدا کر

تجھے آزاد ایوں درویشِ کامل کون ملنے گا
جہاں سے ہو جریب و جبہ و دستار پیدا کر

باسط بھوپالی

کب بھولتا ہوں حسن کے کیف اثر کو میں — رگ رگ میں پا رہا ہوں تشکر نظر کو میں

اب کیا خطاب دوں تری کافر نظر کو میں — دل میں لئے ہوں فطرت دیوانہ گر کو میں

حرماں پر بتوں یہ مدارات عشق ہے — پھر کہئے کیا کرونگا مذاق نظر کو میں

شاید وہ دیکھ لیں متجسس نگاہ سے — دلکش بنائے جاؤں متاع نظر کو میں

رسوائی خیال کی تکمیل ہوگئی — کھو گیا جہاں سے اب عمر بھر کو میں

دیوانۂ شباب ہوں آوارۂ خیال — کیا کیا ترس رہا ہوں گناہ نظر کو میں

مہدی اجنالوی

آغاز میں چرچے تھے انجام بھی اب دیکھو
خاموشی میخانہ بیہوشی دیوانہ

دریوزہ گری کب تک اے ننگ امانت اُٹھ
تو جوش میں آدم بھر اے ہمت مردانہ

جب تہ میں حقیقت کی دیکھا تو ہمیں زاہد
کعبہ بھی نظر آیا اُجڑا ہوا بتخانہ

بہار شاعری

محمد مظہر جلیل شوق

خط و خالِ حسن ہیں نقش و نگار شاعری — لذت سوزِ جگر صبح بہار شاعری

اشتیاقِ بے نہایت جلوۂ دیدار کا — دیدۂ محوِ تماشہ مایہ دار شاعری

جان و دل نذرِ چمن، وقفِ فضا ہوش و خرد — بے خودی بے اختیاری اختیارِ شاعری

جذبۂ عاشق سے اور شاعر سے رسمِ اتحاد — محفلِ عشاق میں ہے اقتدار شاعری

شیوۂ سامانِ عشق و آئینہ داریِ حسن — ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں کاروبارِ شاعری

منظرِ فطرت پہ مرمٹنا ہے شاعر کا غرور — حیرت چشم تماشہ افتخار شاعری

گلشن شاعر بہارستانِ حسنِ پردہ پوش — منظر خونین جہاں کا۔ لالہ زار شاعری

جذبۂ دل کو بدل دینا جنونِ عشق میں — حسن کو خود بین بنا دینا ہے کار شاعری

شعر کا مفہوم ہے نیرنگیِ حسنِ ازل — نو دمیدہ سبزۂ نو بہارِ شاعری

ہے سکوں افزائے دل بوئے گل شاعر کبھی — گہ جنوں انگیز الفت ہے بہار شاعری

شوق شاعر ہے کشِ خم خانۂ جذبات ہے — بید لیہائے تمنا ہے خمار شاعری

صبوحی

اختر صہبائی

گلزار کا پھول پھول پیمانۂ حسن — اشجار کی شاخ شاخ دیوانۂ حسن

دوشیزۂ صبح ہے صبوحی بر دوش — ہنگام سحر چمن ہے میخانۂ حسن

کیا روح فروز ہے ضیا باریِ حسن — طاری ہے میرے دل پہ جنوں کاریِ حسن

ہے بارگاہ حسن اگر سجدہ طلب — ہے مقصد زیست بھی پرستاریِ حسن

ہے زیر نقاب شادمانی آئی — کس رنگ میں مرگ ناگہانی آئی

تاریکی و نور میں نہ کچھ فرق رہا — آندھی کی طرح اختر جوانی آئی

تاریک ہیں زندگی کی راہیں ساقی! — ظلمات فزا ہیں میری آہیں ساقی!

ہو جلوۂ آفتاب پیمانۂ مے — ہو جائیں نور سے لبریز نگاہیں ساقی!

استفسارات

کیا حضرت عمر واقعی شراب کے عادی تھے

(جناب محمد علی خاں صاحب بہار)

چند روز ہوئے میں نے اتفاق سے لکھنؤ کے ایک شیعی رسالہ میں دیکھا کہ حضرت عمر نے ہمیشہ شراب صلب پی، حالانکہ اس رسالہ کی تحقیق کے مطابق جو اس نے ہمارے ہاں کی کتابوں سے پیش کی ہے، شراب صُلب حرام ہے۔

براہ کرم اس باب میں اپنی تحقیق سے آگاہ فرمائیے اور مطلع کیجئے کہ شراب صلب کیا چیز ہے اور یہ کس قسم کی شراب تھی جسے حضرت عمر نے ترک نہیں کیا۔

(نگار) میں معذرت خواہ ہوں کہ آپ کا استفسار باوجودیکہ خاص اہمیت رکھتا تھا، نظر انداز ہو گیا اور غیر معمولی تعویق کے بعد اس طرف توجہ کرنے کی فرصت ملی۔

آپ نے جس رسالہ کی طرف اشارہ کیا ہے وہ میری نگاہ سے گزر چکا ہے اور آپ کی طرح میرے بعض احباب بھی اسکو دیکھ کر متحیر ہو چکے ہیں، لیکن حقیقت اس سے زیادہ نہیں ہے کہ جو کچھ اس مضمون میں لکھا گیا ہے، وہ یکسر مناظرانہ مغالطہ ہے اور فاضل مقالہ نگار نے بہت زیادہ عصبیت سے کام لیا ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ آیت "یسالونک عن الخمر والمیسر الخ" نازل ہونے سے قبل عام طور پر لوگ شراب کے عادی تھے اور اس آیت کے نازل ہونے پر بھی سب نے اسے ترک نہیں کیا تھا لیکن جب ایک مرتبہ واقعہ پیش آیا کہ کسی صحابی نے (اور بعض کے نزدیک خود حضرت علی نے) نماز مغرب بہ حالت سُکر پڑھائی اور قرأت میں غلطی ہو گئی تو آیت "لاتقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ" نازل ہوئی جس پر تمام مسلمانوں نے اوقات نماز میں شراب کا استعمال ترک کر دیا لیکن علاوہ اوقات نماز کے شراب کا استعمال اب بھی جاری رہا، آخرکار حضرت عمر نے جب یہ دعا کی کہ "بیّن لنا فی الخمر بیانا شافیا" (یعنی اے خدا شراب کے بارہ میں صاف صاف حکم نازل کر) تو آیہ "انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان" نازل ہوئی۔

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس آیت کے نازل ہونے پر تمام لوگوں نے شراب ترک کر دی تھی یا اس کے بعد پھر کبھی کسی نے شراب پی ہی نہیں کیونکہ یزید بن معاویہ" (جو یزید الخمور کے نام سے مشہور تھا) ابو الولید بن عقبہ بن ابی معیط، عباس بن عبد اللہ بن عباس

(اخطل کے ہمنشین) بلال بن ابی بردہ ابو محجن الثقفی[لہ]، ابراہیم بن ہرمہ، عبداللہ بن عروہ بن الزبیر، عبدالعزیز بن مروان، عاصم بن عمر وغیرہ امرار وشرفاء عرب کے واقعات مے نوشی تاریخوں سے ظاہر ہیں، لیکن یہ بھی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ حضرت عمر کے عہد میں کوئی ایسا شرابی نہیں بچ سکا جس کی بادہ خواری کا علم آپ کو ہوگیا ہو۔ چنانچہ عبیداللہ بن عمر پر علانیہ حد جاری کرنا۔ قدامہ بن مظعون کو سزا دینا عہد فاروقی ہی کے روشن واقعات ہیں جن سے کم از کم یہ امر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ آپ نہ صرف تارک خمر تھے بلکہ اس کے انسداد میں کسی کی رعایت نہ کرتے تھے، چہ جائیکہ خود اس کا استعمال کرنا۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ آپ نے شراب صلب ہمیشہ پی اور شراب صلب حرام ہے یا نہیں اس کے متعلق جب ہم اسی کتاب کی طرف رجوع کرتے ہیں جس سے اس شیعی رسالہ نے جناب فاروق کا عادی مے خوار ہونا ظاہر کیا ہے، تو ہم کو حیرت ہوتی ہے کہ کیونکر اُسنے ایسی جسارت سے کام لیا۔

اسکے مضموں کا ماخذ عقد الفرید ہے یا عقد الفرید کے حوالہ سے ابن قتیبہ لیکن فاضل مقالہ نگار نے دیانت سے کام لیکر نہ عقد الفرید کی پوری بحث پیش کی اور نہ ابن قتیبہ کی پوری عبارت نقل کی، کیونکہ اگر ایسا کیا جاتا تو اصل مقصود فوت ہو جاتا اور حضرت عمر پر بادہ خواری کا الزام اسقدر صفائی سے عاید نہ ہو سکتا۔

صاحب عقد الفرید نے ایک مستقبل باب نبیذ کی حلت وحرمت پر قائم کیا ہے اور اسمیں موافق ومخالف رائیں ظاہر کی ہیں لیکن اسکی ساری بحث پڑھنے کے بعد ایک لمحہ کے لئے بھی کوئی شخص اس نتیجہ پر نہیں پہونچ سکتا کہ حضرت عمر بادہ خوار تھے

صاحب عقد الفرید نے لکھا ہے کہ "وکان عمر یشرب علی طعامہ الصلب ویقول یقطع ہذا اللحم فی بطوننا" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر کھانے کے وقت صلب کا استعمال کرتے تھے۔ اب ایک صورت تو جواب کی یہ ہے کہ ہم شراب صلب کے استعمال کو جائز قرار دیں اور اس کے ثبوت میں۔ خود رسول اللہ[ص] کا شراب صلب پینا ثابت کر دیں جیسا کہ خود صاحب عقد الفرید نے ابن مسعود کی مشہور وکثیر روایات کی بنا پر لکھا ہے کہ "رسول اللہ[ص] نبیذ تمر کی شراب صُلب پیتے تھے اور حجۃ الوداع کے وقت بھی آپ نے اسے استعمال کیا"

فریق مخالف اس پر یہ حجت نہیں لا سکتا کہ ابن مسعود کی روایات صحیح نہیں ہیں کیونکہ جب اُس نے عقد الفرید کے بیان کو حضرت عمر کے صلب نوشی کے بیاں میں استدلالاً پیش کیا ہے تو اسی عقد الفرید کے اس بیان کو بھی صحیح سمجھنا چاہئے، لیکن ہم اس طریق کے

[لہ] یہ شراب کے بڑے دلدادہ تھے۔ انھیں کا شعر ہے:- اذا مت فادفنی الی ظل کرمۃ + تروی عظامی بعد موتی عروقہا۔ (جب میں مر جاؤں تو مجھے تاک کے سایہ میں دفن کرنا تاکہ اس کی جڑیں میری ہڈیوں کو سیراب کرتی رہیں)

جواب کو پسند نہیں کرتے، بلکہ اس سے علیحدہ ہو کر دیکھنا چاہتے ہیں کہ شراب صلب واقعی حرام تھی یا نہیں اور اسے حرام ہونا چاہئے تھا یا نہیں
شراب صُلب کسے کہتے ہیں؟ اسکے متعلق ابن قتیبہ کہتا ہے "ہو نبیذ التمر اذا صلب" یعنی وہ کھجور کی نبیذ ہے جب گاڑھی ہو جائے
اس سے یہ امر واضح ہو گیا کہ شراب صلب حقیقتاً نبیذ ہی کی ایک قسم ہے اور نبیذ ہی کی حلت و حرمت کے احکام اس سے بھی متعلق ہونے چاہئیں اس لئے اب بحث صرف یہ رہجاتی ہے کہ نبیذ حلال ہے یا حرام

ہم یہ ابھی بیان کر چکے ہیں کہ اُس شیعی رسالہ کا ماخذ صرف عقد الفرید یا اس کے حوالہ سے ابن قتیبہ ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم بھی اسی کو ماخذ قرار دیکر غور کریں کہ آیا نبیذ کا استعمال کرنے والا واقعی شراب خوار کہلائے جانے کا مستحق ہو سکتا ہے یا نہیں

صاحب عقد الفرید نے لکھا ہے کہ "تحریم النبیذ مختلف فیہ بین الاکابر من اصحاب النبی والتابعین" یعنی نبیذ کی حرمت کے باب میں صحابہ و تابعین کا اختلاف ہے۔ اسکے بعد اُسنے حفص بن غیاث کی روایت سے اعمش کا وہ واقعہ بیان کیا ہے کہ جسوقت حدیث کے طلبہ اسکے پاس آئے تو نبیذ سامنے رکھی ہوئی تھی، حفص نے اس کو چھپانا چاہا لیکن اعمش نے کہا کہ اس کی کیا ضرورت ہے کیونکہ "لوکان النبیذ ہو الخمر التی حرمہا اللہ تعالیٰ فی کتابہ ما اختلف فی تحریمہ اثنان من الامۃ" اگر نبیذ شراب ہوتی تو اس کی حرمت میں کسی کو بھی اختلاف نہ ہوتا)

ابن قتیبہ نے شراب کی حلت و حرمت پر تنقید کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ "قول فیصل میرے نزدیک یہی ہے کہ خمر کو کتاب خدا نے حرام کیا ہے اور نبیذ کو سنت رسول نے" لیکن اس کے آگے خود ہی وہ اس بات کا قایل ہے کہ "شراب کی دو قسمیں ہیں۔ایک یعنی انگور کی شراب بغیر جوش دی ہوئی بالاتفاق حرام ہے جس کی نہ کم مقدار حلال ہے نہ کثیر، لیکن دوسری قسم جس میں کشمش اور کھجور کی شراب (شراب صُلب) شامل ہے مختلف فیہ ہے"

یعنی ابن قتیبہ ایک جگہ تو نبیذ کو سنت نبوی کی رو سے حرام ہونا بیان کرتا ہے اور دوسری جگہ اس کی حرمت کو مختلف فیہ قرار دیتا ہے۔ صاحب عقد الفرید نے بھی ابن قتیبہ کے اس اختلاف بیانی پر رائے زنی کرتے ہوئے اس کے قول فیصل سے اختلاف کیا ہے۔

بہرحال ابن قتیبہ نبیذ کے متعلق جو رائے بھی رکھتا ہو یہ امر یقینی ہے کہ حرمت نبیذ کے بارہ میں سخت اختلاف بیان کیا جاتا ہے اور عقد الفرید میں بھی اس اختلاف کا ذکر موجود ہے، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ اختلاف نزاع لفظی سے زیادہ نہیں ہے اور نبیذ متفقہ طور پر حلال ہے

قبل اس کے کہ ہم اپنے اس دعوے کو ثابت کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے حرمت خمر کی علت پر ایک سرسری نگاہ ڈال لیں صاحب عقد الفرید کا خیال ہے کہ خمر کو رجس لفظی اعتبار سے کہا گیا ہے نہ کہ معنی کے لحاظ سے کیونکہ حقیقتاً وہ نجس نہیں ہے اور اسکو رجس کہنا اسی قبیل سے ہے جیسے اور معاصی کو خبائث سے تعبیر کیا ہے اگر شراب واقعی نجس العین ہوتی یا محض سکر باعث حرمت ہوتا تو اللہ اپنے احسانات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے "ومن النخیل والاعناب تتخذون منہ سکرا ورزقا حسنا" کبھی نہ ارشاد فرماتا اور نہ اسے "لذۃ للشاربین" کے نام سے یاد کرتا۔

پس اللہ تعالے کا اُسے رجس کہنا اسی اعتبار سے ہے جیسے اُس نے کفر کو رجس کہا ہے اور چونکہ اللہ نے ہر حرام چیز کے عوض اس کے مثل یا اس سے بہتر کوئی اور چیز حلال کر دی ہے جیسے زنا کے عوض نکاح، ربوٰ کے عوض بیع، اسی طرح خمر کے بجائے نبیذ حلال کر دی گئی ہے اگر حرمت خمر کی علت واقعی سُکر نہیں ہے جیسا کہ عقد الفرید میں ظاہر کیا گیا ہے بلکہ وہ صرف "تعبّداً" حرام کی گئی ہے تو پھر نبیذ کی حرمت کا سوال ہی سامنے نہیں آتا خواہ خم کے خم چڑھا لئے جائیں، لیکن کم از کم میں صاحب عقد الفرید کے اس بیان سے متفق نہیں ہوں اور حرمت خمر کا حقیقی سبب اس کے سُکر ہی کو قرار دیتا ہوں، جیسا کہ اور بہت سے علماء کا خیال ہے۔

پھر اگر حرمت خمر کی علت سکر قرار پائے (اور یہی ہونا چاہئے) تو نبیذ کے مسئلہ میں کسی اختلاف کی گنجائش باقی نہیں رہجاتی، کیونکہ اگر نبیذ اس حد تک استعمال کی جائے کہ اس میں سکر نہ پیدا ہو تو حرمت کا کوئی سبب پیدا نہیں ہوتا اور اگر وہ سکر و مخموری کی حد تک پی لی جائے تو یقیناً حرام ہے۔ اسکی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے معمولی کھانا کہ وہ متفقہ طور پر حلال ہے لیکن اگر وہ اس حد تک کھالیا جائے کہ تخمہ پیدا کر دے حرام ہے پس اگر ایک شخص نے دو پیالے نبیذ کے استعمال کئے اور اسپر سکر کی کیفیت طاری نہیں ہوئی تو اس حد تک اُس نے کوئی ناجائز فعل نہیں کیا، لیکن اگر تیسرے پیالے سے اس کو سکر پیدا ہوگیا تو یہ تیسرا پیالہ حرام ہوگا۔

ہم یہ مانتے ہیں کہ حضرت عمرؓ شراب صلب استعمال کیا کرتے تھے (اور حضرت عمرؓ کیا بلکہ خود رسول اللہ نے اسے استعمال کیا) لیکن جب تک یہ نہ ثابت کر دیا جائے کہ آپ پر سکر کی سی کیفیت طاری ہوجاتی تھی، کسی طرح مورد الزام نہیں ہو سکتے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت عمرؓ مطلقاً نبیذ کو حلال خیال کرتے تھے خواہ وہ قلیل ہو یا کثیر، تو ہم اسکے ماننے کے لئے طیار نہیں کیونکہ بروایت شعبی معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی اعرابی نے، حضرت عمرؓ کے مشکیزہ سے نکال کر اسقدر نبیذ پی کہ وہ بیہوش ہوگیا، آپ نے فوراً اسپر حد جاری کر دی۔ اس واقعہ سے یہ امر بخوبی روشن ہے کہ حضرت عمرؓ نبیذ کے باب میں اس رمز سے واقف تھے کہ کس حد تک اس کا استعمال جائز ہو سکتا ہے۔ اور اس میں حرمت کب اور کیوں پیدا ہوتی ہے

اسی طرح ایک مرتبہ رسول اللہ طواف ختم کرنے کے بعد اونٹ سے اترے اور ایک بڑا پیالہ نبیذ کا آپ کے سامنے لایا گیا، آپ نے اسے چکھا اور پھر کئی مرتبہ پانی ملانے کے بعد اسے پیا اس سے بھی یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ اگر نبیذ کی نوعیت اس قسم کی ہو کہ اس کے استعمال سے سکر پیدا ہو سکتا ہے تو وہ یقیناً حرام ہے ورنہ نہیں۔

اب یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر علت حرمت صرف سکر ہے تو پھر خمر بھی اس مقدار تک کہ اس سے سکر پیدا نہ ہو جائز ہونی چاہئے لیکن اس کا جواب ایک تو یہ ہو سکتا ہے کہ خمر نص قطعی سے حرام ہو چکی ہے اور اس لئے اس کا قلیل و کثیر حصہ سب حرام ہے اور دوسرا جواب یہ ہے کہ خمر میں چونکہ الکحل بہت ہوتا ہے اسلئے اسکی قلیل مقدار بھی بعض طبایع میں ہلکا سا سکر

پیدا کرسکتی ہے اور پھر چونکہ عوام اس میں کوئی امتیاز پیدا نہ کرسکتے تھے اس لئے اصلاح کو پیش نظر رکھ کر اس کا قلیل و کثیر سب حرام کر دیا گیا تاکہ پھر کوئی سوال ہی اس قسم کا پیدا نہ ہو۔

نبیذ میں چونکہ سکر اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتا جب تک بہت کثرت سے اُسے استعمال نہ کیا جائے، اس لئے اس میں امتیاز آسان تھا اور اسے جائز قرار دیدیا۔

تصانیف شاہ عزیز اللہ صفی پوری

حضرت شاہ عزیز اللہ صاحب عزیز صفی پوری (جن کا دوسرا نام ولایت علی ولایت بھی ہے) کی متعدد تصانیف ریویو کے لئے موصول ہوئی ہیں، لیکن افسوس ہے کہ اسوقت تک ان پر کوئی تبصرہ نہیں ہوسکا۔ میں اب بھی اس کے لئے آمادہ نہ تھا لیکن بعض احباب کے اصرار نے مجبور کردیا کہ فی الحال اختصار ہی سے کام لیکر ان کا ذکر کردوں۔

جناب عزیز اللہ شاہ صاحب، صفی پور کے نہایت برگزیدہ و معزز خاندان سے متعلق ہیں اور اس وقت فارسی دانی میں دور دور اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ فارسی نظم و نثر دونوں پر آپ کو اس قدر قدرت حاصل ہے کہ زمانۂ موجودہ میں کوئی دوسرا شخص اس تبحر اور فضل و کمال کا پیش نہیں کیا جاسکتا۔

آپ کی فارسی نظم و نثر کی داد غالب نے دی، آپ کے ذوق کو حالی نے پسند کیا، شبلی نے سراہا، اور امیر مینائی، مولوی عبدالحق خیرآبادی اور محسن کاکوروی نے ان کو اپنے عصر کا بہترین فارسی داں تسلیم کیا۔ آپ ایک درویش وضع و درویش خصائل انسان ہیں اور وطن میں گوشہ نشینی کی زاہد و مرتاض زندگی بسر کررہے ہیں۔ آپ کی تصانیف پر ریویو کرنے کے لئے بڑی فرصت درکار ہے اس لئے اس جگہ مختصراً ان کی تصانیف کی فہرست دینے پر اکتفا کرتا ہوں۔

مرآۃ الصنایع، اعجاز التواریخ، نور ہاں، ارمغاں، پیشکش شاہجہانی، دیوان ولایت، دیوان عزیز، نور تجلی، ذکر جمیل، خبر خیبر، اعجاز محمدی، ماہ شب افروز، حسرت دل، رمز الشہادتین، جلوۂ حسن، شعلۂ محبت خبریۂ عشق فتح مبیں، مصدر الابرار، پنجرقعہ، مخزن الولایت، بیان التواریخ۔ فارسی نظم و نثر کی کتابیں ہیں۔ اردو نظم و نثر میں طور تجلی، نور ولایت۔ نظم دلفریب، ذکر الحبیب۔ عین الولایت، تذکرۂ اولیاء، اشعار الاشعار، قواعد المصادر، عقاید العزیز، اور تاریخ اسلاف خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

معلومات

حیوانات میں نظام لاسلکی

جب کسی جانور سے کوئی حیرت انگیز حرکت سرزد ہوتی ہے تو اس کی تاویل ہم عموماً دو طرح سے کرتے ہیں (۱) حیوانوں کے حواس ہم سے زیادہ سریع اور ذکی ہوتے ہیں۔ (۲) ان کو قدرت کی طرف سے ایک ملکہ عطا ہوا ہے جس سے انسان محروم رکھے گئے ہیں لیکن یہ تاویلیں زیر بحث مسائل کی کما حقہ توجیہ نہیں کر پاتیں۔ مثال کے طور پر اُن پرندوں کو لیجئے جو کبھی ایک ملک میں اور کبھی دوسرے ملک میں رہتے ہیں۔ کون سا ملک ہے جو افریقہ سے یورپ یا چین سے اسٹریلیا تک ان چڑیوں کی رہنمائی کرتا ہے کون سی قوت ہے جو نامہ بر کبوتر کو اسکی منزل مقصود کا پتہ دیتی ہے۔ الو اور چمگادڑ تاریکی میں اپنی غذا کیسے تلاش کر لیتے ہیں۔ تیتری میلوں کے فاصلہ سے اپنے رفیق کا پتہ کیسے لگا لیتی ہے۔ ہم ان سوالات کا جواب نہیں دیسکتے لیکن فرانسیسی سائنس داں ڈاکٹر جرجیس لاخوسکی نے اس موضوع پر ایک بیش بہا کتاب لکھی ہے جس میں اس نے ایک اجتہادی نظریہ پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمام حیوانات اپنے جسم سے ایتھر کی چھوٹی چھوٹی لہریں خارج کرتے رہتے ہیں اور اکثر حیوانوں میں ان لہروں کو قبول کرنے کا مادہ ہوتا ہے۔ وہ ان برقی لہروں سے دور کے جانوروں اور حشرات الارض کا حال دریافت کر لیتے ہیں۔

یہ تو کہا نہیں جا سکتا کہ ڈاکٹر موصوف نے اپنے نظریہ کو پوری طرح ثابت کر دیا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ غور و فکر کیلئے انھوں نے ایک نیا مبحث نکالدیا ہے ہم جانتے ہیں کہ نور حرارت اور برق کی لہریں اصل میں یکساں ہوتی ہیں۔ یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ تمام حیوانات اپنے جسم سے حرارت کی لہریں خارج کرتے رہتے ہیں جگنو کے جسم سے نور کی لہریں بھی نکلتی رہتی ہیں۔ بعض مچھلیاں ہیں جو اپنے جسم سے برقی کی لہریں خارج کرتی ہیں۔ لہذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بعض جانوروں کے جسم سے برقی لہریں بھی نکلتی ہیں نور اور حرارت کی لہریں ہوا میں جذب ہو جاتی ہیں اور ان کی حرکت محدود ہو جاتی ہے۔ لیکن برقی لہریں جیسا کہ نظام لاسلکی سے ثابت ہوتا ہے فضا میں حیرتناک سرعت کے ساتھ دوڑتی ہیں۔ اب اگر یہ معلوم ہو جائے کہ بعض جانور ان لہروں کو خارج کرتے ہیں۔ اور بعض ان کو قبول کرتے ہیں تو اس راز پر کافی روشنی پڑ سکتی ہے۔ ڈاکٹر لاخوسکی نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے جو اسکے نظریہ کی تائید کرتا ہے اس نے اسپین میں بلنسیہ کے ایک لاسلکی اسٹیشن پر نامہ بر کبوتروں کو چھوڑ دیا۔ وہ پریشان ہو کر ادھر اودھر اڑنے لگے۔ ڈاکٹر موصوف نے کئی بار اسی طرح اپنے تجربہ کا اعادہ کیا اور ہر بار وہ اسی نتیجہ پر پہنچا کہ لاسلکی کی لہریں ان لہروں کی راہ میں خلل پیدا کر رہی ہیں جو کبوتروں کو منزل مقصود کا پتہ دے سکتی تھیں۔ ڈاکٹر موصوف کا عقیدہ ہے کہ کرم خور

پرندے دور سے کیڑوں کا سراغ اسی طرح لگاتی ہیں۔ کیڑوں کے جسم سے لہریں نکلتی ہیں پرندے ان سے متاثر ہو کر کیڑوں کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ چونکہ بعض برقی شعاعیں سورج کی روشنی میں کمزور پڑ جاتی ہیں۔ اس لئے بعض پرندے مثلاً چمگادڑ اور الو وغیرہ رات کو اپنا رزق تلاش کرتے ہیں

مردار کھانے والے جانوروں کا بھی یہی طریقہ ہے سڑی ہوئی لاشوں میں جو جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں وہ بھی برقی شعاعیں خارج کرتے ہیں اور ان جانوروں کی رہبری کرتے ہیں۔

پلاٹینم کا قائم مقام

پلاٹینم جسکو "شاہ فلزات" کہنا چاہئے اپنی چند مفید خصوصیات کی وجہ سے نہایت کمیاب ہے کچھ عرصہ گزرا کہ برقی قمقموں میں اس کا تار استعمال کیا جاتا تھا صرف اس لئے کہ شیشہ اور پلاٹینم میں پھیلنے کی صلاحیت برابر ہے۔ لیکن تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ لوہے اور ۴۶ فیصدی نکل پلاٹینائٹ کے مرکب میں بھی پھیلنے کی صلاحیت اسی قدر ہے اور اب پلاٹینم کی چنداں ضرورت نہیں ہے

نیا الکحل

آئندہ پچیس سال میں مرکبات کیمیاوی کی دنیا میں بھی حیرتناک ترقیاں ہونیوالی ہیں حال کے تجربات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک جو الکحل لکڑی سے نکالا جاتا تھا اس کی جگہ آبی گیس یا کاربن مانو اکسائڈ اور ہائڈروجن سے اُسکو پیدا کیا جائیگا۔ ممکن ہے یہ نیا الکحل آئندہ ایندھن کا بھی کام دے۔

یوکیلپٹس کا زہر

یوکیلپٹس کا تیل کم و بیش ہر گھر میں استعمال ہوتا ہے اسکو عام طور پر بے ضرر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ لیکن دراصل اسمیں خطرناک سمی خواص موجود ہیں جیسا کہ اس مثال سے ثابت ہوتا ہے۔

ایک ۱۶ برس کے لڑکے کو جس نے ابھی خسرہ سے نجات پائی تھی غلطی سے ایک آونس یوکیلپٹس کا تیل دیدیا گیا۔ اس نے اسکو پی لیا فوراً منھ میں سوزش شروع ہوئی اور دو تین منٹ میں بالکل بیہوش ہو گیا۔ دس منٹ میں ڈاکٹر آیا تو معلوم ہوا کہ نبض ساقط ہو رہی ہے اور مریض خطرناک حالت میں ہے۔ ڈاکٹر نے رائی اور پانی پینے کو دیا جو نہایت دشواری سے اسکی حلق کے نیچے اتر سکا اس کے بعد لڑکے کو استفراغ ہوا۔ کہا نہیں جا سکتا کہ یہ رائی کا اثر تھا یا یوکیلپٹس کا بہرحال مریض کا رنگ اپنی اصلی حالت پر آنے لگا اور نبض بھی درست ہونے لگی۔ ڈاکٹر نے مزید اطمینان کئے لئے اس کے معدہ کو حقنہ کے ذریعہ سے دھو ڈالا تین گھنٹوں کے بعد آنتوں کا فعل درست ہو گیا۔ لیکن مریض پر پھر بھی ایک گھنٹہ تک تومائی سی کیفیت طاری رہی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یوکیلپٹس میں بھی دیگر خواب آور سمیات کے خواص ہوتے ہیں اسکو بچوں سے بچا کر رکھنا چاہئے اور اس کے استعمال میں احتیاط کرنی چاہئے۔

دنیا کا سب سے بڑا اسٹیج

اہل امریکہ نے حال ہی میں ایک بہت بڑی عمارت تعمیر کی ہے اور اس کی عظمت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جو حصہ اس تعمیر کا ڈراما دکھانے لئے مخصوص ہے وہ دنیا میں سب سے بڑے اسٹیج کی

حیثیت رکھتا ہے۔ اس اسٹیج میں علاوہ حجروں کی نشست کے نیچے کے درجہ میں ۳۰ ہزار آدمی بیٹھ سکتے ہیں اور اوپر دس ہزار آدمی اس کی لمبائی ۲۰۰ مٹر چوڑائی ۱۰۰ مٹر اور بلندی ۵۳ مٹر ہے۔ اس عمارت کے اندر اور بڑے اسٹیج کے پہلو میں ایک اور چھوٹا اسٹیج ہے جس میں تین ہزار آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔

اس عمارت کی تعمیر میں کوئی ایسی چیز استعمال نہیں کی گئی جو قابل احتراق ہو اس لئے وہ آگ کے خطرہ سے بھی بالکل محفوظ ہے

عزم و استقلال کی عجیب مثال

اٹلی میں ایک آدمی ہے جس کا نام مازولی ہے یہ شخص اپنے عزم و استقلال کے لحاظ سے عجیب و غریب چیز سمجھا جاتا ہے اس نے ایک کلیسہ خود اپنے ہاتھوں سے بغیر اس کے کہ کسی اور متنفس کی مدد حاصل کرے ۳۳ سال میں طیار کیا ہے اور بعض اوقات اس کو ایک ایک دن میں ۸۰۰ پتھر تنہا اٹھا کر لیجانے پڑے ہیں۔ اس نے ۴۵ برس کے سن سے اس گرجا کی تعمیر شروع کی اور ۷۸ سال کی عمر میں اسکو انجام تک پہونچایا

کمال کی قدر

سنما کی دنیا میں مضحک کھیل کرنے والوں میں چارلی نے جس قدر شہرت دولت حاصل کی ہے اس سے کوئی شخص ناواقف نہیں ہے، لیکن غالباً ہرولڈ کی قسمت میں اس سے زیادہ کامیابی لکھی ہے جو باوجود متاخر ہونے کے اس وقت شاہانہ دولت کا مالک بن گیا ہے۔

اس کی مضحک تمثیل بعض لحاظ سے بہت زیادہ مکمل سمجھی جاتی ہے اور ایک وقت میں متضاد جذبات کے اظہار میں اسقدر بیساختہ پن اس کی طرف ظاہر ہوتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے اس شخص کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کی سالانہ آمدنی تین لاکھ گنی یعنی تقریباً چالیس لاکھ روپیہ ہے۔

۶۰۰ سال میں فیصلہ

۶۰۰ سال ہوئے جب فرانس کے ایک صوبہ میں کسی قطعۂ زمین کی بابت چار گانوں کے لوگوں میں نزاع پیدا ہوا۔ ہر گانوں اس امر کا مدعی تھا کہ یہ قطعۂ زمین اس کی ملکیت ہے اور اس کے مویشیوں کی چراگاہ رہی ہے۔ یہ مقدمہ حاکموں کے سامنے پیش ہوتا رہا اور حکومت کے نظام بدلتے رہے یہاں تک کہ استبدادی حکومت سے جمہوریت ہوئی۔ جمہوریت نے پھر شخصی حکومت کی صورت اختیار کر لی اور اس کے بعد پھر جمہوریت قائم ہوئی۔ یہ مقدمہ تمام اس زمانہ انقلاب میں اپنے حال پر قائم رہا اور کوئی فیصلہ نہ ہوا۔

اب موجودہ حکومت نے ۶۰۰ سال کے بعد زمین کا معائنہ کرانے کے بعد یہ حکم نافذ کیا ہے کہ زمین کے چار برابر حصے کر کے تقسیم کر دے جائیں۔

خطوط نویسی کے شایق

یوروپ کی بین الاقوامی انجمن برید نے اس امر کی تحقیق کی ہے کہ کس ملک و قوم کے لوگ سب سے زیادہ شایق خطوط نویسی کے ہیں، چنانچہ اس تحقیق کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ انگریز سب سے زیادہ خط لکھتے ہیں یعنی

فی کس سالانہ ۸۱ خطوط کا اوسط اس کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اہل امریکہ کا درجہ ہے جن کے ہاں فی کس سالانہ اوسط ۶۹ ہوتا ہے۔ جرمنی کا اوسط ۶۷، سوئٹزرلینڈ کا ۶۰، فرانس کا ۲۷ اور پرتگال کا ۱۹ فی کس سالانہ ہے

مومی تصویریں

آکسفورڈ کے ایک تجارتی کارخانہ کا ملازم ہے جو اپنے فرصت کے اوقات صرف بڑے بڑے لوگوں کی مومی تصویریں بنانے میں صرف کرتا ہے اسوقت تک وہ ۱۵۰۰ مومی تصویریں زمانۂ قدیم سے لیکر اسوقت تک کے بڑے بڑے مردوں اور عورتوں کی بنا چکا ہے

ان مومی تصویروں کے بنانے میں اس نے اسقدر کاوش سے کام لیا ہے کہ مشکل سے کوئی نقص کسی قسم کا ان میں نکالا جاسکتا ہے لباس، وضع صورت و شکل سب اصل کے مطابق ہے اور جن قدیم لوگوں کی تصویر اسے نہیں مل سکی ہیں ان کے حالات، تاریخ کی کتابوں سے معلوم کرکے اُن کی صورت اور وضع و لباس کو طیار کیا ہے۔

اتنا اچھا اور مکمل مجموعہ مومی تصویروں کا اسوقت دنیا میں کسی جگہ نہیں پایا جاتا۔

یورپ کے جنرل مرچنٹ

لندن میں ایک تجارتی کارخانہ ہے جسکا مالک ایک شخص واٹیلی ہے اور جہاں سے تمام ضرورت کی چیزیں فراہم کی جاتی ہیں۔ ہندوستان میں جنرل مرچنٹ نام ہے۔ صرف بساطخانہ کی دوکان رکھنے والے کا، لیکن یورپ میں اس لفظ کا وہی مفہوم ہے جو ہونا چاہیئے چنانچہ مسٹر واٹیلی کو دعویٰ ہے کہ وہ ہر چیز نہایت عجلت کے ساتھ فراہم کرسکتا ہے

بعض لوگوں نے یہ جانچ کی کہ واقعی اس کا دعویٰ صحیح بھی ہے یا نہیں اور ایک ہاتھی کی فرمائش کی، چنانچہ ۲۴ گھنٹے نہ گزرے تھے کہ ایک عظیم الشان ہاتھی سامنے موجود تھا۔ ایک شخص نے کہا کہ مجھے قدیم زمانہ کا ایک تابوت چاہیئے، ایک گھنٹے کے اندر یہ بھی مہیا ہوگیا۔

ایک مرتبہ کسی شخص نے یہ عجیب و غریب فرمایش کی کہ پیالہ بھر پسّوؤں کی اسے ضرورت ہے۔ مسٹر واٹیلی نے فوراً باغ حیوانات کے مہتمم اور کٹیلے جانوروں کے تاجر مسٹر جامرک کو لکھا کہ جن بندروں کے جسم میں پسو پڑگئے ہوں اُن کے بالوں میں کنگھی کرکے پسو بھیج دئے جائیں اس طرح نصف پیالہ بھر پسو مشکل سے جمع ہوئے لیکن چونکہ فرمائش پورے پیالے کی تھی اسلئے مسٹر واٹیلی نے صاحب فرمائش کو پسوؤں کا پیالہ بھیجتے ہوئے لکھا کہ نصف پیالہ قصداً اس لئے خالی رکھا گیا ہے کہ ضروری ہوا انھیں پہونچتی رہے اور وہ مریں نہیں۔ گویا اس طرح تاویل کرکے اس نے اس اعتراض و الزام کا دروازہ بند کردیا کہ بجائے پیالہ بھر پسوؤں کے صرف نصف پیالہ کی مقدار فراہم کی گئی۔

شمع کا درخت

پناما کے کسی حصہ میں ایک ایسا درخت پایا جاتا ہے جسکے پھل موم بتی کی طرح چار چار فٹ کے لمبے ہوتے ہیں

اور ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زرد موم کی بتیاں ہیں۔ پھر یہ مشابہت صرف صورت ہی میں نہیں ہے بلکہ حقیقت کے لحاظ سے بھی ان کو موم بتی کہہ سکتے ہیں کیونکہ ان پھلوں میں نصف حصہ سے زیادہ چربی کا مادہ پایا جاتا ہے اور جس کو نکال کر اہل چپاما تیل کی طرح جلاتے ہیں اور کبھی اسکو منجمد کر کے شمع کی طرح روشن کرتے ہیں اس کی روشنی نہایت صاف پاکیزہ اور بے ضرر ہوتی ہے

مرتبہ:

نیاز فتحپوری

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

جلد ۱۱ شمارہ ۶

نگار

لکھنؤ سے ہر ماہ کی پندرہ کو شائع ہوتا ہے چندہ سالانہ ہندوستان میں پانچ روپیہ۔ ہندوستان سے باہر سات روپیہ

فہرست مضامین جون ۱۹۲۷ء

بسم اللہ

نگار

ایڈیٹر نیاز فتحپوری

جلد ۱۱	جون ۱۹۲۷ء	شمارہ ۶

ملاحظات

گزشتہ ماہ کے رسالہ میں، جناب آرگس کے مضمون نے، جس میں ابن یمین اور حافظ شیرازی کی شاعری کے متعلق گفتگو کی گئی ہے، بعض حلقوں میں برہمی پیدا کر دی ہے۔ ایسا اختلاف جس کی بنیاد صرف تحقیق حق پر ہو یقیناً نہایت مفید چیز ہے، لیکن کم ہیں جن کا اختلاف، تنقید صحیح ہوتا ہے اور زیادہ ہیں وہ جو صرف اپنے معتقدات کے نقطۂ نظر سے ہر چیز کو دیکھنا پسند کرتے ہیں، چنانچہ اس مسئلہ میں بھی اکثر حضرات کی "چین پیشانی" کا باعث محض وہ جذبۂ صنم پرستی ہے جو حافظ نہیں، بلکہ حافظ کے "بت" سے قایم ہے ــــ اور "بت" بھی کونسا؟ دنیائے تصوف کا، عالم "ہمہ اوست" کا اور اس کارگاہِ ظن و تاویل کا، جہاں "مے و بادہ" کے معنے آبِ کوثر و سلسبیل، اور "ساقی" کے معنی مرشد کامل کے لیے جاتے ہیں۔ حالانکہ غریب بے خبر ہیں اس حقیقت سے کہ اگر حافظ کی رندانہ زبان، بادہ پرستارانہ غزلخوانی، اس کی رامشگرانہ شاعری اور مذہب سے یکسر بے نیاز ذوقِ سخن کو اس کے حقیقی اور صحیح رنگ میں دیکھا جائے تو وہ "بت" سے زیادہ ایک غیر فانی "خدا" ہے عالم کیف و سرور اور دنیائے نغمہ و رباب کا ــــ کہ بت کو تو ادنی سی ضرب تیشہ کی توڑ سکتی ہے لیکن خدا کی خدائی چھیننے کا خیال بھی کسی کے دل میں پیدا نہیں ہو سکتا۔

میں خود آرگس کے دلایل کو اُن کے دعوے کے ثبوت کے لئے ناکافی سمجھتا ہوں، جیسا کہ میں نے اس مہینے کے باب استفسارات میں

ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ظاہر کیا ہے، لیکن اس کے یہ معنے تو نہیں ہو سکتے کہ کوئی صرف فلسفۂ دشنام کو پیش نظر رکھ کر جواب دینے کی کوشش کرے دران حالیکہ اس تلخی کے ساتھ "لعل شکرخا" کا ادنیٰ سا تصور بھی شامل نہ کرسکوں!

اس وقت تک صرف ایک مضمون جناب میر ولی اللہ صاحب بی اے وکیل ایبٹ آباد کا ایسا موصول ہوا ہے جسمیں متانت سنجیدگی سے کام لیا گیا ہے اور جو آئندہ مہینے کے نگار میں شائع ہوگا۔

اس مہینے میں ایک مضمون "پردہ اور صحت و تعلیم" کے موضوع پر ریاست چرکھاری کی ایک خاتون (ف - ن بیگم) کا لکھا ہوا ہے۔ یہ مضمون اپنے انداز بیان یا ندرت موضوع کے لحاظ سے کوئی ایسی خصوصیت اپنے اندر نہیں رکھتا کہ اسے نگار میں جگہ دیجاتی۔ لیکن چونکہ مجھے معلوم ہے کہ یہ مقالہ حقیقتاً ایک خاتون ہی کے دماغ کا نتیجہ ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی جانتا ہوں کہ جو کچھ لکھا ہے حد درجہ خلوص کے ساتھ لکھا ہے، اس لئے اُسے بغیر کسی حذف و اضافہ یا ترمیم و اصلاح کے درج کرتا ہوں تاکہ ملک سوچے کہ ہندوستان کے تاریک ترین گوشوں میں بھی عورت کے جذبات اس باب میں کس حد تک وسیع ہوگئے ہیں اور کیا اب مرد کے لئے کوئی اور چارۂ کار سوائے اس کے رہگیا ہے کہ وہ عزت و آبرو کے ساتھ سپر ڈالدے؟

ایک اور خاتون نے جب اس مضمون کا مسودہ دیکھا تو انھوں نے بھی ایک کافی طویل تقریر صرف فرمائی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اس مضمون کے دلائل کا پہلو صرف مدافعانہ ہے، حالانکہ ضرورت جارحانہ دلیل کی بھی تھی:۔ انتقام ایک فطری حق ہے جسمیں مرد و عورت برابر کے شریک ہیں پھر اگر مرد اپنی آزادی کی وجہ سے عورت کو تکلیف پہونچا سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس سے انتقام لینے کے لئے وہی حربہ نہ اختیار کیا جائے جسے وہ استعمال کرتا ہے۔ اس کے بعد گو وہ خاموش ہوگئیں لیکن چونکہ ان کا یہ سکوت خدا جانے کتنے؟؟؟ کس قدر!!! اور کتنے فا فہم اور رفتار سے معمور تھا، اس لئے میں بھی ایک کتاب لیکر خاموشی سے اس کے مطالعہ میں مصروف ہوگیا، کہ گھر کی زندگی کے اکثر خطرے میں اسی طرح ٹالنے کا عادی ہوں

میرے ایک عزیز دوست سید حامد حسین رضوی (علیگ) نے جو اس وقت بہ سلسلۂ ملازمت یوت محل میں مقیم ہیں، ایک اسلامی لغت طیار کیا ہے جسمیں تمام ان الفاظ کو اصطلاحات کی محققانہ تشریح ہے جو اسلامی لٹریچر میں علمی، تاریخی، فقہی، جغرافی، مذہبی، تصوفی حیثیت سے مستعمل ہوتے ہیں۔ یہ لغت نگار مشین پریس میں چھپ رہا ہے اور کئی جلدوں میں ختم ہوگا۔ سید صاحب موصوف نے اپنی سعی سے ایک ایسی مفید و کارآمد کتاب کا اضافہ اردو لٹریچر میں کیا ہے کہ میرے نزدیک اس کی قدر کرنا فریضۂ شرعی کے حد تک پہونچ جاتا ہے۔ میں اکاڈیمی کے آئندہ اجلاس میں بھی اسے پیش کرونگا تاکہ حکومت مؤلف موصوف کی ہمت افزائی کرے

جناب مجنوں گورکھپوری نے اپنا افسانہ "گوہر محبت" دسمبر ۱۹۲۶ء میں رسالۂ زمانہ کو شائع کرنے کے لئے دیا تھا، لیکن جب وسط مئی تک وہاں شایع نہ ہوا تو نگار کو دیدیا۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ جب جون کے نگار میں اس کی کتابت ہوگئی تو اپریل کا زمانہ (مئی کے اخیر میں) اس افسانہ کو لئے ہوئے شایع ہوا۔

یہ افسانہ چونکہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت بلند اور اچھوتا ہے اس لئے ہم اسے منقول حیثیت سے لینے کے لئے طیار ہوجاتے، چہ جائکہ خود مصنف ایک جگہ کی زحمتِ انتظار سے گھبراکر خود ہمیں اپنے ہات سے مسودہ سپرد کرے۔

غالب کے ذوقِ فارسی پر مولوی غلام ربانی صاحب عزیز کا جو مضمون شایع ہورہا ہے وہ جاری رہیگا یہانتک کہ غالب کے تمام اصنافِ سخن پر تبصرہ نہ ہوجائے۔ جناب عزیز کی یہ سعی قابلِ ستایش و مبارکباد ہے۔

وین میچی کا مضمون اس مہینے میں ختم ہوا ہے میں نے غلطی سے پچھلے مہینے کے رسالہ میں اس کے اختتام کا ذکر کردیا تھا، اسی طرح کی ایک اور غلطی اس نظم کے متعلق ہوگئی ہے جو "ملے کاش" کے عنوان سے مئی کے رسالہ میں شایع ہوئی ہے۔ یہ نظم جناب روشِ صدیقی (جوالاپوری) کی ہے، میں نہیں کہہ سکتا کہ مخمور کا نام کس ترنگ میں درج ہوگیا۔

حسبِ وعدہ "طنزیات" کا سلسلہ اس مہینے سے شروع ہوگیا ہے، امید ہے کہ لوگ دلچسپی سے پڑھیں گے۔ پھبتی کے عنوان سے ایک صاحب اور بھی (جو لکھنؤ کے قدیم رازداران معاشرت و معیشت میں سے ہیں) مضمون لکھ رہے ہیں جو نگار میں شایع ہوگا۔

اس مہینے میں علاوہ اور دلچسپ ادبی مضامین کے چار افسانے ہیں جن میں سے گوہر محبت کا ذکر پہلے کرچکا ہے، رادھا ہندوؤں کی معاشرت سے متعلق ہے، شکست کی آواز میں شخصیت نگاری کے ساتھ ساتھ ہلکی ہلکی تنقید بہت پُرلطف بات ہے۔ اکبر کے متعلق آئین اکبری کی امداد سے جو معلومات ہم پہونچائی ہیں وہ نہایت دلچسپ اور کارآمد چیز ہے۔

ارادہ ہے کہ آئندہ مہینے سے علاوہ نگار کے ایک اور رسالہ شایع کیا جائے جس کا نام "فسانہ" تجویز کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ فی الحال ۳ جزو کا ہوگا اور اس میں سوائے افسانوں اور ڈراموں کے اور کوئی مضمون نہ ہوگا، اگر اسمیں کامیابی ہوگئی تو خیر ورنہ یہ تو یقینی ہے کہ آئندہ سے نگار میں کم از کم ڈھائی تین جزو صرف فسانوں کے لئے وقف ہوں گے۔

نیاز

غالب کا ذوق فارسی

(بسلسلۂ ماسبق)

مرزا نے مثنوی چراغِ دیر میں اپنی سیاحت بنارس کا تذکرہ کیا ہے۔ مثنوی سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کس تقریب پر وہاں تشریف لے گئے۔ غالباً ان کی سیاحت کے لئے بھی وہی امر داعی ہوگا جو سیاحتِ کلکتہ کے لئے تھا اور ممکن ہے وہ تلاشِ معاش میں کشاں کشاں یہاں لائے گئے ہوں۔ اور اسی کو اس سیہ نصیبی کا باعث قرار دیا ہو کہ وہ اپنے عزیز وطن سے یوں علٰحدہ کر دئے گئے لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ بنارس اسوقت نہ حیدرآباد تھا نہ لکھنؤ۔ پھر مرزا کا بنارس میں اس غرض سے آنا ایک معما ہے اور پھر مرزا ایسے خوددار انسان کا روزگار کی تلاش میں یوں سرگرداں رہنا اور زیادہ عجیب ہے۔ جو فارسی پروفیسری کے منصب سے اس لئے دست بردار ہو جاتا ہے کہ پرنسپل کیوں اس کے استقبال کے لئے نہیں آیا اس غرض کے لئے بنارس آنا بہت ہی مستبعد معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال جہان آباد سے نکل کر وہ اپنی سیہ بختی خیال کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں۔

> "آج میرے منھ سے صور کی آواز نکل رہی ہے۔ اور میری خموشی محشر زار ہو رہی ہے
> میں پتھر ہوں جس سے آگ کے شرارے نکل رہے ہیں۔ مجھے اپنے احباب سے چونکہ بہت سی
> شکایتیں ہیں، اس لئے آج میرے حبابِ دل سے لاکھوں طوفاں کے شور
> پیدا ہو رہے ہیں۔"

مرزا کی شاعرانہ تخیل کسی تعارف کا محتاج نہیں جن لوگوں نے ان کا اردو کلام پڑھا ہے وہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ شہنشاہ اقلیم سخن کس طرح اپنے تخیل کے زور پر نازاں ہے جدت اور ابداع مرزا کی عین فطرت ہیں جس مضمون پر انھوں نے قلم اٹھایا ہے وہاں جدت نگارش کی گلکاریوں سے ایک ایسی دلفریب فضا پیدا کر دی ہے جسمیں وہ خود واحد حکمراں ہیں اختراع اور ابداع وہ خصوصیات ہیں جو انسے کسی حالت میں بھی علٰحدہ نہیں ہو سکیں انکے مرغِ تخیل کی پرواز صرف یہیں تک محدود نہیں ہے۔ کہ وہ نئے نئے مضامین اختراع کر سکتے ہیں۔ بلکہ نئے الفاظ، نئی تراکیب اور نئی بندشیں وہ خصوصیاتِ نگارش ہیں، جو مرزا کو اپنے تمام معاصرین سے ممتاز کرتی ہیں۔ صنائع لفظی و معنوی کا التزام مرزا کے ہاں بہت زیادہ ہے اور اسی کو وہ روحِ شاعری قرار دیتے ہیں، استعارے اور تشبیہیں اسی نسبت سے ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ وہ نہایت نادر تشبیہیں اور انوکھے استعارے استعمال کرتے ہیں اور پھر اپنے زورِ بیان اور طرزِ ادا سے اس میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔ ان کی تشبیہیں اکثر نیچرل اور فطری ہوتی ہیں وہ اپنے اسلوب بیان سے واقعات کی روشنی میں کام نہیں لیتے

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کا عطر خاص مشہور ہے

اور نہ اصل واقعہ کو وہ شاعری کا کوئی ضروری جزو خیال کرتے ہیں۔ بلکہ واقعات کو اس طریقہ پر ڈھالتے ہیں جس طرح ان کا اسلوبِ بیان اجازت دیتا ہے بلکہ بہت سے مختلف واقعات اسلوبِ بیاں کی خاطر گڑھ کر اس میں ملا لیتے ہیں۔ وہ اکثر اشیاء کے روشن پہلو پر بحث کرتے ہیں۔ اور اپنے زورِ تخیل سے اسمیں خوب چاشنی ملا دیتے ہیں۔

نفس باصور دمساز است امروز — خموشی محشرِ راز است امروز
رگِ سنگم شرارے مے نویسم — کفِ خاکم غبارے مے نویسم
دل از شورِ شکایتہا بجوش است — حبابِ بے نوا طوفاں خروش است

محشرِ راز، طوفان خروش اور حبابِ بے نوا کی تراکیب کتنی چست اور دلآویز ہیں۔ اور پھر نفس وصور، خموشی و محشر، راز، رگِ سنگ۔ شرار، کفِ خاک وغبار، اور حباب وطوفان کی لفظی مناسبتیں کتنی دلفریب ہیں۔

نفس ابریشم ساز فغان است — بسان نے تہم در استخوان است
محیط افگندہ بیروں گوہرم را — چو گرد افشاندہ آہن جوہرم را

دہلی کو محیط اور آہن قرار دے کر خود کو موتی اور جوہر کہنا مرزا سے ہی بن آسکتا تھا۔

جہان آباد سے انھیں نکلنے کا اتنا رنج نہیں جتنا انھیں اس کا رنج ہے کہ ان کے احباب ان کو بھول گئے کیونکہ جب تک عالم آباد ہے لاکھوں گھر اور آشیانے بنائے جا سکتے ہیں اور وطن کو بھلایا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد وہ بنارس کی تعریف وہ ح کی طرف گریز کرتے ہیں جو قابلِ ستائش ہے مجھے دہلی کیوں یاد آئے جب بنارس جیسا خطۂ زمین جو جنت نگاہ اور فردوس گوش ہے۔ سیرت سامنے ہے علاوہ اس کے اسکے قدرتی مناظر دلفریب اور دلکش واقع ہوئے ہیں اور یہاں کی ہر پری صورت باقی شہروں کے پری صورتوں اور گل رنگوں سے بہتر واقع ہوئے ہیں۔ یہ شہر روحانیت کا سرچشمہ اور ہندوستان کا کعبہ بھی ہے۔

جہان آباد گر نبود الم نیست — جہان آباد باد اجائے کم نیست
بنا شد قحط بہر آشیانے — سرِ شاخِ گلے در گلستانے
نفس در لالہ زارے جاے تواں کرد — وطن را داغِ استغنا تواں کرد
بخاطر دارم اینک گل زمینے — بہار آئین سواد دلنشینے
نگہ را دعوے گلشن ادائی — ازاں خرم بہار آشنائی
سخن را نازش مینو قماشی — ز گلبانگ ستائشہاے کاشی

یہ قاعدہ ہے کہ جب انسان کسی اچھی چیز سے محروم کر دیا جائے تو جو چیز اسے سردست میسر آسکے وہ اسی میں اپنی دلچسپیاں اور

دلفریبیاں تلاش کرکے اپنے دل بہلانے کا سامان بہم پہنچا لیتا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ جہان آباد اور بنارس میں بظاہر کوئی نسبت نہیں۔ مرزا کا طرز بیان کتنا نیچرل اور بے ساختہ ہے۔ اور خصوصیت سے دوسرا شعر کتنا کیف بار ہے۔

تناسخ مشرباں چوں لب کشائید بکیش خویش کاشی راستائید
کہ ہر کس کاندراں گلشن بمیرد دگر پیوند جسمانی نگیرد
چمن سرمایۂ امید گردد بمردن زندۂ جاوید گردد

ہندوؤں کے اس عقیدہ سے مرزا کو گفتگو کرنے کی اسی لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ بنارس کے لئے ایک اور وجہ فضیلت بیان کر سکیں جہاں وہ طوعاً کرھاً اقامت پذیر ہیں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ مرزا بحیثیت مسلمان ہونے کے اس عقیدہ کو کوئی وقعت نہیں دے سکتے۔ انسان کی فطرت حسن پرست واقع ہوئی ہے۔ وہ ہر حسین چیز سے متاثر ہوتا ہے۔ خواہ وہ شجر ہو یا حجر۔ انسان ہو یا حیوان لیکن جب اس حسن کا مظہر انسانی ہیکل ہو۔ تو اسوقت تو کوئی بدبخت ہی ہوگا جو ایسے منظر سے متاثر نہ ہو۔ گو جب مرزا بنارس میں تھے انکے باغ جوانی میں خزاں آچکی تھی اور ان کے سیاہ بالوں پر بڑھاپے کی برف برس چکی تھی اور مزید براں مرزا اخلاقاً نہایت متین اور سنجیدہ واقع ہوئے تھے لیکن جب پریرویوں کے جھرمٹ انھوں نے گنگا پر اشنان کرنے جاتے دیکھے۔ تو اس منظر سے بہت ہی متاثر ہوئے ان کے جذبات بھڑک اُٹھے۔ ان کے دماغ میں خیالات کا ایک طوفان امنڈ آیا اور وہ صفحہ کاغذ پر یوں برس پڑے

آؤ! ذرا تم یہاں کے پری زادوں کو تو دیکھو۔ میرا تو خیال ہے۔ یہ جسم روح ہیں۔ ورنہ آب و گل میں یہ دلآویزیاں کہاں سے آئیں۔ ان کے جسم اسقدر ہلکے پھلکے اور معطر ہیں کہ بوئے گل کو رشک آئے یہاں خس و خاشاک میں وہ دلکشی ہے کہ باغوں اور لالہ زاروں میں نہیں پائی جاتی۔ موسم بہار اسکی دلفریبیوں پر فریفتہ ہو کر موجِ گل سے زنار بدوش ہے۔ اور آسمان اسکی بارگاہ رفیع میں رنگینی شفق سے قشقہ بجبیں اس زمین کے چپے چپے پر مندر آباد ہیں۔ اور اس کا ذرہ ذرہ لالہ زار ہے۔ یہاں بت پرستوں کا پایۂ تخت اور مذہبی دیوانوں کا کعبہ اور زیارت گاہ ہے۔ یہاں کے گل اندام بے انتہا دلفریب اور دلربا ہیں شعلہ طور اُن کے جلوۂ رخ کے سامنے تبسم شرار سے زیادہ بے حقیقت ہے ان کی ایک ایک ادا صد ہزار گلستاں بار اور ان کا خرام ناز لاکھوں فتنہ ہائے قیامت آستین میں لئے ہوئے ہے وہ گوہر سے زیادہ لطیف اور خون عاشق سے زیادہ تیز اور چست ہیں۔ اور ان کے خوبصورت رنگین رخسار غارت گر ہوش ہیں غرض وہ سراپا نزاکت اور ہمہ تن دلربائی ہیں"

بیا اے غافل از کیفیتِ ناز نگاہے بر پری زاداں فرانداز

همه جانهاے بے تن کن تماشا | ندارد آب و گل ایں جلوه حاشا
نهادِ شاں چو بوے گل گراں نیست | همه جان اند جسمے درمیاں نیست
دریں دیرینه دیرستانِ نیرنگ | بهارش ایمن ہست از گردشِ رنگ
به تسلیمِ ہواے آں چمن زار | ز موجِ گل بہاراں بستہ زنار
فلک را قشقه اش گر بر جبیں نیست | پس ایں رنگینیِ موجِ شفق چیست
کفِ ہر خاکش از مستی کنشتے | سرِ ہر خارش از سبزی بہشتے
سوادش پاے تختِ بت پرستاں | سراپایش زیارتگاهِ مستاں
بتانش را ہیولے شعلهٔ طور | سراپا نورِ ایزد چشمِ بد دور
تبسم بسکه در لبها طبیعی ست | دہنہا رشکِ گلہاے ربیعی ست
اداے یک گلستاں جلوه سرشار | خرامے صد قیامت فتنه دربار
به لطف از موجِ گوہر نرم رو تر | بناز از خونِ عاشق گرم رو تر
ز انگیزِ قد انداز خرامے | بپاے گلبنے گسترده دامے
ز رنگیں جلوه ہا غارتگرِ ہوش | بہار بسترِ نوروز آغوش
قیامت قامتاں مژگاں درازاں | ز مژگاں بر صفِ دل نیزه بازاں
مگر گوئی بنارس شاہدے ہست | ز گنگش صبح و شام آئینه در دست
بیابان در بیاباں لاله زارش | گلستاں در گلستاں نو بہارش

فصلِ بہار کو موجِ گل سے زنار بدوش اور خنگیرِ فلک کو رنگینیِ شفق سے قشقه بر جبیں کہنا کتنی پیاری اور نیچرل تشبیہ ہے مہ رویان، بنارس کو شعلۂ طور سے تشبیہ دینا ایک بالکل اچھوتی تشبیہ ہے چونکہ شعلۂ طور نورِ ایزدی بنا۔ اس لئے جب مہ رویان بنارس کی تخلیق اسی شعلہ سے ہوئی۔ تو وہ بھی نورِ ایزد سبحانہ ہی ہونگے، اور پھر اس مجسم حسن کا حلیہ بیاں کرنے کے بعد چشمِ بد دور کہنا کتنا نیچرل طرزِ بیان ہے اور ضرور ہے کہ ایسے مواقع پر یہ کلمہ انسان کی زبان سے نکلے متبسم ہونٹوں کو گلِ ربیعی سے تشبیہ دینا بہت بڑا شاعرانہ کمال ہے۔

جلوۂ محبوب کو گلستاں ریز اور خرام یار کو فتنۂ قیامت سے تشبیہ دینا بہت دلکش بیان ہے۔ خرام یار کو فتنۂ قیامت تو بہتوں نے لکھا ہے مگر جلوۂ یار کو گلستان تماشا لکھنا مرزا ہی کا حصہ ہے۔

محبوب کے سہی قد اور اس کے طرزِ خرام کو یوں بیان کرنا کہ گویا وہ سراپا گلبن ہے اور اس کی کبک خرامی ایک پھندا ہے۔ جو اس گلبن ناز کے پاؤں میں ڈال دیا گیا ہے۔ ایسی تشبیہ ہے کہ قابلِ صد ہزار تحسین و آفریں ہے۔

محبوب کے جلوہ کو غارتگرِ ہوش کہنا ایک عام اندازِ بیان ہے۔ لیکن اسے بہار بستر اور نوروز آغوش کہنا کتنی اچھوتی ترکیب اور دلفریب اسلوب بیان ہے۔

بنارس کو شاہد کہہ کر اس کے آئینہ بینی کے شوق کو پورا کرنے کے لئے اسے گنگا کا آئینہ دنیا کیسی سادہ اور نیچرل تشبیہ ہے کسی چیز کی کثرت کو بیاباں در بیاباں اور گلستاں در گلستاں کہنا بہت دلآویز طرز ادا ہے۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مرزا کوشش کرتے ہیں کہ واقعات کو اپنے طرزِ بیاں کے ماتحت رکھ کر ان سے اپنے مفید مطلب نتائج استنباط کریں۔ بنارس گنگا کے کنارے واقع ہے اور شاعر کو حق حاصل ہے کہ وہ بنارس کو معشوق سے تشبیہ دیکر گنگا کو اس کا آئینۂ حسن نما قرار دے۔ لیکن جہان آباد بھی تو جمنا کے کنارے واقع ہے، اس لئے چونکہ حالات برابر ہیں۔ یہ تشبیہ وہاں بھی استعمال کی جاسکتی ہے مگر شاعر نے واقعات کو اپنے مفید مطلب بنانے کی کوشش کرتے ہوئے اس منظر کو یوں بیان کیا ہے۔

"وہ شاید جہان آباد نے بنارس کو کہیں خواب میں دیکھ پایا ہے جس سے اسے بنارس سے رشک ہوگیا ہے۔ اور اس کے منھ میں پانی بھر آیا ہے کہ کاش وہ بھی انھیں خوبیوں اور قدرتی مناظر سے متصف ہوتا۔ تو گویا دلی کے پاس سے جو جمنا بہ رہی ہے یہ درحقیقت وہ پانی ہے جو بنارس کو دیکھ کر اس کے منھ میں پانی بھر آیا ہے۔"

بنارس را مگر دیدست در خواب　　کہ مے گردد ز نہرش در دہن آب
حسودش گفتن آئینِ ادب نیست　　ولیکن غبطہ گر باشد عجب نیست

بنارس کی فضیلیت ثابت کرنے کے لئے وہ کتنے بے تاب نظر آتے ہیں اپنے ترکش کا آخری تیر یوں استعمال کرتے ہیں۔

عبادت خانۂ ناقوسیانست　　ہمانا کعبۂ ہندوستاں است

ناظرین یہ نہ خیال فرمائیں کہ واقعی بنارس کو دلی پر فضیلیت حاصل ہے اور واقعی مرزا اپنے اثنائے قیام میں اس قدر دلدادہ ہو گئے تھے کہ وہ دلی کو بالکل بھول گئے تھے۔ اور بنارس کی صحبت ان کے رگ و پے میں ساری ہو گئی تھی۔ یقیناً ایسا نہیں تھا۔ وہ گو دلی کی گلیاں چھوڑ چکے تھے۔ مگر ان کا دل ابھی تک جہان آباد کے گلی کوچوں میں ہی کہیں اٹکا پڑا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جس کے آب و گل میں دلی کی محبت داخل ہو چکی ہو وہ بنارس میں جاکر دلی کو یوں بھول جائے۔ یہ صرف شاعرانہ تخئیل ہے جسمیں ذرہ بھر بھی حقیقت نہیں جسے کعبہ جانے کو کہا جائے اور حیلہ تراشیوں پر اتر آئے۔ وہ بھلا بنارس میں جاکر دلی کو بھول سکتا ہے، ہاں اسی پر بس نہیں بلکہ وہ فرماتے ہیں:-

میں نے ایک ہیئت داں سے پوچھا۔ کہ جب دنیا سے اس کی رخصت ہو چکی ہے اور دغا دھرا اور محبت و الفت کا صرف نام

ہی نام رہ گیا ہے۔ عبادت گزاری اور خدا پرستی شکم پری کے مرادف ہے۔ باپ بیٹا، بھائی، بہن میں کوئی محبت باقی نہیں رہی اور آشتی و صلح دنیا سے اٹھ چکی ہیں۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ قیامت کے آنے میں ابھی دیر ہے کیا ان سے بھی بدتر حالات کا انتظار کیا جاسکتا ہے مہندس نے یہ سنکر جواب دیا۔ کہ گو نبی نوع انسان کے اعمال بد اور کردار ناہنجار کا تقاضا تو یہی ہے کہ قیامت جلد سے جلد آجائے، لیکن قدرت یہ نہیں چاہتی کہ کاشی کی یہ عظیم الشان در فیع الشوکت عمارت فتنۂ قیامت کے ہاتھوں تباہ ہوجائے۔"

شبے پرسیدم از روشن بیانے	زگردشہائے گردوں راز دانے
کہ بینی نیکو یہا از میاں رفت	وفا و مہر آزرم از جہاں رفت
زایمانہا بجز نامے نماندہ	بغیر از دانہ و دامے نماندہ
پدرہا تشنۂ خونِ پسر ہا	پسرہا دشمنِ جان پدر ہا
برادر با برادر در ستیز است	وفاق از شش جہت رود گریز است
بدیں بے پردگیہائے علامت	چرا پیدا نمی گردد قیامت
بنفخ صور تعویق از پے چیست	قیامت را عناں گیرِ جنوں کیست
سوے کاشی بانداز اشارت	تبسم کرد و گفتا ایں عمارت
کہ حقا نیست صانع را گوارا	کہ از ہم ریزد این رنگیں بنارا
بلند افتادہ تمکینِ بنارس	بود براوج او اندیشہ نارس

وفاق از شش جہت رود گریز ست، اور قیامت را عناں گیرِ جنوں کیست، کیسے چست اور اعلیٰ پایہ کے مصرعے ہیں۔ رود گریز، اور عناں گیرِ جنوں، ہر دو نہایت برجستہ تراکیب ہیں۔

مرزا قادر الکلام شاعر ہونے کے لحاظ سے بعض اوقات بڑے متصوف معلوم ہوتے ہیں صوفیانہ شاعری کے سردفتر مولانا روم کے ایک شعر پر مرزا نے بھی ایک مختصر سی مثنوی لکھی ہے مرزا اور مولانائے روم میں عملی اور شرعی پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مولانا اگر بہت بڑے متدین، صالح۔ خدا رسیدہ اور شریعت نواز تھے تو مرزا بلا کے رند، غضب کے بادہ نوش اور ہمہ تن تحقیر دین متین ہیں۔ لیکن مرزا کی صوفیانہ شاعری مولانا کی شاعری کے دوش بدوش ہے۔ وہ اسی طرح ہمہ اوست کے عقیدہ کے قائل ہیں۔ اور اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام تصوف پر حاوی ہیں۔ بلکہ یہاں تک کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ اگر مرزا کی اس مختصر سی مثنوی کو مولانا کے کلام میں مزج کر دیا جائے۔ تو بہت ہی مشکل ہے کہ کوئی تمیز کر سکے۔ وہی برجستگی ہے وہی اسلوب

بیان ہے وہی مضمون کی آمد ہے - وہی دلآویز تراکیب اور دلکش بندش ہے، وہی تصوف اور حقیقت میں ڈوبا ہوا کلام ہے - فرق صرف اتنا ہے کہ وہ مثنوی معنوی میں ہے اور یہ کلیاتِ غالب میں، چنانچہ وہ فرماتے ہیں -

جو کچھ میں کہ رہا ہوں وہ اپنی طرف سے نہیں کہ رہا بلکہ ایک ایسے آدمی کی باتیں نقل کر رہا ہوں جو حق آشنا ہے اور نے (بانسری) بھی جو کچھ تم کو سنا رہی ہے - یہ اپنے پاس سے نہیں، بلکہ ایک حقیقت آشنا دل کی کہانیاں ہیں جو تم کو سنائی جا رہی ہیں - اگر تم بھی چاہتے ہو کہ راز آشنا ہو - تو اس دربار میں راز خود تہی ہو کر آؤ تاکہ نور معرفت سے تم بہرہ یاب ہو سکو - اگر تم شاہد حقیقی کے زخم خوردہ نہیں ہو تو اس شراب کے قریب بھی مت پھٹکنا - کیونکہ شراب معرفت ایسی تند اور پر جوش واقع ہوئی ہے کہ مجھے خطرہ ہے تمھارا سینہ پھٹ نہ جائے اور تم اسکو ہضم نہ کر سکو اس لئے شرط اول یہ ہے کہ تم راہ شناس بنو - اور کسی راہ شناس سے اکتساب فیض کرو - لیکن دیکھنا کہیں دھوکا نہ کھا جانا - مرد راہ شناس کی پہچان بھی بڑی مشکل اور دشوار ہے - یوں تو خدا کی مخلوق کی کوئی گنتی اور شمار نہیں - لیکن تم جانتے ہو کہ اتنی بڑی انتہا خلقت میں بادشاہ ہونے کا فخر صرف ایک کو ہی حاصل ہوتا ہے"

من نیم کز خود حکایت مے کنم	از دمِ مردے روایت مے کنم
از دمِ فیضے کز استاد آورم	خامہ را چوں نے بفریاد آورم
نالۂ نے از دمِ مرد رہ است	کان ہم از سازِ ہم از راز آگہ ست
بر نوائے رازِ حق گر دل نہی	بایدت چوں نے زخود بودن تہی
گر نہ دل ریش از مستی غلاف	کیں مے از تندی بود پہلو شگاف
اے کہ از رازِ نہاں آگہ نۂ	دم مزن از راہ کہ مردِ رہ نۂ
دست در دامانِ مردِ راہ زن	لیک رہبر را شناس از راہ زن
در ہزاراں مرد مردِ رہ یکے ست	آدمی بسیار اما شہ یکیست
مردِ رہ باید کہ باشد مردِ عشق	لب ترنم خیز و در دل دردِ عشق

معرفت اور خدا شناسی کا طریقہ صوفیائے کرام کے ہاں سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ کامل پیر و مرشد کی رہنمائی سے انسان منزل معرفت پر پہونچ جائے یہ ان کے یہاں نہایت ضروری ہے اور بغیر اس کے کنہ حقیقت امر محال ہے - مرزا نے بھی یہی بات بیان کی ہے لیکن اگر کسی کو معلوم نہ ہو کہ کہنے والا کون ہے تو اشعار اور بھی وقیع معلوم ہوں گے - خصوصیت سے پانچواں اور آخری شعر کس طرح درد اور تاثیر میں ڈوبے ہوئے ہیں - اور پھر کتنے برمحل ہیں - شاعرانہ شوخیوں کے لحاظ سے بھی ہر دو شعر بہت بلند پایہ ہیں

اور نفس مضمون کے لحاظ سے بھی بہت ٹھوس ہیں اور پھر ایسے شخص کو جو عشق حقیقی کا زخم خوردہ ہے دل ریش، شراب عشق کی تندی کو پہلو شگاف، اور لب ہائے گویا کو لب ترنم خیز کہنا کتنا قابل قدر شاعرانہ کارنامہ ہے۔ وصل شاہد حقیقی سلوک کا انتہائی مقام ہے اور یہی مقام سالکان راہ کا مطمح نظر رہا ہے۔ اسی مقام کے حصول کی خاطر وہ ہر قسم کی تکالیف سہتے ہیں اور قربانیاں کرتے ہیں مرزا ایسے سالک کے لئے جو اس مقامِ قرب کا متلاشی ہو۔ چند ہدایات ارشاد فرماتے ہیں۔

اگر کوئی شخص طالب دیدار یار ہو اور وہ چاہتا ہو کہ اپنے یار کی تجلی سے اپنے کاشانۂ غم کو مشرق زار بنا دے تو اسے چاہئے کہ اپنی جھو نپڑی کو صاف کرے۔ اور نا محرم اور اجنبیوں کو اندر نہ آنے دے یار کی راہ میں خالص کستوری کا پا انداز بچھائے راستے میں پانی چھڑک دے تاکہ ہوا کے چلنے سے غبار نہ اٹھے۔ پھر راستے میں پھول بکھیر دے تاکہ اس کے محبوب کا قدم مٹی پر نہ پڑے اپنا میلا کچیلا لباس اتار دے اور صاف لباس زیب بدن کرے جب محبوب اندر قدم رکھے مدہوش ہو جائے اور اپنے آپ کو اس کے قدموں پر گرا دے۔ اب وہاں سوائے محبوب کے اور کوئی نہ ہوگا جیسے سورج کے نکلنے سے سایہ غایب ہو جاتا ہے۔ اور ہر جگہ مہر انور کا ہی پرتو نظر آتا ہے۔ یہاں بھی سوائے محبوب کی تجلی کے اور کچھ باقی نہ رہیگا نہ وصل و فراق کے قصے ہوں گے نہ ہجر و حرماں کی شکایتیں ہونگی۔ صرف محبوب ہوگا اور اس کا نور ہوگا۔ تو اپنی شبنم کو خورشید کے نور میں فنا کر دے اور اپنے جسم کو اس عید کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دے تو اپنے جسم کی سیاہی اور تاریکی کو الگ پھینک دے۔ اگر تو روشنی اور درخشندگی کا خواہاں ہے تو اپنی بے مائگی کو چھوڑ دے اگر تو عماں بننے کا شائق ہے ۔"

گفت اندر معرضِ اسرار دوست	ہر کہ باشد طالبِ دیدار دوست
خواہد از نور جمال یار خویش	روکشِ مشرق در و دیوار خویش
بایدش کاشانہ نیکو ساختن ہو	حجرہ از نامحرماں پردا ختن ہو
خار و خس از خانہ بیروں ریختن	مشکِ تر باخاکِ رہ آمیختن
آورد آب وزندگی در رہگزار	تا ہوا از رہ نینگیزد غبار
برگ گل در راہ فشاند مشت مشت	تا نباید خاک زیر پا درشت
رختِ گرد آلودہ از تن بر کشد	جامۂ پاکیزہ اندر بر کشد
چون در آید آں نگار از خود رود	خوشش باستقبالِ یار از خود رود
عاشق از خود رفت دلبر ماند و بس	سایہ گم شد مہر انور ماند و بس
جملہ جاناں ماند و جسم و جاں نماند	حسرتِ وصل و غمِ ہجراں نماند

شبنمی را طعمۂ خورشید کن خویش را قربانیِ ایں عید کن
تیرگی بزدائی تا رخشاں شوی قطرگی بگزار تا عماں شوی

کیا ایک عاشق کی اپنے محبوب کی آمد کی تقریب پر جو تیاریاں ہوئی ہیں یعنہ یہی نہیں ہوتیں اور محبوب کی آمد پر عاشق کا بیہوش و از خود رفتہ ہوجانا کتنا قرین قیاس اور پر لطف ہے ۔

محبوب کی تجلی سے عاشق کی جھونپڑی کا جگمگا اٹھنا کسقدر مسرت خیز اور کیف بار ہوگا اور اسے روکش مشرق شدن سے تعبیر کرنا کتنا بہترین طرز ادا ہے ۔ برگ گل در راہ فشاندن مشت مشت، میں مشت کی تکرار کتنی موزوں اور مناسب ہے اور پھر آخری دو شعر کتنے وزنی اور ٹھوس ہیں جن کی شاعرانہ صفتوں نے انہیں چار چاند لگا دیئے ہیں اور حق یہ ہے کہ ان دو اشعار کی تعریف نہیں ہوسکتی اس مقام پر ایک اعتراض وارد ہوتا ہے ۔ کہ جب عشق سے مراد عشق حقیقی اور شاہد سے مراد شاہد حقیقی ہے ۔ تو پھر شاہد حقیقی کی آمد جھونپڑی پاک وصاف کرنا ، اور عاشق کا استقبال کے لئے جانا کیا معنی رکھتا ہے ۔ کیونکہ یہ تمام امور شاہد حقیقی صفات وذات کے منافی ومتبائن ہیں ۔ سو اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

جھونپڑی کے صاف کرنے سے مراد دفع اوہام ونفی ما سوا ہے ۔ اور اس سے مراد صرف یہ ہے کہ انسان اپنے اخلاق کو درست کرے تاکہ وہ اکتساب فیض کا اہل ہوسکے اور محبوب کے آنکے یہ معنی ہیں کہ خدا کے ہاں سے انسان کے دل میں ایک خالص جذبہ پیدا ہوجائے اور استقبال سے مراد آیات ربانی میں فنا اور محو ہوجانا ہے اور یہی مقام فنا فی اللہ کہلاتا ہے

رفتنِ کاشانۂ اوصحن مرا دفعِ اوہام است ونفیِ ما سوا
بدعا تہذیب اخلاق است وبس سعی در تحصیل اشراق است وبس
وانِ خود آرا دلبرے کز در رسد جذبۂ باشد کہ از حق در رسد
رفتنِ عاشق باستقبالِ دوست مطلبِ محویت آثار اوست
سالکِ آزادہ چابک خرام چوں رسد اینجا شوش تمام
نیست کس بعد از خدا غیر از خدا این بود سر بقا بعد الفنا

غالب گو عملاً سلوک کے ان مقامات سے آشنا نہ تھے ، لیکن ان نظریوں پر ان کو پورا عبور حاصل تھا جس سے مقصد صرف یہ تھا کہ کلام میں شیرینی اور حلاوت پیدا کرسکیں ۔ باقی .... باقی

عزیز

گوہر محبت

(فسانہ)

موتی جواہرات میں ایک ممتاز مرتبہ رکھتا ہے۔ اس کی آب وتاب ضرب المثل ہوگئی ہے۔ دنیا اس کو تشبیہ واستعارہ کی صورت میں استعمال کرنے لگی ہے۔ چنانچہ آج جس زبان کے ادبیات کا مطالعہ کیجئے آپ کو "گوہر مقصود" جیسی ترکیبیں اکثر ملیں گی۔ یہی نہیں بلکہ واعظوں اور ناصحوں کی زبان پر ایسی ترکیبیں چڑھ گئی ہیں۔ اس چھوٹی سی چیز کو اس قدر اہمیت شاید اس لئے دی گئی ہے کہ: وہ ایک ذی حیات کی مشقت سے پیدا ہوتا ہے اور ایک ذی شعور کی جانفشانیوں سے دستیاب ہوتا ہے۔ وجہ جو کچھ بھی ہو مگر واقعہ یہ ہے کہ "طالع گہر" کا "اوج" ہمیشہ رشک کی نگاہوں سے دیکھا گیا اور "گوہر فروش" کا "ستارہ" ہر جگہ اور ہر زمانہ میں بلندی پر رہا میں خود اس معاملہ میں کوئی رائے نہیں رکھتا موتیوں کی دھندلی چمک میں میرے لئے کوئی دلکشی نہیں ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ معشوق کے دانتوں یا آنسو کے قطروں کو تشبیہ دینے کے لئے اس سے بہتر اور زیادہ موزوں چیزوں کو کیوں نظر انداز کر دیا گیا۔ نہ جانے کیوں موتی اسقدر ہر دلعزیز اور مقبولِ ہر خاص وعام ہوگیا۔

"گوہر محبت" فی الحقیقت ایک تمثیلی افسانہ ہے جس سے اکثر فارسی جاننے والے آشنا ہونگے۔ یہ مسئلہ مدتوں زیر بحث رہ چکا ہے کہ اسکی تفسیر کیا ہوسکتی ہے۔ آیا یہ دکھانا مقصود ہے کہ حسن وعشق غیر فانی اور سرمدی ہے یا دونوں کو سراسر بے بنیاد اور مایا جال ثابت کرنا ہے میں خود کوئی قطعی فیصلہ نہیں کرسکتا تاہم میرے خیال میں اس افسانہ کی تین طرح سے تاویلیں کی جاسکتی ہیں۔ ایک تو بہت سطحی ہے یعنی یہ کہ کوئی چیز کمال کو نہیں پہنچ سکتی اس لئے کہ کمال جیسی کوئی چیز دنیا میں ہے نہیں۔ درجۂ کمال کا مفہوم یہ ہے کہ اب آگے کوئی درجہ نہیں اور جو شے کمال حاصل کرچکی ہے وہ یا تو رک جائیگی یا پیچھے ہٹیگی۔ لیکن سکون اور حرکت معکوس دونوں اقتضائے ہستی کے خلاف ہیں۔

دوسری تاویل یہ ہے کہ زندگی میں جس چیز کے لئے ہم سب کچھ کرنا چاہتے ہیں اسی کا وجود ہمارے راستہ میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے اور ہمارے کاموں کو امیدوں اور خواہشوں کے خلاف بدنما بناتا چلا جاتا ہے۔ ہم جسکو سب سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور جسپر اپنا سارا سرمایۂ حیات نثار کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں اسی کی بہبود کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس سے دستکش ہوجائیں اور اسی میں بیشک ہماری بھی بہبود ہے۔ مہابھارت پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ سلطنت کے لئے جن لوگوں کو خون کی ندی میں نہانا پڑا انھیں لوگوں نے آخر میں اپنے فلاح کی صورت یہ دیکھی کہ تاج وتخت سے منہ موڑ کر پہاڑوں میں زندگی کے باقی ماندہ دن گزار دیں۔ رامائن کو لیجئے

جس سیتا کے لئے رام کو ایسے صعب گزار راستے طے کرنے پڑے جس نے رام کی رفاقت کے لئے بن باس لیا اُسی سیتا سے آخرکار رام کو جدا ہونا پڑا یہ کوئی رام کا ظلم نہ تھا کوئی بے اعتنائی نہ تھی کوئی بے اصولی حرکت نہ تھی جیسا کہ اکثر کا خیال ہے اور بعض نہ جاننے والے مسلمان اس غلط فہمی میں مبتلا۔ بلکہ سیتا اور رام دونوں کی اگر سچ پوچھئے تو نجات اسی میں تھی میں بحث کو زیادہ طوالت دینا نہیں چاہتا۔ اتنا کہدینا کافی ہے کہ اس افسانہ میں "تیاگ" کی حقیقت بیاں کی گئی ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ "تیاگ" کی خواہش انسان میں کیوں کر پیدا ہوتی ہے اور اس کا سنگِ بنیاد کون سا جذبہ ہوتا ہے۔

تیسری تاویل بہت مختصر اور معمولی ہے جو ہر شخص کی سمجھ میں آسانی سے آسکتی ہے۔ اس قصہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کسی چیز کی یادگار قائم کرنا نفسِ انسانی کی باطل پرستی ہے ورنہ جو بات ایک بار ہو چکی وہ بجائے خود ایک یادگار ہے صدیاں گزرتی جائینگی مگر وہ یادگار مٹ نہیں سکتی۔ انسان جھوٹی تسکین حاصل کرنے کے لئے یادگاریں قائم کرتا ہے لیکن ان سے اسکو کبھی تسکین نہیں ہو سکتی۔ غالب کا یہ مصرع بھی اپنے خاص انداز میں اسی فلسفہ کی تعلیم دیتا ہے۔

بھول جانا ہے نشانی میری —

محبوب اگر مر جائے تو جہانتک ممکن ہو اس کا نشانِ مزار بھی باقی نہ رہنے دو تاکہ اس کی یادگار میں ایک تخئیل مطلق کے سوا کچھ نہ رہے۔ مادیات کا ایک ذرہ بھی اسکو آلودہ نہ کر سکے۔ اس قسم کی یادگار کبھی فنا نہیں ہوگی اگر یہ سچ ہے کہ قادر مطلق غیر فانی ہے۔

افسانہ بہت چھوٹا ہے۔ اس کو اگر ایک تمثیل کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ لیکن اس کی تاویلیں ادبیات فارسی کا ایک خاص جزو بن چکی ہیں۔ شاعروں نے اُسپر حاشیے چڑھائے اور اس کے متعدد مطالب بیان کئے مذہبی پیشواؤں نے موقع پاکر موت وزندگی۔ حشر ونشر۔ جسم و روح کے نہ جانے کتنے مسائل حل کر ڈالے۔ ماہرین "جمالیات" نے بھی اپنا حصہ نہ چھوڑا اور افسانہ کو اپنے رنگ میں رنگ لیا اور بعض نے تو یہ کہدیا کہ یہ کوئی افسانہ نہیں ہے بلکہ تاریخی واقعہ ہے جس کی تردید نہیں کیجا سکتی۔

قصہ شمالی ہند سے متعلق ہے۔ یہ وہ خطہ ہے جو کسی زمانہ میں حسن و محبت کے لئے دنیا کا سب سے زیادہ بار آور ملک تھا اور شاید اب بھی ہے۔ اس زرخیز سرزمین پر سورج کی کرنیں ہمیشہ اپنا خزانہ نچھاور کر رہی تھیں جنگلوں اور پہاڑیوں کی دلفریب فضا فطرت کی عنایتوں کی خاص مثال تھی۔ وہ خوشگوار جھیلیں وہ شاداب وادیاں۔ وہ سرسبز میدان، وہ برف پوش چوٹیاں! ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آدم و حوا کی جنت یہی رہی ہوگی جہاں یاس و حرماں۔ بیدلی اور افسردگی جیسے الفاظ کے کوئی معنے نہ تھے ہرن اس طرح چوکڑیاں بھرتے تھے گویا درندوں کی طرف سے کوئی اندیشہ نہ تھا۔ چڑیاں اس طرح چہچہاتی تھیں جیسے شکاریوں کا کھٹکا کوئی چیز نہ تھا۔ اس ملک کے بسنے والے زندگی میں کوئی کمی نہ محسوس کرتے۔ ان کا نوجوان بادشاہ اگر ایک طرف اپنی صورت میں بےمثل تھا تو دوسری طرف

عقلمندی اور دور اندیشی میں آپ اپنی نظیر تھا۔ مطلق العنان ہونے کے باوجود وہ رعایا کی مصلحتوں کو اپنی خواہشوں پر مقدم سمجھتا۔ اس کے قلمرو میں اور بہت سی ریاستیں تھیں اور گرد و نواح میں وہ شاہنشاہ سمجھا جاتا تھا مگر وہ خود اپنے کو ملک اور رعایا کا خادم تصور کرتا تھا بادشاہ کی شادی ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔ اسکو جب کبھی اُمور سلطنت سے فرصت ملتی تو وہ سیر و شکار سے اپنا جی بہلایا کرتا۔

آخر کار اسکو ایک ایسی حسین لڑکی مل گئی جو حسن و جمال میں یگانۂ روزگار تھی معصوم بادشاہ حسن کی ذوق انگیزیوں سے آشنا ہو گیا اور اس کو معلوم ہوا کہ محبت ایک مزے کی چیز ہے۔ اس نے اس چاند کے ٹکڑے کو اپنے تاج و تخت میں شریک بنا کر محبت کو مستحکم اور پائدار کر لیا۔ غریب و نادار لڑکی ملکہ ہو گئی۔ اب بادشاہ ایسا محسوس کرنے لگا کہ اس کو اس جنم میں کسی چیز کی حاجت نہیں ہے ملکہ بھی بادشاہ کی محبت میں دنیا و مافیہا سے بے خبر تھی۔ دونوں کی زندگی محبت سے معمور تھی۔ دن رات ان کے تھے جینا ان کا تھا۔ دنیا ان کی تھی تلخکامی سے وہ ناآشنا تھے۔ رنج و مصیبت کا ان کو تجربہ نہ تھا دونوں سمجھ رہے تھے کہ جینا نام ہے صرف لذت کا۔ ایسی کامیاب محبت کا خواب بھی کم لوگوں نے دیکھا ہوگا۔

اسی بے خبری کے عالم میں ایک سال گزر گیا۔ دفعتاً زمانہ نے کروٹ بدلی۔ کارپردازانِ قضا و قدر نے نظام عالم کو از سر نو ترتیب دینا چاہا تو ان کی نگاہ ان دو خوش نصیب متوالوں پر بھی پڑی۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ بادشاہ ملکہ کے ساتھ باغ میں چاندنی رات کا لطف اٹھا رہا تھا ملکہ چاند سے ناخوش تھی۔ وہ اس کی بیباک اور شوخ نگاہی کو گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ یکایک وہ سراسیمہ ہو کر چونک پڑی اور اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ بادشاہ نے مڑ کر دیکھا تو اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ ملکہ کو سانپ نے ڈس لیا تھا تھوڑی دیر بعد وہ اپنے چاہنے والے کی آغوش میں ہمیشہ کے لئے سو گئی۔

آدھی رات ہو چکی تھی چاند کی شوخ نگاہ پڑ رہی تھی پھولوں کی مہک فضا میں بس رہی تھی بادشاہ کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا اس نے کبھی موت نہیں دیکھی تھی۔ وہ غور سے اس چہرہ کو دیکھ رہا تھا جسمیں موت نے ایک نئے رنگ کا اضافہ کر دیا تھا۔ اس کے سوچنے کی قوت زائل ہو رہی تھی اسکو کسی طرح یقین نہ ہوتا تھا کہ ملکہ اس سے یا وہ ملکہ سے عمر بھر کے لئے چھن گیا ہے۔ وہ اس خوفناک حقیقت کو سمجھنے سے معذور تھا کہ اب کبھی ملکہ اس کے ساتھ سیر کرنے باغ میں نہیں آئیگی۔

دو روز تک بادشاہ ملکہ کی لاش کے قدموں سے لگا رہا اور خاموشی کے ساتھ ماتم کرتا رہا ارکانِ دولت کو خوف تھا کہ کہیں وہ اس جانکاہ صدمہ سے مغلوب ہو کر خودکشی نہ کرے۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ بادشاہ کا دھیان ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر بادشاہ بچہ نہیں تھا تیسرے روز وہ خود بخود اٹھا اور کھا پی کر بدستور اپنے ملک کے ضروری کاموں میں مصروف ہو گیا۔ انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُسنے کوئی زبردست ارادہ کر لیا ہے جس سے اسکو بہت سکون ہو گیا ہے۔

اس نے لاش کو ایک چاندی کے صندوق میں محفوظ کیا اور اس کو پھر ایک صندل کے صندوق میں رکھا جسپر سونے کا

کام کیا ہوا تھا۔ اس صندوق کے لئے ایک اور سنگِ مرمر کا تابوت بنوایا گیا اور اسمیں قیمتی جواہرات جڑوائے گئے۔ اس درمیان میں بادشاہ ان کنجوں اور سیرگاہوں میں جا جاکر ملکہ کی یاد میں اپنا جی بہلایا کرتا تھا جہاں وہ اس کے ساتھ فرصت کا بیشتر حصہ صرف کرنے کا عادی تھا۔ اُس نے نہ کپڑے پھاڑے نہ چہرہ پر راکھ ملی جیسا کہ اس زمانہ کی رسم تھی۔ کچھ دنوں بعد وہ پھر دربار کرنے لگا اور ملک کے انتظام کی نگرانی شروع کردی اُس نے اہلِ دربار کو اپنے ارادہ سے آگاہ کرنے کے لئے کہا "میں اب کسی عورت سے سروکار نہ رکھوں گا بلکہ عورت کا خیال بھی دل میں نہیں لاؤنگا۔ اس لئے کسی ایسے لڑکے کو گود لینا چاہتا ہوں جو میرا وارث بننے کی قابلیت رکھتا ہو۔ لیکن اسکے علاوہ میں اپنی ساری زندگی ساری طاقت اور ساری دولت ملکہ کی ایک یادگار تیار کرانے میں صرف کردونگا جو ملکہ کی طرح دنیا میں اپنا جواب نہ رکھتی ہو جو ہر زمانہ میں ایک انوکھی چیز سمجھی جائے جس کی زیارت کو دور دور سے دیکھنے والے آئیں اور ملکہ کو یاد کریں۔ تاکہ ہماری محبت فانی نہ رہجائے" اہلِ دربار نے بادشاہ کی رائے سے اتفاق کیا۔ ایک مقبرہ کی بنیاد ڈالی گئی جس کا نام "گوہرِ محبت" رکھا گیا۔

سال پر سال گزر رہے تھے اور "گوہرِ محبت" کی تعمیر کا سلسلہ کسی طرح ختم نہیں ہوتا تھا اور نہ بادشاہ کی سرگرمی میں سرمو فرق آیا پہاڑ کی چٹانیں کاٹ کاٹ کر یہ عمارت بنوائی گئی تھی جسکا شمار نوادرِ عالم میں ہو رہا تھا۔ چاروں طرف سبزہ زار پہاڑیاں تھیں اور بیچ میں "گوہرِ محبت" ایک جانب دریا لہریں لے رہا تھا جو عمارت کو اور بھی پُرشکوہ بنائے ہوئے تھا "گوہرِ محبت" کے وسط میں ملکہ کا مرمریں تابوت تھا۔ اس کے گرد قیمتی پتھروں کے ستون کھڑے تھے جو صناعی کے بہترین نمونے تھے۔

پہلے "گوہرِ محبت" کی عمارت بہت چھوٹی تھی مگر رفتہ رفتہ بڑھتی گئی۔ پہلے اس میں اتنے گنبد اور کنگرے نہ تھے جتنے کہ بعد میں ہوگئے اس کے طاق و رواق اور در و دیوار کے نقش و نگار ہمیشہ نئی اور پہلے سے زیادہ دلکش صورت اختیار کرتے رہے۔ بادشاہ جب اسکو دیکھنے آتا تو اس میں کوئی نہ کوئی خامی یا کمی پاتا اور اپنے تخیل کے مطابق کوئی ترمیم یا اضافہ کرا دیتا۔ زائرین آتے اور "گوہرِ محبت" کو دیکھکر دنگ رہجاتے۔ عورتیں دیکھتیں اور کہتیں "دیکھو محبت بھی کیا چیز ہے؟ کیسے کیسے کرتب دکھاتی ہے؟"

مگر بادشاہ کو کسی نہ کسی طرف سے اسمیں خامیاں نظر آجاتی تھیں اور وہ مضمحل ہو جاتا تھا اسی طرح اس کی آدھی عمر گزر گئی اور ملکہ کی یادگار معیار پر پوری نہیں اتری۔ اب بادشاہ اور بھی جوش اور سنجیدگی کے ساتھ اس بات پر تل گیا کہ "گوہرِ محبت" کو اپنے تخیل کے لحاظ سے درجۂ کمال تک پہنچا دے۔ ہر سال محراب اور مینارے نئی طرز پر بنائے جاتے۔ نئے نئے قسم کے جواہرات آتے اور ان کی پچی کاری ہوتی پرانے نقوش اور کتبے مٹا دئے جاتے اور انکی جگہ نئے کندہ کئے جاتے۔ بادشاہ کا مذاق آہستہ آہستہ بدل رہا تھا اس کو سنہرا رنگ اب بالکل مرغوب نہیں تھا۔ چنانچہ اس کی جگہ آسمانی رنگ نے لے لی تھی۔ کچھ مدت بعد اس کے مزاج میں اسقدر سادگی آگئی کہ اُس نے تمام نقش و نگار جن کو اب وہ بچپن کا کھیل سمجھنے لگا تھا مٹوا دئے۔ پھر بھی دیکھا تو "گوہرِ محبت" کو نامکمل اور

عیوب سے بھرا پایا۔ بادشاہ حیران تھا کہ اب کیا کرے۔ بہت غور کرنے کے بعد اس نے ایک دن حکم دیا کہ اگر ان پتھر کے ستونوں کو گرا دیا جائے تو تابوت زیادہ خوشنما نظر آئے گا۔ حکم کی تعمیل ہوئی مگر "گوہر محبت" میں اب بھی کوئی نقص باقی تھا۔

دوسرے دن بادشاہ پھر آیا اور تابوت کو غور سے دیکھنے لگا۔ بڑی دیر تک تامل کے بعد اسنے معمار سے کہا "اب اس میں بجز ایک چیز کے اور کوئی نقص نہیں معلوم ہوتا۔ اور یہ تابوت ہے جو نہایت بدنما اور غیر ضروری نظر آتا ہے اسکو یہاں سے فوراً ہٹا لیجاؤ"۔

مجنوں

صفر علی محمد علی تاجر عطر کی دوکان بہت مشہور ہے

اکبر، آئین اکبری میں

شہنشاہ اکبر کے حکم سے اس کے وزیر ابوالفضل نے اسکی سوانحعمری لکھی ہے۔ یہ کتاب اسکے نظام حکومت اور ملک کے مختلف صوبوں کے حالات، اعداد و ہندسہ کی تفصیل کے ساتھ بتاتی ہے جو اس کی عہد سلطنت کی ایک قابل قدر یادگار ہے[1]

اس کتاب کے پڑھنے سے مغلوں کی سلطنت کی انتہائی عظمت و جلال کی ایک خوشنما تصویر نگاہ کے سامنے پھر جاتی ہے اسمیں اس روشن دماغ بادشاہ کے خصائل آئین اور توانین کی صورت میں دکھائے گئے ہیں۔ ابوالفضل کی طرز تحریر سراسر خوشامد اور چاپلوسی سے بھری ہوئی ہے جو اہل مغرب کی نزدیک ناپسندیدہ بات ہے خاصکر اس لئے کہ اس کا مخاطب بادشاہ ہے اور سلاطین کی وقعت دقیانوسی بات ہوگئی ہے تاہم یہ ان تقریروں سے زیادہ مکروہ نہیں ہے جو پارلیمنٹ یا کانگریس کے امیدوار ووٹ دینے والوں سے کرتے ہیں جس طرح سے کہ سمجھدار آدمی آخر الذکر خوشامدانہ تحریر کو وقعت کے ساتھ نہیں دیکھتے اسی طرح سے ہم اول الذکر طرز تحریر کو شمار میں نہیں لاتے۔ اسی لئے میں نے ابوالفضل کی کتاب کا وہ حصہ جسمیں زیادہ تر بادشاہ کی مدح و ثنا درج ہے ترک کر دیا ہے کیونکہ وہ ایک قسم کا رسمی تکلف ہے جسمیں واقعیت کم ہے۔

اکبر ہمایوں کا بیٹا تھا۔ وہ ۱۵۵۶ء میں تخت سلطنت پر بیٹھا اور قریب قریب پچاس برس سلطنت کرنے کے بعد ۱۶۰۵ء میں انتقال کر گیا۔ اس کی لڑائیوں اور فتوحات کی تاریخ اس قدر دلچسپ نہیں ہے جتنی کہ اسکے ملکی انتظام کی تصویر۔

ابوالفضل کی کتاب سے ہمیں اسکا پورا پتہ چلتا ہے کہ بادشاہ اپنی ایسی وسیع اور باقاعدہ سلطنت کے ہر جزوی معاملات میں دست اندازی کرتا تھا جو فارس سے دریائے گنگ تک اور کشمیر سے دکن تک پھیلی ہوئی تھی۔ کتاب کی فہرست مضامین پر نظر ڈالنے سے منجملہ اور بہت کے یہ خاص عنوان مضمون پائے جاتے ہیں۔ آئین منزل آبادی، آئین خزینہ آبادی، آئین خزینۂ جواہر، آئین دارالضرب آئین شبستان اقبال، آئین منزل در یورشہا، آئین فرود آمدن اردو آئین شکوہ سلطنت، آئین خوشبوخانہ آئین تصویرخانہ آئین توپ، آئین اصطبل بنا بر فیل، اسپ، شتر، گاو۔ آئین آویزۂ جانوران و جنگ آہو۔ آئین آموزش آئین در ملک آبادی آئین احوال پنجدہم صوبہ، تفصیل شرح لگان۔ آزادی مذہب، احوال ہندوستان، اس کے باشندے۔ ان کے علوم الہیات اسکے

[1] اس کتاب آئین اکبری کا دو مرتبہ ترجمہ کیا گیا ہے۔ (۱) فرنسیز گلیڈون نے ۱۸۰۰ء میں (۲) پروفیسر بلاکمین نے ۱۸۷۳ء میں ترجمہ کیا ہے ۱۸۹۱ء کے ترجمہ میں ایسے مکمل، ایسے دلچسپ اور ایسے فاضلانہ حواشی اضافہ کئے گئے ہیں کہ ابوالفضل کی اس کتاب کو دنیا کی سب سے بڑی کتابوں کی فہرست میں داخل ہونے کا دوہرا حق حاصل ہو گیا ہے۔ میں نے اس باب میں دونوں ترجموں کا اقتباس کیا ہے۔ مصنف

رسم و رواج وغیرہ وغیرہ اور ان کے علاوہ ہزاروں ہی باتیں ہیں۔

ابو الفضل لکھتا ہے "یہ جمہور کا تسلیم کردہ مسئلہ ہے کہ رعایا کی عادات کی اصلاح۔ زراعت کی ترقی۔ دفاتر کا انتظام۔ فوج کی شائستگی سے عمدہ اور پاکیزہ کوئی شغل نہیں ہے۔ اور یہ پسندیدہ مقصد اُسوقت تک حل نہیں ہو سکتا جبتک کہ رعایا کی رضامندی کے اسباب پر غور نہ کیا جائے آمدنی کا پورا انتظام نہ کیا جائے اور سلطنت کے اخراجات میں کفایت شعاری نہ برتی جائے جب یہ جملہ امور ملحوظ خاطر رہیں گے تو ہر درجہ کے لوگ خوشحال رہیں گے۔

اکبر کے مورث اعلیٰ تیمور کے خیالات سے اس فقرہ کا مقابلہ کرو۔ کیسا زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے! رعایا کی خوشحالی واسطے تیمور کے اون خوفناک کوچ اور ہیبتناک محاصروں کا مقابلہ کرو جن کی یادگار میں آدمیوں کے سر اکٹھا کر کے مینار بنائے گئے تھے۔ زراعت کی ترقی! یہ خیال ان ترکی سپاہیوں کے جانشین کا ہے جو گیہوں کو دیکھکر لعن طعن کرتے اور اسے "گھاس کی بنگی (دانہ) بتاتے"۔

بادشاہ نے ہر محکمہ کے لئے خزانچی مقرر کئے تھے جو روزانہ، ماہوار، سہ ماہی اور سالانہ حساب مرتب کرتے تھے۔ ہیرے اور دیگر جواہرات جو خزانہ شاہی کے متعلق تھے ان کی قیمت لگا کر قسم وار رکھائے گئے تھے۔ موتی کوڑی کوڑی کر کے علیحدہ پرو دیئے گئے تھے اور ہر لڑی کے سرے پر مہر لگا دی گئی تھی تاکہ کوئی ان میں سے تبدیل نہ کرسکے یا چرا نہ سکے۔ ہر قیمتی لعل و یاقوت پر لکھا ہوتا تھا "بیش بہا لعل"۔

ایک ٹکسال قائم کی گئی تھی جس کے مقررہ قواعد بنے اور تنخواہ دار ملازم اسمیں رکھے گئے۔ اسمیں قیمتی دھاتوں کی خوبی کے متعلق قاعدے مقرر کئے گئے[1] کم وزن کے سکے مقررہ بٹہ پر واپس لئے جاتے تھے۔ جب ہم ان فقروں کو پڑھتے ہیں کہ:۔

معاملات زر اطمینان کے ساتھ طے ہو جائیں گے جبکہ فریقین اپنا اپنا عندیہ صاف طور پر ظاہر کریں اور وہ قلم اٹھا کر اپنا بیان مایقرء خط میں لکھدیں" تو ہمیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ہم ازمنۂ متوسطہ میں ہیں۔ اکبر نے اپنے سکوں کے خالص ہونے کا ایک خاص معیار مقرر کیا تھا اور ان کی شکل و صورت میں بھی ترقی دی تھی۔ وہ سنگِ سلیماں کے مقررہ باٹوں سے وزن کئے جاتے تھے۔ اس کے ایک سکہ پر یہ عبارت

---

[1] منجملہ اس کے جوہریوں کے ایک انگریز مسٹر لیڈس بھی تھے بادشاہ نے اس کی بہت خاطر کی، ایک مکان پانچ خدمتگار ایک گھوڑا اسے عطا کیا اور روزانہ چھ شلنگ نقد دیا کرتا تھا۔ مسٹر لیڈس کا عجیب و غریب قصہ ہے یہ صاحب منجملہ اُن چار انگریزوں کے ہیں جنھوں نے ۱۵۸۳ء میں شام اور فارس سے ہندوستان کا سفر اختیار کیا تھا اور ملکہ الزابتھ کے خطوط مغل اعظم کے نام لائے تھے بہت سے مصایب جھیلنے کے بعد ان سب کا مختلف انجام ہوا مسٹر اسوڑی، گوا میں پادری ہو گئے۔ مسٹر لیڈس اکبر کی ملازمت میں داخل ہو گئے۔ نیوری نے وطن کی واپسی میں انتقال کیا اور مسٹر فچ ۱۵۹۱ء میں انگلستان واپس ہوئے اور اپنے سفر کے حالات شائع کئے۔

کسندہ تھی:- "افضل دینار ینفقہ الرجل دینار ینفقہ علی اصحابہ فی سبیل اللہ"

بہترین دینار جو انسان خرچ کرتا ہے وہ ہے جو خدا کی راہ میں اپنے ساتھیوں پر خرچ کرتا ہے

اکبر نے خود سکوں کے دہات میں خاص خاص ناقص دہاتوں کے آمیزش کا رواج دیا۔ جانوروں کی لڑائی میں شرط لگانے کے مفصل قاعدے مقرر کئے گئے "تیرہ درجوں میں ہاتھی کی لاغری رکھی گئی" تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ان کی خوراک میں سے کچھ چرایا تو نہیں گیا۔

اکبر نے ہر ایک شے کو جدا کرنے اور اسے باقاعدہ ترتیب دینے کی خواہش اپنے باپ ہمایوں سے ورثہ میں پائی تھی جسمیں ترتیب دہی کا میلان مضبوطی کیساتھ ودیعت کیا گیا تھا۔ ہمایوں نے اپنی اوائل زمانۂ حکومت میں تین طرح پر لوگوں کی تقسیم کی تھی۔ شاہی خانداں کے لوگ، شرفا، فوجی سردار اول درجہ میں تھے۔ صوفی، سادات، علما، قاضی و مفتی۔ ہیئت داں اور شعرا علاوہ اور بڑے معزز آدمیوں کے دوسرے درجہ میں تھے۔ جوان اور حسین، مغنی اور مطرب تیسرے درجہ میں رکھے گئے تھے۔ کاروبار کے لحاظ سے ہفتہ کے دن ان تینوں قسم کے لوگوں میں بحصہ مساوی تقسیم تھے یعنی دو دن ہر ایک درجہ کے آدمیوں کے لئے وغیرہ وغیرہ لیکن تاج و تخت بلکہ خود اپنی جان کی حفاظت میں زیادہ مصروف رہنے کی وجہ سے اس کے یہ خیالی اور احمقانہ منصوبے قایم نہ رہ سکے جن کا کہ ہمنے بہت اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

ابوالفضل حرم شاہی یا شبستان اقبال کے متعلق دلسوزی سے لکھتا ہے "عام طور پر عورتوں کی کثرت سے بڑی دقتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں لیکن گیتی پناہ نے حد درجہ عقل اور احتیاط سے کام لیا ہے جن سے مکانوں کی آبادی اور خانہ داری کے بہترین انتظام درست کئے جا سکتے ہیں۔ راجگان ہند اور دیگر بلاد کے شاہزادوں کی لڑکیوں سے شادی کی خواستگاری کر کے اُس نے اپنے تئیں در دولت پر فتنہ و فسادات سے محفوظ کر لیا ہے اور باہر کے لئے ایک مضبوط اتحادی طاقت قائم کر رکھی ہے[۵]۔ حرم کا احاطہ اتنا وسیع ہے کہ ہر ایک کے لئے جداگانہ مکان نامزد ہے جن کی تعداد پانچ ہزار سے بھی بڑھکر ہے۔ ان کی جماعتیں بنا دی گئی ہیں اور ہر عورت کے لئے جداگانہ خدمات مخصوص ہیں۔ ہر گروہ پر ایک عورت بطور نگراں و دیدبان مقرر ہے اور پھر ان سب پر ایک اور محافظ عورت منتخب کی گئی ہے تاکہ حرم کے معاملات کی بھی اسی نظم کے ساتھ رہنمائی ہوتی رہے۔ جیسا کہ سلطنت کے اور محکمہ جات کی ہو رہی ہے اس طرح پر حرم شاہی ایک قسم کا سرکاری دفتر تھا۔ ان کی سردار ماہم انکہ تھی جو اکبر کی دایہ اور بچپن کی مشکل خطرات میں اسکی وفادار رفیق رہ چکی تھی اور جو درحقیقت اوائل زمانۂ حکومت میں اسکی وزیر اعظم تھی۔ ابوالفضل لکھتا ہے۔

---

۵ یہ اکثر بیان کیا گیا ہے کہ اکبر کی بیگمات میں سے ایک عیسائی شہزادی بھی تھی۔ یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ حاشیہ ایک غلطی کی اصلاح کے لئے لکھا جاوے۔ مغرور راجپوتوں کے شاہی خاندانوں میں سے صرف ایک راجہ اودیپور نے مغل فاتحین کے گھرانے سے شادی بیاہ کے تعلقات کو نہایت مستقل مزاجی کیساتھ نامنظور کیا اور قدیم راجپوتوں کے مراسم کے مطابق آج تک وہ خالص راجپوت سمجھے جاتے ہیں۔ مصنف

اون میں سے ہر ایک اپنی قابلیت کے اندازہ سے تنخواہ پاتی ہے۔ قلم بادشاہ کی بے حد بخشش کا احاطہ نہیں کر سکتا لیکن اسموقع پر ماہوار معاش کی کسیقدر تفصیل دیجاتی ہے۔ اعلیٰ طبقہ کی بیگمات ۶۱۰ روپئے[1] سے لیکر ۱۰۲۸ روپیہ تک پاتی ہیں۔ بعض خاص پرستاران کو اکیاون روپیے سے بیس روپیہ تک اور بقیہ کو دو روپیہ سے لیکر چالیس روپیہ تک معاش دیجاتی ہے " جب اس گروہ میں سے کسی عورت کو کچھ ضرورت پیش آتی ہے تو وہ تحویلدار سے کہلا بھیجتی ہے۔ شبستان اقبال کا اندرونی احاطہ عورتوں کی پاسبانی میں ہے علاوہ ان کے خواجہ سرا، دیدبان (دربان) اور فوجی سپاہی (پاسبان) بیرونی حصہ میں ہر ایک مقررہ مختلف فاصلوں پر مامور رہتے تھے۔

کیمپ شاہی سامان سفر اور خیمہ جات کیوجہ سے ایک قصبہ کی طرح گنجان رہتا تھا کیونکہ جب بادشاہ ایک شہر سے کوچ کرتا تھا تو اس کے ساتھ باشندے بھی روانہ ہوتے تھے جن میں سوداگر، مختلف خانداں کے لوگ، نوکر اور غلام سب ہوتے تھے۔ کیمپ شاہی اچھا خاصہ خیموں کا شہر معلوم ہوتا تھا۔ اکبر کی مختلف مہریں تھیں ایک پر صرف اس کا نام کندہ تھا۔ دوسرے پر اس کے آبا و اجداد کا نام تیمور تک تحریر تھا۔ دادخواہوں کی عرضیوں پر جو مہر ثبت کی جاتی تھی اسپر یہ بیت نقش تھی ؎

راستی موجب رضای خداست

کس ندیدم کہ گم شد از رہ راست

وہ گیتی خداوند مطبخ کی طرف بھی اپنی توجہ مبذول فرماتے رہتے ہیں اور بہت سے آئین اس کے متعلق بھی مرتب فرمائے ہیں چوبیس گھنٹہ کے وقفہ میں صرف ایک بار طعام تناول فرماتے ہیں اور سیر ہونے سے پہلے ہاتھ کھینچ لیتے ہیں، لیکن پرستارانِ شبستانِ اقبال کے کھانے کا سلسلہ صبح سے شروع ہو کر شب تک ختم ہوتا ہے۔" "دیانتدار لوگ محکمۂ مطبخ میں ملازم رکھے گئے ہیں اور باینہمہ خود بدولت انکی نگرانی سے غافل نہیں رہتے۔"

بابر کے وقت میں باورچیخانہ کے اوپر ایک شامیانہ نصب کر دیا جاتا تھا تاکہ اوپر سے کوئی زہریلی چیز گر کر نہ دیجاوے اور سب کھانا محافظین کی نگرانی میں طیار ہوتا تھا۔ علاوہ اس کے چاشنی گیر مقرر کئے جاتے تھے تاکہ بادشاہ کی جان ہر قسم کی آفت سے محفوظ رہے۔ ذائقہ چکھنے والے جو غافل پائے جاتے ان کی زندہ کھال کھنچوائی جاتی تھی! اکبر نے بھی اس قسم کی احتیاط جائز رکھی تھی۔ باورچیخانہ سے طباق دسترخواں سے ڈھک کر بھیجے جاتے تھے جن کے سرے سربمہر ہوتے تھے۔

ظروف مسی جو بادشاہ کے استعمال میں رہتے ہیں اُن پر مہینہ میں دوبار قلعی کی جاتی ہے۔ شاہزادگان اور پرستاران شبستانِ اقبال کے

---

[1] اکبر کا روپیہ موجودہ زمانہ کے حساب سے آٹھ آنہ دس پائی کے برابر ہوتا ہے مصنف

استعمال کے برتن مہینہ میں ایک بار قلعی کرائے جاتے ہیں۔" ہر ایک چیز اس آئینی سلطنت میں باقاعدہ تھی۔ اکبر صرف گنگا کا پانی شورہ سے ٹھنڈا کرکے پیتا تھا۔" شورہ کو جو بارود کی ترکیب میں گرمی پیدا کرتا ہے خدیو جہان اپنی فراست سے پانی ٹھنڈا کرنے کے کام میں لاتے ہیں۔"

اکبر کے پینے کا پانی اور کھانے کا سامان برتنوں میں سر بمہر رہتا تھا۔ اسلحہ خانے اور باغات کی حفاظت کے لئے معتبر ملازم تھے۔ اس قسم کی احتیاط ایسی سلطنت میں جہاں سازش کا بازار گرم رہتا تھا اور جہاں زہر خورانی کا عام رواج تھا نہایت ضروری تھی[۵]۔

وزیر نے تیس۳۰ قسم کے کھانوں کے مسالے درج کئے ہیں۔ میں صرف یہاں پر ایک کھانے کا ذکر کرتا ہوں۔ دس پونڈ گیہوں کے آٹے کا خمیر کرکے اس قدر دھویا جائے کہ کم ہو کر دو پونڈ رہ جائے، ایک پونڈ روغن زرد اور اسی قدر پیاز؛ زعفران، قاقلہ، دو قرنفلی ہر ایک ½ اونس، دارچینی، فلفل، گشنیز ہر ایک ½ اونس زنجبیل تر، نمک ہر ایک ½۱ اونس بعض عرق لیمو بھی زیادہ کرتے ہیں"

اہل مغرب کے بلحاظ مذاق سے یہ ایک خارج از بحث بات ہے کہ آیا لیمو شامل کیا جائے یا نہیں۔ اکبر کے سامنے معمولاً سو قسم کے قابوں کی فہرست رکھی جاتی تھی۔ ایک روز جبکہ گیتی پناہ خاصہ تناول فرما رہے تھے دل پر یہ الہام ہوا کہ شاید کسی گرسنہ شخص کی نگاہ کھانے پر پڑی ہے۔ اس لئے وہ خود بدولت کیسے کھا سکتے تھے جبکہ بھوکے اس سے محروم تھے؟ اس لئے حکم صادر فرمایا کہ روزانہ طعام خاصہ سے جو ما بدولت کے لئے طیار کیا جاتا ہے چند بھوکے لوگ کھلا دئے جایا کریں تب اس کے بعد ما بدولت کے لئے طعام لایا جایا کرے۔" "بادشاہ کو گوشت کھانے کی طرف میلان نہیں ہے اور وہ اکثر کہتا ہے 'خدا نے آدمی کے لئے قسم قسم کی غذائیں مہیا کر دی ہیں لیکن بے عقلی اور گرگ خوری سے وہ جانوروں کو ہلاک کرتا ہے اور اپنے جسم کو جانداروں کا گورغانہ بناتا ہے۔ اگر میں بادشاہ نہ ہوتا تو میں فوراً گوشت خوری ترک کر دیتا اور اب میرا ارادہ ہے کہ رفتہ رفتہ اسے ترک کر دوں۔" اور درحقیقت وہ ہمیشہ ہفتہ میں دو روز گوشت سے پرہیز رکھتا تھا۔ اکبر کو عمدہ پھلوں کا بہت شوق تھا اس نے ایران اور توران کے کئی قسم کے میووں کی پیداوار کو ہندوستان میں رواج دیا۔ تاتاری عمدہ خربوزے ہر ایک ڈھائی ڈھائی روپیہ میں، سمرقندی سیب ایک روپیہ کے دس کے حساب آئے۔" "بادشاہ کو خوشبو سے بے انتہا رغبت ہے اور محفل عطر آگیں کو ہمیشہ پھولوں، اور عود و عنبر کی خوشبو سے جو زریں و سیمیں مجمروں میں بخور کئے جاتے ہیں معطر رکھتا ہے۔" اس کا وفادار وزیر بہت سی خوشبوؤں کی ترکیب وغیرہ کا ذکر کرتا ہے اس ملک کے پھولوں کی ایک بڑی لمبی فہرست دی ہے

---

[۵] ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ سلطان محمود (۹۹۷ - ۱۰۳۰ء) کے اردلی میں ہمیشہ ایک خاص شخص میرے ساتھ رہتا تھا جس کا کام یہ تھا کہ بادشاہ کے استعمال کے لئے پانی کے برتنوں پر مہر لگاتا۔ مصنف

اور ان کے کھلنے کا موسم بھی لکھا ہے"۔ شادی:- بادشاہ ہر ایک کیلئے یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ ایک سے زیادہ شادی کرے وہ بوڑھی عورتوں کو جو جوانوں سے شادی کرتی ہیں سخت ملامت کرتا ہے بادشاہ کا خیال ہے کہ زن وشو کی رضامندی اور والدین کی اجازت شادی کے لئے نہایت ضروری باتیں ہیں"۔ جب ہندوستان کے رسم ورواج اور اس خاص زمانہ کا خیال کرتے ہیں تو ہمیں اکبر کا یہ اصول بہت زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ہندوؤں میں صغر سنی کی شادی کے رواج سے اکبر کی یہ راے اس مسئلہ میں قائم ہوگئی تھی"۔ روزانہ کوئی قابل شخص بادشاہ کے حضور میں کتاب پڑھتا اور وہ شروع سے آخر تک سنتا ہے اور جہاں پر کتاب پڑھنے سے چھوڑ دیجاتی ہے بادشاہ تاریخ اور مہینہ تحریر کر دیتا ہے۔ سائنس، یا تاریخ غرض علوم اور حکم کی شکل سے کوئی کتاب باقی ہوگی جو بادشاہ کے حضور میں نہ پڑھی گئی ہو۔ ان کے سننے سے بادشاہ کا جی گرانبار نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ مکرر سہ کرر نہایت شوق سے سنا کرتا ہے"۔ اس کے حکم سے بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا[1] اور دنیا کے ہر حصہ کی ایک تاریخ اس کے حکم سے اخیر ہزار سال تک کی طیار کی گئی۔ اکبر نے پوپ روما سے توریت کی ایک جلد منگوائی اور جیسا کہ ابو الفضل لکھتا ہے اکبر کے پاس انجیل اور زبور بھی فارسی زبان میں موجود تھیں[2]"۔ دنیا کے کل مہذب قوموں میں اسکول جاری ہیں لیکن ہندوستان خاص طور پر اپنی درسگاہوں کے لئے

[1] پیوستہ بکار فرمائی زباں دانان کتب ہندی و یونانی وعربی وفارسی بدیگر زبانہا گزارش یابد چنانچہ لختی زیچ جدید میرزائی را بدیدہ وری امیر فتح اللہ شیرازی و ترجمانی راقم اقبالنامہ، کشن جوشی، گنگا دہر، مہیش مہانند از ہندی فارسی آوردند۔ وکتاب مہابھارت از کتب قدیم ہندوستان باہتمام نقیب خان و مولانا عبد القادر بدایونی و شیخ سلطان تھانیسری از ہندی بفارسی آمد۔ قریب یک لک بیت است۔ آنحضرت نام داستان باستانی رزم نامہ نہادو ہمیں گروہ کتاب رامایں راکہ از تالیف قدیم ہنداست در احوال رام چندر بتفصیل در ان و بسے از نوادر حکمت دران مندرج است بفارسی آوردند وکتاب اتھربن راکہ بزعم این طایفہ یکے از کتب چہارگانہ الہی است حاجی ابراہیم سرہندی فارسی نمود ولیلاوتی کہ در حساب گزیدہ اثر یست از جلای ہندوستان ہمیں برادسان شیخ ابو الفضل فیضی۔ از ہندی نقاب برآوردہ طیلسانِ فارسی بردوش گزاشت وکتاب تاجک در علم تنجیم نسخہ ایست معتبر باشارت عالی مکمل خاں گجراتی فارسی ساخت وواقعات حضرت گیتی ستانی کہ دستور العمل کار آگہی ہست میرزا خان خاناں از ترکی بفرس آورد۔ وتاریخ کشمیر کہ احوال چہار ہزار سالہ آن دیار ہست مولانا شاہ محمد شاہ آبادی از لغت کشمیر بزبان فارسی برگزارد۔ ومعجم البلدان کہ در احوال بلاد امصار کتابی ہست شگرف جمعی از زباں دانان چوں ملا احمد تتہ وقاسم بیگ وشیخ منور وچندے دیگر از لغت تازی بہ فارسی بردند و ہربنس راکہ متضمن احوال کشن ہست مولانا شیری بفارسی نوشت۔ وکتاب کلیلہ ودمنہ کہ در حکمت عملی کارنامہ ایست غرابت بخش باآنکہ نصر اللہ مستوفی ومولانا حسین واعظ بفارسی نقل کردہ بودند ...... وقصہ عشق نلدمن کہ بزبان ہندی جگر گداز ارباب ذوق بود شیخ فیضی فیاضی در بحر لیلیٰ مجنوں بسلک نظم درکشید ... چون خاطر مقدس شاہنشاہی بر خزانہ نقل آگاہی یافت احوال ہزار سال اخیر کہ در اقالیم سبعہ روی دادہ خبر شناسان تاریخ دان را اشارت عالی شد کہ در یکجا فراہم آرند نخست نقیب خان وجمعی دیگر آغاز نہادند ..... وتاریخ الفی نام بر نہادند۔ آئین اکبری مترجم

[2] ایک ایرانی شاعر بیان کرتا ہے کہ زبور در اصل حضرت داؤد علیہ السلام نے فارسی بول چال میں لکھا تھا (حالات سعدی از مسٹر س) مصنف

مشہور ہے " اور جیسا کہ سلطنت کے جملہ معاملات میں اکبر ترقی کا خیال رکھتا تھا اس نے اس میں بھی ترقی دی " اور جس تعلیم میں برسوں لگ جاتے ہیں۔ اب لوگ یہ سنکر تعجب کریں گے کہ اس کی تکمیل چند مہینوں میں ہو جاتی ہے "

ہر ایک طالب علم کے لئے لازمی مضامین یہ ہیں، اخلاق، حساب، فلاحت، مساحت، ہندسہ، نجوم، رمل، تدبیر منزل، سیاست مدن (منطق، ریاضی، طب) فلسفہ اور تاریخ۔ ان میں سے ہر ایک کو رفتہ رفتہ حاصل کرنا چاہیئے "

" بادشاہ تصویر کشی کو دل سے پسند کرتا ہے اور اپنی عہد حکومت کے آغاز ہی سے اس فن کی سرپرستی فرمائی ہے اس لیے یہ فن اپنی انتہائی حد تکمیل کو پہونچگیا ہے " ہر ہفتہ تصاویر اس کے حضور میں پیش کیجاتیں اور مصوروں کو انعام واکرام دیا جاتا۔ ایک فہرست ۱۸ بڑے ممتاز درباری مصوروں کی دی ہے۔ کتابیں بھی تصاویر سے مزین کیجاتی تھیں۔ ایک کتاب جو بارہ جلدوں میں تھی اس میں چودہ سو سے کم تصاویر نہ تھیں۔ ممتاز ملازمین سلطنت کی تصویریں کھنچوائی گئیں اور سب کی ایک جلد بندھوائی گئی جسمیں " رفتگاں کی حیات تازہ اور حاضراں کی زندگی جاوید موجود ہے "

اس کے درباری ملک الشعرا (برادر ابوالفضل) کے کتبخانہ میں چار ہزار چھ سو قلمی نسخے موجود تھے خود اکبر کا کتبخانہ اس سے کہیں زیادہ مکمل تھا۔ جہانگیر کے عہد سلطنت میں لاہور کے قصر شاہی کی دیواریں تصاویر اور شبیہوں سے قریب قریب بھر گئی تھیں سمرقند نگارخانہ تیموریہ کی دیواریں اسکی ہندوستانی لڑائیوں کی تصویروں سے آراستہ تھیں۔ اکبر کہتا ہے " ایسے لوگ زیادہ ہیں جو مصوری کو ناجائز قرار دیتے ہیں لیکن میں ایسے لوگوں کو ناپسند کرتا ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا مصور خدا کے اقرار کرنے کا بالکل خاص ذریعہ رکھتا ہے کیونکہ ایک مصور جب کسی جاندار کی شبیہ بناتا ہے اور اس کے عضو عضو کو دکھتا ہے تو ضرور محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنی تصویر میں روح نہیں پیدا کرسکتا اور اس لئے اس جاں آفریں خدا کے یقین کرنے پر مجبور ہوتا ہے "

۱۵۶۹ء میں اکبر نے شہر فتحپور سیکری کی بنیاد خواجہ سلیم چشتی کے خانقاہ کے قریب رکھی جسکے نام پر اس کے بڑے بیٹے (شاہزاد سلیم جو بعد میں جہانگیر مشہور ہوا) کا نام رکھا گیا۔ وہ جگہ درحقیقت موزوں نہ تھی اس لئے ۱۵۸۴ء میں شہر خالی چھوڑ دیا گیا۔ اس کے آثار قدیمہ آج بھی سیاحوں کو حیرت زدہ بنا دیتے ہیں۔ آگرہ کا عظیم الشان قلعہ بھی اکبر ہی نے تعمیر کرایا۔ اگر اس کے بعد دو اس کے اور جانشین تعمیر کے دلدادہ نہ پیدا ہو جاتے جیسا کہ جہانگیر اور خاصکر شاہجہان ہوے تو اکبر تعمیرات کے لحاظ سے بھی بہت مشہور ہوتا۔ اس کی اکثر عمارات میں متانت اور مضبوطی پائی جاتی ہے جس سے وہ آج تک اکبر کے ساتھ مخصوص معلوم ہوتی ہیں۔

توپ خانہ اور اسلحہ سازی کے لئے خاص قواعد منضبط کئے گئے تھے اور اکبر خود ان میں سے ہر ایک کی آزمائش کیا کرتا تھا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے صرف ایک بندوق سے ۱۹۰۰۰ مختلف جانوروں کا شکار کیا ہے کیونکہ مثل اور دیگر چیزوں کے وہ اپنے شکار کا بھی حساب وکتاب ٹھیک ٹھیک رکھتا تھا۔ بادشاہ کی ہر ایک بندوق کے مناسب نام ہوتے تھے۔ ابوالفضل نے ہندوستان کے ہاتھیوں کا بیان نہایت

دلچسپ پیرایہ میں لکھا ہے۔ لیکن اس کے انتخاب کرنے میں بہت زیادہ طوالت ہے اس کا یہ بیان قابل لحاظ ہے کہ اس جانور کی عمر طبعی " انسان کی طرح " ایک سو بیس سال کی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ اکبر سے پہلے پلے ہوئے ہاتھیوں کا بچہ لینا منحوس سمجھا جاتا تھا " مگر بادشاہ اس متعصبانہ یقین بلکہ وہم پرستی پر غالب آگیا "

" چونکہ بادشاہ کو گھوڑوں کا بہت زیادہ شوق ہے اس لئے ہمیشہ کثیر تعداد میں آیا کرتے ہیں یہانتک کہ آج اس کے طویلہ میں بارہ ہزار گھوڑے موجود ہیں " اصطبل میں ایک تنخواہ دار افسر مامور تھا جس کا کام یہ تھا کہ وہ رائی کے بیج کی دھونی دیا کرتا تھا تاکہ گھوڑے نظر بد سے محفوظ رہیں۔ سلطنت کے ضروری احکام کی تعمیل تیز رفتار سانڈنیوں کے ذریعہ سے کرائی جاتی تھی نہ کہ گھوڑوں کے ذریعہ سے خاص راستوں پر چھ چھ میل کے فاصلہ پر ڈاک کا ہرکارہ متعین تھا اور ان کے علاوہ " محل شاہی پر بہت سے سانڈنی سوار حاضر رہتے ہیں انکا کام یہ تھا۔ کہ بمجرد اس کے کہ احکام شاہی صادر ہوں وہ انھیں ملک کے دور دراز حصوں میں پہونچانے کے لئے طیار رہیں "

جب بادشاہ بسرداری فوج کوچ کرتا ہے تو سڑک کی پیمائش نہایت احتیاط کے ساتھ بانس کے لٹھوں سے کیجاتی ہے خاص لوگ محض اسی کام پر متعین ہیں۔ پیمائش کا حساب گزوں (ایک گز ۳۲ انچہ کا) اور کوسوں پر جو پانچہزار گز کا ہوتا ہے رکھا گیا تھا " ان مقررہ پیمائش کی پرانی زمانہ کی تعریف قابل ذکر ہے۔ تاہم اکبر کے بعض اصلاحات کی ضرورت کچھ سمجھ سکیں۔ ایک صوبہ کا کوس یا مقررہ پیمائش یہ تھی کہ " زیادہ سے زیادہ جتنی دور تک بیل کی معمولی آواز سنائی دے " اور دوسرے صوبہ میں " راہ گیر ایک سبز پتی توڑ لیتا ہے اور اسکو اپنے سر پر رکھکر سفر کرتا ہے یہاں تک کہ وہ پتی خشک ہوجاتی ہے " میں میزان پیمائش کا ایک جز اسجگہ درج کرتا ہوں:-

۶ موی دم استر ..... ایک جو ۶ جو ...... ایک اصبع یا انچہ ۲۴ اصبع [illegible] .... ایک گز

ہمارے قدیم حساب کا دانہ " جو " یہاں بھی موجود ہے "بادشاہ کو علم موسیقی کا نہایت ذوق ہے اور اسکے اصول سے کماحقہ واقف ہے۔ یہ فن جسے عام طور پر لوگ نیند لانے کا ذریعہ سمجھتے ہیں بادشاہ کو بہت محفوظ کرتا اور بیدار رکھتا ہے " (باقی آئندہ)

عبدالسبحان ناظر

وہ فوراً کسی نہ کسی طرح اسکو دربار تک پہونچاتے تھے جب امیر یمین الدین نے فریومد میں مستقل سکونت اختیار کر لی تو رفتہ رفتہ ان کے علم وفضل کا چرچا ہوا اور ان کی شہرت علاؤالدین محمد کے کانوں تک بھی پہونچی جو اسوقت وزیر السلطنت اور تمام نظم ونسق کا مالک تھا۔ اس نے امیر یمین الدین کی ان کے مرتبہ کے موافق قدر کی اور یہ علاء الدین محمد کے مصاحبین یا مداحین میں شامل ہوکر صاحب املاک وجاہ داد ہوگئے۔ اس بات کے دوبارہ اظہار کی ضرورت بہت کم ہے کہ یمین الدین کوئی معمولی شاعر نہ تھے بلکہ فضلائے زمانہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ان کو فریومد میں رہتے ہوئے کچھ زمانہ گزرا تھا کہ محمود پیدا ہوئے اور اسی اعلیٰ پیمانہ پر ان کی تربیت وتعلیم ہوئی جیسی ہونی چاہئے تھی۔

ان کے اکثر شعر اسبات کے گواہ ہیں کہ ان کو زبان عربی پر اتنی ہی قدرت حاصل تھی جتنی ایک کامل الفن ادیب کو ہونی چاہئے یہ ظاہر ہے کہ ایک غیر زبان میں شعر وہی کہہ سکتا ہے جو اسمیں اچھی طرح مہارت رکھتا ہو۔

تعلیم وتربیت کے بعد ابن یمین کی شاعری کا زمانہ آتا ہے۔ شعر وشاعری کو جس نظر سے آج دیکھا جاتا ہے اس سے دہوکا کھانا سخت غلطی ہے اسوقت شاعری کو تفنن طبع نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ وہ شاعر کے لئے ایک حد تک ذریعۂ معاش بھی تھا اور دربار اور اہل دربار کے اغراض اس سے وابستہ رہتے تھے۔

ابن یمین نے اپنی آبائی عزت کو نظر انداز نہیں کیا اور شعر کی طرف توجہ کی۔ ان کے والد نے اصلاح شروع کی اور جوش محبت سے جس طرح میں خود غزل کہتا اسی پر صاحبزادہ کو بھی طبع آزمائی کا موقع دیتے تھے انھوں نے روم سے جو ابن یمین کے نام تحریریں بھیجی ہیں وہ کافی شہرت حاصل کر چکی ہیں۔ چنانچہ تذکرۂ دولت شاہ کا مصنف لکھتا ہے "مکاتیب نظم ونثر امیر یمین الدین بفرزندش امیر محمود از روم بخراسان نوشتہ وجواب ابن یمین بپدر را شہرتے دارد وایں تذکرہ تحمل آں نیارد" نمونتاً ایک رباعی درج ہے۔

دارم زعتاب فلک بوقلموں ۔۔۔ وزگردش روزگار جس پر زردوں
چشمے چو کنارۂ صراحی ہمہ اشک ۔۔۔ جانے چو میانہ پیالہ ہمہ خوں

ابن یمین نے جواب میں برجستہ یہ رباعی لکھی۔

دارم زجفاے فلک آئینہ گوں ۔۔۔ پر آہ دلے کہ سنگ از دگر دو خوں
روزے بہزار غم بشب مے آرم ۔۔۔ تا خود فلک از پردہ چہ آرد بیروں

یہاں ان دونوں رباعیوں کا موازنہ تو ایک مہمل سی بات ہے کیونکہ امیر یمین الدین کی رباعی کا تیسرا چوتھا مصرع کڑی کمان کا تیر ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس رباعی کے کہنے تک بیٹے کے بازووں میں اتنا دم نہیں آیا تھا کہ باپ کی کڑی کما

کو پہنچ سکتا مگر اس مطارحہ اور مشاعرہ کا آگے چلکر نہایت عمدہ اثر پڑا اور ابن یمین کے لئے یہ ایک ایسی نیک فال بناکہ لوگوں نے ایک وقت میں ان کو بھی ان کے باپ کی برابر سمجھا اور موازنہ کیا۔ بعض نے یمین الدین کو اس زمانہ میں ابن یمین سے اچھا شمار کیا تھا چنانچہ دولت شاہ نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے۔

"بعضے از فضلائے سخن امیر یمین الدین را تفضل فرمودہ اند بر سخن امیر محمود و ظاہر امکابرہ است" امیر یمین الدین کا ۷۲۴ھ میں انتقال ہوا اور فریومد میں مدفون ہوئے

ابن یمین کے قطعات اور غزلیں ضرورت سے زیادہ مشہور ہوئیں۔ دولت شاہ نے لکھا ہے " والیوم سخن او را در ایران و توران مے خوانند"

ابن یمین نہایت ہی قابل اور نیک اور با اخلاق آدمی تھے مولف تذکرہ آتشکدۂ آزر ان کے لئے یہ الفاظ استعمال کرتا ہے "از فضلائے عہد خود بود صاحب اخلاق حمیدہ و اوصاف پسندیدہ۔ ہموارہ فقہا و فضلا را مہمانی خواندے و عند الاعزہ عزیز بودی" دولت شاہ نے اپنے تذکرہ میں یہ الفاظ لکھے ہیں کہ " از فضلائے عہد خود بودہ اخلاق حمیدہ و سیرتے پسندیدہ داشتہ و فضلا و فقرا را ضیافت کردے و اکابر او را حرمتے زیادہ از وصف میداشتند اس کے بعد خود بخود یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ ابن یمین کی شاعری کی ابتدا اخلاق سے ہوئی جس کا سبب تو یہ تھا کہ ان کی شاعری نے ان کے والد کی نگرانی میں نشو و نما پائی وہ خود ایک بزرگ فاضل آدمی تھے ان کے یہاں اخلاق و تصوف موجود تھا۔ لہذا ان کے پیرو اور خصوصیت سے ابن یمین ایسے پیر کو ان کے نقش قدم پر چلنا پڑا۔ اور اخلاقی رنگ سے اونکی شاعری کا آغاز ہوا۔ دوسری وجہ یہ کہ وہ خود نہایت ہی با اخلاق اور نیک صفت انسان تھے۔ الغرض ابن یمین کی شاعری انھیں مہذب حدود کے اندر شروع ہوئی جنھیں وہ اپنے باپ کے سامنے پیش کرسکتے تھے اور ان کی شاعری اس عہد سے گزر رہی تھی جبہیں سعدی۔ فرید الدین عطار۔ مولانا جلال الدین وغیرہ لوگوں کو قبولیت عام کی سند مل چکی تھی۔ ضرورت کے اقتضا سے انھوں نے سربدار وں کی بھی مداحی کی۔ سربداروں کے متعلق یہاں اتنا ہی لکھنا کافی ہے کہ یہ ایک نہایت ہی دلیر اور شجاع فرقہ تھا جس نے سلطان ابو سعید کے مرنے کے بعد تقریباً پچاس سال تک خراسان کے اکثر شہروں میں حکومت کی ان میں نو آدمی سربر آوردہ اور حاکم وقت ہوئے۔ اول عبد الرزاق۔ دوسرے وجیہہ الدین مسعود جو عبد الرزاق کا بھائی تھا۔ تیسرا شمس الدین فضل اللہ۔ چوتھا خواجہ علی شمس الدین پانچواں یحییٰ کرابی چھٹا ظہیر کرابی۔ ساتواں حیدر قصاب حشمی۔ آٹھواں حسن دامغانی۔ نواں علی موید۔ اس فرقہ کا سربداروں کے نام سے موسوم ہونا بھی ایک لطیفہ ہے لہذا وہ بھی لکھتا ہوں۔ سربداروں کے فرقہ کا پہلا حکمران عبد الرزاق ہے جو خواجہ فضل اللہ باشتینی کا بیٹا تھا۔ یہ شاہ جرین کے خدام میں شامل تھا۔ اور باشتن جو نواح سبزوار میں ایک قصبہ ہے اس کا مولد و مسکن تھا۔ خواجہ فضل اللہ نہایت ہی مالدار تھا اور عبد الرزاق

مذکور اور وجیہ الدین مسعود اور شمس الدین اسکے تین لڑکے تھے چونکہ ان سب میں عبدالرزاق سب سے زیادہ دلیر اور وجیہ تھا اس لئے وہ سلطان ابوسعید خان کا آذربائجان میں ملازم ہوا اور سلطان ابوسعید خاں نے اس کو یسادل مقرر کیا۔ مدتوں تک اس خدمت کو حسن وخوبی سے انجام دیتا رہا ایک مرتبہ حکم سلطانی کی بنا پر تحصیل وصول کے لئے کرمان گیا۔ مگر کچھ ایسے اسباب پیش آئے کہ جسقدر روپیہ وصول کیا وہ سب اس کے ہاتھ سے ضایع ہوگیا - اب لوٹ کر ابوسعید خاں کے دربار تک جانا محال تھا لہذا باشتین اپنے وطن کو واپس ہونے لگا اور اس فکر میں تھا کہ باپ کی جائداد فروخت کرکے شاہی قرضہ ادا کردے راستہ میں یہ خبر سنی کہ سلطان ابوسعید خاں کا انتقال ہوگیا۔ عبدالرزاق کو ایسی حالت میں اس خبر سے زیادہ اور کونسی چیز خوش کرسکتی تھی نہایت خوش ہوا اور باشتین چلا آیا اپنے اعزہ واقربا سے ملا تو یہ شکایت سنی کہ یہاں کا حاکم علاءالدین محمد فریومدی کا بھانجہ مقرر ہوا ہے اور وہ نہایت ظالم وفاسق ہے۔ شراب کا شایق ہے اور شاہد کی ہر وقت تلاش ہے ہمسے بھی برابر یہی تقاضہ ہے کہ شراب پلاؤ اور کوئی معشوق لاؤ۔ عبدالرزاق کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور کہنے لگا کہ ابوسعید خان کا انتقال ہوگیا۔ زمانہ پلٹ گیا اب اس دہقانی کے ناز اٹھانے سے فائدہ اپنے ساتھیوں کو لیکر اسی رات کو علاءالدین محمد (جو وزیرالسلطنت تھے) کے بھانجے پر شبخون کیا اور اس کو گرفتار کرکے قتل کردیا اسپر یہ ستم ظریفی کی کہ صبح کو قصبہ کے باہر بہت سی داریں نصب کیں اور انپر مقتولین کے سر لٹکا کر نشانہ بازی کرنا شروع کی اور اسی روز سے سربدار اپنا خطاب مقرر کیا اہل قصبہ نے جب عبدالرزاق کی یہ بہادری دیکھی تو سات سو آدمیوں نے اسی روز اس سے بیعت کی جب یہ خبر علاءالدین کو پہونچی تو انھوں نے ایک ہزار مسلح سوار جمال الدین محمد کی ماتحتی میں دیکر بھیجے کہ علاءالدین سے اس بے ادبی کا بدلہ لیں مگر علاءالدین کے بہت سے ساتھی موجود تھے دل بڑھا ہوا تھا۔ اس کو بھی شکست دی اور اپنے چھوٹے بھائی وجیہ الدین مسعود کو علاءالدین کے قتل کے لئے روانہ کردیا۔ اس کے بعد ہنگامہ ہوتا رہا جس کی تفصیل یہاں بیکار ہے۔

ایسے عالم میں کہ فتنہ برپا ہو رہا تھا، علاءالدین محمد جو ابن یمین اور اس کے باپ کا محسن، اور ان کا ہموطن تھا دشمن سے برابر ہزیمت پر ہزیمت اٹھا رہا تھا اور فریومد پر آفتیں آنے کا احتمال تھا۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ ابن یمین سربداروں کی مداحی نہ کرتے بہرحال انھوں نے ضرورتاً سربداروں کی مداحی کی مگر وہ ہرگز بالطبع اس کی طرف مائل اور متوجہ نہ تھے ان کا ابتدائی رنگ وہی اخلاق تھا ان کے اخلاقی قطعات کی شہرت عالمگیر ہوئی اور وہ شہرت آج تک ویسی ہی قائم ہے جیسی اس زمانہ میں تھی اُن کے چند قطعات یہاں نمونتاً درج کئے جاتے ہیں :-

چوں جامہ حریر ہمی شمرم صحبت نادان　　زیرا کہ گراں باشد وتن گرم ندارد
از صحبت نادان عبرت نیز بگویم　　خویشے کہ توانگر شد و آزرم ندارد

زین ہروہ نبردان توشہرا کہ در اقلیم　　باخنجر خونریز دل نرم ندارد
زین ہر سہ بتر نیز بگویم کہ چہ باشد　　پیرے کہ جوانی کند و شرم ندارد

کنجے و کتابے و حریفے دو سہ ہمدم　　باید کہ عدد بیشتر از چار نباشد
رودے و سرودے و شرابے و کبابے　　شرط است کہ ساقی بجز از یار نباشد
ایں دولت اگر دست دہد ابن یمین را　　با ہیچکسش در دو جہاں کار نباشد

دو قرص نان اگر گندم است و گر از جو　　دو تائے جامہ اگر کہنہ است و گر از نو
چہار گوشۂ دیوار خود بخاطر جمع　　کہ کس نگوید ازینجا بخیز و آنجا رو
ہزار بار نکوتر بہ نزد ابن یمین　　ز فر مملکت کیقباد و کیخسرو

من و نفس نفیس و فقر و فاقہ　　نمیخواہم غنی گشتن بہ خواری
بو د جاں دادنم در آب بہتر　　ازاں کز غوک باید جست یاری
گرسنہ گر بمیرد باز ازاں بہ　　کہ جغد آورد اکند سیر از شکاری

پہلے قطعے میں انسان کے اخلاقی ارتقاء کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ ایسا ہے جس سے بہتر ذہن میں نہیں آسکتا فرق مراتب اور اخلاق کی رفتار تدریجی ـــــــ کی سب صورتیں بے مثل دکھائی گئی ہیں۔

دوسرے قطعہ میں عیش و فراغت کے باغ و بہار کی خوشنما تصویر اور خوشحالی کا دلچسپ روح افزا ــــ منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اسکو محاکات کہئے یا مصوری یا کچھ اور مگر شاعر کی پرواز خیال اس سے زیادہ اگر دشوار نہیں تو آسان بھی نہیں

تیسرے قطع میں آزادی کی قدر دانی کا بہتر سے بہتر اسلوب میں سبق دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی دولت بھی اس کے مقابلہ میں ہیچ اور لا یعنی ہے۔ اسی طرح چوتھے قطع میں کسی کا احسان اپنی گردن پر لینے کی ممانعت کی گئی ہے اس مضمون کو بہت سے شعراء نے کہا مگر یہ لطافت اور شیرینی مشکل سے کہیں ملیگی۔

ابن یمین کے قطعات کا ایک دیوان پورا موجود ہے اور ہر قطعہ ایک سے ایک بہتر اور برتر صورت میں موجود ہے مگر ہم کو اسوقت اس سے بحث کرنا منظور نہیں بلکہ آپ کی توجہ محض انکی غزل گوئی کی طرف منعطف کرنا چاہتے ہیں جس پر انھوں نے قطعات

سے زیادہ محنت کی ہے ان کے غزلوں کا دیوان سربداروں کے ہنگامہ میں ضائع ہوگیا تھا اور غالباً پھر وہ ان کو عمر بھر نہ مل سکا۔ مگر ہندوستان کی خوش نصیبی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح یہاں تک پہونچ گیا۔ مولانا غلام علی آزاد نے ید بیضا میں لکھا ہے کہ میں نے ان کا دیوان دال کی ردیف تک دیکھا جس پر مولانا شبلی نے شعر العجم میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ غالباً یہ قطعات کا دیوان ہوگا چونکہ مولانا شبلی نے خود ابن یمین کا دیوان نہیں دیکھا اور نایاب ہونے کی وجہ سے وہ ان تک نہیں پہونچ سکا اس لئے ہم اس رائے دینے میں ان کو کوئی الزام نہیں دے سکتے۔ مگر مولانا کی یہ رائے کہ ابتدا میں وہ غزل اور قصاید سب کچھ کہتے تھے ایک حد تک غلط ہے۔ وہ مدتوں تک غزل اور قطعات سب کچھ کہتے رہے اس لئے کہ ۷۳۶ھ میں سربداروں کے ہنگامہ کی ابتدا ہوئی اور غالباً اسی میں ان کا دیوان ضایع ہوا اور ۷۴۵ھ میں ابن یمین نے دار فانی کو خیرباد کہا گویا دیوان کے ضائع ہونے کے بعد ان کی سات آٹھ برس کی عمر اور باقی رہجاتی ہے اور یہ بلاشبہ انکی شاعری کا آخری دور مانا جائے گا۔ پھر مولانا شبلی کا یہ جملہ کہ ابتدا میں وہ سربداروں کی مداحی کرتے تھے بالکل معکوس ہوجاتا ہے اور کہنا پڑتا ہے کہ انھوں نے ضرورتاً آخر میں سربداروں کی مداحی بھی کی ورنہ اُن کا وسطی اور ابتدائی شوق وہی غزل گوئی کی شاعری اور قطعات نگاری پر مبنی تھا۔

مولانا شبلی ید بیضا سے ایک دو شعر نقل کرتے ہوے لکھتے ہیں کہ ان اشعار سے اگرچہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ غزل میں کم مایہ نہیں۔ لیکن ان کا خاص رنگ اخلاقی شاعری اور اس میں بھی قناعت و خودداری ان کا خاص حصہ ہے جیسا کہ مولانا نے فرمایا ہے پہلے میں بھی یہی سمجھا تھا۔ مگر تحقیق کے بعد مجھے اپنا خیال بدلنا پڑا اسوقت میری نظر کے سامنے ان کی غزلیات کا تمام و کمال دیوان موجود ہے اور میں نے جہانتک غور و فکر کے بعد اندازہ کیا ہے ان کے کلام میں حسب ذیل خصوصیات نظر آتی ہیں

(۱) اُن کی غزلیات کا سب سے بڑا عنصر شیرینی زبان تھا جو اب بھی اسی طرح قائم ہے۔

(۲) ان کی زبان یا ان کا طرز بیان استعاروں اور لایعنی پامال تشبیہوں سے اکثر پاک و صاف ہے اور ان کے طریق ادا میں صفائی ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ اور وہ اپنے معاصرین کی طرح ہرگز ایہام۔ یا مراعات النظیر، دوراز کار تشبیہات اور بعید استعاروں میں نہیں پڑتے۔ جو کچھ کہتے ہیں اس طرح کہتے ہیں کہ نہ وہ سامعہ پر گراں ہوتا ہے اور نہ اس کے سمجھنے میں گتھیاں سلجھانے کی عقل کو ضرورت ہوتی ہے۔

(۳) انکی غزلیں یکسر سوز و ساز عشق کا آئینہ ہیں

(۴) امور تصوف سے انکی غزلیں لبریز ہیں، اگرچہ عشق تصوف کا رنگ نیا دھے اور یہ ابن یمین کے یہاں بھی بدرجہ احسن موجود ہے مگر انھوں نے استعاروں اور پامال تشبیہوں سے احتراز کرتے ہوے یہ خصوصیت پیدا کردی کہ ایشیائی شاعری پر استعاروں کی کثرت کی وجہ سے جو حقیقی اور شہوانی جذبات کی آمیزش کا الزام تھا اسے دور کیا۔ یعنی انھوں نے اس امر کو

اچھی طرح سے سمجھا۔ اور صوفیانہ مذاق کے جسقدر شعر لکھے ان میں اکثر ایسے ہیں جنہیں گنجایش پیدا کرکے حقیقت اور مجاز کو ہم معنے اور مرادف قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ان کی قادر الکلامی نے ان شعروں میں ایسے الفاظ رکھدئے ہیں جن کو دیکھنے کے بعد شعر کو مصنف کے مافی الذہن اور اس کے اصلی مفہوم سے جدا نہیں کیا جا سکتا، اور اس لحاظ سے وہ اپنے معاصرین کیا بڑے بڑے صوفیوں سے بھی آگے ہیں

(۵) تصوف کے اسرار کو شعر کے قالب میں اس طرح ڈہالا گیا ہے کہ نقل بالکل اصل معلوم ہوتی ہے یعنی کہیں اگر اصل مسئلہ کو بیان کر دیا ہے تو شعر میں ایک لفظ بھی ضرورت سے زائد نہیں ہے

(۶) ان کے یہاں سوائے عشق کے اور کسی فلسفہ سے غزل میں بحث نہیں کی گئی

(۷) جذبات ان کے یہاں بہت ہیں۔ یہ صفت کچھ ان کو انکے معاصرین سے ممتاز نہیں کرتی۔ مگر ان کے اظہار جذبات میں آداب عشق اس قدر ملحوظ رہتا ہے کہ دوسروں کے یہاں بمشکل اسکی نظیر مل سکتی ہے۔

(۸) بزم حقیقت سے جب فراغت پاتے ہیں تو وہ شریک مجلس ساقی بھی ہو جاتے ہیں مگر اس خصوصیت کے ساتھ کہ وہ جب خانقاہ سے اٹھکر میکدہ کی طرف جاتے ہیں تو وہاں جاکر صوفی رہتے ہیں نہ اُن کا جبہ و دستار کبھی رہن مے ہوتا ہے نہ وہ دین و دنیا کو ساقی کے نذر کر دیتے ہیں۔

(۹) ان کی غزل مسلسل ہوتی ہے۔ غزل میں تسلسل کا طریقہ سعدیؒ نے متروک کیا تھا۔ ابن یمین اُسی قاعدہ کے پابند ہیں اور پابندی کو دور کرتے ہیں تو اس طرح کہ سب شعر علحدہ علحدہ ہونے پر بھی ایک رنگ میں قرار دئے جا سکتے ہیں اب ہم ہر ایک خصوصیت کے کچھ اشعار نقل کرتے ہیں۔ پہلے سادگی و شیرینی زبان کی مثالیں ملاحظہ کیجئے:-

بار جفا و جور کشیدیم و کس نگفت — تا چند بار غم کشد این ناتوان ما

در کوئے یار ہیچ بجائے نمیرسد — ہر چند بگزرد ز فلک این فغان ما

دردا کہ سوخت شعلۂ شوق تو جان ما — آتش نہاد عشق تو در خانمان ما

دلدار وعدہ داد کہ سوی تو بنگرم — من منتظر کہ کے شود آن وعدہ را وفا

اے دل مپرس از من بیدل حساب عمر — حیران حسن یار چہ داند حساب را

نالہ تا چند کنم از غم او ابن یمین — قامتم چنگ شد و او بہ صدائے ننواخت

زاہداں را خبر عشق بنو دیکو　　عمر در روزہ و نماز گزشت

دلم می بُرد و منجند ید و میگفت　　کہ چوں ایں شیوہ ہائے آشنائی ست

بعد مرگ اے دوستاں من چو در خاکم کنید　　بر سر قبرم علم پیراہن یا کم کنید

ہر کہ را بود دیدۂ بینا　　روے او را بدید و حیران شد

جز وصال تو جمع می نشود　　خاطرے کز غمت پریشاں شد

یہ اور اسی قسم کے بہت سے شعر ہر رنگ میں ہر مضمون کے ابن یمین کے یہاں موجود ہیں دوسری خصوصیت یعنی استعاروں سے ان کے کلام کا پاک و صاف ہونا اور بعید تشبیہوں سے احتراز کرنا بھی انھیں چند شعروں سے ظاہر ہو سکتا ہے اور آئندہ دوسرے خصوصیات کے لئے جو اور شعر پیش کئے جائینگے اُن سے بھی معلوم ہو سکے گا۔

تیسری خصوصیت یعنی سوز و ساز عاشقانہ کی مثال میں چند شعر ہم لکھتے ہیں کہ ابن یمین تغزل کو صرف تغزل ہی کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، ان کو صرف با معشوق سخن گفتن سے کام ہے اور اس ایک بات کے نباہنے کے لئے وہ رفعت تخئیل، مضامین کی بلندی جدت خیال کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ ایک جذبۂ حزن و ملال پر انھوں نے سب باتوں کو ٹھکرا دیا ہے اور پھر لطف یہ کہ اس ترک ما سوا سے ان کے کلام کا لطف اور بڑھ گیا ہے ذرا بھی کلام میں سُستی نہیں پیدا ہوتی اس سے پتہ چلتا ہے کہ ابن یمین رموز و اسرار شعر کے ماہر تھے۔ وہ جانتے تھے کہ شعر میں نشتر نہ نئے مضمون لکھنے سے پیدا ہوتا ہے نہ عرش کے تارے توڑ لانے سے اس کو کوئی لگاؤ ہے، بلکہ وہ شے جو شعر کو سراپا درد و سوز بنا دیتی ہے اور ہی کچھ ہے فرماتے ہیں:۔

روزیکہ می شدیم جدا از وصال یار　　بر حال ما گریست زمین و زمان جدا

ما پریشاں حال و او غافل ز حال خستگاں　　اے صبا او را بگو فکرے کند در کار ما

در سر کویت غریب و بے کسیم　　رحم کن بر دیدۂ خونبار ما

عاقبت ابن یمین راز نہاں　　فاش شد از نالہائے زار ما

گفتم کہ کیست ابن یمین بر در تو گفت　　بیچارۂ شکستہ دلے بے نوائے ما

محنت بحد کشید ابن یمین در کوئے دوست　　چون کنم اینہا چو بر پیشانیش مکتوب بود

مفلسانیم کہ سودائے جمالت داریم　　نقد جان و دل اگرچہ بکمی ارزد

دست لطفے بر دل زار من شیدا نہید　　چارۂ سازید و فکر جان غمناکم کنید

عاشقاں در سر کوئے تو بصد درد ہمہ　　جان سپردند و لیکن بہ تمنا رفتند

خود را بسر کوی تو بر خاک تواں زد — ہر لحظہ گریباں زغمت چاک تواں زد

میکنم پارہ گریباں زغمت ابن یمین — چہ کنم در رہ او دست بداماں نرسید

ہر کجا کہ اثر کرد آہ ابن یمین — دراں دیار گیاہے زخرمی نہ دمید

ایکہ از حال دل خستہ فراغے داری — سینہ ام چاک بکن بیں کہ چہ داغے داری

ابن یمین کے کلام کی چوتھی اور پانچویں خصوصیت تصوف ہے چونکہ اس سے ہمارے مضمون کا بہت گہرا تعلق ہے اسلئے اس کو آئندہ ذرا تفصیل سے بیان کریں گے سردست ہم چھٹی خصوصیت کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی یہ کہ ان کا کلام نہ ابن رشد، ارسطو وغیرہ کا فلسفہ ہے اور نہ امام غزالی کی طرح انکو فلسفۂ اسلام سے کوئی واسطہ ہے، بلکہ وہ صرف عشق کے اثرات اور کیفیات کو نظم کرتے ہیں اس میں بھی وہ عشق کے حقایق کو بہت کم بیان کرتے ہیں البتہ صرف حال کو قال کر دکھاتے ہیں۔ چنانچہ اس سے پہلے لکھے ہوئے شعروں سے اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہو سکتا ہے البتہ ساتویں خصوصیت یعنی عشق کی کیفیات اور سوز و درد کے اثرات میں آداب عشق ملحوظ رکھنا یہ صرف ابن یمین ہی کا کام ہے اور وہ اس میں معاصرین سے سبقت لے گئے ہیں۔ ان کے اس ادب و احترام عشق سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کا عشق اصلی ہے اور ان کا سوز و ساز مصنوعی نہیں ہے۔ وہ ایک صوفی صافی ہیں اور ان کا دل عشق حقیقی سے لبریز ہے صرف ردیف الف میں سے چند اشعار کا انتخاب ملاحظہ ہو:۔

عمریست سر نہادہ بر آں آستانہ ایم — تا نگفت یار کہ ہست از سگان ما

کردم نظارہ بر رخ معشوق بے بصر — گفتم حدیث عشق ز کام و زباں جدا

این بود حاجتم کہ عشق تو جان دہم — شکر خدا کہ گشت ہمہ حاجتم روا

ما زخاصان در او نتوانیم شدن — رحمت خاص اگر خود نبود شامل ما

گر بروے تو بہ بینیم بسے عیش و طرب — ور بکوئے تو بمیریم زہے دولت ما

با سگاں در کویت دم یاری وا سیم — بس ہمیں در دو جہاں سلطنت و حشمت ما

حد آں نیست کہ من ہمدم رازش باشم — کاش سازد سگ او ہمدم و ہمراز مرا

بر سر کوی تو ہر دم مست و بیخود بودہ ایم — رفتہ ہست القصہ اکنوں اختیار از دست ما

گو بچیزے نخرد بر در او کس ما را — بندۂ آں سر کوئیم ہمیں بس ما را

گر صد ہزار ہمچو منے کشتہ بیہ باک — زاں چشم یک نگاہ و دو صد بے نوای ما

خاک آں کو را بچشم ما رساند گر سحر — ایں امید از جانب باد سحر داریم ما

گر ز یاراں کہن بیگانہ ایم ایدل چہ باک | چوں سگانِ آن سرکو آشنا داریم ما
گر ہمہ اغیار بر ما تیغ بیدادی کشند | چوں تو ہستی یار ما دیگر چہ غم داریم ما
بعد ازیں ابن یمین را طعنہ دشمن چہ باک | مثل او چوں پادشاہی محتشم داریم ما
ما سگِ آں سر کوئیم دگر ابن یمین | ہر کجا ہست ہمیں است ما آل سخن ما
جاں دادہ ایم و درد و غمت را خریدہ ایم | در کشور وجود ہمین است سود ما
عمرے است تا بخاک درت سر نہادہ ایم | باشد کہ پائے لطف نہی بر جبیں ما
کاشکے بختم دراں کو پاسباں سازد مرا | در کف آن پا چو خاک آستاں سازد مرا
مہرباں سازد خدایا دل آن دلبر ما | کہ ز خاک قدمی دور نہ سازد سر ما

نویں خصوصیت یعنی غزل کا تسلسل اس انداز سے کہ وہ مسلسل بھی ہو تو اس صورت سے کہ مسلسل معلوم ہو چند مثالیں پیش ہیں :-

تعالی اللہ کہ بنمود آن دل آرا | جمالِ خویش را بر ما ہم از ما
جمال یار را در خویش دیدم | یکے شد شاہد و مشہود مارا
مرا حاجت بناشد بادہ صاف | کہ من مستم ز جام حق تعالے
بمن آمیخت ہمچوں شہد و شکر | کہ امکان جدائی نیست اصلا
چو من حیرانِ روئے آن نگارم | از ان رو خارِ غم از لا و الّا
رخ خود را یکے با من نماید | ہمیدارم ازاں دلبر تو لّا
چو صبحے چشم خود بکشایم از خواب | بود در دیدہ ام ذوقِ تماشا
من اے ابن یمین در ہر دو عالم | ندارم جز وصال او تمنا

تا بکے از حسرت دیدار سوزد جانِ ما | ہیچ باشد رخ نماید ناگہاں جاناں ما
گر بہ انداز دنگار ما ز روئے خود نقاب | تا قیامت باز ماند دیدۂ حیراں ما
در سر کوئش در دن آتش غم ساکنیم | تا بود قوت سگانش سینۂ بریاں ما
عشق رہ فرما کہ از زلف تو زنجیری نہد | چند گردد ہر طرف ایں عقل سرگرداں ما

صبر کن ابن یمین گر چہرہ را افروختند — عاقبت خواہد علم زد آتش پنہان ما

ان دو غزلوں کے رنگ ہی میں تقریباً ان کی تمام غزلیں رنگی ہوئی ہیں۔ اس تسلسل میں عدم تسلسل کی ایک خاص وجہ معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ یہ رنگ ہنوز ان کی طبیعت پر پورا قبضہ جمانہ چکا تھا کہ وہ اس زنجیر تسلسل کو توڑ کر اس قید سے آزاد ہوجاتے مگر اکثر کوشش یہی تھی اس میں جسقدر کامیابی ہوئی وہ آپ نے ملاحظہ فرمائی۔ میری تشریح ایک امر فضول سے زیادہ نہیں۔ مگر انکی چوتھی خصوصیت یعنی تصوف کے رموز کو تصوف ہی کے دائرہ میں بیاں کرنا ایک ذرا طوالت طلب ہے۔ ابن یمین کے کلام میں اسرار تصوف کے جسقدر اشعار ملتے ہیں وہ اس قدر مستحکم ہیں کہ کسی صورت سے دائرۂ تصوف سے باہر نہیں جا سکتے زیادہ تر کلام ایسا ہی ہے جو محتاج تاویل نہیں ہے اور جو محتاج تاویل ہے وہ صرف اسی قدر کہ ذرا سے اشارہ میں مجاز کو حد حقیقت سے ملا دیتا ہے۔ مثال میں چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

ما زخاصان در او نتوانیم شدن — رحمت خاص اگر خود نبود شامل ما

من یہدیہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضلل فلا ہادی لہ

جمال یار را در خویشتن دیدم — یکے شد شاہد و مشہود آنجا

چونکہ در بحر قدم قطرۂ آبے شدہ ایم — گر بجوئید نیابند ازیں پس ما را

جذبۂ ما ہمہ از عین عنایات ویست — کہ بجود میکشد آن ذات مقدس ما را

اسی مضمون کو مولانا نظامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے ؎

بسے منزل آمد ز من تا بہ تو — نشاید ترا یافت الا بتو

اے مسلماناں چہ عیب از بت پرستی میکنم — چونکہ در دل مہر آن زیبا صنم داریم ما

اسی مضمون کو سعدی نے یوں کہا ہے کہ

در عمل کوش ہر چہ خواہی پوش — تاج بر سر نہ و علم بر دوش

ہر چہ در کائنات مے بینم — ہمہ را نور ذات مے بینم

من کہ در ذات او شدم فانی — کے بسوئے صفات می بینم

ہست آن رخ ز شش جہت تاباں — گر چہ من از حیات مے بینم

چوں خضر در میانۂ ظلمات — صاف آب حیات مے بینم

ابن یمین اپنے تصوف میں سوائے عشق کے اخلاق وغیرہ کو شامل نہیں کرتے اور ہر جگہ اصل مقصود کو چھوڑ کر فروع کی جانب کچھ توجہ نہیں کرتے اور اسی رنگ سے ان کا پورا دیوان مملو ہے سب سے زیادہ تعجب یہ ہے کہ باوجود تصوف کے نازک اور لطیف مسایل کے بیان کرنے کے بھی کہیں ان کے کلام میں شاعرانہ خوبیاں نظر انداز نہیں ہوتیں۔ اسلوب بیان اسقدر دلکش ہے کہ خواہ مخواہ تعریف کرنی پڑتی ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں۔

حدیث توبہ و تقوی ز شیخ شہر شنو رموز عشق ز مستان بے سر و پا پُرس

اسی شعر کو دوسرے قالب میں ڈھالکر حافظ نے یوں کہا ہے

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

مندرجۂ بالا غزل میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

خمار نرگس مستش ز ہوشیار مجوے جنوں حلقۂ زلفش ز عقل شید اپُرس

ایک اسلوب بیان ہی نہیں بلکہ شاعرانہ تمام خوبیاں اپنی اپنی جگہ پر اُن کے کلام میں موجود ہیں۔ جوش بیاں کا زور طرز ادا میں خوش سلیقگی۔ سادگی۔ مستانہ انداز۔ ترنم اور موسیقیت وغیرہ نے ملکر ان کے دیوان کو ایک چمن زار لطافت بنا دیا ہے جسمیں ہر قسم کے پھول موجود ہیں اس پر شیرینی زبان ایسی ہے کہ ان کے معاصرین میں نہیں ہے۔ حافظ کا کلام مستانہ صاف اور سادہ زباں میں ہے مگر وہ صرف ابن یمین کے ایک خوشہ چین ہیں اور اسی سے ان کے یہاں بعض وہ باتیں جو اکثر ابن یمین کے یہاں ہیں انکی مستانہ روش پر دھوکا ہوتا ہے کہ ایک شرابی جھومتا جھامتا اپنے نشہ کی ترنگ میں خوش ادائیگی کے ساتھ نغمۂ روح افزا سنا رہا ہے ملاحظہ ہو۔

ز چشم مست تو عشاق مے پرست شدند ہمہ سبوکش بزم مے الست شدند
ز بادہ ہائے فرح بخش غمزۂ ساقی بہ نیم جرعہ حریفان تمام مست شدند

دوش و سلسلۂ بادہ پرستاں بودیم از مے عشق ہمہ بیخود و مستاں بودیم
پیش از آنَدم کہ ز حیرت بجہاں نام برند ما بدیدار تو آشفتہ و حیراں بودیم

روز عید ست حریفاں سوی میخانہ رویم مے کشیم و بہ مصلا ہمہ مستانہ رویم

من بیا ولب میگوں تو ای ساقی جاں — از جہاں مست روم وصفِ مستاں خیز

من آسایش خوابِ اجلم ہر زہ مگوی — گر بخیزم بخیال رخ جانان خیز

اگرچہ انداز مستانہ کے ساتھ ہی ساتھ مندرجۂ بالا شعروں میں بھی موسیقیت کی بھی کمی نہیں ہے مگر ہم ترنم کے ذیل میں چند اور شعر بھی لکھتے ہیں جن کا ایک ایک لفظ نغمہ سے معمور ہے۔

منم محو جمال او نمیدانم کجا رستم — شدم غرق وصال او نمیدانم کجا رفتم

بآں مہ آشنا گشتم ز جاں و دل جدا گشتم — فنا گشتم فنا گشتم نمیدانم کجا رفتم

رہیں روے او بودم اسیر موی او بودم — غبار کوی او بودم نمیدانم کجا رفتم

بریت بسے دویدم بکجا رسیدہ باشم — ز جمال جانفزایت مہ من چہ دیدہ باشم

بکجا تواں رسیدن بحریم خلوت تو — ہمیں خوشم کہ عمرے زپیت دویدہ باشم

ابن یمین کے یہاں اسی صورت سے سیکڑوں غزلیں موجود ہیں جن کے الفاظ نہایت شستہ اور ڈھلے ہوئے ہیں۔ ابن یمین کا دیوان رباعیات سے بھی خالی نہیں ہے مگر وہ کچھ زیادہ قابل ذکر نہیں ۷۴۵ھ میں ابن یمین نے دنیائے فانی کو خیرباد کہا اور اپنے مولد فریومد میں مدفون ہوئے اب بھی ان کی قبر وہاں زیارت گاہ عوام ہے مرتے وقت اپنی تصنیف کردہ ایک رباعی پڑھتے رہے

منگر کہ دل ابن یمین پُر خوں شد — بنگر کہ ازیں سرائے فانی چوں شد

ذیل میں ایک مختصر اقتباس ان کے کلام کا پیش کیا جاتا ہے:۔

بار جفا و جور کشیدیم و کس نگفت — تا چند بار غم کشد این ناتوان ما

عمرے ست سر نہادہ بر آں آستانہ ایم — اما نگفت یار کہ ہست از سگانِ ما

ابن یمین بدرگہ او نالہ می کند — شاید ترحمے بکند دلستانِ ما

روزے کہ می شدیم جدا از وصال یار — بر حال ما گریست زمین و زماں جدا

دلدار وعدہ داد کہ سوئے تو بنگرم — من منتظر کہ کے شود آں وعدہ وفا

نے خاک را از کوئے خبر نے باد را از بوئے گل　　یارب کہ گوید حالِ من آں سروِ جوئے ناز را

ہر کجا ایم دل ما بجمال تو خوش ست　　ہرگز دمے ماہ نرفتست ازیں منزل ما

چو صبح چشم خود بکشایم از خواب　　بود بود دیدہ ام ذوقِ تماشا

در سر کویت غریب و بیکسم　　رحم کن بر دیدۂ خونبار ما

گو بچیزے نخرد بر در او کس مارا　　بندۂ آں سر کویم ہمیں بس مارا

عمرے ست تا بخاک درت سر نہادہ ایم　　باشد کہ پائے لطف نہی بر جبین ما

داشتم ابن یمیں من ہر سر و ساماں ولے　　ساخت آں بیرحم آخر بے سر و ساماں مرا

برو ابن یمین از کوئے خوباں　　کہ می میرم من حیراں ہم آنجا

سالہا ابن یمین بر خاک راہت خفتہ است　　بر امیدِ آنکہ بیند یک شبی رویت بخواب

افتادہ ایم بر در تو بیکس و غریب　　بر ما ترحمے بکن اے مہربان طبیب

خود گو کہ جان چگونہ بریم ای مراد جاں　　زاں نرگسے جانفزا و ازاں چشم دلفریب

در بزم قدح نوشاں یک بادہ فروشی ہست　　در مجلس سرمستاں سرمایۂ جوشے ہست

ای ابن یمین بلبل هر چند ز گل نالد
چون غنچه دل پرخون دریاکے خوشی هست

دلم میبرد و می خندید و می گفت
که چون این شیوه های دلربائی است

اگر داری وفا از سر گذر کن
که فکر سر درین ره بیوفائی است

ایجان بطرب کوش که دلدار قرین ست
ای دل بادب کوش که در پرده کسے ست

اے طبیبا ز حال ابن یمین
پرسشے کن که نیک بیمار ست

بعد عمرے چو بپرسیدن من آمدهٔ
زود مگذر که بدیدار تو آخر نفس ست

سالها ابن یمین در سر کوی تو فتاد
نگرای شوخ نگفتی که فلانے چه کس ست

حسرت عاشق از انست که در مقتل عشق
می شود کشته و لے در نظر قاتل نیست

ای ابن یمین هرگز بے داغ دلی نبود
تا آنکه درین عالم یک لاله عذاری هست

لب او در تکلم گرچه شیرین و شکر ریز ست
ولیکن چشم او بسیار شوخ و فتنه انگیز ست

نقاب از رخ برافگنده نگارم کاسه دارد
بیا می نوش ای زاهد چه وقت زهد و پرهیز ست

با دل صد پاره و جان حزین ابن یمین
از سر کوی تو رفت و سینهٔ افگار داشت

آن جمالے که درپس پرده ست
بود بے ما و لے ظهور نداشت

بود ابن یمین به کوی تو خوش
هیچ فکر بهشت و حور نداشت

سیر نا دیده رفت ابن یمین است دریغ
از سر کوی تو آخر به تمنا برخاست

روز ازل که بنام همه کس قرعه زدند
قرعهٔ عشق بنام من مسکین افتاد

حریفے کو شراب عشق نوشد
دو عالم را بیک جرعه فرو شد

دل خون گشته را ابن یمین با عهد او
چه شد گر پاره پاره کرده گلهای چمن سازند

ابن یمین تو این همه دیوانگی مکن
آخر سر تو زود بدیوار می رسد

سالها بودم بیاد او من دلخسته شاد
حالتے آمد که رفت آن یاد هم اکنون نیاد

کسے کو جام می بر عاشقان مست می گیرد
کرمها می کند افتادهٔ را دست می گیرد

با نام کسی فال به رندی نه بر آمد
این قرعه بنام من بیباک توان زد

آن طره را کسے که بدست صبا دهد
باشد که یک گره زده بر دست ما دهد

لاف دانش می زنند ابن یمین این مردمان
چون سر توقیع خود والله اعلم ساختند

صد آفرین به همت ابن یمین که او
تا سر بباخت در ره عشقت قدم نماند

در غمت ابن یمین را خبر از عالم نیست
در سر کوی تو خوش آمد و بے غم افتاد

ما بیاد لب او توبه شکستیم دگر
بر در میکده سرمست بگشتیم دگر

قدم دریغ مدار از فضاے دیدهٔ ما
چه حالتست که ماه سر حقاست هنوز

بگفتم از غم عشق تو سوختم چه کنم
بخنده گفت که ابن یمین کجاست هنوز

ابن یمین خوشم ز هر محنتے که هست
گر اشک حسرت ست و گر آه درد ناک

اگر مستی کنم عیبم مگوئید
که شب تا صبح در میخانه بودم

منال ابن یمین از چشم شوخش
میان مردمان افسانه بودم

پیرهن چاک بود در بر ما ابن یمین
چند روزے به غم دوست پریشان بودم

چو گل گفتیم رویش را گهی همچون مه تابان
ندانم از سر مستی که با او باز چها گفتم

به کوی میکده ابن یمین با یاد لعل او
در میخانه بشکستم حریفان را صلا گفتم

تا سر کوی یار منزل ماست
فارغ از صحن باغ و گلزاریم

بر هست لبے دو دیدم کجا رسیده باشم
ز جمال جانفزایت مه من چه دیده باشم

به کجا توان رسیدن به حریم خلوت تو
به همین خوشم که عمری ز پیت دویده باشم

گفتمش ای دلربا خون دل من ریختی
گفت رو ابن یمین بر تو ترحم کرده ایم

گر ناله کرد ابن یمین عیب او مکن
بیچاره گشت رفت چو صبر و ثبات او

ای دل برآ از خانقه اندر سر بازار شو
هر که یابی بے او قربان آن بیمار شو

گفتیم که بیهوشی ما از چه سزا ایست
هر غمزهٔ ساقی همه کردند حواله

غنچه بودی ای گل اکنون واشدی
آفت صد بلبل شیدا شدی

ای مغنی چه صدا بود که در گوش زدی
آتشے در دل و جان من مدهوش زدی

"آرگس"

دین مسیحی یا آفتاب پرستی

(گزشتہ سے پیوستہ)

یسوع کا جی اٹھنا

جس طرح یسوع کی پیدایش کی تاریخ محقق نہیں ہے اسی طرح ان کی موت کی تاریخ بھی تحقیق نہیں ہوئی ابتدائی زمانہ کے عیسائی یسوع کے مرنے کی تاریخ میں کوئی تہوار نہیں مناتے تھے، لیکن شروع ہی زمانہ میں وہ ایک محفل ان کے جی اٹھنے کی یادگار میں قائم کرتے تھے، جو دن کہ اس کے لئے مقرر کیا گیا تھا وہ وہی تھا، جس دن کفار قدیم سورج دیوتا اور تمام نیچر کے جی اٹھنے کی عید مناتے تھے۔ وہ دن تھا اڈونس کے جی اٹھنے[1] کا۔ اُس دن اڈونس کے عابد ایک دوسرے کو ان الفاظ کے ساتھ مبارک باد دیتے تھے کہ "اڈونس جی اوٹھا" ایسٹر کے دن شروع زمانہ کے عیسائی ایک دوسرے کو ان الفاظ میں مبارکباد دیتے تھے کہ "یسوع جی اٹھا" ہر وہ شخص جو ایسٹر کی اصلیت پر غور کریگا اسی نتیجہ پر پہونچے گا۔ ....

.... کہ یسوع کے جی اٹھنے کی خوشی اور عید کی اصلیت پُرانے زمانہ کے اُن مراسم میں مضمر ہے جو موسم بہار کے واپس آنے کی خوشی میں ہوتی تھیں[2]

ایک مذہبی رسم کی ادائیگی کے موقعہ پر چقماق سے آگ جھاڑ کر ایک موم بتی روشن کی جاتی ہے اور اس کو یسوع کا قایم مقام سمجھا جاتا ہے۔ پھر خدا سے جو تمام روشنیوں کا خالق ہے یہ دعا مانگی جاتی ہے کہ اس روشنی کو برکت دے! اور زمین کو خوشخبری دیجاتی ہے اور اس سے کہا جاتا ہے کہ وہ خوش ہوجائے کہ تاریکی سے نکل گئی جس میں وہ گھری ہوئی تھی جب یہ رسم ختم ہوجاتی ہے تو ایک تین کونوں کا چراغدان رکھا جاتا ہے جس میں پندرہ بتیاں ہوتی ہیں۔ اس چراغدان کے سامنے نماز ہوتی ہے اور ایک ایک کرکے تمام بتیاں بجھا دی جاتی ہیں، صرف وہی بتی روشن رہتی ہے، جو چقماق سے جلائی گئی تھی اور اس کو چراغدان کے سب سے اوپر رکھدیا جاتا ہے پھر اسی بتی کو قربان گاہ کے پیچھے لے جاتے ہیں، جس کے یہ معنی ہیں کہ وہ مقبرے میں پہونچ گئی۔ ادھر وہ ہوتا ہے ادھر تمام نمازی ایک گیت گاتے ہیں اور جن کرسیوں یا بنچوں پر لوگ بیٹھے ہوتے ہیں ان کو خوب زور زور سے پیٹتے اور شور

---

[1] اڈونس کا یا ہیلس کا۔ روم میں ہیلس کے جی اٹھنے کی عید ۲۵ مارچ کو منائی جاتی تھی۔ [2] اصل میں ایسٹر اس اتوار کو منایا جاتا تھا جو موسم بہار کے بعد آتا تھا قدما کا خیال تھا کہ پہلے ہفتہ کے پہلے دن یعنی اتوار کو روشنی پیدا ہوئی تھی۔ یسوع خود روشنی ہیں، اس لئے ان کا سال کے سب سے پہلے اتوار کو جی اٹھنا لازمی قرار پایا۔ مگر چونکہ عروج آفتاب ہر سال اتوار کو نہیں ہوتا اس لئے یسوع کے جی اٹھنے اور روشنی کے پیدا ہونے کی عید اس اتوار کو قرار پائی جو عروج آفتاب سے قریب ترین ہو کچھ زمانے کے بعد کلیسا نے موسم بہار کی چاند کی چودھویں تاریخ کے بعد جو اتوار آتا ہے اس کو قرار دیا یہی وجہ ہے کہ اس تہوار کی تاریخ مقرر نہیں، بلکہ ہر سال بدلتی رہتی ہے۔

مچاتے ہیں اور یہ سب کچھ اس شور و شغب کے مشابہ ہے جو نجات دہندہ کے مرنے سے پہلے دنیا میں پیدا ہوا تھا۔ جب یہ نماز ختم ہو جاتی ہے تو وہ بتی پھر لاکر چراغدان پر رکھدی جاتی ہے اور اس کے یہ معنی لئے جاتے ہیں کہ یسوع پھر جی اٹھے۔

جنوبی افریقہ کے بعض قبائل خاص کر ہوٹن ٹاٹ میں ایک عجیب خیال ہے وہ یہ کہانی بیان کرتے ہیں کہ "بہت زمانہ گزرا کہ چاند نے ایک خرگوش اپنی طرف سے انسانوں کے پاس ایلچی بناکر بھیجا اور یہ کہلوا یا کہ جس طرح چاند مرتا اور پھر زندہ ہوجاتا ہے اسی طرح وہ بھی کریں گے۔ لیکن خرگوش نے پیغام پہونچانے میں غلطی کی اور اس نے یہ کہدیا کہ چاند کی طرح تم لوگ بھی مروگے مگر چاند کی ہدایت کے خلاف یہ کہا کہ پھر تم زندہ نہ ہوسکوگے۔"

اسی لئے ہوٹن ٹاٹ حشر کے قائل نہیں ہیں اگر ہوتے تو عیسائی علماء الہیات کا سا اعتقاد رکھتے۔

یسوع کا آسمان پر چڑھ جانا

یسوع کا آسمان پر چڑھ جانا بھی علم نجوم کے خرافات میں سے ہے[۱] یہ دوزخ میں جانے کے اعتقاد کا ایک حصہ ہے یا بہ تبدیل الفاظ طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کا مقابلہ ہے جس طرح کہ آفتاب نصف النہار پر پہونچکر غروب کی طرف مائل ہوجاتا ہے اسی طرح یسوع بھی جو آسمان پر چڑھ گئے تھے بہت جلد دنیا میں آجائینگے۔

یسوع اور خدا کا کلام

جب یسوع آسمان پر چلے گئے تو اب ان کے دنیا میں واپس آنے کا انتظار شروع ہوا۔ اس زمانہ قرب میں عیسائیوں نے یہ چنا شروع کیا کہ یسوع کو جو اب خدا بن گئے تھے، دیوتاؤں، یا خود خدا کے خاندان میں کس طرح جگہ دی جائے۔ یہ خاندان تین ہستیوں میں محدود کیا گیا جس دن کہ خدا نے دنیا پیدا کی اسی دن سے اس نے دو ذریعے اختیار کئے ایک سانس دوسرے کلام۔ سانس سے غیر منتظم ہونے کے جراثیم پیدا ہوتے ہیں اور کلام سے جان پیدا ہوتی ہے سوچتے سوچتے آخر عیسائیوں نے یہ قرار دیا کہ خالق الکل خدا کے یہ دونوں ذرائع خود خدا ہیں۔ ایک کا انھوں نے "کلام" نام رکھا اور دوسرے کا "روح القدس"[۲]

[۱] اناجیل کے انسانوں کے موافق بطریق اینوش اور الیاس نبی آسمان پر آگ (روشنی) کی گاڑی میں لے جائے گئے تھے (غالباً سورج کی گاڑی سے مطلب ہوگا) تمام رومی بادشاہ بھی مرنے کے بعد سیدھے آسمان پر جاتے رہے ہیں۔ یسوع کا آسمان پر جانا جو جی اٹھنے کی دوسری صورت ہے صرف دو حواریوں نے بیان کیا ہے۔

[۲] قدیم زمانہ کے لوگوں کے نزدیک "کلام" اور "خیال" کا وہی تعلق تھا جو بیٹے کا باپ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور ایک کو دوسرے سے وابستہ رکھتا ہے۔ کلام خدا، خیال خدا کا بیٹا سمجھا گیا جس میں خدا یا باپ، حلول کئے ہوئے ہے باپ کے حکم سے بیٹا بول پڑا اور اس کے پہلے ہی لفظ نے روشنی پیدا کردی روشنی چونکہ منتظم دنیا کا غیر منفک ولازمی ذریعہ ہے اس لئے وہی تمام چیزوں کی خالق تسلیم کرلی گئی۔ یسوع روشنی تو پہلے ہی بن چلے تھے اب انھوں نے جو صورت بدلی تو وہ کلام خدا ہوگئے اور وہ مخلوق الہی سب سے فرد اول چیز بن گئے پولوس نے صاف کہا ہے کہ "یسوع ہی میں سب چیزیں پیدا کی گئیں زمین ہو یا آسمان، وہ چیزیں ہو جو نظر آتی ہیں یا وہ چیزیں جو نظر نہیں آتیں... تمام چیزیں ان ہی کے ذریعے اور ان ہی کے لئے پیدا کی گئیں۔"

افلاطون کا قول ہے کہ سب سے پہلی چیز خدا ہے، سب سے پہلے اصول کا بیٹا نطق ہے جس کو اس نے اپنی صورت پر بنایا تھا دنیا کی روح باپ اور بیٹے سے پیدا ہوئی افلاطون اور اشراقیوں سے آباء کلیسا نے تثلیث کا اصول لیا کارڈنیل پلاوی سینی بہت صحیح کہتے ہیں کہ "اگر یونانی فلسفی اور یونانی فلسفہ نہ ہوتا تو کلیسا کے پاس اس کے بہت سے اصول نہ ہوتے کسی کارڈنیل سے اتنی صاف گوئی کی امید نہ رکھنی چاہئے مگر سولھویں صدی میں یہ لوگ آزادی کے ساتھ جو کچھ چاہتے تھے لکھ ڈالتے اور زبان سے کہہ ڈالتے تھے۔

یسوع کو دیوتاؤں میں جگہ دینے سے بہت عرصہ پیشتر اصول تثلیث بن چکے تھے چونکہ تین کا ہندسہ متبرک سمجھا جاتا تھا اور روایات سے بھی اس کے مبارک ہونے کی تائید ہوتی تھی نیز اس کی جگہ کچھ اور نہیں رکھا جا سکتا تھا اسلئے یسوع کو "کلام خدا" قرار دیدیا گیا یعنی وہ (کلام خدا) ان تین متبرک ہستیوں میں سے ایک تھا جس سے وہ کام منسوب ہو سکتے تھے جو یسوع نے اپنی زندگی میں کئے اور اب بھی کریں گے۔

یسوع کی واپسی کی اُمید اور انتظار

قریباً ایک ہزار سات سو پچاس برس گزرے کہ رہوان اور لائنس وغیرہ کے عیسائیوں کو یہ اہم اور ضروری اطلاع ایشیا کوچک کے عیسائیوں نے دی کہ فریجیا کے ایک بت پرست برہمن مونٹانوس نے یہ کہا ہے کہ اس کو "زندہ خدا" نے یہ بشارت دی ہے کہ مسیحا کے آنے کا وقت بہت قریب آ گیا ہے۔

یہ وہ وقت تھا کہ قریباً ایک صدی سے عیسائی اپنے استاد کی واپسی کا بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ خود یسوع نے یہ کہا تھا کہ "میں بہت جلد آسمان کے بادلوں میں واپس آؤنگا تاکہ دنیا میں امن پیدا کر دوں اور اپنے ایمانداروں کے ساتھ دنیا میں بادشاہت کروں۔ میرا دار السلطنت یروشلم ہوگا، مگر وہ قدیم یروشلم نہیں، جو یہودیوں کا دار السلطنت رہا تھا، بلکہ ایک نیا[۱] یروشلم جو سونے اور قیمتی لکڑیوں کا بنا ہوگا اور میرے ہی ساتھ آسمان سے اتریگا" تقریباً اٹھارہ سو برس ہوئے جب مونٹانوس نے ٹھیک وہ مقام تبلا دیا جہاں خدا کا یہ شہر قائم ہوگا تو تمام عیسائیوں کے دلوں میں خوف خدا طاری ہو گیا کہ بس اب دنیا کا خاتمہ ہے بیویوں نے اپنے شوہروں کو چھوڑ دیا اور پوری تمارنیت شروع ہو گئی یعنی اخلاق کی تعلیم انجیل نے دی تھی اسپر لفظاً و معناً عمل ہونے لگا۔ غرض رہون اور لائنس وغیرہ میں ایک آفت برپا ہو گئی؟ یہاں تک کہ ایرین یوس شہر سمرنا سے بھاگ کر وہاں پہونچے کیونکہ علمار کلیسا میں سے سب سے پہلے یہی صاحب تھے جنھوں نے مسیحا کی واپسی کا اصول گڑھا تھا، اور یہ اصول تمام عیسائیوں کا جزو ایمان ہو گیا تھا[۲]۔

اس پیشینگوئی کے پورا نہونے کا نتیجہ

جب یہ ہنگامہ برپا ہو چکا اور مونٹانوس کی پیشینگوئی بھی پوری نہیں ہوئی تو عیسائیوں کو سخت شرمندگی ہوئی اور انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس کے یہ معنی نہیں ہے کہ یسوع جھوٹے پیغمبر تھے، بلکہ ان کے الفاظ کے لفظی معنی کئے گئے ہیں۔

---

[۱] عیسائیوں نے روم کو نیا یروشلم قرار دیدیا تھا [۲] اس کی تفصیل راقم کی کتاب اخبار الاندلس میں قابل دید ہے۔

اب لوگوں کا اس پر اتفاق ہوگیا کہ ان کے الفاظ کے لفظی معنی نہیں کرنے چاہئیں، بلکہ یسوع نے جو کچھ کہا ہے وہ مرموز الفاظ میں کہا ہے "خدا کا شہر" آسمان سے نہیں اترے گا بلکہ اس کے معنی آسمان کے ہیں جہاں وہ برگزیدہ خدا اپنے تقدس کی وجہ سے رہتا ہے اور جب دنیا کا خاتمہ ہوگا تو وہ اور آگے بڑھیگا اور آسمانوں ہی پر خدا کے ساتھ رہیگا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ دنیا کا خاتمہ کب ہوگا؟ یہ سوال ایسا ہے کہ جس کے حل کرنے کے لئے عیسائیوں کی نسلیں کی نسلیں گزرتی چلی جارہی ہیں اور نہیں حل ہوتا، لاکھوں عیسائیوں کی عقلیں ہیں کہ اسی ادھیڑ بن کی مصیبت میں گرفتار ہیں اور مصیبت ختم نہیں ہوتی۔ امید یہ کی جارہی ہے کہ ایک وقت آئیگا کہ یک لخت ایک ہی دن میں ساری بے انصافیوں کا خاتمہ ہوکر انصاف ہوجائیگا۔ مگر کتنے افسوس کا مقام ہے کہ یہ وقت نہیں آتا اور آسمان کے دروازے ہمیشہ کے لئے سختی کے ساتھ بند ہیں کسی ایک عیسائی کو بھی "باپ" کا اعتبار نہیں رہا، کسی کو اس کی طرف سے کوئی موہوم امید بھی باقی نہیں رہی؛ وہ گونگا، بہرا، اندھا ہے اور اپنے خاص بندوں عیسائیوں کی دعاؤں کی طرف اپنا دل بھی متوجہ نہیں ہونے دیتا۔ کیا یہودیوں کا تجربہ کافی نہیں ہے کہ ان کا مسیحا نہ آیا پر نہ آیا؟ لیکن "بیٹے" سے تو بہت کچھ امیدیں تھیں کسی طرح وہی اپنا وعدہ پورا کرے اور چلا آئے!

جن لوگوں کے دل اعتقاد سے معمور اور تھوڑی بہت امیدوں سے بھرپور ہیں وہ اب بھی کہے جاتے ہیں کہ "وہ اس طرح آئیگا جیسے رات کو چور؟ ایسے وقت آئیگا کہ کسی کو اس کا انتظار نہو گا" لیکن ان لوگوں کی تعداد زیادہ ہے جن کا شیشہ انتظار و امید بالکل چکنا چور ہوچکا ہے، وہ اس کو بھی نہیں مانتے اور کسی نئے تسلی دہندہ کا انتظار کر رہے ہیں۔

یسوع کے بعد روح القدس

ایسی حالت میں طبعی امر یہ ہے کہ ان کی امیدگاہ کچھ اور ہو؛ یعنی تثلیث کی تیسری ہستی روح القدس۔ یہ خیال ابیلارڈ اور اسیسی نے پیدا کیا اور لوگوں کے دلوں میں ڈالا تھا۔ ۱۲۵۴ء میں ان دونوں فرانسسکن علماء نے تو یہاں تک نوبت پہونچا دی تھی کہ انھوں نے پیرس میں یہ اعلان کیا کہ ایک تیسرا "عہد نامہ" شایع کیا جائیگا جو انجیل کا اسی طرح قایم مقام ہوگا جیسا کہ وہ (انجیل) پرانے عہد نامہ کی تھی۔ چونکہ روح القدس کی کوئی مادی شکل نہیں تھی وہ عوام الناس میں بالکل مقبول نہیں ہوا نئے معبود کی طرف کسی نے بھی توجہ نہیں کی لوگوں کی نگاہ میں روح القدس کی قدر و منزلت کم ہوئی اس لئے کچھ زیادہ عرصہ نہوا تھا کہ ایک اور ہستی کا عروج ہوا؛ وہ کون؟ مریم عذرا!

روح القدس کے بعد مریم عذرا

نوع انسان، سب سے پہلے انسان کے گناہ کی وجہ سے تباہ و برباد ہوئی اس واسطے یہ ضروری تھا کہ آدم کے گناہ کے واسطے یسوعؑ کفارہ بنیں تاکہ انسان کا جرم انسان ہی کی نیکی سے معاف ہوجائے۔

لہ عیسائی عالم الہیات کی یہ ایک خصوصیت ہے کہ جب کسی آیت کی بیہودگی ثابت ہوجاتی ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ فلاں آیت خاص مرموز معنی رکھتی ہے اس کے لفظی معنی لینا غلط اور خطرناک ہیں۔

یہ امر تسلیم کرنے کے قابل ہے کہ مرد نے گناہ کیا تھا، مگر کیا اس میں عورت شامل نہ تھی؟ کیا وہ عورت ہی نہ تھی جس نے مرد کو اس گناہ کی طرف مائل کیا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ عورت ہی نے تو مرد سے گناہ کرایا تھا حوّا بھی ویسی گنہگار تھیں جیسے کہ آدم، بلکہ اور زیادہ اس واسطے انسان کو خدا سے تعلق پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ عورت کا بھی کفارہ کیا جائے اسی خیال کے موافق ایک عورت نجات دہندہ کی تلاش ہوئی مریم عذرا اس غرض کے لئے بہت آسانی کے ساتھ موجود تھیں اُن ہی کو انتخاب کر لیا گیا۔

جب یہ ہو چکا تو اب اندھوں کا دیکھنا بہروں کا سننا، لنگڑوں کا چلنا یسوع کے نام اور کام سے نہ ہوگا بلکہ مریم کے نام سے ابتدأً عیسائی یسوع کے حمل بلا دنس کے قایل تھے، اور اب ایک نیا افسانہ یہ گڑھا گیا کہ مریم کا ایک کنواری کے پیٹ میں جانا بلا دنس تھا اب ہم کو یہ امید کرنی چاہیے کہ اگر مقدس کنواری کے معاملہ پر غور ہوتا رہا تو اس کا تمام افسانہ یسوعؑ کے افسانہ سے ماخوذ ہوگا، جس طرح کہ خود یسوع کا افسانہ قدیم زمانہ کے تمام دیوتاؤں کے افسانہ سے ماخوذ ہے

فباتی حدیث بعدہ یومنون

محمد خلیل الرحمٰن

رادھا

(فسانہ)

سوبھا پور پر ہنوز تاریکی طاری تھی اور حزین وملول ستاروں کی خنک درخشانی ابھی تک زائل نہ ہوئی تھی، لیکن گاؤں کی گلیوں اور چوپالوں میں آثار حیات پیدا ہو چلے تھے، کیونکہ گاؤں کے رہنے والے جو بہت تڑکے جاگنے کے عادی ہوتے ہیں اس حقیقت سے واقف رہتے ہیں کہ ستاروں کی مضمحل جھلملاہٹ صبح کی نزدیکی کا اعلان ہے۔

آہستہ آہستہ روشنی کی لکیر افق سے نمودار ہو کر پھیلنے لگی، ستارے ـــــــ ایک ایک کرکے غائب ہونے لگے اور رات کی سیاہی رفتہ رفتہ اس طرح گم ہوگئی جیسے کوئی سیاہ چادر تھی جو لپیٹ کر کہیں دور پھینک دی گئی ہو

پھوس کے بے قاعدہ بنے ہوئے جھونپڑے، کچھ پختہ اور کچھ خام دیواروں کے نیچے نیچے مکان، گیہوں کے پکے ہوئے کھیتوں کے درمیان کہیں کہیں نظر آتے تھے اور ان سنہرے کھیتوں کی وسیع فضا سے دور شمال میں برف پوش ابر کی سفید لکیر آسمان کی صاف دھلی ہوئی نیلگونی سے ملکر اس منظر کی تصویر کے لئے نہایت خوشنما بیک گرونڈ بنی ہوئی تھی۔ انھیں کھیتوں کے درمیان سے ایک نظر نہ آنے والا تپلا سا راستہ گاؤں کے بڑے کنوئیں تک جاتا تھا جہاں صبح وشام عورتیں اور بچے پانی بھرنے جمع ہوتے، اور تھوڑی دیر کے لئے اچھا خاصہ ہنگامہ پیدا کر دیتے تھے۔ کلسوں کی آواز، چاندی کے زیوروں کی جھنکار، بچوں کا شور، لڑکیوں کے بے حجاب قہقہے، بہوؤں کی زیر نقاب تبسم آمیز آہستہ آہستہ گفتگو، بڑی بوڑھیوں کے دودھ دہی کے قصے اور کھیتی کے معاملات پر باہم تبادلۂ خیالات، یہ تھے تمام عناصر اُس چہل پہل اور آبادی کے جو گاؤں میں صرف کنوؤں کی حلگت پر نظر آسکتی ہے۔

چونکہ ابھی بہت سویرا تھا اس لئے کنوئیں پر دور کے دھند ھلکے میں ایک ہی عورت نظر آتی تھی جو سر سے پاؤں تک گاڑھے کے موٹے اور بھدے لباس میں لپٹی ہوئی تھی اور اسی کا گھونگھٹ اس کے چہرہ کو چھپائے تھا۔ اس کے سر پر چمکتا ہوا پیتل کا گھڑا رکھا ہوا تھا۔ اور وہ ایک ایسے انداز رفتار کو ساتھ جسکی نقل ہی نہیں ہوسکتی ایک خاص لچک نرمی اور بیساختہ پن لئے ہوئے کنوئیں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ایک ہات اس کا کمر پر تھا اور دوسرے سے گھونگھٹ کئے ہوئے تھی، نہ اس کے حسین بازو پر کوئی زیور تھا، نہ اس کی نازک کلائی میں چوڑیاں تھیں، اور نہ چلنے میں کوئی جھنکار پیدا ہوتی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ پاؤں میں خلخال بھی نہیں ہے۔

یہ ہندو بیوہ تھی، اپنے شوہر کے موت کی معصوم مجرم تھی، اور ذلت و رسوائی، بیکسی و بیچارگی کی سنسان زندگی صرف موت کی آرزو میں بسر کر رہی تھی، اس کو کتنا زمانہ اس حال میں بسر کرنا تھا؟ اس اٹھارہ سال کی نوجوان بیوہ کو اس کی کیا خبر ہو سکتی تھی، جس کے شباب کا ایک ایک لمحہ پہاڑ بنا ہوا تھا۔

کنویں پر پہونچکر گھڑا جگت پر رکھا، گنڈری اتار کے قریب ہی پھینکدی اور کچھ اس انداز سے بیٹھکر دم لینے لگی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ جسم سے زیادہ اس کی روح تھکی ہوئی ہے۔ لیکن اس کے پاس وقت کم تھا اور وہ زیادہ عرصہ تک آرام نہ لے سکتی تھی کیونکہ پانی بھرنے والوں کا ہجوم ہونے ہی والا تھا۔ اور اسے لڑکوں کے مذاق اور سہاگنوں کے طعن و تشنیع سے جو اس کی بدقسمتی اور نحوست پر آوازے کسا کرتی تھیں سخت صدمہ پہونچتا تھا جس سے بچنے کے لئے وہ بہت سویرے آتی اور چکر کاٹ کر سنسان راستے سے واپس جاتی تھی۔

شادی ہونے کے بعد صرف اٹھارہ مہینے تک اس کا محبوب شوہر زندہ رہا اور یہ زمانہ وہ تھا جب وہ اپنے آپ کو گانوں کی نہایت خوش نصیب بہو، گھر کی مسرت، اور شوہر کے دل کی ملکہ سمجھتی تھی، ڈیڑھ سال نہ گزرا تھا کہ دفعتہً اس کا پیارا شوہر گھر کا دیوتا جس کی زندگی سے اس کی مسرت وابستہ تھی دفعتہً بیمار ہوا اور اس سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا، اس طرح کہ اولاد کی صورت میں اپنی کوئی نشانی بھی اس نے نہ چھوڑی۔ ساس کا یہ طعنہ کہ منحوس میرے بیٹے کو کھا گئی، نندوں کا یہ الزام کہ سبز قدم ہمارے بھائی کو نگل گئی، گانوں والوں کا یہ کہنا کہ گانوں کو ایک خوبصورت نوجوان لڑکے سے محروم کر گئی۔ وہ یہ دل میں زخم ڈالدینے والی باتیں سنتی اور .... کبھی امنڈ کر آنے والے آنسوؤں کو پی جاتی اور کبھی موقعہ ملتا تو کونے میں بیٹھکر ان سے اپنا دامن تر کر لیتی۔ وہ ساس کے مظالم، نندوں کی سختیاں، معاشرت کی ذلت، فاقوں کی تکلیف برداشت کر لیتی، وہ یہ بھی باور کر لیتی کہ ۲۴ گھنٹے تک مسلسل سخت محنت کرنے کے بعد بھی اسے تھکنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے لیکن وہ اس الزام کو کسی طرح برداشت نہ کر سکتی تھی کہ شوہر کے موت کا باعث وہی تھی۔ وہ حیران تھی کہ کیونکر لوگ ایسا کہہ سکتے ہیں جب کہ وہ اپنے شوہر کو بیماری سے بچا لینے یا اب دوبارہ اس کو زندہ دیکھنے کے لئے بدترین طریقہ کی موت بھی نہایت مسرت کے ساتھ قبول کرنے کے لئے آمادہ تھی اور ہے۔ بعض وقت وہ اس خیال سے پاگل ہو جاتی کہ لوگ اسکے درد دکھ کا اندازہ کیوں نہیں کرتے، اس پر جو غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے لوگ اسے کیوں نہیں دیکھتے، وہ جس کرب و درد میں تڑپنے کے لئے تنہا چھوڑ دی گئی ہے اس کی طرف سے دنیا نے کیوں آنکھیں پھیر لی ہیں۔

آج صبح کو جب اس کا حزن و ملال انتہائی حد تک پہونچکر اس کے دل کو بالکل افسردہ کر چکا تھا، اور ضبط اس کے اختیار سے باہر تھا، حسب معمول کنویں پر پہونچی اور ڈول کنویں کے اندر ڈال کر سوچنے لگی کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ وہ سوچتی

جاتی تھی اور ڈول ٹپکتا ہوا، کنویں کے اندر گرنے والے قطروں سے ایک خاص قسم کی آواز پیدا کرتا ہوا اوپر آرہا تھا جب وہ کنارہ تک آگیا تو یہ اس کے لینے کو جھکی اور اس کے صاف پانی میں اپنی دھندلی سی تصویر اسے نظر آئی وہ پہلے جھجکی اور اسے یقین نہیں آیا کہ آسی کی صورت ہے کیونکہ جب سے اس کا شوہر مرا تھا اس نے کبھی اپنا چہرہ نہیں دیکھا تھا اور اب وہ اپنی صورت سے بھی بالکل ناآشنا ہوگئی تھی۔ اس نے پھر ہمت کرکے اپنا سوگوار مگر جمیل چہرہ اس میں دیکھا اور اس قدر متاثر ہوئی کہ جب ڈول کا پانی گھڑے میں ڈالا تو دو چار قطرے اس کے آنسو کے بھی اس میں شامل ہوگئے۔ اس نے چاہا کہ جھک کر گنڈری سر پر رکھے اور گھڑے کو لیجائے، لیکن وہ پھر رک گئی اور خاموش کھڑی ہوکر کچھ سوچنے لگی۔

بارہا ایسا ہوا کہ جب وہ کنویں پر پانی بھرنے آئی تو واپس جانے کو جی نہ چاہا، آج بھی وہ کنویں کے کنارے کھڑی ہوئی کچھ یہی سوچ رہی تھی، اس کا ایک ہات پتھر کے ستون پر تھا اور وہ اندر کی خنک تاریکی کو جھانک رہی تھی کہ ظلم، تکلیف اور بیکسی کی دنیا سے آزاد ہونے کے لئے یہ راستہ کتنا صاف، مختصر، اور آسان ہے۔ صرف ایک لمحہ کی ہمت وجراءت اور چند لمحول کی جسمانی ایذا پھر اس کے بعد لانہایت سکون۔ ابدی آزادی۔ فرامشیِ دوام!

وہ جانتی تھی کہ اکثر بدنصیب عورتیں مصائب سر سے گزر جانے کے بعد یہی آسان طریقہ آزادی کا اختیار کرتی ہیں اور خود بھی اس نے آج کی طرح بارہا اس پر عمل کرنا چاہا لیکن ہمیشہ اس کے شباب نے اس کے دل کے اندر سے یہ مخفی پیغام پہونچایا کہ چند دن اور صبر کر، چنانچہ وہ اب تک انتظار کرتی رہی یہانتک کہ اسے آخر کار یہ یقین آگیا کہ اب اگر زندگی کے پاس کوئی انعام مجھے دینے کے لئے ہوسکتا ہے، تو وہ صرف ایک ہی ہے جس کا نام "موت" ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اسے جلد سے جلد نہ حاصل کرلیا جائے۔

یہ خیال کرکے اس نے ستون سے ہات ہٹایا، سیدھی تن کر کھڑی ہوئی اور دونوں ہتیلیاں آگے کرکے آپس میں ملائیں لیکن جست کرنے سے قبل اس نے یہ یقین حاصل کرنے کے لئے کہ یہاں کوئی اور تو نہیں ہے پیچھے مڑکر دیکھا ہی تھا کہ ہلکی سی چیخ کے ساتھ اس نے ہات علیحدہ کرلئے اور شرما کر الگ ہٹ گئی۔

ایک اجنبی ہات اس کے بازو پر تھا جس کے مس نے اس کے چہرہ پر شرم کا ہلکا رنگ دوڑا دیا تھا اور وہ سر جھکائے ہوے خاموش کھڑی ہوئی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

—— "رادھا"

—— "رادھا، رادھا، ادھر دیکھو، میری طرف دیکھو"

—— "یہ تم کیوں اسقدر جان سے بیزار ہو، کیا وہ ذپو یا تج دنیا میں دلوں پر حکومت کرنے کے لئے

آئی ہیں، زندگی کے صحیح لطف سے واقف نہیں ہوتیں"

گزشتہ تین سال کے عہد بیوگی میں یہ پہلے الفاظ محبت و خلوص تھے جو اس کے کانوں میں پڑے۔ باوجود اس کے کہ وہ حد درجہ شرمیلی اور عفت مآب تھی، لیکن ان الفاظ نے اس کے روح پر وہی اثر کیا جو خشک کھیتی پر بارش کا پہلا چھینٹا کرتا ہے وہ دماغ میں نشہ سا محسوس کرنے لگی، ایک خاص لذت دل میں پیدا ہوئی، دیکھنے لگی، تھوڑی دیر تک خاموش رہی صورت حال پر غور کرتی رہی، مختلف کیفیت کا تجربہ کرتی رہی اور جب اجنبی کے بار بار اصرار نے اُسے یقین دلا دیا کہ وہ بغیر جواب لئے یہاں سے نہ جائے گا، مجبور ہو کر بولی کہ "تمھیں نہیں معلوم کہ میں بیوہ ہوں۔ حقیقی موت تو مجھ پر تین سال ہوئے جبھی طاری ہو چکی تھی۔ اس لئے اب جسمانی موت کا مجھے کیا ڈر ہو سکتا ہے۔ جاؤ اپنی راہ لو، اور مجھے مرنے دو، تم کیوں ایسی بدنصیب کے لئے اپنا دل دکھاتے ہو"

یہ کہکر وہ ہٹی اور پھر اس نے وہی ارادہ کیا جو پہلے کیا تھا لیکن اجنبی نے اسے پھر روکا، زیادہ مضبوط گرفت کے ساتھ روکا اور بولا "نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، تیری اور موت کے درمیان میں اپنا جسم حائل کر دونگا، میں گانوں کے جاہل لوگوں کی طرح نہیں ہوں، میں نے کتابیں پڑھی ہیں، بہت سے شہروں میں پھرا ہوں، اور میں جانتا ہوں کہ یہ لوگ بیوہ لڑکیوں کے ساتھ کیسا بُرا سلوک کرتے ہیں لیکن میں تو تجھپر کوئی الزام نہیں رکھتا، تجھے منحوس نہیں کہتا، میں تو تجھ سے محبت کرتا ہوں، تیرے سامنے اس دل کو پیش کرتا ہوں جسپر اس سے قبل کسی نے حکومت نہ کی تھی"

وہ اپنے جذبات شباب کو اس طرح آہستہ آہستہ توی الفاظ میں ظاہر کرتا جا رہا تھا کہ دوسرے کسی عورت کے قہقہہ کی آواز آئی اور رادھا گھبرا کر بولی کہ "الگ ہو جاؤ، دیکھو وہ خوش نصیب سہاگنیں ہنستی بولتی آ رہی ہیں ان سے مذاق کرو مجھے تنہا چھوڑ دو"

—— "کبھی نہیں، میں اسوقت تک نہ جاؤنگا جب تک تم اپنے ارادہ سے باز آکر قسم نہ کھاؤ گی، کیونکہ مجھے تم سے پھر ملنا ہے"

—— "اچھا جاؤ میں قسم کھاتی ہوں"

—— "تم یہاں روز آتی ہو"

—— "ہاں، اچھا تم ہٹو تو سہی"

دو منٹ کے بعد نوجوان قریب کے کھیت میں غائب ہو گیا، اور رادھا دھوپ میں اپنا چمکتا ہوا گھڑا لئے ہوئے اسطرح دیر تک کھڑی رہی جیسے اسے گہرے خواب سے کسی نے بیدار کر دیا ہو۔ تھوڑی دیر بعد جب عورتوں کی آواز قدم اور قریب آئی تو اسے ہوش آیا اور اس نے کھیت کے اس حصہ پر نگاہ ڈالتے ہوئے جسمیں وہ اجنبی غائب ہوا تھا گھڑا سنبھالا اور جلدی

جلدی قدم اٹھاتی ہوئی گھر کی طرف چلدی۔

(۲)

مئی کی گرمی ہے اور صبح سے رادھا حسب معمول گھر جھاڑنے، کھانا پکانے، برتن مانجنے اور سینے پرونے میں مشغول ہے، لیکن آج اس کا دل نسبتاً مطمئن ہے اور وہ ایسا محسوس کر رہی ہے جیسے اس کے گرتے ہوئے جسم کو کسی نے سہارا دیدیا ہو ساس نندیں بدستور بُرا بھلا کہ رہی ہیں، جھڑک رہی ہیں، برہم ہو رہی ہیں، لیکن وہ دیکھتی ہے کہ آج طعن تشنیع کے الفاظ میں وہ نیش نہیں رہا جو پہلے پایا جاتا تھا اور نہ گھر والوں کے جبین پیشانی میں اتنا زہر اُسے ملا ہوا نظر آتا ہے۔ کیونکہ اسکے دماغ کے سامنے اگر کوئی چیز تھی تو صرف اجنبی کے یہ الفاظ کہ "میں پھر تجھ سے ملونگا، میں تجھے نحوس نہیں سمجھتا"

اس کا کیا مطلب ہوسکتا ہے۔ شادی کی کوئی امید نہیں۔ پھر اس کے آگے اسنے کچھ سوچنا بھی نہیں چاہا۔ اس کا دماغ منتشر تھا، اس کے دل میں کوئی ایسی تمنا پیدا ہو رہی تھی جس کو وہ کسی نام سے موسوم نہ کرسکتی تھی، ایک نیلگوں چادر پر اسکے ہات کے سریع حرکت ٹانکے پر ٹانکے چھوڑتی جا رہی تھی اور ہر مرتبہ جب اس کی چٹکی سوئی کو کپڑے سے نکال کر باہر لاتی تھی تو یہ خیال ساتھ ساتھ ہوتا تھا کہ "کیا واقعی کل کا دن آئے گا، کیا حقیقتاً کل وہ مجھ سے پھر ملیگا"

آفتاب کی پہلی کرن طلوع ہوئی تھی کہ رادھا حسب معمول کنوئیں پر پہنچی اور اس نے پھر ستون کا سہارا لیا اور پھر کنوئیں کے اندر تاریک پانی کو دیکھا جس نے ۲۴ گھنٹہ قبل ایک خاص کشش اپنے اندر ظاہر کی تھی وہ پانی کو دیکھکر مسکرائی ہلکی سی جنبش گردن کو دی اور ادھر ادھر کی فضا میں نگاہ ڈالتی ہوئی ڈول کو آہستہ آہستہ کنوئیں میں ڈالا۔

—— کوئی حرکت نہیں، کوئی علامت حیات نہیں ——!

لیکن ابھی بہت سویرا تھا۔ دھوپ ابھی درختوں کی چوٹیوں سے نیچے نہیں اتری تھی اپنا ڈول بھر بھر کر گھڑے میں ڈالتی جاتی تھی اور یہی سوچ رہی تھی۔ آج گھڑا بھرنے میں معمول سے زیادہ دیر لگی، اس نے بہت جی لگا کر پانی بھرا، آج اُسے یہاں زیادہ ٹھہرنے میں تکلیف بھی نہیں ہوئی، لیکن پھر بھی آخر کب تک، روشنی بڑھتی جا رہی تھی اور وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں اس اجنبی کا بھی وعدہ ویسا ہی ضعیف نہ ثابت ہو۔

جیساکہ اس کے شوہر کے حیات کا پیمان وفا۔ وہ پانی بھرنے کے بعد ایک ہات کمر پر اور دوسرا گھڑے پر رکھے ہوئے کھڑی تھی اور انتظار کر رہی تھی اس حال میں کہ اس کی آنکھیں قصداً قریب کے کھیت سے بھری ہوئی تھیں اور دل میں کہہ رہی تھی

کہ آج آفتاب کس قدر جلد بلند ہوتا جارہا ہے ابھی تک کنوئیں پر کوئی اور نہ تھا اور دور دور کسی آدمی کا پتہ نہ تھا کووں کا ایک جھنڈ شور کرتا ہوا اس کے سر سے گزرتا ہوا گانوں کی طرف چلدیا پھر دور سے چیل کی غمگین آواز سنائی دی اور پھر اسکے منھ سے بھی مایوسی کی ایک سانس نکلی وہ گھڑے کو اٹھانے کیلئے مڑی تھی کہ اجنبی اس کے سامنے اور وہ ایک سنگین بت کی طرح بے حس وحرکت ہوگئی ۔ خوشی کی ہلکی چیخ کے ساتھ وہ اس کے پہلو کی طرف آیا ۔ لیکن رادھا ۔ اس جرأت سے شرما کر جس سے کام لیکر اس نے اجنبی کی پزیرائی کی تھی، چہرہ کو گھونگھٹ میں چھپا لیا اور اسکی حریص نگاہوں کے سامنے سے اپنی صورت ہٹالی ۔

اجنبی ایک ہلکی ہنسی کے ساتھ اس ادا پر ہنسا اور ہات بڑھا کر اس کا گھونگھٹ علیحدہ کردیا اور شانہ پر ہات رکھ کر بولا "کیوں رادھا، تم نہیں چاہتی کہ میں تمھاری صورت دیکھ کر اپنے دل کو تسکین دوں، کیا تم کو میری مسرتوں کے خون کردینے پر کچھ افسوس نہ ہوگا"

محبت بھرے لب ولہجہ کے جوش اور" مضبوط مردانہ ہات کے گرفت نے دفعۃً" رادھا کے اندر اس "عورت" کو بیدار کردیا جو اس کے دل میں سو رہی تھی آخر کار وہ آپ کو اس خوش بختی کے سپرد کردینے پر مجبور ہو ہی گئی ۔

اکثر بلکہ روز صبح کو رادھا اس اجنبی سے ملتی اور اس ایک گھنٹہ کی مسرت اس کے لئے بادۂ صبوحی سے کم نہ ہوتی تھی جس کے نشہ میں وہ دن کے بقیہ گھنٹوں کی محنت وتکلیف کو بالکل بھول جاتی تھی ۔ وہ موجودہ زندگی پر بالکل قانع تھی اور اس سے زیادہ انعام وہ خدا سے کوئی نہ چاہتی تھی کہ یہی حالت جس نے اس کے شباب کو از سرنو زندہ کردیا تھا عرصہ تک قائم رہے، لیکن گوپال چونکہ مرد تھا اس لئے صرف اسپر قناعت نہ کرسکتا تھا اس نے ایک صبح کہا "اے رادھا اس طرح زندگی کب تک بسر ہو سکے گی کیوں نہ اب ہم تم ایک ہوکر باہم آزادی کے ساتھ زندگی بسر کریں" یہ کہکر اس نے اپنی آغوش میں اس کی کمر کو لینا چاہا، لیکن جھجک کر علیحدہ ہوگئی اور بولی "گوپال یہ کیا کہتے ہو تمھارا اس سے کیا مطلب ہے ۔ میں بیوہ ہوں، اس لئے کیونکر تمھارے ساتھ رہ سکتی ہوں ۔ کاش میں نے تمھیں نہ دیکھا ہوتا"

یہ کہکر اس نے اپنا سر گوپال کے شانہ پر ڈالدیا اور ایک بچہ کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی"

"دیکھو، میں نے ایک تدبیر سوچی ہے ۔ یہ سچ ہے کہ ہم کھتریوں میں بیوہ کی شادی کا دستور نہیں ہے، لیکن کیوں نہ سکھوں کے اصول کے مطابق تمھارے سر پر ایک زعفرانی چادر ڈال کر ہمیشہ کے لئے تمھیں اپنا بنالوں اس کے لئے ایک گواہ کی ضرورت ہوتی ہے کیا کوئی ایسا آدمی ہے جو تمھاری طرف سے گواہ کی خدمت انجام دے اور کسی سے اس کا ذکر نہ آئے"

"ہاں ہے میں ایسی ایک عورت سے واقف ہوں، لیکن گوپال سچ بتاؤ کیا اس وقت دنیا میں کوئی عورت ایسی نہیں ہے

جس کے حقوق مجھ سے فائق ہوں "

"نہیں نہ میرے بیوی ہے نہ ماں، عرصہ ہوا دونوں مر چکی ہیں"

"لیکن یہ تو سوچ لو کہ ایسا کرنے سے تم برادری سے خارج ہو جاؤ گے، ذلیل ہو جاؤ گے، کوئی تم سے بات کرنا پسند نہ کریگا کیونکہ میرے خسر سے سب ڈرتے ہیں۔ علاوہ اس کے میرے خسر کو معلوم ہوگا تو وہ تم کو مار ڈالیگا ------ نہیں گوپال، میں تمھاری زندگی کو خطرہ میں نہ ڈالونگی، ایک دفعہ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ مرد کی زندگی عورت کے لئے کسقدر ضروری ہے"

"رادھا، یہ کیا کہتی ہو، لیکن برادری کس کی ذات پات، میں کسی کی پروا نہیں کرتا میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ میں تمھیں لیکر کہیں دور چلا جاؤنگا اور پھر چند دن کے بعد دنیا اس قصہ کو فراموش کر دیگی اور کسی کو خیال بھی نہ آئے گا کہ رادھا کون تھی اور کہاں چلی گئی۔

(۳)

رات کے دو بجے ہیں اور سارے گاؤں کے سب لوگ چاندنی رات میں آسمان کے نیچے غافل و مدہوش پڑے ہوئے ہیں۔ مٹی کی چھتوں پر، گلیوں میں، مکانوں کے صحن میں، کہیں قطار در قطار، کہیں جھنڈ کی صورت میں چادر لپیٹے ہوئے لوگ سو رہے ہیں دفعتہً گنپت رام کے مکان میں دالان کے اندر سے سفید چادر میں لپٹی ہوئی ایک عورت نکلی آہستہ آہستہ چاندنی میں آئی اور کچھ جھجکتی ہوئی گھر سے باہر نکلی

رادھا کے لئے گھر سے چھپ کر نکلنا بہت آسان تھا کیونکہ اس کو اجازت نہ تھی کہ وہ سب کے ساتھ کوٹھے پر سوئے بلکہ گرمی کے ایام میں بھی وہ نیچے کوٹھری میں تنہا سلائی جاتی تھی۔ جس وقت وہ باہر نکلی تو اس کی سہیلی انندا جس نے اس کی طرف سے گواہ بننے کا وعدہ کیا تھا موجود تھی۔ یہ دونوں آہستہ آہستہ چاندنی سے بچتی ہوئی، درختوں کا سایہ ڈھونڈھتی ہوئی چلیں اور جب گاؤں سے باہر ہو گئیں تو انھوں نے اطمینان کی سانس لی گوپال ایک یکہ لئے ہوئے وہاں موجود تھا اس نے فوراً زعفران سے رنگی ہوئی چادر، رادھا کے سر پر ڈالی اور گود میں اٹھا کر یکہ میں بٹھایا، رادھا نے انندا پر آخری نگاہِ رخصت ڈالی اور یکہ روانہ ہو گیا ....

....

موضع ریواں کے زمیندار انند رام کے کوٹھے پر چار عورتیں ایک حلقہ میں بیٹھی ہوئی گاؤں کے واقعات وحالات کا ذکر کر رہی ہیں۔ اگست کے مہینے کا آفتاب ایک گھنٹہ ہوا کہ غروب ہو چکا ہے لیکن ابھی تک اس کی گرمی باقی ہے۔

ایک ۱۶ سال کی نوجوان لڑکی نے انگلی اٹھا کر کہا " یہ بالکل صحیح خبر ہے، میں نے جمنا سے سنا اور جمنا نے خود گنگا دیں سے کہ

رادھا بیوی نہیں ہے بلکہ وہ تو بیوہ ہے یہ کیسی شرم کی بات ہے چار مہینے ہوئے کہ وہ ہم سے ایسی گھل مل گئی کہ ہم اس کو بالکل اپنا ہی سمجھے۔ سوبھا پور سے ایک آدمی گنگا دین کے یہاں آیا تھا اور اس سے معلوم ہوا کہ گوپال اپنے گانوں سے ایک بیوہ کو لیکر بھاگ گیا اور پتہ نہیں کہ کہاں ہے۔ ایک بڑھیا نے سنکر کہا۔ "ہے، ہے، یہ مرد بھی کتنے بیوقوف ہیں۔ کیا انھیں کنواری لڑکیاں نہیں ملتیں جو ایسی نازیبا حرکتیں کرتے ہیں۔ جب برادری سے خارج ہو جائیں گے۔

"جب سارے کھتری اس کی دوکان سے چیزیں لینا چھوڑ دیں گے، جب برادری میں کھانا پینا بند ہو جائیگا اس وقت ہوش آئیگا اور تب معلوم ہوگا کہ خوبصورت چہرہ زیادہ قابل قدر چیز ہے یا خوبصورت سکہ"

اگر اس بڑھیا کا کہنا لفظ بہ لفظ صحیح نہیں نکلا، تو قریب قریب اس کے ضرور ہوا کیونکہ رفتہ رفتہ جب گانوں والوں کو سارا حال معلوم ہوا تو سب نے متفقہ طور پر گوپال کو چھوڑ دیا اور اس سے کاروبار بند کر دیا چونکہ گوپال ذرا ضدی طبیعت کا انسان تھا اس لئے اول اول تو اس نے جرأت کے ساتھ ان تکالیف کا مقابلہ کیا اور رادھا سے اپنے مصائب کو چھپاتا رہا لیکن کب تک۔ ایک وقت آیا کہ اس نے حقیقت کی تلخی کو شدت سے محسوس کرنا شروع کیا اور رادھا بھی سمجھ گئی کہ گوپال کسی خاص فکر میں مبتلا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ رادھا کی محبت بدستور اپنے حال پر قائم تھی۔ اس کی پرستاریوں کا وہی عالم تھا۔ لیکن ایک مرد تو عورت کی طرح صرف محبت کی زندگی بسر نہیں کر سکتا، اس لئے گوپال کبھی کبھی رات کی بے چین کروٹوں میں اُس لمحہ پر تنقید کیا کرتا تھا جب اول اول رادھا کی موہنی صورت دیکھ کر عقل و حواس کھو بیٹھا تھا

ہوا بند تھی اور اگست کی گرمی شباب پر کہ ایک شام کو گوپال نے سوسائٹی کے متفقہ قوت کے سامنے اپنی شکست کا اعتراف کر لیا۔ صحن میں تنہا کھڑا ہوا ایک چھوٹے سے سرخ کاغذ کو دیکھ رہا تھا جو اس کے ہات میں دیا گیا تھا اور دل ہی دل میں کہ رہا تھا کہ یہ چیں کی نیند سلا دینے کے لئے کافی ہے اور اس سے بہتر ذریعہ تکالیف و مصائب کے دور کرنے کا اور کوئی نہیں ہوا تھا۔ چار راتیں گزر گئی تھیں کہ اس کی پلک سے پلک نہیں لگی تھی اور آخر کار جب پانچویں رات آئی تو اس کے ہمتوں نے جواب دیدیا وہ ایک دکان سے افیون لے آیا مگر صرف اس خیال سے کہ روزانہ شام کو تھوڑی سی کھا لیا کریگا تاکہ نیند آ جائے، لیکن پھر اس نے سوچا کہ کیوں نہ دفعتہً اس کو کھائے تاکہ پھر وہ کبھی نہ جاگ سکے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر میں مر گیا تو بھی دنیا کو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے اور کون مجھ پر رونے والا بیٹھا ہے۔ لیکن فوراً اسے رادھا کا خیال آیا اور اس کا دل پھٹنے لگا۔ اتنے ہی میں رادھا آ گئی اور گوپال نے اس اضطراب کے ساتھ جو مجرم کی طرف سے ہمیشہ ظاہر ہوتی ہے اپنی مٹھی بند کر لی تاکہ رادھا افیون کو نہ دیکھ سکے، مگر چونکہ محبت کی نگاہ بہت تیز ہوتی ہے اس لئے اس نے دیکھ لیا کہ کوئی چیز مٹھی میں اُس نے چھپائی ہے اور اس نے گھبرا کر دریافت کیا "یہ کیا ہے؟ تم کیوں ایسے گھبرائے ہوئے ہو۔ کیا تمھاری

طبیعت اچھی نہیں ہے کیا تم کوئی دوا لائے ہو۔"

وہ یہ سنکر مایوسی کی ہنسی ہنسا اور بولا "ہاں یہ ایک دوا ہے جو ہمیشہ کے لئے میری بیماریوں کو دور کردیگی"۔ رادھا کے سمجھنے کے لئے اس کی ہنسی کافی تھی، وہ فوراً سمجھ گئی اور تھوڑی دیر تک حیرت سے اس کا منھ تکتی رہی اور موقع کی اہمیت اور وقت کی نزاکت کا خیال کرکے اس نے اس کی مٹھی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور گوپال کے چہرہ پر نگاہ تجسس ڈالتی ہوئی بولی "کیوں صاحب" کیا ارادہ تھا، تم نے مجھ سے کیوں چھپایا کیا تم مجھ کو تنہا چھوڑکر آرام کی نیند سونا چاہتے تھے، کیا انصاف اسی کو کہتے ہیں؟ بولو۔ اب بولتے کیوں نہیں ہو۔

رادھا کی صورت اور اس کے غیر معمولی محبت نے گوپال کو پھر بزدل بنا دیا اور بولا کہ "میں تم سے جھوٹ نہ بولوں گا" واقعی میرا یہی ارادہ تھا اور اب بھی یہی ہے کیونکہ تکلیفیں حد سے گزر گئی ہیں اور میں بالکل مجبور ہوں۔ یہ سنکر رادھا یکایک اس کے قدموں پر گر پڑی اور بولی کہ "یہ ساری مصیبت میری ہی لائی ہوئی ہے، اور میں بہت شرمندہ ہوں کہ میری وجہ سے تم پر ایسا سخت وقت آکر پڑا، لیکن یہ تو دیکھو کہ اگر تم کو میری محبت عزیز نہیں ہے اور تم صرف میری وجہ سے اپنی زندگی کو ضروری نہیں سمجھتے، تو اس ہستی کے لئے زندہ رہو جو بہت جلد ہم دو کو تین بنا دینے والی ہے اس کی سیاہ آنکھیں جو محبت کے جذبہ سے چمک رہی تھیں اور جن میں اسوقت انتہا سے زیادہ حکم و فرمان کی کیفیت پیدا تھی، اوپر اٹھیں جن کو دیکھتے ہی گوپال کی مٹھی ڈھیلی ہوگئی اور رادھا نے فوراً وہ پڑیا لیکر اپنے آنچل میں باندھ لی۔

(۴)

گوپال اپنی تجارت اور مال و اسباب کے نقصان کو گوارا کرکے رادھا کو ساتھ لیکر دور کسی گاؤں میں چلا گیا اور اس میں شک نہیں کہ جس مشقت و محنت کی زندگی وہ بسر کررہا ہے وہ ایک شخص کے لئے حد درجہ تکلیف دہ ہوگئی ہے لیکن جسوقت وہ دن بھر کی مزدوری کے بعد شام کو گھر آتا ہے اور ننھا سا بچہ ہمک کر اس کی گود میں جاتا ہے تو رادھا کا وہ محبت بھرا تبسم جس سے زیادہ تسکین دینے والی چیز دنیا میں کوئی نہیں ہوسکتی، تمام تکلیفوں کو محو کردیتی ہے اور صبح کو پھر وہ تازہ قوت کے ساتھ زمین کھودنے اور پتھر کاٹنے کے لئے رادھا پر محبت بھری نگاہ ڈالتا ہوا روانہ ہوجاتا ہے۔

غالب۔مومن۔ذوق

یہ تینوں بزرگ ہم عصر تھے اور مسلم استاد۔ سب کی زبان شستہ اور بندشیں پختہ لیکن استادی کا خاتمہ یہیں نہیں ہوجاتا شاعری اور اصلی شاعری کی وسعتیں اور آگے بڑھتی ہیں اس کے لئے شاعرانہ مشاقی، پرگوئی، زودگوئی بلکہ صرف خوشگوئی بھی کافی نہیں شاعری ذہن کا زمانہ زرین ہے۔ وہ تخیل کے پروں سے اڑتی اور فضائے روحانی میں چکر لگاتی ہے۔ شاعری ایک نغمہ ہے کہ ہر شخص اسکو سن سکتا ہے۔ لیکن کم لوگ ہیں جو اس سے حقیقی لطف حاصل کر سکتے ہیں اور بہت کم ہیں جو اسکو گا سکتے ہیں نفس شاعری ردیف و قافیہ، وزن و بحر کی قیود سے بھی آزاد ہے۔ ہر اچھوتا خیال ایک شعر ہے اور ہر خوبصورت اظہار جذبات ایک غزل لیکن اس میں شاعری بحر و وزن اور قافیہ و ردیف کی محتاج ہے اور بے شبہہ یہ چیزیں اس کے لئے زینت و آرایش ہیں شاعری اصل میں جذبات کو نغمہ کی شکل دیدینے کا نام ہے۔ یا دل کو الفاظ کی صورت میں منتقل کردینے کے لئے جو مناسب ہو اور الفاظ جو موزوں ہوں۔ لیکن اس میں شاعری عموماً اسی طرح کی جاتی ہے کہ ایک قافیہ کو ذہن میں رکھکر اس کے متعلق مضمون تلاش اور نظم کیا جاتا ہے یہ صورت بھی شاعر کے مخصوص اسلوب بیان اور پایۂ تخئیل کے اظہار میں مانع نہیں ہوتی شاعر ہر حالتمیں شاعر ہے اور اس کی خصوصیات ہر جگہ نمایاں۔

ہم بحر و ہم قافیہ اشعار میں مختلف شاعروں کی رسائی فکر و رفعت تخئیل، تلاش الفاظ و اسلوب بیان کے مقابلہ کا خوب موقع ملتا ہے۔ نمونہ کے طور پر ہم غالب۔ مومن اور ذوق کے چند اشعار کا موازنہ کرتے ہیں، غالب شاعری کے لئے پیدا ہوئے تھے اور شاعری اُن کے لئے ان کے علو تخئیل کا یہ عالم ہے کہ دلی سے لیکر آج تک یہ بلندی کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ مومن بھی شاعرانہ طبیعت اور عاشقانہ دل لائے تھے ان کی طبیعت میں ایک مزہ تھا اور یہ سچ ہے کہ لطافت تخئیل، رفعت فکر اور جدت بیان میں غالب کے بعد مومن ہی کا درجہ ہے۔ ذوق صرف مشاق تھے قادر الکلام تھے، استاد تھے اور بس انکی پرواز سطح زمین سے صرف چند گز بلند ہے۔ ماوراء السحاب و مافوق السماء ان کی رسائی سے بلند تر ہیں۔ زبان پر ان کے بڑے احسانات ہیں لیکن حقیقت شعری ان کی ممنون نہیں وہ ان دل والوں میں نہ تھے جن کی ہر آہ مرثیۂ دل اور ہر کراہ دیوان درد ہوتی ہے۔ ان کی طبیعت میں مزہ نہ تھا اسی لئے ان کی شاعری بھی بے مزہ ہے۔

زمین مقابلہ (زباں کے لئے۔ فغاں کے لئے) میں غالب کے ۱۴ شعر ہیں جنمیں ۵ شعر کا قطعہ مدحیہ شامل ہے۔ مومن کے ۱۴ ذوق کے ۲۸۔ غالب کا گہرا رنگ یہاں نہیں ہے۔ مومن کی رنگینی بڑی حد تک روشن ہے۔ ذوق اپنی پوری رنگا رنگی کیساتھ

چمک رہے ہیں۔ بہت زور لگایا ہے اور اس میں شک نہیں کہ خوب خوب شعر نکالے ہیں، لیکن بس شعر ہی شعر ہیں، شاعری کچھ نہیں

ذوق نے "آسمان" کا قافیہ چار جگہ باندھا ہے

نہیں ثبات بلندی عز و شان کیلئے کہ ساتھ اوج کی پستی ہے آسماں کیلئے

ہزار لطف ہیں جو ہر ستم میں جاں کیلئے ستم شریک ہوا کون آسماں کیلئے

دم عروج ہے کیا فکر نردباں کیلئے کمند آہ تو ہے بام آسماں کیلئے

بلند ہووے اگر کوئی میرا شعلۂ آہ تو ایک اور ہو خورشید آسماں کیلئے

چاروں شعروں میں کوئی بلند اور نیا خیال نہیں۔ صرف "ہزار لطف" والے شعر میں البتہ ایک لطف ہے۔ مومن نے ایک بات پیدا کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

نہ پائے یار کے بوسہ نہ آستاں کیلئے عبث میں خاک ہوا میل آسماں کیلئے

لیکن غالب کا مطلع اور تخیّل کا عجیب نمونہ ہے۔ ذوق کے "پر لطف" شعر کے ساتھ پڑھیے اور دونوں کو بار بار پڑھکر موازنہ کا لطف اٹھائیے کہتے ہیں

نوید امن ہے بیداد دوست جاں کیلئے رہی نہ طرز ستم کوئی آسماں کیلئے

اب تینوں کی "زباں" آرائی ملاحظہ ہو۔ ذوق کہتے ہیں

مزہ یہ دل کیلئے تھے نہ تھے زباں کیلئے سو دل میں ہم نے مزے سوزش نہاں کیلئے

بیاں درد محبت جو ہو تو کیونکر ہو زباں نہ دل کے لئے ہے نہ دل زباں کیلئے

یہی موجیں ہیں کہ سطح آب سے بلند نہیں ہوتیں

مومن کا شعر ہے اور کس قدر با مزہ ہے

مزہ یہ شکوے میں آیا لبِ مزہ ہوئے وہ میں تلخ کام رہا لذت زباں کیلئے

مضمون کی شگفتگی کے ساتھ مزہ اور بے مزہ کا تفاوت "تلخ کام" کا انتخاب اور "لذتِ زباں" کی ایجاد بھی دیکھئے غالب کے ہاں یہ قافیہ قطعہ مدحیہ میں ہے۔ لیکن رنگ غزل سے خالی نہیں اور اپنے لطف بیاں کے سبب سے قبول عام و بقائے دوام کا مالک ہے۔

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے

آشیاں کا قافیہ دیکھئے۔ ذوق کے ہاں پھر وہی قافیہ پیمائی ہے

صبا جو آئے خس و خار گلستاں کیلئے
قفس میں کیونکہ نہ پھڑکے دل آشیاں کیلئے

مومن کا مضمون دیکھئے۔

کہاں وہ عیش اسیری کہاں وہ امن قفس
ہے بیم برق بلا روز آشیاں کیلئے

غالب نے خوب مثال پیدا کی ہے۔

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کیلئے

''جاوداں'' کے قافیہ میں ذوق نے بہت زور لگا کر ایک بات پیدا کی ہے

اگر امید نہ ہمسایہ ہو تو خانۂ یاس
بہشت ہے ہمیں آرام جاوداں کیلئے

مومن نے بھی اس قافیہ پر پوری قوت صرف کی ہے۔ لیکن اس ''کوہ کندن'' کا نتیجہ ''کاہ برآوردن'' نہیں ہوا بلکہ اپنے زور ایجاد سے دلچسپ مضمون پیدا کر سکے۔ فرماتے ہیں۔

خلاف وعدۂ فردا کی ہم کو تاب کہاں
امید یکشبہ ہے یاس جاوداں کے لئے

غالب نے جو شعر کہا ہے وہ اس قدر بیساختہ ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہنے میں ایک منٹ بھی صرف نہ ہوا ہوگا۔ خضر کا مضمون عام ہے لیکن شاعری کی جدت طرازی نے شوخ مقابلہ کر کے خوب شعر بنا دیا ہے ''چور بنے'' کا ٹکڑا بہت پر لطف ہے سنئے۔

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کیلئے

''امتحان'' کا قافیہ ذوق کے ہاں دیکھئے۔ ذہن کی رسائی یہیں تک ہے

وہ مول لیتے ہیں جسدم کوئی نئی تلوار
لگاتے پہلے مجھی پر ہیں امتحاں کے لئے

مومن کا اسلوب بیان قابل دید ہے

بھلا ہوا کہ وفا آزما ستم سے موئے
ہمیں بھی دینی تھی جاں سکے امتحاں کیلئے

غالب کا مضمون اور انداز بیاں غالب ہی کا حصہ ہے

فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
دراز دستی قاتل کے امتحاں کیلئے

''جہاں'' کا قافیہ ذوق نظم فرماتے ہیں۔

بنایا آدمی کو ذوق ایک جزو ضعیف
اور اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کیلئے

خالص میاں جی گری ہے۔

مومن کی وارفتگی ملاحظہ ہو کیا خوب کہا ہے۔

جنونِ عشقِ ازل، کیوں نہ خاک اڑائیں ہم جہاں میں آئے ہیں ویرانیِ جہاں کے لئے

غالب کی جوبات ہے نرالی ہے۔ رشک کے عجیب عجیب مضمون لکھے ہیں کہ اکثر شاعروں کا تصور بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا انھیں عجائبات میں سے ایک اعجوبۂ روزگار یہ بھی ہے

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفت رشک بلائے جان ہے ادا تیری اک جہان کے لئے

تینوں کے ہم قافیہ اشعار یہی تھے۔ ان سے تینوں کی ذہنیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اور اب دو دو کا مقابلہ دیکھئے بعض قافیے مومن و ذوق نے لکھے ہیں غالب نے نہیں لکھے۔ بعض غالب و مومن کے ہاں ہیں ذوق کے ہاں نہیں۔ مرگ ناگہاں کا بہانہ ذوق و مومن دونوں نے تلاش کیا ہے ذوق نے صرف سامنے پڑی ہوئی چیز اٹھالی ہے مومن نے اپنے سحر سے اس کو گلدستہ بنا دیا ہے ذوق لکھتے ہیں

اشارہ چشم کا تیری یکایک ہو قاتل ہوا بہانہ مری مرگ ناگہاں کیلئے

مومن کا شعر ہے

دعا بلا تھی شب غم سکونِ جاں، کیلئے سخن بہانہ ہوا مرگ ناگہاں کیلئے

"فغاں" کا قافیہ دیکھئے

ذوق :- مثال نے ہے مرا جب تلک کہ دم میں دم فغاں ہو میرے لئے اور میں فغاں کے لئے

"دم میں دم" کو پھر ایک مرتبہ پڑھکر دیکھ لیجئے

مومن :- حجاب چرخ بلا ہے ہوا کرے بیتاب فغاں اثر کے لئے اور اثر فغاں کے لئے

غالب و مومن کے ہاں ایک قافیہ "پاسباں" کا مشترک ہے۔ مومن کے نشتر چنے جائیں تو ان میں ایک تیز نشتر یہ ہے جس کی تعریف نہیں ہوسکتی فرماتے ہیں۔

ہے اعتماد مرے بخت خفتہ پر کیا کیا وگرنہ خواب کہاں چشم پاسباں کے لئے

غالب نے بھی جو مضمون نکالا ہے اور جس انداز سے لکھا ہے اس کے مزے دل ہی لیتا ہے۔ زبان قلم قاصر ہے۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی اٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

اگر تینوں غزلوں کے ۵۶ شعر ملا کر ایک غزل فرض کرلی جائے تو اس میں یہی دو شعر انتخاب ہیں۔ مقابلہ ختم ہوا اب تینوں غزلوں کے باقی شعر بھی سن لیجئے کہ ان میں اچھے شعر بھی موجود ہیں۔

ذوق

فروغ عشق سے ہے روشنی جہاں کیلئے — یہی چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کیلئے
سدا تپش پہ تپش ہے دل تپاں کیلئے — ہمیشہ غم پہ ہے غم جان ناتواں کیلئے
حجر کے چومنے ہی پر ہے حج کعبہ اگر — تو بوسے ہم نے بھی ہیں سنگ آستاں کے لئے
نہ چھوڑ تو کسی عالم میں راستی کہ یہ شے — عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کے لئے
جو پاس مہر و محبت کہیں یہاں بکتا — تو مول لیتے کسی اپنے مہرباں کے لئے
خلش سے عشق کی ہے خار پیرہن تن زار — ہمیشہ اس ترے مجنون ناتواں کے لئے
تپش سے عشق کی یہ حال ہے مرا گویا — بجائے مغز ہے سیماب استخواں کے لئے
مرے مزار پہ کس وجہ سے نہ برسے نور — کہ جان دی تری روئے عرق فشاں کے لئے
الٰہی کان میں کیا اس صنم نے پھونک دیا — کہ ہاتھ رکھتے ہیں کانوں پہ سب اذاں کے لئے
نہیں ہے خانہ بدوشوں کو حاجت ساماں — اثاثہ چاہیئے کیسا خانہ کماں کے لئے
نہ دل رہا نہ جگر دونوں جل کے خاک ہوئے — رہا ہے سینہ میں کیا چشم خونفشاں کیلئے

اس شعر کا موازنہ غالب کے ایک شعر سے ہو سکتا ہے۔ غالب کا قافیہ "خونچکاں" ہے مضمون وہی کمی خون کا ہے لیکن غالب نے اپنی بات الگ ہی نکال لی۔ کس انداز سے کہتے ہیں۔

بلا سے گر مژہ یار تشنۂ خوں ہے — رکھوں کچھ اپنی بھی مژگاں خونچکاں کے لئے

اب ذوق کی غزل پوری کر لیجئے۔

نہ لوح گور پہ مستوں کے ہو نہ ہو تعویذ — جو ہو تو خشت خم ہے کوئی نشاں کے لئے
صریح چشم سخن گو تری کہے نہ کہے — جواب صاف ہے پر طاقت و تواں کے لئے
رہے ہی ہول کہ برہم نہ ہو مزاج کہیں — بجا ہے ہول دل ان کے مزاجداں کے لئے
چلے ہیں دیر کو مدت میں خانقاہ سے ہم — شکست توبہ لئے ارمغان مغاں کے لئے
وبال دوش ہے اس ناتواں کو سر لیکن — لگا رکھا ہے ترے خنجر و سناں کے لئے

ان میں سے دو شعر جن پر صاد ہے مجھے پسند ہیں۔ مومن کے باقی اشعار یہ ہیں۔

مومن
سین نہ آپ تو ہم بوالہوس سے حال کہیں — کہ سخت چاہیئے دل اپنے رازداں کے لئے

لیا ہے دل کے عوض جان ہی رقیب تو دوں
میں اور آپ کی سوداگری زیاں کیلئے

مضمون نکالا لیکن اس معاملہ میں سوداگری کے تصور سے طبیعت ابا کرتی ہے۔

وہ لعل روح فزا دی کہاں تلک بوسے
کہ جو ہے کم ہے یہاں شوق جانفشاں کے لئے

ملے رقیب سے وہ جب سنا وصال ہوا
دریغ جان گئی ایسے بدگماں کے لئے

یہ شعر مومن خاں کے خاص رنگ کا ہے۔ مقطع خوب کہا ہے

روان فزائی سحر حلال مومن سے
رہا نہ معجزہ باقی لب بتاں کے لئے

غالب کے قطعہ کو چھوڑکر غزل کا صرف مقطع باقی ہے اور اس کو اس مضمون کے خاتمہ کا پیراگراف سمجھئے

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کیلئے

حامد حسن قادری

شکست کی آواز

(فسانہ)

شاہدہ نے ایف اے تک کی تعلیم پائی تھی باپ گو سب جج تھا
لیکن مذہبیت اسکے رگ و پے میں ساری تھی۔ شاہدہ پر بھی اس کا
کچھ نہ کچھ اثر ضرور پڑا اور شاید یہی سبب تھا کہ وہ دوسری جدید تعلیم یافتہ
لڑکیوں کی طرح آزاد و بیباک نہ تھی۔ اس میں شک نہیں کہ پردہ کا
اُسے بہت زیادہ خیال نہ تھا، لیکن سر بازار کھلی گاڑی میں سیر
بھی نہیں کرتی تھی، اردو ادبیات سے بھی دلچسپی رکھتی تھی جیسا
آج کل ہر نوجوان مرد اور عورت کا رنگ ہے۔ رسالہ پروین کی
وہ دلدادہ تھی اور اس کے مدیر کے ذوق ادب اور حسن انتخاب
کی مداح۔ اس رسالہ کا مشہور مضمون نگار "میں ہوں اپنی شکست
کی آواز" جسنے مدیر تک سے اپنا نام چھپا رکھا تھا شاہدہ کی نظر
میں چڑھا ہوا تھا وہ اسکی تحریر کی عاشق تھی اور اس کا نام معلوم
کرنے کے لئے بیتاب۔ بارہا اس کے دل میں خیال آیا کہ اگر
اس گمنام فسانہ نویس کے ساتھ زندگی بسر ہوتی تو خوب ہوتا،
رسالہ ہمیشہ اس کے زیر نظر رہتا اس کے تازہ نمبر میں پہلا
افسانہ "پیمان وفا" گمنام فسانہ نویس کے قلم سے نکلا تھا۔
شاہدہ اس کو بار بار پڑھتی اور کہتی "پیمان وفا" کتنا اچھا فسانہ ہے
فسانہ کا ہیرو واقعہ ہے۔ ظالم نے اس فسانہ کے لئے کیا پیاری
سرخی اختیار کی ہے۔ شادی کو پیمان وفا کہنا اپنے اندر کتنی شعریت
رکھتا ہے۔ شادی عروسی سب مکروہ اور پامال الفاظ ہیں اگر دنیا میں
ہر شادی پیمان وفا ہوتی تو دنیا بہشت ہو جاتی۔ شادی اگر پیمان وفا
نہیں ہے تو دنیا کے ہر گناہ کبیرہ سے بدتر "پیمان وفا" افسانہ
کی سرخی نام کے بجائے "میں ہوں اپنی شکست کی آواز" کسقدر
پر معنی ہے۔ فسانہ نگار شعر مجسم ہوگا۔

افسانہ کے لفظ لفظ سے درد ٹپکتا ہے۔ اس مصرع میں
جذبات کے کتنے محشر پوشیدہ ہیں۔ شاید "میں ہوں اپنی
شکست کی آواز" کی زندگی بڑی پُر حسرت رہی ہے اور اگر
اب تک نہیں رہی ہے تو ہو کر رہیگی میں تو اس مصرع کو جب
دیکھتی ہوں تو مجھے اس لڑکے کا واقعہ یاد آجاتا ہے جس نے
سودا کے سامنے یہ شعر پڑھا تھا ؎

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

اور سودا کمبخت نے بھی اسی شعر کو سنکر کسی منحوس گھڑی کہا تھا
کہ میاں صاحبزادے بچتے ہوئے نظر نہیں آتے" اور آخر وہی
ہو کر رہا یہ مصرع بھی مجھے رہ رہ کر اسی واقعہ کو یاد لاتا ہے
اور کون کہہ سکتا ہے کہ فسانہ نگار کا حشر اگر ابتک نہیں ہو چکا ہے
تو آئندہ اسی مصرعہ کے مطابق نہوگا، جو کچھ ہو مدیر لائق صد
مبارکباد ہے جس نے ایسا سحر طراز مضمون نگار اپنے مجلہ کیلئے
فراہم کیا ہے۔ میں ان کو آج خط لکھتی ہوں۔

سہیل نے علی گڑھ سے فلسفہ میں بی اے آنرز کیا تھا اور اور کچھ دنوں سے شاہجہاں پور میں اپنے ماموں احمد حسن صاحب صدیقی سب جج کے یہاں مقیم تھا۔ شاہدہ کی طبیعت بھی بھائی کی صحبت میں بہل گئی تھی۔ اکثر دونوں میں علمی مذاکرے رہتے تھے ادبیات سے دونوں کو شغف تھا۔ شاہدہ نے باتوں باتوں میں سہیل سے ایکدن دریافت کیا کہ آپ پردیں کے اس مضمون نگار کو جانتے ہیں جو اپنے نام کے بجائے صرف "میں ہوں اپنی شکست کی آواز" لکھنے پر اکتفا کرتا ہے سہیل نے جواب میں کچھ دیر تک سکوت سے کام لیا اس کے بعد گردن اٹھا کر مسکراتے ہوئے کہا کہ مجھے بہت کم لوگوں سے واقفیت ہے رہ گیا کسی کو جاننے کی بابت سو میں ابھی اپنے کو پہچاننے کی کوشش میں سرگرداں ہوں۔ ادھر سے ذرا فرصت ہو تو دوسری کو تلاش کروں میں کسی کو نہیں جانتا حتی کہ اپنے کو نہیں جانتا۔ پردیں کے مضمون نگار کا کیا تذکرہ جسدن سے فلسفہ میں میں نے یہ پڑھا کہ اپنے کو پہچانو اس دن سے اسی مصیبت میں گرفتار ہوں

آج خلاف معمول سہیل کی گفتگو بہت متین اور سنجیدہ تھی لیکن اتنی سلجھی ہوئی اور طمانیت بخش نہ تھی جتنی ہمیشہ ہوا کرتی تھی ورنہ وہ ہمیشہ سائل سے الجھ پڑتا تھا لڑ جاتا تھا بلکہ اپنی مخاطب کو کاٹ کھاتا تھا۔ لیکن ہمیشہ اپنے حریف کو زور استدلال سے خاموش ہونے پر مجبور کر دیتا تھا۔ شاہدہ نے اس وقت اس موضوع پر مزید گفتگو کرنی مناسب نہ سمجھی اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی تھوڑی دیر کے بعد پھر وہی تذکرہ شروع ہوا ابکی بار شاہدہ سہیل سے "پیمان وفا" کی داد طلب کر رہی تھی اور چاہتی تھی کہ سہیل کم از کم مضمون نگار کے ذوق ادب کی بابت میرا ہم رنگ ہو۔ شاہدہ نے دو ایک جملے بشکل فسانہ نگار کی تعریف میں زبان سے نکالے ہی تھے کہ سہیل بول اٹھا "آپ مضمون نگار کی کس چیز کی تعریف مجھ سے کرانا چاہتی ہیں ذرا میں بھی سنوں۔ زبان کی طرز تحریر کی۔ خیال کی۔ سیرت نگاری کی زبان کو لیجئے سوائے اس کے کہ اس میں عربی فارسی الفاظ اور ترکیبوں کی بھرمار ہے میں نے اور کوئی بات نہ پائی نہ وہ حلاوت ہے جو شرر کا طرۂ امتیاز ہے نہ وہ رنگینی ہے جو آزاد کا حق ہے نہ وہ سادگی ہے جو سرسید کا حصہ تھی نہ وہ زور ہے جس نے شبلی کو شبلی کر دیا پھر آپ ہی فرمایئے میں کسکی تعریف کروں۔ طرز تحریر آپکا کوئی مخصوص نہیں۔ آپ ہی فرمائیے کونسی خاص بات آپ کی تحریر میں ہے اس سے یہی مطلب نہیں کہ وہ بری ہے یا بھلی جس سے معلوم ہو سکے کہ یہ فسانہ اسی فسانہ نگار کا تحریر کردہ ہے ہر افسانہ کی زبان میں رنگ نیا۔ آپ کے خیال کی بابت مجھے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اکثر فسانے آپ کے مضمون نگار صاحب کے ماخوذ ہوتے ہیں۔ اور جو دو ایک بظاہر ماخوذ نہیں معلوم ہوتے ان کے خیالات روسیوں اور فرانسیسیوں سے مستعار لیے گئے ہیں۔

رہ گئی آپ کی سیرت نگاری وہ ہمیشہ غیر واقعی ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ آپ کو ان میں لطف آتا ہے۔ آپ کہتی ہیں کہ "پیمان وفا" میں نسیمہ کی سیرت کا خاکا اچھا کھینچا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اچھا بیشک ہے لیکن وہ کیرکٹر اس بنا پر اچھا ہے کہ بالکل غیر واقعی ہے۔ اس دنیائے فانی میں تو کوئی نسیمہ آپ کے

مضمون نگار کی نسیمہ کی طرح تو پیدا نہیں ہوتیں۔ آپ پیمان وفا کی سرخی پر واہ واہ کرتی ہیں۔ میں مضمون نگار کی بیوقوفی پر آہ کرکے رہجاتا ہوں کہ کتنی معصوم ہستیاں اس افسانہ کو پڑھ پڑھکر اپنی زندگی برباد کرینگی۔ آپ کہتی ہیں کہ شادی کے لئے پیمان وفا کتنا اچھا نام ہے۔ میں کہتا ہوں کہ شادی میں پیمان وفا بننے کی سرے سے صلاحیت ہی نہیں آپ اس مصرعہ پر سر دھنتی ہیں جو آپ کے مضمون نگار صاحب نے اپنے نام کے بجائے تجویز کیا ہے گویا یہ مصرعہ انھیں کی تصنیف سے ہے۔ نام کے بجائے مصرعہ لکھنا کوئی جدت ہی نہیں میں نے اس سے پہلے ایک صاحب کو اپنے نام کے بجائے یہ مصرعہ لکھتے ہوئے دیکھا ہے۔

آوارۂ و مجنوں نے رسوا سر بازار ے

آپ نے بھی غالباً ان کے مضامین پڑھے ہوں گے اب آپ ہی فرمائیں آپکے فسانہ نویس صاحب کی کس ادا کی تعریف کروں

آج سہیل کی تنقید ناکامیاب رہی اور شاہدہ برابر اس امر کو محسوس کرتی رہی کہ اس گمنام مضمون نگار کے معاملہ میں سہیل کی تنقید اکثر کامیاب نہیں ہوئی نہ آج سہیل کی تقریر میں وہ زور تھا نہ اس کا استدلال ہی کچھ لاجواب تھا۔ شاہدہ اس کی تقریر سنکر خاموش تو ضرور ہوگئی لیکن دل کو تشفی دیئے اٹھکر گھر میں چلی گئی اور سہیل اپنے کمرے میں جاکر خلاف معمول دوپہر کو سو رہا

صدیقی کو شاہجہاں پور آئے ایک ہفتہ سے زیادہ ہوچکا ہے وہ شاہدہ کا چچا زاد بھائی ہے لکھنؤ میں بی اے کلاس میں تعلیم پاتا ہے چھٹیوں کے سلسلے میں شاہجہاں پور چلا آیا شاہدہ اور سہیل کے علمی شغلوں میں اسے چنداں لطف نہ آتا پروین کا تذکرہ ہوتا اور اسی ضمن میں گمنام مضمون نگار کا نام بھی آتا بلکہ یوں کہئے کہ گمنام مضمون نگار کے ضمن میں پروین کا نام بھی آتا۔ یہ معلوم ہونے پر کہ سہیل یا شاہدہ کوئی بھی مضمون نگار سے واقف نہیں ہے۔ صدیقی نے کہا کہ میں "میں ہوں اپنی شکست کی آواز" کو بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں مجھ سے بہت گاڑھی چھنتی ہے "پیمان وفا" رسالہ میں چھپنے سے پہلے میں دیکھ چکا ہوں ان کا نام احمد رشید ہے پارسال انھوں نے کیننگ کالج سے بی اے پاس کیا ہے ان کا شمار قابل آدمیوں میں ہوتا تھا جب تک صدیقی یہ گفتگو کرتا رہا سہیل صرف اس کا منھ تکتا رہا۔ اور گفتگو ختم ہونے سے پہلے وہ وہاں سے اٹھکر چلا گیا۔ شاہدہ کا اشتیاق اور بڑھتا جاتا تھا۔ پہلے صدیقی سے اُسے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی لیکن اب بے نام و نشان فسانہ نویس کا نام سنکر اُسنے صدیقی سے ربط و ضبط بڑھانا شروع کیا تاکہ مضمون نگار کا کچھ اور حال معلوم ہوسکے اب صدیقی اور شاہدہ میں اکثر یہی تذکرے رہتے اور سہیل عمداً ایسے موقعوں پر اٹھکر چلا جاتا۔ صدیقی کے لئے ایسے مواقع غنیمت تھے اور وہ ایک حد تک شاہدہ کی توجہ اپنی جانب جذب کرنے میں کامیاب رہا۔ صدیقی کے آنے سے پہلے شاہدہ کے دل میں سہیل کی قدر تھی۔ حالانکہ "میں ہوں اپنی شکست کی آواز" کے بارے میں دونوں کی رائیں مختلف تھیں۔ اور

شاہدہ کبھی اس معاملے میں کسی کے اختلاف کو اچھی نظروں سے
نہیں دیکھتی تھی، لیکن اس اختلاف کے باوجود وہ سہیل کی دل سے
مداح تھی۔ شاہدہ گو تعلیمیافتہ اور روشن خیال عورت تھی لیکن
تھی عورت ہی۔ عورت اپنی ذات سے اختلاف رائے کو ہمیشہ برداشت
نہیں کر سکتی۔ صدیقی کے آنے کے بعد شاہدہ نے یہ معلوم کر لیا
کہ صدیقی بیشک اس معاملے میں حق پر ہے اس کی سہیل کی
بابت یہ رائے ہرگز غلط نہیں کہ سہیل بعض وقت ہٹ دھرمی
سے کام لیتے ہیں۔ "پیمان وفا" اردو زبان میں اپنے رنگ کا
ایک افسانہ ہے صدیقی سہیل کے برابر قابل نہ سہی لیکن اسکا
ذوق ادب لائق تحسین و آفرین "پیمان وفا کی خوبیوں کو وہ
دیکھتا ہے۔"

صدیقی نے رفتہ رفتہ شاہدہ کے دل میں گھر کر لیا سہیل کو
کو فلسفے کی گتھیاں ہی سلجھانے سے فرصت نہ تھی صدیقی سے
زیادہ رسم و راہ ہونے کے بعد شاہدہ کو پھر دھن ہوگئی کہ سہیل
کو اپنا ہم خیال بنائے علمی حیثیت سے شاہدہ کو سہیل سے
کوئی نسبت نہ تھی لہذا اس نے سہیل کو اپنے رنگ میں رنگنے
کے لئے دوسری تدبیریں اختیار کیں۔ عورت کا کسی کام کے
کرنے پر تل جانا قیامت ہے۔ شاہدہ کے ترکش میں وہ کونسا
تیر تھا جو سہیل پر خالی نہ کیا گیا ہو۔ لیکن سہیل کچھ اس بلا کا تجس
واقع ہوا تھا کہ شاہدہ کی مخصوص ادائیں بھی اسے اپنا نہ کرسکیں
شاہدہ کو یہ کاوش تھی کہ سہیل اس کا ہم آہنگ کیوں نہیں
ہوتا۔ صدیقی اس کا ہم خیال تھا لیکن اس سے وہ بے پرواہ
تھی۔ فکر تھی تو یہ تھی کہ سہیل اس کا ہمنوا کیوں نہیں ہے۔
عورت خود دنیا سے بے نیاز رہے یا نہ رہے لیکن دوسرے کو تو خود
سے بے نیاز نہیں دیکھنا چاہتی۔ سہیل پر اس کا آخری نسوانی
حربہ یہ تھا کہ وہ یکلخت اس کی طرف سے نگاہیں پھیرے اور
اپنے کو صدیقی کے سپرد کر دے شاید یہی جادو سہیل پر چل جائے
سہیل اس سے بھی متاثر نہ ہوا اور شاہدہ روز بروز صدیقی
کی واقعی گرویدہ ہوتی گئی۔ کبھی کبھی یہ خیال بھی دماغ میں گزرتا
کہ اگر میری زندگی اسی افسانہ نویس کے ساتھ گزرتی تو یقیناً
اس سے بہتر ہوتا، لیکن موجودہ حالات میں صدیقی ہی غنیمت
ہے اس مضمون نگار کا دوست ہے خود بھی کچھ بڑے مضامین
نہیں لکھتا اور کیا چاہئے۔ اس دوران میں اس کے چچا نے
صدیقی کا شاہدہ سے شادی کا پیغام اپنے بھائی کو دے دیا
تھوڑی سی بحث تمحیص کے بعد یہ طے پایا کہ صدیقی بُرا لڑکا نہیں
ماں کی رائے تھی کہ سہیل اس سے بہتر ہے اور شاہدہ بچپنے
سے اسے منگی ہوئی تھی۔ لیکن صدیقی میں بھی کوئی عیب نہیں
اور میں دیکھتی ہوں کہ شاہدہ بھی صدیقی سے زیادہ مانوس ہے
شاہدہ کے چچا کو لکھ دیا گیا کہ شادی کے لئے رجب کے مہینے کا
انتظار کرو۔ سہیل کے یہاں اس دوران میں شادی کی کوئی
خاص کوشش نہیں کی گئی۔ اس کے والدین کا خیال تھا کہ
سہیل وہیں منگا ہوا ہے شادی بھی ہو جائیگی۔ سہیل نے بھی
دیکھا کہ شاہدہ کو اس سے چنداں دلچسپی نہیں ہے اگر ہے
تو میں ہوں اپنی شکست کی آواز" اور اس کے مداحین سے
اس بنا پر سہیل بھی خاموش تھا وہ سمجھتا تھا کہ شاہدہ جوہر

جوہر شناس نہیں غرض پسند ہے۔

سہیل کچھ دنوں اور ٹھہر کر اپنے گھر چلا گیا تھا لیکن پھر شاہجہاں پور شاہدہ کی شادی کے سلسلے میں آیا۔ شادی بخیر و خوبی ختم ہوئی رخصتی بعض وجوہ سے نہ ہو سکی۔ لہذا صدیقی صاحب سسرال ہی میں مقیم رہے۔ سہیل کے واپس جانے سے پہلے شاہدہ میں اور اس میں جو گفتگو ہوئی اسمیں یہ کیونکر ممکن تھا کہ پردیں اور گمنام مضمون نگار کا تذکرہ نہ ہوتا۔ سہیل نے شاہدہ سے مسکراتے ہوئے کہا کہ شادی کا نام "پیمانِ وفا" کتنا غلط ہے۔ یہی تو میں کہتا تھا کہ یہ مضمون نگار کی ناتجربہ کاری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مضمون نگار نے اتنا، یا اس راز کو محسوس کر لیا ہوگا ورنہ وہ بہت جلد اپنی غلطی سے متنبہ ہو جائیگا

اس گفتگو کے دوسرے دن سہیل صدیقی اور شاہدہ سے رخصت ہو کر لکھنؤ واپس گیا۔

صدیقی اور شاہدہ میں اب بھی جو گفتگو ہو رہی ہے وہ اسی مضمون نگار کے موضوع پر۔ شاہدہ نے دریافت کیا کہ آپ تو اس مضمون نگار سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔ بڑا دلچسپ آدمی ہوگا۔ مجھے ملتا تو میں عمر بھر اس کی پرستش کرتی۔ مجھے امید ہے کہ اگر کوئی مناسب موقع ہاتھ آیا تو آپ ضرور مجھے اس مضمون نگار سے ملائینگے۔

ادھر یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ شاہدہ کا سات آٹھ برس کا بھائی احسن باجی باجی کہتا ہوا ہاتھ میں ایک سیاہ کاپی لئے دوڑتا ہوا آیا اور اپنی بہن سے لپٹ گیا۔ اور کہنے لگا باجی دیکھئے ہمنے کیسی اچھی کتاب پائی ہے۔ شاہدہ نے بھائی کے ہاتھ سے وہ کاپی لے لی کچھ پڑھا اور پڑھکر ایک بکس میں مقفل کر دیا۔ صدیقی نے دریافت بھی کیا کہ کیا چیز ہے لیکن اُنسے یہ کہکر ٹال دیا کہ ایک کاپی ہے۔ شاہدہ وہاں سے اُٹھکر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور اندر سے کنڈی لگا کر یہ خط سہیل کو لکھنے لگی۔

"بھائی جان آپکے فسانوں کی کاپیاں عمداً یا سہواً آپ سے چھوٹ گئی ہیں جسکو آپ اطمینان رکھئے کہ میں کبھی واپس نہیں کر سکتی۔ پیمانِ وفا کے بعد والا مضمون تلخ تجربہ جو یقیناً میری شادی کے بعد لکھا گیا ہے میرے دل پر تیر و نشتر کا کام کرتا ہے آپکو تلخ تجربہ ہوا اور میری زندگی ہمیشہ کے لئے تلخ ہو گئی۔ مجھے بارہا اس کا خیال آیا کہ "میں ہوں اپنی شکست کی آواز" آپکے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ میں آپ کی کیا شکایت کروں جو شخص اپنا نہ ہوا وہ دوسرے کا کیا ہو سکتا ہے۔ گر رونا ہے تو اس کا ہے کہ میں کیوں اندھی ہو گئی تھی میں کیوں بہری ہو گئی تھی۔ آپ کو کب دیکھا آپ کی آواز کب سنی جب شاہدہ شاہدہ نہ تھی۔ آپکو الزام دوں کہ اپنی قسمت کو کوسوں بعض وقت کی باتیں بھی صحیح ہو جاتی ہیں۔ ہائے شاہدہ کمبخت تو نے کس وقت یہ کہا تھا کہ کہیں مضمون نگار پر یہ مصرع "میں ہوں اپنی شکست کی آواز" ابھی جب یہ معلوم ہوا کہ آپ ہی نے "میں ہوں اپنی شکست کی آواز" تب حقیقت میں یہ عقدہ کھلا کہ "میں ہوں اپنی شکست کی آواز" سچ فرمایا تھا آپنے فلسفہ کی ساری تعلیم کا لب لباب یہ ہے کہ "اپنے کو مٹا" تو میں بھی اب خاک میں ملکر اپنے کو مٹا لونگی۔

...... آپ کی کنیز شاہدہ"

طنزیات اور اردو زبان

ہر غور کرنے اور تحقیق کرنے والے شخص کو اختیار ہے کہ وہ اہل لغت کی اس بارہ میں شکایت کرے کہ انھوں نے طنز کے معنی بیان کرنے میں نہایت مسامحت اور استغنا سے کام لیا ہے وہ صرف یہ لکھکر خاموش ہو گئے ہیں، کہ ناز کرتے، مسخرہ پن کی گفتگو کرنے اور رمز کے ساتھ بات کہنے یا طعنہ دینے کو طنز کہتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تک کوئی موضوع زیر بحث نہ آجائے اسوقت تک نہ اُسپر کافی روشنی پڑتی ہے اور نہ اسپر کوئی صحیح رائے دیجا سکتی ہے نہ اس کے معانی کو صحیح اور برمحل استعمال کیا جاتا ہے چنانچہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ طنز کثیر المعنی لفظ ہے جسمیں طعن۔ آوازہ۔ تشنیع، استہزا۔ پھبتی۔ زجر و توبیخ ملامت، ہجو، بولی ٹھولی، گلہ و شکایت، نوک جھونک، رمز و کنایہ، جلی کٹی۔ واسوخت۔ سب شامل ہو سکتے ہیں۔

طنز چونکہ ایک ایسا لفظ ہے جس کی تحقیق ابھی تک نہیں ہوئی اسی لئے اکثر اہل زبان حضرات نے اس کی تمام انواع و اقسام کو تقریباً ایک ہی سمجھا، اور جہاں جس چیز کو جو کچھ چاہا کہہ دیا۔ مثلاً۔ غالب مرحوم ایک جگہ کہتے ہیں "کہ مولوی کرم حسین صاحب ایک میرے دوست تھے ایک مجلس میں چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اور بے ریشہ اپنے کف دست پر رکھکر مجھ سے کہا کہ اس کی کچھ تشبیہات نظم کیجئے میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ لکھکر دیا اور صلہ میں وہ ڈلی اُن سے لی قطعہ بہت مشہور ہے۔ اچھا کہئے، زیبا کہئے۔ یہاں تک غالب نے صرف تشبیہات کہا مگر آگے چلکر انہیں تشبیہات کو پھبتیاں کہتے ہیں فرماتے ہیں۔ "غرضکہ بیس بائیس پھبتیاں ہیں" حالانکہ پہلا قول صحیح تھا۔ جرأت کہتے ہیں کہ ؎ اس زلف پہ پھبتی شب دیجور کی سوجھی — حالانکہ یہ صرف ایک تشبیہ ہے پھبتی نہیں ہے۔ غالب ایک جگہ فرماتے ہیں۔

نہ کہیو طنز سے پھر تم کہ ہم ستمگر ہیں — مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہئے

یہاں لفظ طنز جس مفہوم میں آیا ہے اس کا تعلق صرف ایک متعارف معنے سے ہے اس میں شک نہیں کہ یہ تمام الفاظ مقدر قریب المعنی ہیں کہ بادی النظر میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا مگر نگاہ غائر ان الفاظ کے مفہوم میں امتیاز پیدا کر سکتی ہے مثلاً طعن، طنز، تشنیع ہجو وغیرہ کو جب آپ سرسری نگاہ سے دیکھیں گے تو امتیاز دشوار معلوم ہوگا لیکن بغور دیکھنے سے فرق محسوس ہو جائیگا اور آپ کو ماننا پڑے گا کہ یہی ہر جگہ وہی طنز مگر بات یہ ہے کہ جب اس میں گہرا رنگ پایا جاتا ہے تو ہجو ہو جاتی ہے۔ اس سے کچھ کم ہو تو طعنہ ہوتا ہے اور بہت کم ہو تو رمز و کنایہ ہے۔

اس مضمون کا عنوان طنزیات اس لئے مقرر کیا گیا ہے کہ امر میں اصطلاحی شان پیدا ہو کر مفہوم متعین ہو جائے اور

اور اس کے ماتحت جتنے انداز بیان کر سکتے ہیں ان کا ذکر مختصراً کر دیا جائے

طعن | اس لفظ کے لغوی معنے نیزہ لگانے، قدح کرنے، کسی میں عیب پیدا کرنے، جنگل میں چلنے، رات کو سیر کرنے اور گھوڑے کو تیز چلانے کی غرض سے باگ کھینچنے کے ہیں مگر ہمارے موضوع کے لحاظ سے اس کی تشریح یوں کیجا سکتی ہے، کہ طعنہ وہ گفتگو ہے جسمیں قایل اپنے مخاطب سے کچھ ایسی باتیں کہے جو مخاطب سے متعلق ہونے والے واقعات پر روشنی ڈالیں یا اس کی کمزوری کا اظہار کرکے اسکو رنج پہونچائیں اس گفتگو سے مراد مخاطب کے اقوال یا افعال پر نکتہ چینی کرکے اُس میں عیب پیدا کرنا اور اُس کی تحقیر کرنا ہوتی ہے طعنہ کی گفتگو کے لئے صحیح یا غلط ہونا ضروری نہیں ہے، نہ اسمیں کسی تشبیہ و استعارہ کی ضرورت ہے مگر گفتگو میں ایسے پہلو کا ہونا ضروری ہے جس سے مخاطب کو رنج پہونچے اور اس کی طبیعت میں ایک قسم کا اشتعال پیدا ہو۔ مثلاً غالب ایک جگہ ذوق کو یوں طعنہ دیتا ہے ؎ آنچہ اندر شعر فخر تست آں ننگ من است۔
اس میں ان باتوں پر روشنی پڑتی ہے کہ (۱) غالب کی طرح ذوق بھی شعر کہتے ہیں، اور یہ ایک واقعہ سے تعبیر کیا جائے گا (۲) ذوق کو اپنی شعروں میں جو باتیں اور جو چیزیں قابل فخر معلوم ہوتی ہیں غالب اپنے لئے ان کو باعث ننگ ہونا بیان کرتے ہیں (۳) یہ ضروری نہیں کہ غالب کا یہ بیان صحیح ہو (۴) ذوق کو اس سے رنج پہنچنا ضروری ہے (۵) ذوق کی اس سے تحقیر ہوتی ہے (۶) ذوق کی کمزوریوں پر ایک روشنی ڈالی گئی ہے ان سب باتوں کے لحاظ سے اسکو طعنہ کہا جائے گا۔
غالب ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

جاہ ز علم بیخبر علم ز جاہ بے نیاز   ہم محک تو زر ندید ہم زمن محک نخواست

اس سے اس واقعہ پر روشنی پڑتی ہے کہ (۱) غالب کی بادشاہ نے قدر نہیں کی (۲) بادشاہ کو نا انصاف۔ تغافل شعار تجاہل پیشہ ظاہر کیا گیا ہے اور اس کی اس خاص کمزوری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہاں سے ایک خاص نکتہ یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کبھی اپنے افعال و اقوال یا اپنی ذات پر فخر کرکے بھی دوسروں کو طعنہ دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ غالب کے ہم زر من محک نخواست یا آں ننگ من است سے ظاہر ہوتا ہے متنبی کہتا ہے ؎ وتنکر موتہم وانا سہیل طلعت لموت اولاد الزنا۔ اپنے آپ کو سہیل بتایا ہے جس کی خاصیت یہ بیان کیجاتی ہے کہ اس کے طلوع کے بعد تمام حشرات الارض فنا ہو جاتے ہیں۔ سہیل کہکر اپنا فخر ظاہر کیا ہے اور اولاد الزنا (یعنی حشرات الارض) سے دوسروں پر طعن کیا گیا ہے نظامی کہتے ہیں ؎

گر مرا دشمن شد اندر این قوم معذور اند از آنکہ   من سہیلم کامدم بر موت اولاد الزنا

اسی طرح خاقانی کا ایک شعر ہے ؎

ولدالزنا ست حاسد منم آنکہ طالع من   ولدالزنا کش آمد چو ستارۂ یمانی

مصحفی ایک جگہ اظہار فخر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

———— ناداں ہے جسکو مجھ سے ہو دعوے شاعری

میں لکھنؤ میں زمزمہ سنجان شعر کو برسوں دکھا چکا ہوں تماشائے شاعری

اسمیں ہمہ دانی اور اپنی شاعری پر فخر و مباہات کرکے اپنے معاصرین کو طعنے دئے گئے ہیں اور اُن کی تحقیر کی گئی ہے اسی صورت سے انشا نے ایک جگہ فخریہ رجز کرکے دوسروں پر طعن کیا ہے:-

کیا تاب ارسطو جو کرے چوں مرے آگے ....

مرغان اولی الاجنحہ مانند کبوتر کرتے ہیں سدا عجز سے غوں غوں مرے آگے

اسی صورت سے غالب اپنے انداز بیاں اور اپنی شاعری کی تعریف کرتے ہوئے اپنے معاصرین پر ہلکا سا طعن کرتے ہیں:-

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کیلئے

زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

طعن سے کبھی صرف مطعون کی برائی بیان کرنا مقصود ہوتی ہے جیسے جلال صاحب ایک جگہ کہتے ہیں سے

نہ دیکھ دولہا کو ساس نند اُسے کہ گھونگھٹ اٹھا اٹھا کر + نئی نویلی دلھن بجی بھی تو دو چار دن حیا کر

مصحفی جرأت پر انکی کم ہمتی کا طعن کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ اپنی افضلیت کا بھی اظہار کرتے ہیں۔

کچھ میں جرأت نہیں اے مصحفی سحر بیاں میر و مرزا سے لڑانے یہ غزل جاؤنگا

یعنی جرأت میں میر و مرزا سے مقابل ہونے کا دم نہیں مگر مجھ میں ہے۔ داغ ناصح کو اس کی بیدردی کا طعنہ دیتا ہے۔

یوں کون جانے درد محبت کو ناصحا وہ جانے جسکے چوٹ ہو دلپر لگی ہوئی

ناصح کو اس کی اس خراب عادت پر کہ حضرت روز میخانہ میں تشریف لاتے ہیں اس طرح طعنے دیتا ہے۔

جب ہوئی صبح آ گئے ناصح انہیں حضرت کو دیکھتا ہوں میں

اپنی اطاعت اور معشوق کی خود غرضی کا یوں طعنہ دیا گیا ہے

—— تم کہتے ہو معشوق اطاعت نہیں کرتے عاشق بھی تو معشوق کا نوکر نہیں ہوتا

حسن بریلوی معشوق کو اس کی بیدردی پر یوں طعنہ دیتے ہیں:-

بیوفا ہو بیوفا کو کیا خبر اس درد کی سنگدل ہو سنگدل پر کیا اثر فریاد کا

ہندوستانی ہونے کا طعنہ ملاحظہ ہو۔ اکبر کہتے ہیں :۔

میری نصیحتوں کو سنکر وہ شوخ بولا نیٹو کی کیا سند ہے صاحب کہیں تو مانیں

یقولون مالا یفعلون کا طعن۔ اکبر ؎

رزولیوشن کی شورش ہے مگر اسکا اثر غائب پلیٹوں کی صدا سنتا ہوں لیکن کھانا نہیں آتا

اکبر رمز کو طعنہ میں شامل کرتے ہوئے ہلکی سی ظرافت کی چاشنی دیکر اطبا کی خود غرضیوں پر یوں روشنی ڈالتے ہیں ؎

اطبا کو تو اپنی فیس لینا اور دوا دینا خدا کا کام ہے فضل و کرم کرنا شفا دینا

اسی طرح موجودہ لیڈروں پر یوں طعن کرتے ہیں ؎

پکالیں پیس کر دو روٹیاں تھوڑے سے جو لانا ہمارا کیا ہے اے بھائی نہ مسٹر ہیں نہ مولانا

طعنہ سے بعض جگہ صرف تحقیر مقصود ہوتی ہے ایک شاعر کہتا ہے

آپ تو کیا ہیں میں وہ عاشق رنگین دل ہوں چوم کر لاکھوں کا منہ غنچہ دہن چھوڑ دیا

آوازہ | آوازہ اصل میں فارسی کا ایک مشہور لفظ ہے جس کے معنی شہرت عام کے ہیں، مگر اردو زبان میں اس کے معنی اور کچھ ہیں اور وہ کسنے کے ساتھ ترکیب پاکر مستعمل ہوتا ہے آوازہ اس گفتگو کو کہتے ہیں جسمیں خصم کے علاوہ کسی اور شخص سے خطاب ہو۔ یا کوئی بھی مخاطب نہو اور خود ہی چند الفاظ، کسی فقرے، کسی جملہ کسی شعر کی صورت میں اس طرح سے کہے کہ اس کے خصم کی برائیوں پر ایک ناتمام اور ہلکی سی روشنی پڑے اس میں کچھ استہزا بھی شامل ہوتا ہے اور کچھ ہجو بھی ہوتی ہے، کچھ جوش دلانے اور بھڑکانے والے الفاظ ہوتے ہیں اور واقعات کا ایک ناقص سا اظہار بھی ہوتا ہے۔ اس کو عرف عام میں چوٹ کرنا بھی کہتے ہیں۔ اسمیں کبھی حریف کی صرف ہجو ہوتی ہے۔ کبھی کسی واقعہ کا اظہار بھی ہجو کے ساتھ ہوتا ہے۔ کبھی واقعہ نہیں ہوتا اور صرف ایسے الفاظ ہوتے ہیں جس سے قایل کی دشمنی اور رنجش کا پتہ چلتا ہے لیکن طرز بیان عام ہوتا ہے اور کسی شخص کے تخصیص نہیں ہوتی کبھی تشبیہ و استعارہ کی صورت میں آوازہ کا استعمال ہوتا ہے اور کبھی نہیں۔ مثلاً ایک شخص گھوڑے پر سوار ہوکر کہیں جاتا ہے دوسرا شخص اسکا حریف ہے، اس کو دیکھکر ایک غیر متعلق شخص سے کہتا ہے کہ شہر کا اب تو ایسا دستور بگڑ گیا ہے کہ سائیس بھی گھوڑے پر سوار ہونے لگے۔ ظاہر ہے کہ یہ سوار پر چوٹ یا آوازہ ہے مگر کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ میں نے اُس کو نہیں کہا بلکہ ایک عام بات کہی تھی۔

آتش نے اپنے حریف ناسخ پر ایک مرتبہ مشاعرہ میں یوں چوٹ کی :۔

مضمون کا چور ہوتا ہے رسوا جہان میں چکھی خراب کرتی ہے مال حرام کی

چونکہ ناسخ کے یہاں اکثر اشعار ایسے ہیں جو اساتذۂ متقدمین سے لئے گئے ہیں یا فارسی سے ترجمہ کئے گئے ہیں لہذا اس شعر کے ذریعہ سے ایک عام بات کہکر اونپر روشنی ڈالی گئی بحر مرحوم ایک جگہ آوازہ کی نقل کرتے ہیں ؎

مغبچے کستے ہیں آوازے مری دستار پر ٹوکر اک بت تک یہ سر پر عزت وتوقیر کا

شاہزادۂ مرزا جواں بخت کی شادی ہوئی تو مرزا غالب نے سہرا کہا جس کا آخری شعر یہ تھا ؎

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بڑھکر سہرا

اس سہرے کو بادشاہ نے سنا تو سمجھ لیا کہ ہم پر چوٹ ہے یعنی ہم نے جو شیخ ابراہیم ذوق کو اُستاد بنایا یہ ایک قسم کی نا انصافی ہے۔ اور در اصل یہی واقعہ تھا کہ مرزا نے ذوق پر چوٹ کی تھی مگر اسی طریقہ سے جیسا کہ آوازہ کا قاعدہ ہے کہ ایک عام بات کہی گئی ہے جب یہ واقعہ ذوق کو معلوم ہوا تو اُنھوں نے بھی سہرے کے مقطع میں وہی انداز برتا۔ اور کہا:۔

جسکو دعوی ہو سخن کا یہ سنادی اُسکو دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

کبھی کبھی جسپر آوازہ کسا جاتا ہے یا جسپر چوٹ کی جاتی ہے اُسکو مخاطب بھی کر لیا جاتا ہے۔ جیسا کہ آوج نے غالب کو یہ شعر سنا کر مخاطب کیا۔

ڈیڑھ جز پر بھی تو ہو مطلع و مقطع غالب غالب آسان نہیں صاحب دیواں ہونا

غالب کے دیوان کی حقیقت اور کیفیت پر ایک روشنی ڈالی ہے اور ساتھ ہی دوسرے مصرع سے ایک آوازہ کی صورت پیدا کر دی ہے اسی طرح سر مشاعرہ مرزا غالب پر یہ چوٹ کی گئی۔

کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

ایک مرتبہ مشاعرہ میں ناسخ پر آتش نے اس طرح چوٹ کی:۔

جو خاص ہیں وہ شریک گروہ عام نہیں شمار دانۂ تسبیح میں امام نہیں

ناسخ کا نام امام بخش تھا۔ ناسخ نے کہا ؎

یہ بزم وہ ہے کہ لاخیر کا مقام نہیں ہمارے گنجفہ میں بازی غلام نہیں

حافظ دانشمند مجلس پر یوں آوازہ کستا ہے

مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

اگر صرف یوں کہا جاتا کہ میری ایک بات سمجھ نہیں آتی توبہ کی ہدایت کرنے والے توبہ کیوں نہیں کرتے تو وہ صرف ایک عام بات ہو جاتی مگر دانشمند مجلس سے سوال کرتے ہے آوازہ کی ایک شان اسمیں پیدا کر دی اور اسمیں تمام وہی قیود باقی رہ

جو آوازہ میں ہونے چاہئیں۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار خدائی فوجدار ہیں اس جگہ جہاں خدائی فوجدار اپنے نحیف و نزار ٹٹو پر سوار ہو کر دنیا کی اصلاح کے لئے تشریف لے چلے ہیں اور لوگوں نے اُنپر آوازے کسے ہیں لکھتے ہیں:۔

"کالی کالی صورت پر لال لال ٹوپی ماشاءاللہ کس قدر زیب دیتی ہے"

ایک جگہ فسانۂ آزاد میں اُسموقع پر لکھتے ہیں جب عین شادی کے روز بارات آنے کے وقت ثریا بیگم کو غش آگیا ہے اور ڈاکٹر صاحب کو علاج کے لئے بلایا ہے۔ اتفاق سے ڈاکٹر صاحب بھدّے جسم کے سیاہ فام تھے، اُن کو دیکھکر پہلے فرمائشی قہقہے لگائے اور پھر یہ آوازے کسے:۔

اس نگوڑے لنگور سے کیا علاج ہوگا۔ کینڈا کتنا سڈول ہے وغیرہ وغیرہ بظاہر ان فقرات میں ایک تمسخر کی شان بھی پیدا ہوتی ہے مگر اصل میں یہ بھی آوازے کی ایک قسم ہے کیونکہ کسی وقت صرف صورت اور ذوات پر بھی آوازہ کسا جاتا ہے۔

تشنیع | یہ لفظ طعنے کے ساتھ مستعمل ہے مگر تشنیع کے معنی اور اس کا مفہوم طعنہ سے جدا ہے، تشنیع کے معنے اہل لغت صرف زشت گفتن کے لکھتے ہیں، مگر ہماری زبان میں جس طرح یہ لفظ رائج ہے اُس کا یہ مفہوم ہے کہ کسی کی برائیاں اس حد تک بیان کرنا کہ وہ الفاظ دائرہ تہذیب سے خارج ہو جائیں، چنانچہ سعدی نے ایک حکایت میں بڈھے کے ان الفاظ کو شنعت سے تعبیر کیا ہے کہتے ہیں کہ:۔

بدوستاں گلہ آغاز کرد و صحبت ساخت
کہ خان و ماں ایں پاک دیدہ پاک برفت

پاک دیدہ کے معنے بیشرم بے باک کے ہیں اپنی غرض سے شیخ نے دوسرے شعر میں کہا ہے کہ

بس از ملامت و شنعت گناہ دختر نیست
ترا کہ دست بلرزد گہر چہ دانی سُفت

نظامی خاقانی متنبی کے وہ تینوں شعر بھی جو ہم اوپر لکھ چکے ہیں اگر اپنے صحیح معنے میں لئے جائیں اور ولدالزنا یا اولاد الزنا کو برتی کیڑوں کے معنے میں نہ رکھا جائے تو وہ اسی تحت میں داخل ہو جائیں گے۔ الحاصل تشنیع سے متخاصمین کی وہ گفتگو مراد ہوگی جو دائرہ تہذیب و ادب سے خارج ہو جائے۔ میرزا مظہر جانجاناں کا یہ شعر اسی حد میں رکھا جائیگا۔

آبرو کی آنکھ میں ایک گانٹھ ہے
آبرو سب شاعروں کی ..... ہے

آبرو کا جواب بھی انہیں عدد میں ہے۔

کیا کروں حق کے کئے کو کور میری چشم ہے
آبرو جگ میں رہی تو جانجاناں ..... ہے۔

نواب مرزا شوق کی مثنوی زہر عشق میں اس قسم کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں مثلاً:۔

کردیا میرے لال کا یہ حال میں بھی دیکھوں کہ کون ہے وہ چھنال

مگر اکثر تشنیع عورتوں کی زبان میں پائی جاتی ہے اسی واسطے جان صاحب کی انشا، رنگین کی ریختیاں، امانت کی اندر سبھا، صاحبقران کا کلام اس قسم کی مثالوں سے بھرا ہوا ہے مثلاً

جانصاحب .... مرزا مقیم سیکڑوں آتے ہیں جوہری گوہر نے گھر کو جوہری بازار کردیا

اس میں گوہر کے حالات و عادات پر تہذیب سے علیحدہ ہوکر ایک سخت حملہ کیا گیا ہے۔

جانصاحب	اس موئے بے حجاب کی مانند	میں بھی ہو جاؤں کیا اجی ننگی
"	نوج در گور کرے مجھکو جو بہرام پسند	اڑی چوٹی پہ اجی اپنے موئے کو وارو
امانت	اڑی چوٹی پہ موئے دلو کو قربان کروں	میں پری ہو کے فدا ایسے پہ کیوں جاں کروں
انشا	بوٹا سے قد پہ اس بڑی آنچل کی اوڑھنی	بن سرڈھپی ہوئی تجھے کیا چاہئے بھلا
"	جو نہ سمجھوں کی زناخی جان تمھاری بولیاں	میں تو کچھ کیلی نہیں ہوں ایسی کچی گولیاں
"	سیکڑوں تم سے یہاں رگڑا کئے ہیں اڑیاں	کیا یہ چھیڑ کھانی کی باتیں آکے ہمسے چھیڑیاں

(باقی دارد)

عبدالباری آسی

تاریخ محبت کا ایک گمشدہ ورق

(فسانہ)

جوزیفاین دغا باز جوزیفاین شہر میلان میں اپنے قصر جمیل کے اندر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کا شوہر نپولین اپنی افواج قاہرہ کیساتھ اطالیہ کے ساتھ مصروف کارزار تھا اپنے وطن کا جھنڈا مقدس سرزمین پر نصب کرنے کے لئے تلا ہوا تھا دشمن پر ایک آخری کاری ضرب لگانے کی تدبیریں کر رہا تھا کہ صفحہ ہستی پر اس کا نام ونشان تک باقی رہ جائے لیکن اس کی ملکہ اپنے قصر میں عیش وعشرت کے مزے لوٹ رہی تھی شہر کے اشراف اور اعیان کے ساتھ تماشہ گاہوں تھیٹروں اور رقص وسرود کی پر لطف محفلوں کی زینت بنی ہوئی تھی ہر شخص ملکہ کے قدموں پر ارادت و عقیدت کے پھول نثار کرنے کو اپنی انتہائی سعادت سمجھتا لیکن یہ تمام سامان عیش اور بزم ہائے رنگیں اس کو شاداں ومسرور رکھنے کے بجائے کچھ اور زیادہ حزیں وملول بناتیں۔ جوزیفائن اپنے کمرے سے واپس آتی لیکن اس خیال میں کہ اس کا دل قابو سے باہر ہوتا دماغ طرح طرح کے افکار و آلام کا نشیمن ہوتا کیونکہ جب وہ رقص و سرود کی محفلوں میں عشق ومحبت کے جنون خیز نغمے سنتی تو اس کے جذبات محبت برانگیختہ ہو جاتے اس کے دل کی بجھی ہوئی آگ ایک بار پھر مشتعل ہو جاتی لیکن اسے کوئی ایسا شخص نہ ملتا جس کے سامنے وہ اپنا دل نکال کر رکھ دیتی جس کے سامنے وہ اپنے گرم آنسوؤں کی بارش پیش کرتی اور جو اسے اپنی آغوش میں لیکر اس کے جلتے ہوئے سینے کی آگ بجھاتا۔ بلکہ اپنے تنگ کمرے میں متفکر اور پریشان ادھر سے ادھر ٹہلا کرتی اس کے تاریک گوشوں میں اس بہادر انسان کو تلاش کیا کرتی جو اس کے نحیف و زار جسم کو اپنے پہلو میں جگہ دیکر اس کے عشق کی بھڑکتی ہوئی چنگاریوں کو بجھاتا...... لیکن نپولین دور تھا اس لئے اس کی جگہ ایک دوسرے فوجی نوجوان نے لے لی۔ اور اس کی امانت پر ایک دوسرے شخص نے قبضہ کر لیا کیونکہ نپولین دور تھا اور دوسرے اہم مشاغل اسکو جوزیفاین کی طرف سے بے نیاز کئے ہوئے تھے۔

جوزیفاین نے اپنے محبوب شارل کو بلانے کے لئے ایک آدمی بھیجا۔ شارل خط پڑھتے ہی نہایت تیزی کے ساتھ قاصد کے ہمراہ ہولیا اور میلان پہونچکر جوزیفائن کے حضور میں حاضر ہو گیا عاشق ومعشوق دونوں بیٹھ کر شراب وکباب کے مزے لینے لگے جوزیفاین نے اپنے ہاتھ سے جام شراب بھر کر مخمور محبت شارل کو پیش کیا پھر خود اسی آتش سیال سے اپنے قلب سوزاں کو تر کیا۔ جوزیفاین نے شراب ناب اور شراب محبت دونوں سے مخمور ہو کر اپنے محبوب کے گلے میں باہیں ڈالدیں حجاب کا پردہ اٹھ چکا تھا کہ شارل نے اس سے پوچھا ملکہ کیا آپ میلان میں خوش نہیں یہاں کی مخلوق تو آپ پر جان نثار کرنا اپنا فخر سمجھتی ہے۔ آپ کے ایک نظارہ پر باشندگان میلان دین و دل نچھاور کرنا اپنی سعادت سمجھتے ہیں آپ کے ایک اشارہ ابرو پر انکا ہر فرد آپ کے قدموں پر جھکنے کے لئے تیار رہے۔ جوزیفاین نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا نہیں پیارے شارل نہیں یہ مجھے دیکھنے کے لئے

میرے دیدار کے لئے نہیں جمع ہوتے - یہ ملکہ جوزیفاین کے لئے نہیں بلکہ اپنے فاتح کی بیوی کی زیارت کے لئے مجتمع ہوتے ہیں - میری تکریم - میری قدر میری محبت صرف پیرس میں ہوتی ہے - وہ پیرس جو کعبۂ عشاق ہے جو قبلۂ اہل دل ہے - جو زیارتگاہ حسن ہے وہاں میری اور صرف میری درگاہ جمال میں کشتگان محبت اپنی جراحتوں کا مرہم تلاش کرتے ہیں وہاں میری قربان گاہ حسن میں دلدادگان محبت اپنے دین و دل قربان کرتے ہیں - میری ہی حضور میں عشاق سجدۂ نیاز ادا کرتے ہیں کتنے پجاری مجھے حسن کی دیوی سمجھ کر پرستش کرتے ہیں - یہاں ..... یہاں تو میں صرف نپولین فاتح کی ملکہ ہوں - فاتح اعظم کی بیوی ہوں رگیا میری زیارت کے لئے لوگوں کا گلیوں اور راستوں میں جمع ہونا مجھے دیکھکر نعرہ ہاے مسرت بلند کرنا یہ سب بالکل اسی طرح ہے جیسے ایک کمزور ناتوان انسان اپنے سے قوی تر اور صاحب اقتدار انسان کی خوشامد ہی میں اپنی نجات دیکھتا ہے - میں ان کے نزدیک ایک تخیلہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی جس کے اندر یہ اپنے مظفر اور منصور بہادر کی شبیہ دیکھتے ہیں اس لئے یہ تکریم و تعظیم یہ اظہار مسرت و محبت درحقیقت میرا اکرام بحیثیت ایک عورت کے نہیں ہے، میری یہ ساری تعظیم و تکریم در اصل نپولین کی تعظیم و تکریم ہے جو اس صورت سے میری معرفت ادا کی جاتی ہے - اس لئے پیاری شارل میں اس سے بہت ہی زیادہ گھبرا گئی ہوں - اور کسی نہ کسی صورت میلاں کی اس زندگی سے نجات حاصل کرنی چاہتی ہوں، ایک دن میں کسی دعوت میں شریک تھی کہ میرے پاس ایک شخص آیا اور مجھ سے نہایت پرلطف اور دلآویز باتیں کرنے لگا میں یہ محسوس کرتی تھی کہ میری آنکھیں جب کبھی اس سے دوچار ہو جاتی ہیں تو وہ تڑپ اٹھتا ہے - میرے ہاتھوں سے جب کبھی اس کا ہاتھ مس ہوتا ہے تو اسمیں رعشہ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے یکایک اس کے لہجے میں تغیر پیدا ہو گیا اس کی باتوں کا رخ بدل گیا عشق و محبت کی شیریں اور پرکیف گفتگو کے بجائے وہ اپنے فاتح اعظم کی تعریف و توصیف کرنے لگا اپنے فاتح جنرل کی شجاعت اور وطن پرستی کا ذکر اس نے چھیڑ دیا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا یکایک میری آنکھوں میں اس نے کوئی خونخوار اور خوفناک شیر دیکھ لیا ہے جس سے ڈر کر وہ مجھے چھوڑ کر یکبارگی چلا گیا - لیکن میرا قلب اب تک اس کی ان محبت آمیز باتوں کا پیاسا ہے - اسوقت شارل نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کی لمبے لمبے سنہرے نرم بالوں سے کھیلتے ہوئے نہایت ہی پیار اور محبت کے نرم و شیریں لہجے میں جس سے آتش محبت اور بھڑک اٹھتی ہے، کہنا شروع کیا "میری پیاری ملکہ آپ ان معمولی باتوں کا خیال نکریں کیا آپ کا یہ رشک سرو قد آپکے یہ نرم نازک رخسار یہ سپید مرمریں سینہ - یہ بھرے بھرے بازو - یہ سحر آفریں آنکھیں بونا پارٹ کی تلوار سے کم نہیں - جنرل کی خونچکاں تیغ صرف ملکوں پر قبضہ کر سکتی ہے اور اس کا گوہر فشاں تبسم تو لوگوں کے دلوں کو مسخر کر سکتا ہے - تیغ براں خنجر ابرو کی روانی کو نہیں پہنچ سکتی - آتشیں گولے شہر و ملک کو جلا کر خاکستر کر سکتے ہیں - لیکن آپ کا برق تبسم خرمن دل کی سوختہ سامانی کا سبب ہے آپ کے حسن کی فتحیابی تلوار کی فتحیابی سے زیادہ تر ہے -

اس طرح شارل ۱۳ جنوری سنہ ۱۸۱۴ء کی شام کو بیٹھا ہوا ملکہ جوزیفاین سے عشق و محبت کی باتیں کر کے اپنے اس قائد اعظم کے حق میں خیانت کا ثبوت دے رہا ہے جو میدان جنگ کی ہیبت ناک فضا میں کھڑا اپنے عزیز وطن کی طرف سے مداخلت کر رہا ہے اور اس مبارک راہ میں خوں کی ندیاں بہا رہا تھا -

اسی رات جب نپولین بوناپارٹ اپنے آئندہ حملوں کے متعلق اسکیم تیار کر رہا تھا اس کے دل میں خیال گزرا کہ اس وقت جب میں میلان سے بہت قریب ہو کر سفر کر رہا ہوں اپنے اوقات میں سے دو گھنٹے بچا کر پوشیدہ طور پر میلان بھی ہوتا آؤں اور وہاں پہونچکر اپنی محبوب بیوی کی جبین ناز پر محبت بھرے لبوں سے مہر خلوص ثبت کر دوں - نپولین محل کے دروازہ پر پہنچا شوق کی جلدی میں اتنا بھی صبر نہ ہو سکا کہ دروازہ کھلوائے اور پھر محل میں داخل ہو - سامنے ہی ایک غرفہ تھا جہاں سے روشنی چھن چھن کر آ رہی تھی گویا اسے جلد تر آنے کی دعوت دے رہی تھی - جنرل دیوار پر چڑھا اس کے سہارے سے جنگلے پر پہنچا اور وہیں سے روشندان کی راہ سے کمرے میں داخل ہو گیا - وہاں کا منظر دیکھ کر اس پر ایک بجلی سی گر پڑی - اس نے دیکھا کہ اس کی محبوب ملکہ جسے وہ دل و جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے - اسی کی فوج کے ایک سپاہی سے مصروف التفات ہے - نپولین اسوقت کثرت غضب سے بے قابو ہو رہا تھا - اس نے ارادہ کیا کہ اپنی تلوار سے اس غدار اور دغا باز سپاہی کا سر تن سے جدا کر دے لیکن پھر سنبھل گیا - ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تحمل وہ دانائی و تدبر جس کا اظہار بارہا سخت سے سخت نازک وقتوں میں اس سے ہو چکا تھا پھر اس کے پاس لوٹ آیا اور اس کے غیظ و غضب پر غالب آکر اس فعل کے برے نتائج سے اُسے آگاہ کر دیا - جب نپولین کو بالکل سکون ہو گیا اور اس کے گئے ہوئے حواس پلٹ آئے وہ شارل کے قریب گیا اور کہا "شارل کیا تیرے لئے میلان میں کوئی دوسری عورت نہ تھی جس سے تو اپنی ہوس پوری کرتا - کیا تیرے لئے صرف اسی جنرل کی ایک بیوی تھی جو اپنے ملک و وطن اور تجھ جیسے بزدل انسانوں کی مدافعت کرتا ہوا میدان کارزار میں مصروف پیکار رہتا ہے - شارل نے اپنے داہیں بائیں دیکھا اور جواب دینے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ نپولین نے ڈانٹ کر کہا "خاموش" "اے خاین خاموش وہ سپاہی جسمیں کچھ بھی غیرت اور خودداری ہوتی ہے وہ عورتوں کے پاس بیٹھنے سے اسکو بہتر سمجھتا ہے کہ میدان حرب میں جاکر اپنے وطن کی راہ میں جو دشمنوں سے گھرا ہوا ہے جان دیدے، افسوس تو نے اپنے نفس کو خود ذلیل کیا اچھا اب فوراً لشکر کے دفتر میں جاؤ اور اس کے چیف سکریٹری سے کہو کہ میں نے تجھے لشکر کا منشی بنایا - تیری خیانت کے لئے فی الحال اتنی سزا کافی ہے" تھوڑی دیر خاموش رہکر نپولین نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا "میں تیری سپاہیانہ شرافت سے امید رکھتا ہوں کہ تو اس واقعہ کو لوگوں تک پہنچانے سے باز رہیگا جس سے ایک جنرل کی شرافت عزت اور آبرو پر حرف آتا ہے - حالانکہ وہ شخص اپنی محنت اور مشقت کا تم سے کوئی صلہ نہیں طلب کرتا اس کا مقصد وطن عزیز اور اس کے باشندوں کی عزت و آبرو کی حفاظت کرنا ہے یہی اسکی جانفشانیوں کا صلہ ہے - اچھا اب جاؤ - مگر خبردار اسے بھولنا مت"

یہ وہ سزا تھی جو نپولین بوناپارٹ نے اس خاین اور دغا باز کے لئے تجویز کی تھی، اس کا سبب یہ تھا کہ وہ دنیا کی نظروں میں ذلیل اور رسوا ہونے کیلئے تیار نہیں تھا - شارل کے چلے جانے کے بعد نپولین ملول و مغموم ہو کر ایک کرسی پر پڑ رہا - تھوڑی دیر بعد جوزیفاین سے یوں مخاطب ہوا "جوزیفاین میں حیران ہوں کہ اسوقت تجھ سے کیا باتیں کروں مجھ میں اسوقت اپنے نفس سے بھی باتیں کرنے کی طاقت نہیں ہے" -
افسوس ظالم تو نے پہلے تو مجھے عزت کی سب سے بلند چوٹی پر جگہ دی اور جب میں اس کی بلندی پر مستقل آرزؤں کے شیریں خواب دیکھنے لگا تو تو نے

یکایک مجھے وہاں سے تاریک ترین غار میں گرا دیا تونے ناسمجھی سے میرے ساتھ وہی کھیل کھیلا جو معصوم بچے کبوتر اور طوطوں کے ساتھ کھیلتے ہیں جب کہ قدرت ان معصوم جانوں کی موت و حیات کا مسئلہ ان بچوں کے ہاتھ میں دے دیتی ہے اور وہ اسے سختی سے اپنی مٹھی میں دبوچ کر اس کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیتے ہیں انہیں اسکا احساس بھی نہیں ہوتا کہ یہ وہ نازک جانیں ہیں جنپر انکا یہ کھیل تکلیف اور درد کی ہزاروں بجلیاں گرا رہا ہے اور جو ہر سانس کو اپنی آخری سانس اس دنیا میں خیال کرتے ہیں۔" جوزیفاین نے ارادہ کیا کہ وہ اپنی دونوں باہیں نپولین کی گردن میں حمایل کر کے اس سے قسمیں کھا کھا کر یہ کہے کہ میں، تمھارے سوا کسی دوسرے سے محبت نہیں کرتی بلکہ دنیا میں صرف ایک ذات ہے جو میری پاک اور خالص محبت کا مرکز ہے - تمھارا اور صرف تمھارا خیال ہے کہ نپولین کے ان بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو جھٹک دیا اور کہا"

"جوزیفاین خدا کے لئے محبت کے ذکر سے باز رہو کیونکہ یہ لطیف کلمہ جو روحانی جذبات کی صحیح آواز اور زندگی کے مقدس خوابوں کی صحیح تعبیر ہے - جو بیک وقت روحانی اور جسمانی خواہشات کو تسلی دینے کی کوشش کرتا ہے تمھارے نقطۂ نظر سے صرف بہیمی جذبات کے پیدا کرنے کا آلہ ہے تمنے محبت کو حیوانیت کا وہ رتبہ دے رکھا ہے جس سے انسانیت اجتناب کرتی ہے تمھارے نزدیک محبت ایک حقیر اور معمولی سودا ہے جو بازاروں میں کوڑیوں کے مول مل جاتا ہے حالانکہ یہی محبت نظام اجتماعی کی اساس ہے اس میں زندگی کی روح پھونکتی ہے۔ اُس کی تجلیات حسن و جمال کو دوبالا کرتی ہیں اور تمام لذتوں کا سرچشمہ ہیں - بالفاظ دیگر محبت انسان کی حقیقی راحت اور زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ کاش تم نے اس نعمت حیات کا شکر ادا کیا ہوتا۔ کاش تمنے قدرت کے اس احسان کی قدر کی ہوتی کہ اس نے تمھیں حسن و جمال عطا کر کے تمام عالم کے دل کا مالک مجازی بنایا ہے لیکن افسوس کہ شیطان نے تمھارے دل پر قابو پا رکھا ہے وہ کبھی کبھی تمھارے ضمیر کی حقیقی روح کو فنا کر دیتا ہے۔ تمھارے دل و دماغ کو غلط راستے پر ڈال دیتا ہے میں اُس عورت سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں جو مردہ دل ضمیر فروش۔ عقل و خرد سے بیگانہ ہو۔ کیونکہ اسوقت عورت اور چڑیل میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ مجھے اس شخص کے حال زار پر رحم آتا ہے جس کے پہلو میں ایسی عورت ہو کیونکہ اس حالت میں وہ دنیا کا سب سے بڑا بدبخت انسان ہے جسکی حیثیت بہایم سے کچھ زیادہ ممتاز نہیں خوبصورت عورت صرف آنکھوں کو بھاتی ہے لیکن خوب سیرت اور خوش خلق عورت دلمیں گھر کر لیتی ہے وہ محض ایک ہیرا ہے مگر یہ پورا دفینہ

نپولین نے اسوقت اپنے چاروں طرف ایک نظر کی اور تیزی کے ساتھ اٹھکر اُسی روشندان کی طرف چلا جہاں سے کچھ پہلے ابھی وہ کمرے میں داخل ہوا تھا جوزیفاین نے چاہا کہ اُسے روکے لیکن نپولین نے اس زور سے اُسے ڈھکیلا کہ وہ زمین پر غش کھا کر گر پڑی اور وہ یہ کہتا ہوا ایک کر روشندان پر ہو رہا پیچھے ہٹ او نابکار عورت پیچھے ہٹ مجھے تیری محبت سے زیادہ کشش رکھنے والی ایک دوسری محبت کھینچ رہی ہے تیرے ساتھ بیٹھکر راز و نیاز کی باتیں کرنے کے علاوہ دنیا میں کچھ اور فرائض ہیں جو مجھے سرفروشی کی دعوت دے رہے ہیں میں لڑائی کی آگ میں جلنے کے لئے پیدا کیا گیا ہوں وطن کی محبت میرا خمیر ہے۔ اُسے مجھ پر اعتماد ہے اور مجھے اس پر۔ میرے سامنے امیدیں اپنے خوشنما لباس میں جلوہ گر ہوتی ہیں اور مجھے کھینچکر بلند سے بلند مقام پر لیجاتی ہیں اور یہیں میرا مسکن ہے اور یہی میرا ملجا و ماویٰ

استفسارات

تعداد ازدواج

ڈاکٹر سید ارشاد علی صاحب نکہت ہاپوڑی - سہاگپور

کثرتِ ازدواج کا مسئلہ میری سمجھ میں نہیں آتا - اس کے سمجھنے کی کوشش میں نے مولویوں سے تو اس ڈر سے نہیں کی کہ وہ نہ سمجھا سکنے کی حالت میں "نیچریا" یا کافر لکھکر مخلصی حاصل کریں گے ہاں البتہ غیر مولوی اصحاب سے کی مگر وہ بھی قلب میں کیفیت مطمئنہ پیدا نہ کرسکے - اب جناب کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں مگر یہاں بھی ڈرتے ڈرتے کہ کہیں اسکا نتیجہ بھی وہی نہ ہو جو میرے پہلے استفسار کا ہوا اور جس کے اخیر میں مجھی کو اس خیال سے خاموش ہونا پڑا کہ بعض اوقات خاموشی بھی تکلم بلیغ کے فرائض انجام دیجاتی ہے - ہاں اس سلسلہ میں میں ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں اور جس کی وجہ سے مجھے سخت تکلیف ہوتی ہے وہ یہ کہ قرآن پاک کے ترجمے اسقدر مختلف ہیں کہ مجھ ایسے بدقسمت کے لئے جسنے عربی کی باقاعدہ تعلیم نہیں پائی یہ فیصلہ کرنا "دشوار بھی نہیں" کی حدتک پہنچ جاتا ہے کہ کون صحیح ہے اور کون غلط اور اسی سے فرقہ بندی کا راز وابستہ معلوم ہوتا ہے بہرحال میرا تو یہ خیال ہے کہ جتنی باتیں اسلام میں خلاف عقل اور قابل اعتراض پیدا ہوئیں اس کے ذمہ دار صرف نااہل مترجم ہیں - اب میں اصل استفسار کی طرف رجوع ہوتا ہوں - فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ وثلث ورباع فان خفتم ان لاتعدلوا فواحدۃ (النساء ع ۱) یعنی نکاح کرو اُن عورتوں سے جو تم کو پسند آئیں دو تین چار تک اگر تم کو یہ اندیشہ ہو کہ ان میں عدل و انصاف نہ کرسکو گے تو ایک ہی نکاح کرو - اس سے صاف ظاہر ہے کہ عدل و انصاف پر منحصر ہے چار تک سے نکاح ہونا اور عدل و انصاف کے متعلق اللہ کا یہ حکم ہے کہ "ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النساء ولو حرصتم (النساء ع ۱۹) ہرگز تم اس کی طاقت نہیں رکھتے کہ عورتوں میں انصاف کرسکو اگرچہ تم اس کی ہوس بھی کرو" اس لئے میری رائے ناقص میں قرآنی فیصلہ صرف ایک بیوی کی موافقت کرتا ہے آپ مہربانی فرماکر حسب عادت آزادی سے گفتگو فرمائیں اور صرف کلام مجید کو سامنے رکھکر -

---

(نگار) اس مسئلہ پر اس بیجہ خامہ فرسائی کی گئی ہے کہ اس کا لطیف پہلو اب کاوش وسعی کے بعد بھی نگاہ کے سامنے نہیں آتا اس لئے یہ صرف آپکی خاطر ہے کہ میں اسپر گفتگو کرنے کیلئے آمادہ ہوا ہوں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس کے تصور سے بھی غثیانی کیفیت پیدا ہوتی ہے - تعلیم اسلام پر منجملہ اور بہت سے اعتراضات کے ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس نے تعداد ازدواج کو جائز رکھا - اور اس کے جواب بھی اتنے دئے گئے ہیں کہ دفتر کا دفتر ان سے مرتب ہوسکتا ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ نہ معترضین نے حقیقت پر غور کیا اور نہ جواب دینے والوں نے اس کی طرف صحیح رہنمائی کی میں اس جگہ اس کی تفصیل نہ بیاں کرونگا، کیونکہ اول تو آپ کا استفسار اس کا مقتضی نہیں دوسرا سبب یہ ہے کہ اگر ایسا کروں بھی تو کوئی نتیجہ نہیں ہے تاہم اشارتاً اس قدر ضرور عرض کرونگا کہ شریعت اسلام میں تمام ان مسائل

کی نسبت جن کے متعلق تمدن و معاشرت سے ہے ہمیشہ ضرورت کے لحاظ سے تغیر و تبدل کی اجازت دی گئی ہے اور ایسا ہونا چاہئے تھا کیونکہ زمانہ کے ساتھ ساتھ قانون معاشرت کا بدلنا ضروری ہے اور بانی اسلام کو ایک غیر مسلم بھی کم ازکم اتنا دانشمند تو ضرور جانتا ہوگا کہ وہ نظام تمدن کے اس اصول اور ہیئت اجتماعی کے اس اقتضاء سے واقف تھے، پھر چونکہ نکاح کا مسئلہ، قومی معاشرت کا حد درجہ ضروری واہم مسئلہ ہے اسلئے ظاہر ہے کہ ہر ملک اور زمانہ کی خصوصیات تمدن کے ساتھ ساتھ اس کے احکام میں بھی تغیر ہونا ضروری ہے، لیکن اس نکتہ کی طرف اغیار کو کیوں توجہ ہوتی، جبکہ خود ہمارے ہاں کے اکابر واعاظم اس کو نظر انداز کر چکے ہیں۔ خیر، یہ ایک نہایت دردناک داستان ہے اپنی کم فہمیوں اور ناعاقبت اندیشیوں کی، کہاں تک میں کہونگا اور کب تک آپ سنیں گے۔ اسے کسی اور وقت پر ملتوی کیجئے اور فی الحال آپ اپنے استفسار کے متعلق میرا جواب سن لیجئے۔ آپ کا اعتراض یا اشتباہ یہ ہے کہ کلام مجید میں سورۂ نسار کی ایک آیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر تم عدل کر سکو تو چار تک شادیاں کر سکتے ہو اور دوسری جگہ اسی صورت میں یہ بھی لکھا ہے کہ تم عدل کسی طرح کر ہی نہیں سکتے، اس لئے منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ ایک سے زائد شادی ممنوع ہے۔ اذا فات الشرط فات المشروط۔ سورۂ نسار کی وہ آیت جس میں چار شادیاں تک کرنے کی اجازت دی گئی ہے یہ ہے:-

وان خفتم الاتقسطوا فی الیتامیٰ فانکحوا ما طاب لکم من النسار مثنیٰ وثلث ورباع، فان خفتم الاتعدلوا فواحدۃ او ما ملکت ایمانکم ذالک ادنیٰ الاتعولوا۔ یعنی اگر تمھیں اندیشہ ہے کہ یتیموں کے باب میں تم انصاف نہ کر سکو گے تو جو عورتیں تمھیں اچھی معلوم ہوں ان میں سے دو تین چار تک شادی کر سکتے ہو، لیکن تمھیں خوف ہے کہ تم ان کے درمیان عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی شادی کرنی چاہئے..........

یہاں سب سے پہلے غور طلب امر یہ ہے کہ ایک سے زاید نکاح کرنے کی اجازت دیتے ہوئے پہلے یتیموں کا ذکر کیوں کیا گیا ہے اور نکاح سے انکا کیا تعلق ہے۔ یہ امر متفق علیہ ہے کہ سورۂ نسار جنگ احد کے بعد نازل ہوئی تھی اور اس لڑائی سے مسلمانوں کی معاشرت پر جو اثر پڑا تھا اس کے متعلق بعض ہدایات اس میں کی گئی ہیں جن میں ایک مسئلہ نکاح بھی تھا۔

چونکہ جنگ احد میں بہت سے مسلمان شہید ہو گئے تھے اور آیندہ جنگوں میں بھی ان کی جانیں ضایع ہونے کا احتمال تھا اس لئے یہ سوال قدرتاً پیدا ہونا چاہئے تھا کہ یتیموں اور بیواؤں کا کیا انتظام کیا جائے۔ وہ بیوہ عورتیں جن کے کوئی اولاد نہ تھی ان کے متعلق تو نکاح ثانی کا دروازہ آسانی کے ساتھ کھلا ہوا تھا اسی طرح وہ یتیم بچے جن کی مائیں نہ تھیں پرورش کیلئے لوگوں میں تقسیم ہو سکتے تھے لیکن مشکل تھی ان بیوہ عورتوں کی جو اپنے ساتھ بچے بھی رکھتی تھیں کیونکہ جسقدر بغیر کسی غرض کے صاحب اولاد عورتوں کی کفالت آسان نہ تھی۔ اس کے لئے خدائے کریم نے ہدایت فرمائی کہ اگر یوں تم یتیموں کے ساتھ اچھا سلوک نہ کر سکتے ہو تو ان کی ماؤں سے دو تین چار تک نکاح کر سکتے ہو۔ اس ہدایت سے یہ مقصود تھا کہ جب لوگ یتیم بچوں کی ماؤں کے ساتھ شادی کریں گے تو قدرتاً انکی اولاد سے بھی دلچسپی پیدا ہو جائے گی اور ان سب کی پرورش ان پر اخلاقی و معاشرتی حیثیت سے فرض ہو جائیگی، لیکن اس کے ساتھ عدل

وانصاف کی بھی شرط لگا دی تاکہ اس اجازت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر لوگ محض ہوسرانی اپنا شعار نہ بنالیں اور پھر اصل مقصود (یعنی یتامیٰ کے ساتھ دلسوزی و ہمدردی) فوت ہو جائے

مسلم کی ایک روایت کے مطابق اس آیت کا مطلب یوں بھی بیان کیا گیا ہے کہ اگر تم ڈرتے ہو کہ یتیم لڑکیوں سے نکاح کر کے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہ کر سکو گے تو اور عورتوں سے چار تک نکاح کر سکتے ہو۔ لیکن یہ مفہوم درست نہیں کیونکہ اول تو یہ معنے لینے میں بہت سے محذوفات تسلیم کرنے پڑیں گے اور دوسرے یہ کہ جو مقصود ہدایت کا ہے وہ پورا نہیں ہوتا کیونکہ اور عورتوں سے نکاح کی اجازت دینے میں یتیموں کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے اور پھر اس صورت میں تین تین چار چار نکاح کرنے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے اور اس کی اجازت بالکل بے محل سی بات ہے۔

آپ نے ایک دوسری آیت کا بھی حوالہ دیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عدل ممکن نہیں اور اس لئے ایک سے زائد نکاح بھی جائز نہیں ہو سکتا۔ آپ نے پوری آیت پر غور نہیں کیا ورنہ مطلب واضح ہو جاتا۔ پوری آیت یہ ہے:-

ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النساء ولو حرصتم فلا تمیلوا کل المیل فتذروھا کالمعلقۃ وان تصلحوا وتتقوا فان اللہ کان غفوراً رحیما۔ یعنی اگر تم چاہو بھی تو عورتوں کے باب میں عدل نہیں کر سکتے، پس ان سے بے تعلق نہ ہو جاؤ اور نہ انھیں چھوڑ بیٹھو۔

اس کا تعلق بھی پہلی آیت سے ہے جس میں عدل کی شرط کے ساتھ چار نکاح تک جائز قرار دئے گئے ہیں جب پہلی آیت میں عدل کی شرط تعدد ازدواج کے لئے قرار پائی تو یہ سوال پیدا ہوا کہ صحیح معنے میں عدل کیسے ہو سکتا ہے جب کہ قلب انسانی محبت کے معاملہ میں مجبور ہے اور وہ اس کا برابر تجزیہ نہیں کر سکتا۔ اس سوال کا جواب دوسری آیت سے دیا گیا اور بتایا گیا کہ عدل کا جو مفہوم تم نے قرار دیا ہے وہ بیشک ناممکن العمل ہے، لیکن عدل سے مراد صرف یہ ہے کہ تم اپنی بیویوں کے حقوق برابر ادا کرو، اور ان سے ایسا سلوک کرو جس سے یہ نہ معلوم ہو کہ تم نے انھیں چھوڑ دیا ہے یا بالکل نفرت کرنے لگے ہو۔

نتیجہ یہ نکلا کہ سورۂ نساء میں جن عورتوں کے ساتھ چار نکاح تک کی اجازت دی گئی تھی، وہ صاحب اولاد بیوہ عورتیں تھیں جن کے شوہر جنگ احد میں مارے گئے تھے تاکہ یتیموں کی پرورش ہو جائے اور باہم عدل کی شرط صرف اس حد تک تھی کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے اور محبت سے مجبور ہو کر ایک کو دوسرے پر اس حد تک ترجیح نہ دی جائے کہ کسی سے قطع کی نوبت آجائے۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں نکاح بھی منجملہ دیگر معاملات معاشرت کے ہے اور اس میں وقت و ملک کے لحاظ سے تغیر ہونا چاہئے۔ چونکہ اس وقت خاص سبب کی بنا پر تعدد ازدواج کی ضرورت لاحق ہو گئی تھی اس لئے اجازت دی گئی اور اب بھی جب کوئی اسی قسم کی صورت پیدا ہو کہ تعدد ازدواج معاشرت و تمدن کے مصالح کو پورا کرنے والا ہو تو اس کی اجازت اس فرد کے لئے ہو سکتی ہے جس کے ذریعہ سے یہ ضرورت پوری ہو سکے۔ یوں بلاضرورت بیکار محض ہوسرانی کی بنا پر ایک شخص کا ایک سے زیادہ شادی کرنا ہرگز درست نہیں ہو سکتا علی الخصوص اُس وقت جبکہ موجودہ حالت کو

دیکھتے ہوئے ہمارے لئے ایک بیوی کے حقوق ادا کرنا بھی دشوار ہوگیا ہے۔

حافظ اور ابن یمین

(جناب بدرالحسن صاحب کورلا)

مئی کے رسالہ میں جو مضمون حافظ اور ابن یمین کے متعلق شایع ہوا ہے، وہ مجھے بڑی حد تک محل نظر معلوم ہوتا ہے۔ مضمون نگار نے معلوم ہوتا ہے قصداً بربنائے عناد حافظ کی شاعری کو ذلیل کرنے کے لئے یہ مضمون لکھا ہے جسمیں اسے کامیابی نہیں ہوئی۔

حافظ کے خراسان جانے کے متعلق جو عبارت نقل کی گئی ہے وہ بھی درست نہیں ہے۔ دیوان حافظ کے دیباچہ میں کہیں اس کا ذکر نہیں ہے علاوہ اس کے اگر ایسا ہو بھی تو یہ کیونکر ثابت ہوسکتا ہے کہ حافظ کا اکثر کلام ابن یمین کے کلام سے ماخوذ ہے اسی کے ساتھ گفتگو اس پر بھی ہوسکتی ہے کہ واقعی مضمون نگار کو ابن یمین کا دیوان ملا یا نہیں۔ بہرحال اس باب میں مجھے آپ کی ذاتی راے معلوم کرنے کا اشتیاق ہے اگر حرج نہ ہو تو مطلع فرمایئے۔

(نگار) آپکے استفسار کا خلاصہ یہ ہے کہ حافظ نے ابن یمین کے کلام سے فایدہ اٹھایا یا نہیں اور کیا ابن یمین کا دیوان واقعی دستیاب ہوگیا ہے۔ جناب آرگس نے جسوقت مضمون لکھ کر میرے پاس بھیجا میں نے بھی سب سے پہلے یہی سوال کیا کہ دیوان ابن یمین کی دستیابی کا ثبوت کیا ہوسکتا ہے، جس کے جواب میں اُنھوں نے مجھے دیوان دکھایا اور اس کو دیکھنے کے بعد میں اس امر پر ضرور ان سے متفق ہوگیا کہ یہ واقعی ابن یمین کا دیوان ہے۔

اب رہا یہ امر کہ حافظ نے ابن یمین کا تتبع کیا یا نہیں اور حافظ کی شاعری پر کس حد تک ان کے کلام کا اثر ہوا، بہت غور و تامل کا محتاج ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ آرگس نے اس عبارت کے نقل کرنے میں جس سے حافظ کا خراسان جانا ثابت کیا جاتا ہے ضرور غلطی ہوئی ہے کیونکہ اصل عبارت یہ ہے "غزلہاے جہانگیرش با دنی مدت بحدود اقالیم خراسان و ترکستان و ہندوستان رسیدہ" اس سے حافظ کا خراسان جانا ظاہر نہیں ہوتا بلکہ ان کے کلام کا خراسان میں مشہور ہونا ثابت ہوتا ہے، لیکن اگر اس استدلال کو رد کر دیا جائے تو بھی اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ حافظ ضرور خراسان گئے اور ابن یمین کے پاس رہے، کیونکہ اس باب میں خود ابن یمین کا یہ شعر نا قابل انکار شہادت ہے

چہ غم از طعنۂ اغیار ترا ابن یمین　　　که چو حافظ بجہاں یادگاری داری

جناب آرگس نے اپنے مضمون میں صرف یہ امر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حافظ کا کلام تصوف ابن یمین کے کلام سے متاثر ہو کر

پیدا ہوا ہے اور اگر یہ صحیح ہو بھی تو اس سے حافظ کی شاعری کی کوئی توہین نہیں ہوتی کیونکہ اول تو حافظ کے ہاں ایسا کلام جس کو ابن یمین رنگ کا کہا جائے، بہت کم ہے اور جس قدر ہے وہ قابل لحاظ نہیں کیونکہ میرے نزدیک دیوان حافظ کا وہی حصہ ناقابل اعتنا رہے جسے ناقابل تاویل رنگ تصوف میں شامل کیا جاتا ہے۔ اس لئے اگر سچ پوچھئے تو جناب آرگس حافظ کی توہین کرنے کے بجائے اس کی حقیقی عظمت ہم پر ظاہر کر گئے ہیں۔

جناب آرگس نے مئی کے نگار میں اور اس مہینے کے مضمون میں جو ابن یمین ہی کی شاعری پر لکھا گیا ہے، ابن یمین کے بہت سے محاسن شاعری شمار کرائے ہیں اور ان کے متصوفانہ شاعری کی تعریف کرتے ہوئے ظاہر کیا ہے کہ حافظ کے ہاں جسقدر تصوف کا رنگ پایا جاتا ہے وہ سب ابن یمین کا ہے۔ لیکن میں اس کے ماننے کے لئے طیار نہیں کہ ابن یمین کا کلام واقعی اس حد تک سراہے جانے کے قابل ہے اور اگر حافظ نے کبھی ان کا تتبع کیا ہے تو کوئی بڑی عمدہ بات کی ہے۔

حافظ کی شاعری کے متعلق یہ کہنا کہ اس کا کوئی خاص رنگ نہیں ہے میرے نزدیک ناروا جسارت ہے، کیونکہ اگر نگاہ تامل سے دیکھا جائے تو حافظ ہی ایک ایسا شاعر نظر آئے گا جس کا رنگ کلام چھپ نہیں سکتا اور ہزار میں علحدہ پہچان لیا جاتا ہے پھر اسی کے ساتھ وہ شوخی و رنگینی دستی و کیف، وہ رندی و سرخوشی جو کلام حافظ کی جان ہے، ابن یمین کے ہاں کہیں نہیں پائی جاتی اور اس کا کلام یکسر خشک، بے کیف و سرسری ہے۔ ممکن ہے کہ حافظ کے ہاں بھی بعض غریب دلچسپ و قابل حذف اشعار ابن یمین کے رنگ کے نکل آئیں لیکن اب یہ انکشاف قابل تسکین نہیں ہے کہ حافظ کے ایسے اشعار ابن یمین کی صحبت کا نتیجہ تھے اور اس لئے حافظ کے اصلی شاعری ان کی وجہ سے داغدار نہیں ہو سکتی۔ میں نے اس پر کبھی غور نہیں کیا کہ جناب آرگس نے قصداً بر بنائے عناد حافظ کے خلاف مضمون لکھا کیونکہ اس عناد کی وجہ بظاہر سمجھ میں نہیں آتی جب کہ حافظ و ابن یمین میں سے کوئی اس وقت موجود نہیں ہے اور نہ جناب آرگس اپنے آپ کو حافظ کا ہمسر یا ہم پلہ شاعر مانتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان کا مقصود صرف تحقیق حق ہو لیکن لب و لہجہ مناسب نہ ہو۔ مگر میں نے اس کو ضرور محسوس کیا ہے کہ جناب آرگس حافظ کے متصوفانہ شاعری کو ابن یمین کے کلام سے ماخوذ ثابت کرنے میں اس حد تک کامیاب نہیں ہوئے جس حد تک انھوں نے دعویٰ کیا ہے تاہم قابل مضمون نگار کا شکریہ ہم پر واجب ہے کہ ان کے اس مضمون نے حافظ کی شاعری کے متعلق بحث و تحقیق کا جدید دروازہ کھولدیا اور ابن یمین کا وہ نایاب کلام جسکے وجود کا بھی علم لوگوں کو نہ تھا نگار کے ذریعہ سے بے نقاب ہو گیا۔

نرگس اور آنکھ

(جناب سید اشفاق حسین صاحب۔ کلکتہ)

مولانا شبلی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ایران میں آنکھ کو نرگس سے تشبیہ دینے کا سبب یہ ہے کہ ترک بچے ان کے محبوب تھے اور

ان کی آنکھ گول اور چھوٹی ہوتی ہے، لیکن اب ہر شخص بلا لحاظ اس امر کے کہ نرگس کا پھول واقعی آنکھ کی طرح ہوتا ہے یا نہیں یا اُسے آنکھ سے تشبیہ دینی چاہئے یا نہیں آنکھ کو نرگس کہنے لگا، حالانکہ آنکھ کی خوبی اس کا بڑا اور لانبا ہونا ہے اور گل نرگس بر خلاف اس کے چھوٹا اور گول ہوتا ہے۔

مولانا کی اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ آنکھ کو نرگس سے تشبیہ دینے کی ابتدا ایران ہی میں اس خاص وجہ سے ہوئی اور شاید کسی اور زبان میں جو فارسی شاعری سے متاثر نہیں ہوئی ہے، یہ تشبیہ نہیں پائی جاتی۔ براہ کرم مطلع فرمائیے کہ اس مسئلہ میں آپ کی کیا رائے ہے اور کیا عربی میں ایسے اشعار ملسکتے ہیں جنمیں آنکھ کو نرگس سے تشبیہ دی گئی ہو۔

(**نگار**) میں نہیں کہہ سکتا کہ ایران میں آنکھ کو نرگس سے تشبیہ دینے کی وجہ وہی ہے جو مولانا شبلی نے بیان کی ہے یا کوئی اور، لیکن یہ ضرور معلوم ہے کہ فارسی میں اُس وقت بھی جب رودکی کا کہیں وجود نہ تھا جب فارسی شاعری کا پتہ بھی نہ تھا آنکھ سے نرگس کو تشبیہ دیتے تھے، چنانچہ کسریٰ انوشیرواں کے متعلق علامۂ سیوطی لکھتے ہیں کہ وہ نرگس کا بڑا عاشق تھا اور کہا کرتا تھا کہ میں اس مجلس میں گفتگو کرتے حیا کرتا ہوں جہاں نرگس ہو کیونکہ چشم نگراں کے مشابہ اس سے زیادہ کوئی چیز نہیں ہے۔ علاوہ اس کے یہ بھی حقیقت ہے کہ آنکھ کو نرگس کہنا صرف شعرائے فارسی ہی کے ہاں رائج نہ تھا بلکہ عربی میں بھی کثرت سے اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ اول تو مجھے اس میں کلام ہے کہ گل نرگس گول اور چھوٹا ہوتا ہے اور اس لئے وہ ترک بچوں کی آنکھ سے زیادہ مشابہ ہے جن کی آنکھیں خود ایسی ہوتی ہیں اور اگر اسے تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیا جائے تو بھی یہ ضروری نہیں کہ نرگس سے اسی آنکھ کو تشبیہ دیجاتی ہے جس کی ساخت بالکل ویسی ہی ہو کیونکہ تشبیہ کے لئے مشبہ اور مشبہ بہ میں مشارکت تامہ کی ضرورت نہیں ہے، صرف ادنیٰ وجہ شبہ بھی کافی ہوا کرتی ہے، اور میرے نزدیک وہ وجہ صرف اس کی نگرانی ہے۔ حسن المحاضرہ میں ایک مستقل باب مصر کے ریاحین واز ہار کے متعلق بھی نظر آتا ہے اور اس میں جو اشعار اس عہد کے شعراء کے نقل کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شعرائے عرب نے کثرت سے آنکھ کے ذکر میں نرگس سے تشبیہ دی ہے۔

ابو نواس لکھتا ہے:-

لدی نرجس غض القطاف کانہ	اذا ما منحناہ العیون عیون
مخالفۃ فی شکلہن مصفرۃ	مکان سواد و البیاض جفون

ابن رومی فرماتے ہیں:-

و نرجس کالثغور مبتسم	لہ دموع المحدق الشاکی
ابکاہ قطر الندی و اضحکہ	فہو مع القطر باکی ثو

اسی طرح ابن المعتز، کشاجم، صنوبری، ابن مکیسہ اور ابو بکر بن حازم نے بھی اپنے اشعار میں نرگس کا ذکر کیا ہے اور سب نے اسے آنکھ سے تشبیہ دی ہے۔

معلومات

بیسویں صدی کی کلیو پٹرا! ہنگری کے پایۂ تخت بوڈاپسٹ میں ایک عورت ہے جو اپنے حسن و جمال اور خوش ادائیوں کے لحاظ سے ممکن ہے کلیو پٹرا سے کم ہو، لیکن اپنی سحر کاریوں اور ستم رانیوں کے اعتبار سے غالباً کچھ زیادہ ہی نکلیگی، کیونکہ کلیو پٹرا کی قربانگاہ حسن کو اتنی قربانیاں نصیب نہیں ہوئیں، جتنی اس ماہ پر کالہ کو میسر آچکی ہیں۔ یوں تو ہر نوجوان شخص جس کی نگاہ اس پر پڑتی ہے بیک نگاہ فریفتہ ہو جاتا ہے، لیکن یہ صرف اسی شخص کی شیفتگی کو قبول کرتی ہے جو ان میں سب سے زیادہ بہتر نمونۂ حسن و شباب ہوتا ہے اور ٹھیک اسوقت جب کہ حسن کی نوازشیں اور اس کے الطاف مرد کو دیوانہ بنا دیتے ہیں یہ اپنے محبوب شکار کے سامنے زہر آلود جام شراب پیش کرتی ہے اور یقین دلاتی ہے کہ میں خود بھی تیرے عشق میں جان دیدونگی وہ غریب جو حقیقتاً دیوانۂ جمال اور مسحور حُسن ہوتا ہے، جوش محبت میں زہر کے گھونٹ حلق سے اتار لیتا ہے اور یہ اپنے جام کو زمین پر پٹک کر اُٹھ کھڑی ہوتی ہے اور اُسوقت تک کہ اُس کے محبوب یا عاشق کا دم نہیں نکل جاتا، نزع کی تمام تکالیف نہایت اطمینان سے دیکھا کرتی ہے اور خوش ہوتی ہے۔ جب وہ چھ نوجوانوں کو زہر دیکر مار چکی ہے اور ساتویں کی باری آئی تو اس نے انکار کیا اور حکومت کو جاکر آگاہ کر دیا سنا جاتا ہے کہ حکومت نے اس قتالہ کو گرفتار کر لیا ہے اور تحقیقِ واقعات ہو رہی ہے۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ فرانس کے کتب خانہ میں ۳۰ لاکھ سے زیادہ کتابیں پائی جاتی ہیں

ریشم کا کیڑا ۵۰ سے ۷۳ دن تک زندہ رہتا ہے۔

مکڑی بغیر غذا کے دس مہینے تک زندہ رہتی ہے۔

سب سے زیادہ قدیم نقشہ وہ تھا جسے چینیوں نے ۶۰۰ سال قبل ولادت مسیح طیار کیا تھا

ان مقامات کی آبادی جہاں عربی زبان بولی جاتی ہے ۷ کروڑ ہے

امریکہ میں ۶۰۰۰ مدرسے ایسے ہیں جہاں سینما کے ذریعہ سے تعلیم دیجاتی ہے

نہر سویز کے افتتاح میں جو جشن منایا گیا تھا اس میں ۱۶ ملین گنی صرف ہوئی تھی۔

فرانس کے مشہور قید خانہ باسٹل کی صرف بنیاد کی تعمیر ۲۲ سال میں ہوئی تھی۔

دنیا میں سب سے زیادہ ارزاں ڈاک کے ٹکٹ جاپان کے ہیں۔

آبشار وکٹوریا دنیا کی سب سے زیادہ حسین آبشار ہے

گدھے کی عمر جسقدر زیادہ ہو جاتی ہے اس کے حس اور قوت اتنی ہی تیز اور قوی ہوتی جاتی ہے

اس وقت دنیا کی سب سے بڑی گھڑی وہ ہے جو اٹلی میں طیار کرا کے بونس ایرس بھیجی گئی ہے اس کے گھنٹے کا وزن ایک

عورت کے متعلق بعض خیالات

آفتاب بحر اوقیانوس کو خشک کر سکتا ہے، لیکن عورت کے آنسو خشک کرنا اس کے امکان میں نہیں

عالم کا سب سے زیادہ جمیل منظر جو نفس انسانی کو متاثر کرنے میں نظیر نہیں رکھتا، وہ منظر ہے جب کوئی حسین عورت حزین وملول نظر آئے۔

عورت تبسم حیات ہے۔ عمران و مدنیت کی بنیاد ہے۔ ایک ایسا جوہر ہے جس کی قیمت کا اندازہ صرف عقلا کر سکتے ہیں

نگار شین پریس لکھنؤ میں باہتمام وصل بلگرامی چھپا
اور دفتر نگار نظیر آباد لکھنؤ سے شایع ہوا

[مو]لانا [...] شہری مرحوم

[...]ت انیس عہ
[...]ئی شاعری عہ
[...]ان بیگم ۸ر
[...]لطان عہ
[...]علی سلطان عہ

[مو]لانا حالی مرحوم

[...]گار غالب ے
[...]ت سعدی رحمۃ اللہ علیہ
[...]ہ شعر و شاعری عہ
[...]ت جاوید
[...]ن حالی
[...]س حالی
[...]نظم حالی
[...]مناجات ۲ر
[...]ہند ۲ر

[...]ینائی مرحوم

[...]ات (نامکمل)
[...]ۂ عشق
[...]غیب
[...]م النبیینؐ ۸ر
[...]سخن عہ
[...]میر مینائی

[...] مرحوم [...]

[...]بان اردو
[...]ہائے دلکش عہ
[...]ین عہ
[...]لیر و تانیث ۸ر
[...]بیخ عہ

قواعد المنتخب ۴ر

پنڈت رتن ناتھ سرشار

فسانۂ آزاد ۴ جلد
سیر کہسار
خدائی فوجدار
جام سرشار
الف لیلیٰ پطرز ناول
کامنی
بچھڑی دلہن ۸ر
سوانح عمر و عیار

منشی سجاد حسین مرحوم

احمق الذین ۸ر
حاجی بغلول ۸ر
پیاری دنیا ۸ر
کایا پلٹ ۸ر
نیکھی چھری ۲ر
طرحدار لونڈی
طلسمی فانوس

منشی جوالا پرشاد برق

مرنالنی ۱۲ر
مار آستین ۱۲ر
بنگالی دلہن ۱۲ر
معشوقۂ فرنگ ۱۲ر
پرتاب ۱۲ر
روہنی ۱۰ر

مولوی محمد حلیم انصاری

تمدن اسلام
فتح اندلس
ابو مسلم خراسانی

تاریخ عرب صہ

پریم چند

پریم پچیسی ۸ر
بازار حسن

شوق قدوائی مرحوم

ترانۂ شوق
قاسم و زہرہ عہ
نیرنگ جمال ۸ر
گنجینہ ۱۲ر
میکفرن اور لوسی ۸ر

خواجہ عبد الرؤف عشرت

زبان دانی ۲ر
اصلاح زبان اردو ۲ر
قواعد میر ۲ر
اصول اردو
جان اردو ۸ر
شاعری کی پہلی کتاب ۸ر
دوسری کتاب ۸ر
تیسری کتاب ۸ر
لغات اردو

منشی محمد احسن وحشی

محبوس گذشت عہ
جام زہر

مولانا حکیم عبد الحی مرحوم

یاد ایام عہ
تذکرہ گل رعنا صہ

مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی

سیرۃ الصدیق
علمائے سلف

تذکرۃ الشعراء (میر حسن)

منشی سید احمد مارہروی

آثار اکبری ے
حیات خسرو عہ
امرائے ہنود

مولوی عزیز مرزا مرحوم

خیالات عزیز
وکرم اروسی

مولانا حسرت موہانی

شرح دیوان غالب عہ
مکمل دیوان حسرت

سید سجاد حیدر بی اے

خیالستان
ثالث بالخیر ۸ر
زہرا ۱۲ر
جلال الدین خوارزم شاہ

مسٹر ظفر عمر بی اے

چوروں کا کلب ۹ر
نیلی چھتری عہ
بہرام کی گرفتاری عہ
مستقبل اسلام

مولوی عبد الماجد بی اے

فلسفۂ جذبات
مکالمات برکلے
پیام امن
تصوف اسلام عہ
فلسفیانہ مضامین
زود پشیمان ۸ر

مولوی سید سلیمان ندوی

ارض القرآن
سیرۃ عائشہؓ
حیات امام مالک عہ
خلافت عثمانیہ اور اسلام عہ
خلافت اور ہندوستان ۸ر

مولوی عبد السلام ندوی

اسوۂ صحابہ ۲ جلد سے
سیرۃ عمر بن عبد العزیز
انقلاب الامم
تاریخ الحرمین الشریفین
فقرائے اسلام
فطرت نسوانی
شعر الہند ۲ جلد سے

مولوی عبد الباری ندوی

مبادی علم انسانی
برکلے کا فلسفہ

مولوی سعید انصاری

سیر الصحابہ جلد اول صہ
سیر انصار ۲ جلد ے
سیر الصحابیات

مولوی عبد الرزاق ندوی

اسوۂ حسنہ
کتاب الوسیلہ
ترکی اور یورپ ۶

منشی عبد المجید سالک بی اے

راہ و رسم منزلہا ۸ر
چھپا و دیگر افسانے
چترا (ٹیگور) ۱۴ر